

# بے نشان منزلیں اور راہی

نایاب جیلانی

پاکستانی پبلیکیشنز ڈاٹ کام



# بے نشان منزلیں اور راہی

نایاب جیلانی

ستابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود تمام ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ وہ لوگ جو وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤنلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: زندگی، بسمہ، حبیب یا مینجمنٹ و قار سے رابطہ کریں، شکریہ

# بے نشان منزلیں اور راہی

آفس سے واپسی پر وہ گھر آنے کے بجائے احمر کی طرف چلا گیا تھا مگر فلیٹ کے لاکڈ دروازے کی طرف دیکھ کر اس کا کوفت اور جھنجلاہٹ سے برا حال ہو گیا۔ احمر کو کوسٹے ہوئے واپس جانے کا قصد کیا۔ ابھی اس نے فرسٹ ٹرن ہی لیا تھا کہ گاڑی ایک جھٹکے سے کھانستے ہوئے رک گئی۔

”آج کا دن ہی برا ہے“ وہ بڑبڑاتے ہوئے ڈور کھول کر باہر نکل آیا آج صبح احمر نے اسے وقت پر جگایا نہیں تھا ورنہ وہ پانچ بجے ہی مس کالز اور میسج بھیج بھیج کر اس کی ناک میں دم کر دیتا تھا۔ ”پوسٹیو اٹھ جاؤ“ آٹھ بجنے میں

صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے جب احمر کا ایس ایم ایس آیا وہ جو شرٹ پریس کر رہا تھا غصے سے موبائل کی طرف بڑھا اور احمر کا نمبر دیکھ کر صوفے پر بیٹھ دیا تھا۔ زیر لب دو چار گالیوں سے احمر کو نوازتے ہوئے اس نے الٹی سیدھی شرٹ پریس کی، ٹائی میچ کرتے ہوئے پانچ منٹ ضائع ہو گئے گھڑی کی طرف نگاہ اٹھی تو احمر کی گردن کو مروڑ دینے کو دل چاہا خبیث، ذلیل خود تو آفس پہنچ چکا ہو گا اور مجھے جگایا بھی ہے تو کب علی نے دانت کچکچاتے ہوئے واش روم کا رخ کیا۔ پیچھے سے احمر کی کھنکٹی آواز سنائی دے رہی تھی علی نے مڑ کر دیکھا تو وہ خوب بن ٹھن کر عین دروازے کے بیچ میں کھڑا مسکرا رہا تھا مجھے اپنی بیوی سمجھ رکھا ہے تم نے رعب تو ایسے جما تے ہو جیسے میں تمہاری نصف بہتر ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے سچ مچ تمہاری زوجہ محترمہ کا گمان ہوتا ہے۔ صبح صبح ہیں جگاؤں بھی اور تمہاری ازلی سست طبیعت کی وجہ سے ناشتہ بھی جیسا تیسرا بنائوں لُچ آورز میں بمعہ لُچ باکس کے تمہارے کین میں آکر اپنی نگرانی میں تمہیں لُچ کروائوں۔ اگرچہ آنٹی کی خاص ہدایت ہے اور پھر اپنے گھر جا کر سار ”سیاپا“ بھی مجھے ہی کرنا پڑتا ہے

فارینہ مہارانی کی تو مجھے دیکھ کر ہی طبیعت خراب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ کبھی سر میں درد ہے کبھی کمر میں یعنی کے حد ہی ہو گئی ہے۔

وہ نان سٹاپ شرع ہو چکا تھا۔ علی مسکراتے ہوئے واش روم میں گھس گیا جب تیار ہو کر آیا تو ناصر ف ناشتہ ٹیبل پر لگا چکا تھا بلکہ کمرے میں جو کچھ بکھیرا تھا وہ بھی سمیٹ چکا تھا۔

احمر کا خیال آنے پر اچانک اسے یاد آیا تھا کہ آج اس نے فارینہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔ اس نے کچھ فکر مندی کے عالم میں سر پر ہاتھ مارا اور پھر بونٹ گرا کر موبائل نکالا اور احمر کا نمبر پریس کیا۔ مگر اس کا سیل ہی آف تھا۔ رات کے سائے ہر سو پھیل چکے تھے پورے علاقے پر مہیب خاموشی طاری تھی۔ گاڑی کے دروازے لاک کر کے اس نے پیدل مارچ کرنے کا سوچا۔ اس کے اور احمر کے گھر کا فاصلہ صرف بیس پچیس منٹ پر مشتمل تھا۔ پہلے پہل وہ اور احمر اکٹھے رہتے تھے اور پھر احمر نے شادی کے بعد فارینہ کو بھی امریکہ بلوا لیا تھا۔ احمر کے بے انتہا اصرار کے باوجود بھی وہ

اسکے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا وہ شروع سے ہی تنہائی پسند تھا اور احمر اپنے خاص دوست کے مزاج اس کی طبیعت کے ہر رنگ سے واقف تھا۔

سیاہ بل کھاتی سڑک کے درمیان پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بڑے لاپروا انداز میں چل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا اس کے بالوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ اس کالونی میں بنے خوب صورت فلیٹس اور چھوٹے چھوٹے ولاز میں رہنے والے لوگوں کیلئے چھوٹی سی خوب صورت تفریح گاہ یعنی پارک تھا۔ جس میں بچوں کیلئے چھوٹے اور درمیانے سائز کے بیچ رکھے گئے تھے۔

پارک کے چاروں طرف سرخ گلابی سفید پھولوں نے ہالہ سے بنا رکھا تھا۔ وہ پارک کے قریب سے گزرا تو پھولوں کی دلفریب مہک اسکے ناک سے ٹکرائی۔ اس نے گہرا سانس کھینچ کر پھولوں کی دلفریب مہک کو اپنے اندر اتارا۔ اسی پل پھولوں کی باڑ کے قریب اسے ہلکی سے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ پہلے پہل علی نے اسے اپنا وہم جان کر نظر انداز کرنا چاہا مگر آواز ہنوز

آرہی تھی۔ وہ کچھ لمحے سوچتا رہا اور پھر ایک فیصلہ کر کے پارک کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ پارک میں اس وقت مکمل اندھیرا تھا۔ موبائل کی ہلکی سی روشنی میں اسے اپنے سے کچھ فاصلے سے وہ ہلتا ہوا وجود نظر آگیا تھا۔

وہ گھٹنوں میں سر دبائے سسکیاں روکنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی اس کے لمبے گھنگریالے اخروٹی رنگ کے بال پوری پشت پر بکھرے ہوئے تھے جبکہ جسم کپکپا رہا تھا۔ علی کی نظروں کی حدت تھی یا پھر ننھی منی موبائل کی روشنی کی کرن محسوس کر کے اس نے سر اٹھایا تو اپنے بالکل قریب کھڑے نوجوان کو دیکھ کر گھبرا اٹھی اور بھیگے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے لاشعوری طور پر وہ چند قدم پیچھے ہٹی تھی۔

علی حیران تھا کہ رات کے اس پہر ٹھٹھرا دینے والی سردی میں بغیر سویٹر کے سنسان پارک میں وہ انگریز لڑکی کیا کر رہی تھی۔ اس ایریے میں زیادہ تر پاکستانی 'انڈین اور عربین خاندان آباد تھے۔ تمام سرکاری ملازم یہاں سرکاری فلیٹوں اور ولاز میں رہتے تھے۔ رات کے اس پہر اس لڑکی کی



موجودگی اسے مشکوک کر گئی تھی اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات  
شبہات سر اٹھا رہے تھے۔ مگر دوسرے ہی پل اسے اپنے خیالات بدلنے  
پڑے تھے۔ وہ لڑکی بہت ہی سہمی ہوئی تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ ٹھنڈ سے  
یا پھر خوف کی شدت سے نیلے ہو رہے تھے جبکہ رنگت پل بھر میں ہی سفید  
سے زردی مائل ہو گئی تھی۔ وہ کسی سہمی نڈھال چڑیا کی مانند کپکپا رہی تھی  
۔

”کون ہو تم...؟“ علی نے قدرے سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا تھا  
جبکہ وہ اس کی کھردری سخت آواز سن کر بے اختیار رودی۔ علی اس صورت  
حال سے قدرے پریشان ہو اٹھا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔  
اب کے وہ لڑکی ہاتھ جوڑتے ہوئے اسکے قدموں میں گر گئی تھی۔

”میں غیر محفوظ ہوں...مجھے بچا لو۔“ اس نے لرزیدہ آواز میں ہکلاتے ہوئے  
کہا دوسرے ہی پل وہ ہوش و خورد سے بے گانہ ہو گئی تھی۔ علی کے  
اوسان خطا ہو گئے۔

☆☆☆

”کہیں نیکی گلے ہی نہ پڑ جائے“ پچھلے تین گھنٹوں میں کوئی ایک سو چالیس  
مرتبہ اپنے بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھ کر علی نے سوچا تھا۔  
”مجھے اٹھا کر نہیں لانا چاہئے تھا۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر خود کو کوسا۔ لائونج  
میں ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے اس کا ذہن مختلف سوچوں میں الجھ کر رہ  
گیا تھا۔ تھک ہار کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پھر اپنے کمرے  
کی طرف دیکھا۔

اس کے بے ہوش وجود کو اپنے پیارے بیڈ پر ڈال کر علی نے ٹھنڈے پانی  
کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے تھے۔ تھوڑی سے کوشش کے بعد اس نے  
آنکھیں کھول لی تھیں۔ مگر اس کے ذہن کی حالت کافی ابتر

تھی جس طرح وہ بے انتہا رو اور چلا رہی تھی۔ علی بے حد گھبرا گیا تھا۔ پھر  
کچن میں جاکر دودھ کا گلاس مائیکروویو میں گرم کر کے لے آیا اور دراز میں  
سے ٹیبلٹ نکال کر بمشکل اسے کھلائی تھی۔ بال نوچتے اور سر پٹختے ہوئے



دودھ تھوڑا پیا اور زیادہ گرایا۔ کچھ ہی دیر بعد اسکی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔ علی نے گہرا سانس لیا اور اس پر کمبل ڈال کر باہر نکل آیا۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پہلے ہمدردی اور اب فکر اور پریشانی کا احساس غالب تھا۔ وہ سست قدموں سے اٹھا اور گرما گرم کافی بنا لایا اسی پل فون کی بیل گنگنا اٹھی۔ علی نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا اور مسکراتے ہوئے فون کان سے لگا لیا۔ ”فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے وضو کریں اور نماز پڑھیں۔“ دوسری طرف چھوٹتے ہی زین نے کہا۔

”السلام و علیکم۔“ علی نے اسے شرم دلانے کی کوشش کی مگر زین پر کہاں اثر ہونا تھا۔ ”جیتے رہیں۔ خوش رہیں۔ مسکراتے رہیں، میموں کو تڑپاتے رہیں اگر اپنا دل بڑھاپے کی طرف محو سفر ہے تو کم از کم اپنے بھائی کا نمبر ہی لگوا دیں۔ کبھی تو آئے گی اپنی باری جب ہم بھی امریکہ کی حسین صبحوں، گلاب شاموں کو انجوائے کریں گے اور اپنی جیبیں نوٹوں سے بھریں گے۔“

”اور سر پر جوتے لگیں گے“ علی نے تیکھے ترش لہجے میں کہا تھا۔ زین کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”چھوٹے تو بہت تیز ہو گیا ہے“ زین کے طنزیہ انداز نے اسے بے انتہا تکلیف سے دوچار کر دیا تھا۔ ”اب میں بڑا ہو گیا ہوں بھائی پورے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔ نہ آپ نے مجھے دیکھا ہے نہ میں نے آپ کو۔ کیا امریکہ کی خوبصورتیاں اسی طرح زنجیر ڈال دیتی ہیں کہ اپنے بھول جائیں۔ یا پھر ڈالرز کی کشش؟“ زین نے بھرائے لہجے میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ یقیناً وہ رو رہا تھا۔ علی نے دل میں درد کی ایک لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔

”زین — میرے بھائی میری جان۔“

”نہیں ہوں میں آپ کا بھائی“ وہ غصے سے چلایا۔ جب مرجائوں گا تو لاش کو کندھا دینے آجائیے گا“ وہ اسی طرح جذباتی تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو دینے والا ”تم کیوں ضد کرتے ہو۔ کیوں مجھے اور خود کو تکلیف دیتے ہو۔ میرے پاس آجاؤ۔ یہاں بے حد قابل ڈاکٹرز اور بہترین علاج معالجے کی سہولیات



موجود ہیں اور پھر تم نے امریکہ کی حسین صبحوں اور گلاب شاموں کو بھی تو انجوائے کرنا ہے،“ علی نے آخر میں کچھ شرارت بھرے انداز میں کہا۔

زین بے اختیار مسکرا اٹھا۔ اور پھر وہ اپنے دوستوں کی شرارتوں کے قصے سنانے لگا تھا۔ علی بے حد دلچسپی سے سنتا رہا۔ فون بند کرنے کے بعد بھی وہ زین کے متعلق سوچتا رہا تھا۔

زین، اس کا چھوٹا بھائی، جس سے علی کو بے انتہا محبت تھی۔ زین پیدائشی بیمار تھا۔ اس کے دل میں سوراخ تھا اور جب علی کو اس کی بیماری کی خبر ملی تو وہ پہروں رویا کرتا تھا۔ اسے آج بھی وہ دن یاد تھا جب وہ کالج سے آیا تو ڈیڈی اور زرمینہ ممی لائونج میں بیٹھے تھے۔ ڈیڈی کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے جبکہ زرمینہ ممی مسلسل رو رہی تھیں۔

اس سے کچھ فاصلے پر واکر میں بیٹھا زین ہر شے سے بے نیاز اپنی معصوم دنیا میں مگن کھیلنے میں مصروف تھا۔ ڈیڈی دھیمی آواز میں ممی کو زین کی بیماری کے متعلق بتا رہے تھے۔ علی کبھی ڈیڈی کی طرف دیکھتا اور کبھی زین کی

طرف اسے بے اختیار ممی کے وہ الفاظ یاد آئے تھے جب وہ ہسپتال سے آئیں تو انکی گود میں گلابی کمبل میں لپٹا وجود تھا۔ علی کی طرف دیکھ کر انہوں نے بچے کو چوما اور پھر انتہائی کدوفر سے کہا تھا۔

”حادث کی جائیداد کا اصل وارث تو اب آیا ہے۔“ علی کو جتنی محبت زین سے تھی اتنی ہی نفرت ممی اور سوہا، سوما سے تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ دن رات زین کو اپنے پاس سلائے رکھتا۔ زین کی گورنس کو تو علی نے کبھی قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ خود ہی زین کو فیڈر پلاتا اسکے کپڑے بدلتا۔ پھر پرام میں بیٹھا کر باہر لیجاتا تھا۔ ممی اور اسکی کتنی ہی مرتبہ لڑائی ہوئی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد بھی اسکا سارا وقت زین کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔

اور پھر جب زین چار سال کا ہوا تو وہ ہمیشہ کیلئے امریکہ چلا گیا تھا۔ اسے آج بھی وہ کربناک رات یاد ہے جب ماما نے اس پر الزام لگا کر ناصرف اسے پٹوایا تھا بلکہ گھر سے بھی نکال دیا تھا۔



”میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“ ماضی کی یاد میں گم، ان تکلیف دہ لمحوں کو سوچتے ہوئے علی نے کچھ چونک کر آنکھیں مسلتے ہوئے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کی طرف دیکھا تھا جو کہ کارپٹ کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ علی ایک دم گر بڑا کر سیدھا ہوا۔

”تم بہت اچھے ہو تم نے مجھ پر احسان کیا ورنہ میں رات کو ٹھنڈ اور خوف کی شدت سے شاید مر جاتی۔“

اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹختے ہوئے وہ خالصتاً امریکن لہجے میں بول رہی تھی۔

میں نے کل رات کو تم پر احسان کیا تھا آئندہ کی امید مت رکھنا۔ اگر تم بہتر فیل کر رہی ہو تو ناشتہ کر لو اور پھر مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھائو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں“ علی نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے مگر سخت لہجے میں کہا تھا۔

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“

علی اسے مزید اب یہاں رکھ کر اپنے گلے میں کوئی مصیبت نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لئے رکھائی کے ساتھ اسے چلنے کہ کر اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ جب وہ کپڑے چینج کر کے آیا تو وہ نجانے کہاں تھی البتہ احمر بولتا ہوا بلکہ چیختا چلاتا ہوا اس سے آکر لپٹ گیا تھا۔

”تو چچا بن گیا علی اور میں پاپا۔“

مبارک ہو یار اور یہ بتائو فارینہ کیسی ہے؟ بیٹا ہوا یا بیٹی؟؟۔

”بیٹی ہے اور پتہ ہے علی اتنی پیاری ہے اتنی خوبصورت ہے اتنی — کہ“

کچن گلاس ونڈو سے نظر آتے وجود کو دیکھ کر احمر ایک دم ٹھٹک کر خاموش ہو گیا تھا۔ پھر اس نے جن نگاہوں سے علی کو دیکھا وہ کچھ گڑ بڑا سا گیا تھا۔ جبکہ احمر جو بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا۔

”نہیں علی تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرا یار ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ میری معصوم

نگاہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہیں گیا۔“



”بکو نہیں یار“ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ علی نے اسے اموشنل ہوتے دیکھ کر ٹوک دیا اور رات والا قصہ من و عن سنا دیا۔ احمر دلچسپی سے سنتا رہا۔ پھر شریر لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا:-

”اس میں کتنی سچائی ہے؟“

”تم میرے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گے احمر! جبکہ میں تمہارے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔“ علی نے دانت پیس کر کہا تھا۔ احمر نے شاندار قسم کا قہقہہ لگایا پھر لہجے میں بے شمار اداسی سمیٹتے ہوئے آہستگی سے بولا:-

”یار! مجھے بھی نیکیاں کرنے کا بہت شوق ہے مگر بد قسمتی سے میرے ساتھ اتنے حسین اتفاقات نہیں ہوتے۔“

”ناشتا کرو گے؟“ علی نے اس کی بک بک سے بے زار ہو کر ترشی سے پوچھا تھا۔

”اگر یہ محترمہ ناشتا بنا رہی ہیں تو پھر ضرور کروں گا۔ تمہارے ہاتھ کا کھا کر میں نے مرنا نہیں ہے۔“

”احمر پلیز یار اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے ایک کپ چائے بنا دو۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے رات بھر ایک پل بھی آنکھ نہیں لگی۔“ وہ کنپٹیاں دباتے ہوئے بڑے خوشامدی لہجے میں بولا تھا۔

”کیوں رات بھر تیمار داری کرتے رہے ہو؟“ احمر کی زبان میں ایک مرتبہ پھر کھجلی ہوئی تھی۔ اسی پل اس کے سیل فون کی بیپ بجی۔ وہ دوسرے ہی لمحے اسپرنگ کی طرح اچھل کر باہر بھاگا۔

”رات کو ملیں گے ابھی میں جا رہا ہوں۔ فارینہ کا فون ہے بہت غصے میں ہے وہ۔“ احمر کے جانے کے بعد علی تیز تیز قدموں کیساتھ چلتے ہوئے کچن کی طرف آیا۔ وہ گٹھنے پر ٹھوڑی ٹکائے گہری سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ علی کو دیکھ کر سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلو۔“

”کہاں؟“ اس نے حیرت سے علی کی طرف دیکھا تھا۔



”تم کیا بہری ہو؟؟؟“ علی نے تیوری چڑھا کر پوچھا تھا۔ اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

”تمہارا یہ دوست جس کی بیٹی پیدا ہوئی ہے کیا یہ بچی کیلئے گورنس رکھے گا؟؟؟“ علی اس کے عجیب و غریب سوال پر حیران رہ گیا تھا تاہم اس نے اسی کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

”نہیں۔“

”اچھا“ وہ قدرے مایوس ہوئی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر آہستگی سے بولی ”میرا یہ سیل نمبر ہے اگر اسے گورنس کی ضرورت ہوئی تو پلیز اسے یہ نمبر دے دینا“ علی ناگواری سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

”تم اچھے ہو بہت ہی اچھے“ اگر تم اس وقت مجھے چند سو ڈالر ادھار دے دو تو میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“ وہ سر جھکائے آنسو پیتی بمشکل بولی۔ علی کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے بغیر کچھ کہے والٹ سے پانچ سو ڈالر نکال کر اس کی طرف بڑھائے اس نے لرزتے ہوئے

ہاتھوں سے ان کاغذ کے چند ٹکڑوں کو پکڑ لیا اور پھر ٹوٹی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولی۔

”تم خود کو تکلیف مت دو میں چلی جاؤں گی“

ایک مرتبہ پھر وہ اسکا شکریہ ادا کر کے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی تھی۔

جبکہ علی عجیب سی کیفیات سے خالی خالی نظروں سے اس کی کمر دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”وہ حسینہ چلی گئی؟؟؟“ احمر نے سوپ کا بائول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شرارت سے استفسار کیا تھا۔ علی کی پیشانی پر سلوٹیں نمایاں ہو گئیں۔

”ویسے تم جدائی میں کہیں بیمار تو نہیں پڑ گئے؟“

”فضول بکواس مت کرو۔“ علی نے ترشی سے کہا۔“



”تم مانو یا نہ مانو مجھے تو یہ دل کا معاملہ لگ رہا ہے“

احمر مسکراتے ہوئے صوفے پر اسکے قریب بیٹھ گیا تھا۔

”اگر اس وقت فارینہ کا فون نہ آجاتا تو میں اس کا تفصیلی انٹرویو لے لیتا

۔“احمر نے افسوس سے سر ہلایا۔

”تم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟“ علی نے جھلا کر کہا تھا۔ احمر کچھ دیر

اسکے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر گہری سانس کھینچ کر آہستگی سے بولا!

”زرینہ آنٹی کا فون آیا تھا۔“

”کیوں؟؟۔“ علی کی بھنویں تن سی گئیں۔

”پیسے تو میں ہر مہینے باقاعدگی سے بھجوا رہا ہوں۔“

”سوما کی شادی کی ڈیٹ فکس کردی ہے انہوں نے اور وہ چاہتی ہیں کہ اسکا

بڑا بھائی شادی میں شریک ہو جبکہ انکل بھی اب نہیں ہیں۔“احمر نے

دھیرے سے کہا!

”اونہہ بڑا بھائی اب کیا ضرورت پیش آگئی ہے انکو میری۔“ علی تنفر سے بولا

تھا اس کی آنکھیں یک دم بہت ہی سرخ ہو گئی تھ

”سوما اور سوما تمہاری بہنیں ہیں علی!“احمر نے ہولے سے اسکے کندھے کو

دبایا اور پھر کافی دیر اسے سمجھاتا رہا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ آفس جانے کیلئے تیار ہو رہا تھا جب زین کا فون آگیا۔ زین کا

فون آتے ہی اسکی طبیعت ایک دم فریش ہو جاتی تھی۔

”بھائی! آپ ٹھیک ہیں نہ عجیب سا خوفناک دیکھا تھا میں نے کل رات

۔“زین کے لہجے میں چھپی ہوئی پریشانی اور محبت کو محسوس کر کے وہ روح تک

سرشار ہو گیا تھا۔

”اچھے خواب دیکھا کرو یار! یہ کوئی عمر ہے فضول قسم کے خواب دیکھنے کی

، علی نے احتیاط کیساتھ ٹائی کی ناٹ لگائی اور پھر ہسیر برش اٹھا کر بال

سنوارنے لگا تھا۔



”اگر خواب ٹوٹ جائیں تو؟؟“ زین کے لہجے میں محسوس کی جانے والے آزر دگی تھی۔

”تو کیا اس خوف سے لوگ خواب دیکھنا چھوڑ دیتے ہیں؟“ وہ چند پل کی خاموشی کے بعد ایک مرتبہ پھر بولا تھا۔

”خواب تو میری جان حوصلہ دیتے ہیں جینے کا، آگے بڑھنے کا، کچھ کر دکھانے کا خواب تو منزل تک لے جانے کا راستہ ہوتے ہیں۔“ پرفیوم سپرے کرنے کے بعد وہ خود کچن میں آگیا تھا۔ چائے کپ میں انڈیل کر اس نے فرانگ پین میں آئل ڈالا اور انڈا فرائی کرنے لگا تھا۔ پھر اس نے فریج سے بریڈ نکالی۔

”آپ کیا کر رہے ہیں؟؟“ انڈے کی مخصوص شوشوں کی آواز سن کر زین نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔

”ناشتا بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ علی نے احتیاط سے انڈا پلیٹ میں رکھا اور برنر بند کرنے کے بعد ٹرے میں مختصر سا ناشتا سجائے لائونج میں آگیا۔

”آپ کی سہیلی کدھر ہے۔“ زین کا اشارہ احمر کی طرف تھا علی کے ہونٹوں پر جاندار قسم کی مسکراہٹ آگئی۔

”وہ آج کل بہت مصروف ہے۔“ علی نے زین کو احمر کی مصروفیت کی تفصیل بتائی۔ دوسری طرف زین نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

”ویسے احمر بھائی کیساتھ اچھا نہیں ہوا۔ فارینہ بھابی نے انہیں باورچی اور دھوبی تک بنا دیا ہے۔ اب تو احمر بھائی مونا کو بھی سنبھالتے ہوں گے؟؟“

”نہیں خیر مونا کی دیکھ بھال تو وہ خود ہی کرتی ہے۔“

”بھائی اب آپ بھی شادی کر لیں۔ ناشتہ، کھانا بنانے کے جھنجھٹ سے بچ جائیں گے۔“ زین نے اپنا پسندیدہ ٹاپک چھیڑ دیا تھا۔ وہ اس ٹاپک پر گھنٹوں کے حساب سے بول سکتا تھا۔ لہذا خطرہ جان کر علی نے بات کو مختصر کیا۔ اسے ویسے بھی آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ الوداعی کلمات کہہ کر اس نے سیل



آف کر دیا اور پھر کوٹ اور بریف کیس اٹھا کر دروازہ لاک کر کے باہر نکل گیا تھا۔

آفس میں اسے سرکھجانے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ مس ریتا نے دو مرتبہ اسے فارینہ کی کال کے متعلق بتایا تھا مگر وہ اس قدر مصروف تھا کہ فارینہ کی کال اٹینڈ نہ کر سکا۔ لنچ آورز شروع ہوتے ہی تقریباً پورا سٹاف ڈائننگ ہال چلا گیا تھا۔ علی نے بھی تمام فائلیں سمیٹ کر انکی پیروی کی۔

وہ احمر کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتا اپنی مخصوص ٹیبل کی طرف بڑھ گیا کچھ ہی دیر میں احسن صاحب بھی تشریف لے آئے تھے۔

”تمہاری بیگم صاحبہ کا دو مرتبہ فون آیا تھا۔ آج پھر تو کہیں جنگ نہیں کر آئے؟؟“

”کیا کہہ رہی تھی“ احمر نے منہ بنا کر پوچھا تھا۔

”خود بات کر لو“ علی نے اورنج جوس کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

”میں نہیں کرونگا اسے فون۔“

”احمر کیا مسئلہ ہے؟“ علی کو کچھ تشویش ہوئی تھی۔

”زندگی عذاب بنا دی ہے اس عورت نے۔ میں اسے پاکستان بھجوا رہا ہوں۔“ احمر نے تلخی سے کہا تھا۔

”کیوں؟“ علی نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

”بہت بد سلیقہ اور پھوہڑ عورت ہے“ احمر نے کڑوے لہجے میں کہا تھا۔

آف کے بعد احمر تو گھر چلا گیا مگر وہ یونہی بے معنی سوچوں میں الجھا نیویارک کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا۔ ساڑھے آٹھ بجے وہ تھکا ہارا سا احمر کی طرف چلا آیا تھا۔ احمر اور فارینہ کے جھگڑے نے اسے اچھا خاص پریشان کر دیا تھا۔

علی نے بیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔

”علی بھائی آپ۔“ فارینہ خوشی سے چہکی اور پھر بلند آواز میں احمر کو پکارا!



”دیکھیں تو علی بھائی آئے ہیں۔“ احمر بھی بیڈ روم سے آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا ان دونوں کے رویوں سے ذرا بھی نہیں لگ رہا تھا کہ چند گھنٹے پہلے دونوں کا جھگڑا ہوا ہے۔ علی نے اپنی حیرت کا اظہار با آواز بلند کر دیا۔ احمر مسلسل دانت نکوستا رہا جبکہ فارینہ منہ بنا کر بولی تھی۔

”پاکستان بھجوانے کی دھمکیاں تو مجھے روزانہ ملتی ہیں۔ میں نے ان کی باتوں پر کبھی دھیان نہیں دیا۔“

فارینہ پہلے سے کافی بااعتماد لگ رہی تھی۔ ورنہ یہی فارینہ صاحبہ جب امریکہ نئی نئی آئی تھیں تو احمر کی ذرا ذرا سی بات پر رو رو کر برا حال کر لیتی تھی۔ پھر علی کو فون پر فون کئے جاتے تھے۔ علی ہی ہمیشہ ان دونوں کی صلح کرواتا۔ جو بات ہمیشہ علی فارینہ کو سمجھایا کرتا تھا وہ اسکی سمجھ میں اب آئی تھی۔

”علی بھائی! یہ صرف ہوائی فائر کرتے ہیں گرج گرج کر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں مگر برستے نہیں۔“

”واہ فارینہ تم تو بہت عقل مند ہو گئی ہو“ علی اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”یہ تمہاری نصیحتوں کا کمال ہے ورنہ عقل کے معاملے میں یہ پوری ہی ہے۔“ احمر نے قہقہہ لگا کر دھیمی آواز میں کہا تھا فارینہ کچن میں چلی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں فارینہ نے کھانے لگنے کی اطلاع دی تھی۔ کھانا لگانے کے بعد وہ ان دونوں کیلئے گرما گرم کافی بنا لائی تھی۔

”علی بھائی! اب آپ شادی کر لیں کم از کم میری تنہائی تو دور ہو۔“ فارینہ نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا تھا۔

”علی یار تم شادی کے بارے میں سوچو اب ورنہ فارینہ ان دیوراؤں سے ٹکریں مار مار کر ختم ہو جائے گی اور مجھے خواہ مخواہ دوسری شادی کے بارے میں سوچنا پڑے گا“ احمر نے فارینہ کو تپانے کی کوشش کی۔ اس نے احمر کو محض گھورنے کے بعد علی کی طرف رخ کیا۔

”آپ ایک مرتبہ ہاں تو کر دیں پھر دیکھیے گا میں کتنی اچھی لڑکی تلاش کروں گی آپ کے لئے۔“



”اپنی جیسی نہ ڈھونڈ لانا۔ علی تو دو دن بھی نہیں رکھے گا اسے، میرے جیسا حوصلہ کسی اور میں نہیں ہے۔“

”آپ مجھے بات کرنے دیں گے بھی یا نہیں۔“ فارینہ سلگ اٹھی تھی۔

”نہیں۔“ احمر نے نفی میں سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے کہ مونا اٹھی چکی ہے اسکا سائرن بج رہا ہے۔“ علی نے فارینہ کے غصیلے تیور دیکھ کر فوراً ہی مونا کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ وہ احمر کو غصے سے دیکھتی ہوئی تیزی سے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

فارینہ کے جانے کے بعد احمر ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”زرینہ آنٹی نے آج پھر فون کیا تھا وہ چاہتی ہیں کہ تم سوما کی شادی میں پاکستان آؤ اور ساتھ تمہاری شادی بھی کر دی جائے۔ انہوں نے کچھ تصویریں بھجوائی ہیں۔ تم ان میں سے پسند کر لو“ احمر سوچ سوچ کر بول رہا تھا کہ کہیں علی کا پارہ نے چڑھ جائے۔

”تمہاری زرینہ آنٹی کو میرا اتنا خیال کیوں ہے؟“ وہ دھیمی آواز میں ترشی سے بولا تھا۔ احمر صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”انہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ تم سے معافی مانگنا چاہتی ہیں اور پھر معاف کر دینے والے تو بہت اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں علی۔“

”میں بہت کم ظرف، بدکردار ہوں“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور پھر سرعت کیساتھ اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ احمر اسے پکارتا ہی رہ گیا تھا۔

گھر آکر اسے نے سلگتے ہوئے بے دردی سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ کوٹ کارپٹ پر پھینکا شرٹ اس انداز میں کھینچ کر اتاری کہ گریبان کے بٹن تک ٹوٹ گئے۔ جوتوں سمیت بیڈ پر ڈھے کر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا تھا۔ دسمبر کی اس سرد ترین رات میں اتنی ٹھنڈ کے باوجود اس کا وجود پسینہ تھا۔ آنکھیں اس قدر سرخ تھیں کہ گویا اسی پل خون ٹپک پڑے گا۔ وہ کچھ بھی اس وقت سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر زہریلی سوچیں پھن پھیلانے ناگن کی طرح اسے ڈسنے کو تیار تھیں۔





”یہ تمہاری ممی ہیں۔“ وہ ابھی ابھی کرکٹ کلب سے میچ جیت کر آیا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں بیٹ جبکہ بائیں ہاتھ میں ٹرافی تھی۔ آج وہ بے حد خوش تھا اور اس خوشی کو اپنے ڈیڈی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ لائونج میں داخل ہوا تو اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ سامنے صوفے پر کامدار کپڑے اور جیولری پہنے سسٹر زرینہ بیٹھی تھیں اور ان کے برابر ڈیڈی۔ وہ کبھی سسٹر زرینہ کو دیکھتا اور کبھی ڈیڈی کو وہ اس پزل کو حل نہیں کر پارہا تھا۔

اس یوں گوگو کی کیفیت میں دیکھ کر ڈیڈی اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔ ساتھ میں سسٹر زرینہ کو بھی کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر جب انہوں نے تعارف کی رسم نبھائی تو علی پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

”ڈیڈی کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ عورت میری ممی ہے۔“ وہ ان دونوں کے جانے کے بعد بھی حیران پریشان سا وہیں کھڑا رہا۔ اس رات پہلی مرتبہ اس نے رت جگے کا عذاب جھیلنا پوری رات وہ ایک پل کیلئے بھی نہیں سو سکا۔ دوسری صبح جب وہ اٹھا تو اس کا سر بے حد بو جھل تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ ٹھنڈے پانی سے شاور لے کر اس نے سکول کا یونیفارم پہنا بال بنائے اور جب وہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو سسٹر زرینہ کو دیکھ کر اس کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ وہ اٹے قدموں واپس مڑا اور زوردار آواز میں چلایا۔

”رضیہ میرا ناشتہ کمرے میں لاؤ۔“

”تم ناشتہ ہمارے ساتھ کرو گے۔“ زرینہ نے اپیل جوس کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے بے نیازی سے کہا تھا۔ علی نے پلٹ کر اک سلگتی نگاہ زرینہ کے چہرے پر ڈالی۔

”میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھ سے بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔“



”تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کرو“ زرمینہ نے ناک چڑھا کر تلخی سے کہا تھا۔ اسی پل زرمینہ کی ہم شکل اک اور لڑکی ڈاننگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ ”آپی یہ صبح صبح کس پر چلا رہی ہیں؟“

”یہ حادث کا بیٹا ہے۔“ زرمینہ بہن کا سوال نظر انداز کر کے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی!۔

”اوہو“ تہمینہ نے ہونٹ سکیرے اور پھر بڑی ادا کے ساتھ بولی تھی۔

”ہائی علی۔ کیسے ہو تم؟۔ تم کو ملنے تم کو دیکھنے کیلئے بہت بے چین تھی میں“

”بے غیرت عورتیں“ وہ منہ میں بڑبڑاتا بغیر ناشتہ کئے سکول چلا گیا تھا۔ مگر

سکول جا کر اسے دوہری تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کے دوست کلاس

فیلوز نے اس ڈیڈی کی شادی کی مبارک باد فرداً فرداً دی تھی۔ وہ سب اس

کا مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اس پر ہنستے رہے تھے۔ وہ سکول میں سب سے

الگ تھلگ رہا تھا۔ کسی نے بات کرنے کی کوشش نہیں کی گھر آکر وہ سیدھا

اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ بیگ پھینک کر جوں ہی اس نے سامنے دیوار پر طنکی تصویر کو دیکھا تو مارے غصے کے اسکی کنپٹیاں سلگ کر رہ گئیں۔ اس کی اما کی تصویر غائب تھی اور زرمینہ کی تصویر گویا اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس

نے ہاتھ بڑھا کر تصویر اتاری اور لائونج میں جا کر پوری قوت سے دیوار پر دے ماری ”میرے بیڈ روم میں قدم رکھنے کی جرأت مت کرنا“ علی نے

قدرے چلا کر کہا تھا۔ زرمینہ غصیلے تیوروں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی ”گھر

میری آپی کا ہے اس کی مالک میری آپی ہیں تمہارے باپ نے اس گھر کو

آپی کی ملکیت میں دیدیا ہے۔ آئندہ اس لہجے میں میری بہن سے بات کرنے

کی کوشش مت کرنا ورنہ اس گھر سے نکالنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

منٹوں میں بے دخل کر دیئے جائو گے ہر چیز سے“ تہمینہ ہاتھ نچاتے ہوئے

غصے سے چلائی تھی پھر نہ جانے کیا کیا جھوٹ سچ ملا کر انہوں نے ڈیڈی کو

بتایا تھا۔ ڈیڈی اس سے بے حد متنفر ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس سے بات

کرنا چھوڑ دی تھی۔ علی ان سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے

جھڑک دیتے۔ ڈیڈی کے پاس اب اس کیلئے وقت نہیں تھا۔ اس کی ماما کی

نرس کو وہ اپنی بیوی بنا کر بے حد مصروف ہو گئے تھی۔ پھر ان مصروفیات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا سوما، سوہا کی پیدائش کے بعد زرینہ کی حیثیت مزید مستحکم ہو گئی تھی۔

زرینہ نے اسکی پاکٹ منی بند کروا دی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کی سوشل لائف بالکل ختم ہو گئی تھی۔ اس نے دوستوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا کالج سے گھر آنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ اس دن موسم بہت خوشگوار تھا پہلے تو وہ کسلمندی سے بستر پر پڑا رہا پھر اٹھ کر لان کی طرف چلا گیا۔ سر سبز و شاداب گھاس پر چت لیٹ کر آسمان پر بادلوں کو دیکھتا رہا۔ تہینہ نے اسے لان میں دیکھ کر باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور لان میں اس کے پاس چلی آئی۔

”مجھے ذرا مارکیٹ تک لے جاؤ“ شولڈرکٹ سیاہ بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے وہ تحکم سے بولی تھی۔ علی نے ترچھی نظروں سے تہینہ کی طرف دیکھا۔

”میں تمہارا ڈرائیور نہیں ہوں“

”تمہیں ڈرائیور کون کافر بنانا چاہتا ہے“ وہ معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ تہینہ کے انداز کچھ دنوں سے بدلے بدلے محسوس ہو رہے تھے وہ زیادہ سے زیادہ علی کے قریب رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ آتے جاتے شوخ فقرے اچھالے جاتے تھے۔ علی اس کے حرکتوں سے سخت بے زار تھا

”علی کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے؟؟“

”دوست۔“ وہ استہزائیہ ہنستے ہوئے اک پل کو رکا۔

”میں تم دونوں بہنوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں“

’اگر تم میرے ساتھ دوستی کر لو تو فائدے میں ہی رہو گے“ وہ اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی اور کچھ پل اس کے وجیہ چہرے کی طرف دیکھنے کے بعد نظریں مور پنکھ کے پودے پر ٹکا دیں۔

”آئی لو یو علی!“ اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

”واٹ۔“ علی کو گویا کرنٹ سا لگا وہ اچھل کر دو قدم پیچھے چلا گیا۔



”میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اگر تم مجھ سے شادی کرلو تو یہ گھر ایک مرتبہ پھر تمہارا ہو جائے گا۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ علی نے بے یقینی سے تہمینہ کی طرف دیکھا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں اور آپ بھی یہی چاہتی ہیں۔“

”اوہ— تو گویا دونوں بہنوں کی پلاننگ ہے۔ کیا ڈیڈی بھی اس منصوبے میں شریک ہیں، علی نے غصے پر قابو پاتے ہوئے بے حد نرمی سے پوچھا تھا۔

”نہیں، ویسے تم فکر مت کرو انہیں منانا آپ کا کام ہے“ تہمینہ مطمئن تھی۔

”چلو میں تمہیں مارکیٹ تک چھوڑ آتا ہوں“

اس نے کچھ پل سوچنے کے بعد دھیرے سے کہا۔ تہمینہ کھل اٹھی تھی۔

”کیا تم ہمیشہ کیلئے میرا ڈرائیور بننے کیلئے تیار ہو؟“

”نہیں—“ وہ مختصر بولا تھا۔ تہمینہ اس کے واضح انکار پر حق دق رہ گئی۔

اس کے چہرے کا رنگ زردی مائل ہو گیا تھا۔

”میں تمہارا ڈرائیور نہیں دوست ہوں اور اس سے آگے کا فیصلہ ڈیڈی کریں گے“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تہمینہ کا منہ حیرت کے مارے کھل گیا۔ اس کی اور تہمینہ کی دوستی نے زرینہ کے کندھوں سے بھاری بوجھ ہٹا دیا تھا۔ اب وہ اپنی من پسند بساط بچھا سکتی تھی۔ اس کے تمام مہرے اس کے ہاتھ میں تھے۔ تہمینہ کو علی کی طرف مائل کر کے وہ خود بہت مطمئن تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ کالج کیلئے نکلتے تھے اور واپسی پر علی اسے پک کر لیتا تھا۔ تہمینہ نے علی سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگ لی تھی۔

تہمینہ نے ہی اسے بتایا تھا کہ زرینہ اس کی سوتیلی بہن ہے اور یہ کہ وہ صرف اور صرف زرینہ کو خوش کرنے کیلئے علی کے ساتھ تلخ کلامی کرتی رہی ہے۔ علی کبھی بھی اس کی کسی بات پر یقین نہ کرتا اگر اسے خود تہمینہ کی چند ایک باتیں نہ بن لی ہوتیں۔ واقعی بے بس اور مجبور تھی۔ زرینہ کے رحم و کرم پر تھی۔ تہمینہ نے اسے بتایا تھا کہ زرینہ ڈیڈی کی فیکٹری کو اپنے

نام کروانے کے چکر میں ہے۔ ادھر زرینہ گویا سب کچھ طے کئے بیٹھی تھی۔ اس نے چھوٹا فنکشن ارنج کر کے علی اور تہمینہ کی منگنی کا اعلان کر دیا تھا۔

تہمینہ بہت شوخ اور چنچل طبیعت کی مالک تھی۔ جبکہ علی شروع سے ہی بہت سنجیدہ مزاج کا تھا۔ پہلے ماما کی بیماری کی وجہ سے بہت ڈرا سہا اور خاموش رہتا تھا۔ پھر ان کی وفات کے بعد وہ بالکل ہی گم سم ہو کر رہ گیا۔

ان دنوں زرینہ کا رویہ اس کے ساتھ اچھا تھا۔ پہلے کی طرح طنزیہ گفتگو اور بات بات پر فساد مچانا ترک کر دیا تھا اس نے۔ سوہا، سوہا بھی بھائی بھائی کرتی اس کے آگے پیچھے پھرنے لگی تھیں۔ زرینہ انہیں علی سے بولنے اور باہر جانے سے نہیں روکتی تھی۔ علی اکثر ان دونوں کو ہوم ورک خود کروا دیتا تھا اور بانیٹ پر باہر گھماتا بھی تھا۔ کبھی کبھی تہمینہ بھی ساتھ ہی چلی جاتی تھی۔ اس طرح وقت دے پائوں گزر رہا تھا۔

اس پر سکون جھیل میں کنکر زین کی آمد سے پڑا تھا۔

زرینہ نے ایک مرتبہ پھر پر پرزے نکال لئے تھے۔ ایک مرتبہ پھر زرینہ اور اسکی لڑائی سے گھر کا ماحول خراب ہونے لگا تھا۔ زرینہ اپنی فطرت کے عین مطابق ڈیڈی کو اسکے خلاف بھڑکانا شروع کر چکی تھی۔ اور جب ڈیڈی اسکو ڈانٹتے تو تہمینہ کے تاثرات بہت عجیب سے ہوتے تھے۔

سوہا، سوہا اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھیں۔ وہ بھی اب ان دونوں سے بات چیت نہیں کرتا تھا البتہ زین سے وہ اول روز کی طرح پیار کرتا تھا۔ زین کی بیماری کے متعلق جان لینے کے بعد تو وہ اسے اور پیارا ہو گیا تھا۔ اس کی معصوم ہنسی، اس کے آنسو، اسکی تو تلی زبان سے ادا ہونے والے حسین الفاظ علی اس کی ایک ایک ادا پر فدا تھا۔ کبھی کبھی تو تہمینہ اس سے الجھ پڑتی ”علی تم زین سے اتنا پیار مت کرو میں خوا مخواہ اس معصوم سے جیلنس ہوتی رہتی ہوں“ زین ساڑھے تین سال کا ہوا تو ڈیڈی بیمار پڑ گئے اس دوران وہ ہی زین کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کروانے لے کر جاتا تھا۔



وہ دن اتوار کا تھا۔ علی زین کے معالج ڈاکٹر احسن سے ملکر گھر آیا تو خلاف معمول گھر میں چھائے سنائے کو محسوس کر کے حیران ہوا۔ رضیہ اور بشیر نجانے کہاں تھے۔ اس نے سوہا اور سوما کے بیڈ روم میں جھانکا اور پھر کچھ سوچ کر تہینہ کے بیڈ روم میں آگیا۔ تہینہ شاید اپنی کسی دوست کے ساتھ فون پر مصروف تھی۔ وہ اس کا فون بند ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر اس کی بات طویل ہوتی جا رہی تھی۔ علی نے اشارے سے اسے فون بند کرنے کا کہا مگر اس نے ان سنی کردی۔ وہ قدرے ناگواری سے اسکی طرف دیکھتا رہا اس کے سر میں شدید درد تھا۔ اور وہ تہینہ سے چائے بنانے کا کہنے آیا تھا وہ سر جھٹکتا باہر جانے لگا تو اسی لمحے لائٹ چلی گئی۔ اس نے کوفت کے عالم میں ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ لاک تھا۔ اس اس نے کئی مرتبہ دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی علی نے جھنجلا کر تہینہ کو پکارا ”کوئی ٹارچ ہے تو لائو نجانے دروازہ کس نے بند کر دیا ہے“ وہ جھنجلاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر دروازہ کھولنے لگا جب اس نے اپنے دائیں شانے پر نرم انگلیوں کا دباؤ محسوس کیا۔

”ٹارچ نہیں ملی؟“ اس نے تھوڑا سا رخ موڑ کر تہینہ سے پوچھا مگر جواب نہ ملنے پر اسے بے حد حیرت ہوئی کچھ دیر بعد گویا منظر ہی بدل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لائٹ آگئی اور دروازہ بھی کھل گیا۔ تہینہ بالوں کو نوچتے ہوئے کارپٹ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ زرمینہ اور ڈیڈی آگ بگولا ہوئے اس پر چلا رہے تھے اور وہ ساکت نگاہوں سے ان سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تمام ڈرامہ سمجھ چکا تھا۔ اس نے ڈیڈی کو سچائی بتانا چاہی تو انہوں نے لاتوں اور ہاتھوں سے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ علی کے منہ اور ناک سے خون کے فوارے ابل پڑے تھے جبکہ ڈیڈی کو اس پر رحم نہیں آیا۔ پھر انہوں نے اسے گھر سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں ڈیڈی کی طرف دیکھ رہا تھا انہوں نے اسے دھکے دیکر گھر سے نکال دیا۔ وہ ساری رات فٹ پاتھ پر لیٹا روتا رہا۔

وہ چاند کی چودہ تاریخ تھی اسی رات علی کی احمر سے ملاقات ہوئی۔ اس رات اگر احمر اس سے نہ ملتا تو شاید خود کو ختم کر لیتا۔ احمر امریکہ کا رہائشی تھا

تھوڑی بہت کوشش کے بعد احمر نے اسکے پیپرز بھی بنوائے تھے۔ اور پھر کچھ عرصے کے بعد وہ احمر کے پاس امریکہ چلا گیا۔ احمر نے اسے یونیورسٹی میں داخلہ لے دیا تھا اس نے قدم قدم پر علی کا ساتھ دیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس بہت اچھی جاب بھی مل گئی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ سال پر سال گزرتے چلے گئے علی نے تو اب وقت کا حساب لگانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد احمر نے پاکستان اس کے گھر میں رابطہ کیا تو ڈیڈی کی وفات کی خبر ملی۔ احمر نے ہی اسے بتایا کہ نا صرف ڈیڈی کی فیکٹری اور بزنس تباہ ہو چکا ہے بلکہ گھر تک بک چکا ہے شاید بزنس کے خسارے نے ہی ڈیڈی کی جان لی تھی۔

زرمینہ کے بھی سارے کس بل نکل چکے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ نرسنگ کے پیشے سے منسلک ہو کر گھر کی گاڑی گھسیٹ رہی تھی۔

احمر کے احساس دلانے پر وہ باقاعدگی کے ساتھ انہیں پیسے بھجوانے لگا۔ اسے زیادہ زین کی فکر تھی۔ وہ زین کے علاج کیلئے علیحدہ سے پیسے بھجواتا تھا۔

زرمینہ کی معافی تلافی اور شرمندگی علی کو ایک مرتبہ پھر اذیت سے دوچار کر گئی۔ وہ ساری رات ماضی کی کربناک یادوں میں کھویا رہا۔ گھڑی کی طرف دیکھ کر وہ کسلمندی سے اٹھا اور وضو کر کے نماز فجر ادا کرنے لگا۔ نماز پڑھنے کے بعد اس نے معمول کی سورتیں تلاوت کیں اور کوٹ پہن کر باہر نکل آیا۔ جوں ہی اس نے دروازہ کھولا دہلیز پر پڑے سفید رنگ کے لفافے کو دیکھ کر ٹھٹک پڑا۔ اس نے تجسس سے مجبور ہو کر سرعت کیساتھ لفافہ کھولا لفافے میں پانچ سو ڈالرز تھے۔ اسے ایک دم وہ معصوم ڈری سی لڑکی یاد آگئی۔ وہ حیران پریشان سا اس معمولی سی رقم کو دیکھتا رہا جسے وہ پورے اڑھائی مہینے کے بعد لوٹا گئی تھی۔ علی کو ڈھیروں پشیمانی نے گھیر لیا۔ وہ خود کو کوستا لعن طعن کرتا واپس مڑ گیا۔



”علی بھائی میں نے بریانی بنائی ہے آج آپ لُنج ہماری طرف کیجیے گا۔“ وہ صوفے پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا جب فارینہ کی کال آئی۔

”ساتھ ہی ایسبولینس اور دو ڈاکٹر بھی لے کر آنا تاکہ ہمیں فوری طبی امداد مل جائے“ پیچھے سے احمر کی آواز آئی۔ علی کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔

”ایک تو اتنی محنت سے کھانا بناتی ہوں اور خوب ٹھونس ٹھانس کر باتیں سنانے لگتے ہیں“ فارینہ نے یقیناً احمر کو پلٹ کر جواب دیا تھا۔

”مجھ سے مخاطب ہو“ علی نے شرارت سے کہا۔ فارینہ گڑبڑا کر فون کی طرف متوجہ ہوئی علی نے چشم تصور سے اس کی گڑبڑاہٹ کا مزا لیا۔

”نن نہیں تو — میں کہہ رہی ہوں کہ پھر جلدی آجائیے گا“

”دراصل بہت ضروری کام ہے اس لئے پیشگی معذرت۔“

”کوئی بہانہ نہیں چلے گا آپ لُنج کے بعد ضروری کام نپٹا آئیے گا“ فارینہ ناراضی سے بولی تھی علی کو ہاں کرتے ہی بنی۔

فارینہ اور احمر کی چٹ پٹی باتوں میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا تھا چائے پی کر وہ اٹھنے لگا تو احمر نے زبر دستی اسے بٹھا لیا۔ فارینہ مونا کو سلانے چلی گئی تھی۔

”پھر تم نے کیا سوچا؟“ احمر نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا!

”کس بارے میں“ علی انجان بنا۔

”اپنی شادی کے بارے میں“ احمر نے قدرے خفگی سے بھرے انداز میں کہا تھا۔ علی کے چہرے پر سایہ سے لہرا گیا۔

”تم جانتے ہو کہ میرا جواب کیا ہو گا“

”دیکھو علی پانچوں انگلیاں ایک برابر نہیں ہوتیں ضروری نہیں کہ سب عورتیں تہمینہ جیسی ہوں اور ویسے بھی وہ تمہارے قابل کہاں تھی زرمینہ آنٹی کے ساتھ بھی اس نے فراڈ کیا خیر زرمینہ آنٹی کو تو اپنے کئے کی سزا مل گئی ہے“ احمر چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا تھا۔

”بھول جائو ان سب باتوں کو نئی زندگی کا آغاز کرو میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اپنے حصے کی خوشی چھین لینی چاہئے“

”تم جس رفتار سے نصیحتیں کرنے لگے ہو احمر مجھے لگتا ہے کہ کسی سو سالہ بڑھے کی روح تم میں سما چکی ہے“ علی نے شرارت سے کہا۔!

” مذاق میں بات مت ٹالو“ احمر خفگی سے بولا تھا۔

علی مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اوکے — تم میرے لیے سہرا تیار کرو میں ذرا بینک جارہا ہوں“ وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔

احمر نے اس کے شانے پر جھانپڑ رسید کیا تو وہ ہنستا ہوا جیکٹ اٹھائے باہر چلا گیا۔

چند ایک ضروری کام نپٹانے کے بعد اس نے زین کے اکاؤنٹ میں ساڑھے تین لاکھ روپے کی رقم مزید جمع کروادی۔ وہ بینک کی شاندار عمارت سے باہر

نکلا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ وہ گھر جانے کے بجائے یوٹیلٹی سٹور پر چلا آیا۔ راشن تقریباً ختم تھا۔ اپنے ہی دھیان میں وہ پاکٹ سے لسٹ

نکالے حساب کتاب میں مشغول تھا۔ پھر ضرورت کی تمام چیزیں ٹرالی میں ڈال کر کائونٹر پر آیا تو اسی لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا وہ اسے پہچان چکی تھی اسی لئے نرم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ٹھہر گئی۔ اس نے برق رفتاری سے بل بنا کر اس کے سامنے کیا اور پھر دھیرے سے بولی!

”میں دو مرتبہ تمہارے گھر گئی تھی مگر تم مجھے نہیں مل سکے اسی لئے تمہاری امانت دروازے میں رکھ کر آگئی۔ کیا تمہیں وہ سفید لفافہ مل گیا؟“

”ہاں“ میں آہستگی سے بولا!

”تم نے پیسے کیوں لوٹائے؟ — رہنے دیتیں۔ — معمولی سی رقم تھی۔“ والٹ سے رقم نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولا نجانے کیوں اس کا دل اس کے ساتھ مزید باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”میں نے پیسے لوٹا دینے کی نیت سے لئے تھے“



چونکہ علی پے منٹ کرچکا تھا اس کا کام ختم ہو گیا تھا لہذا وہ دوسرے کسٹمرز کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ علی بے دلی سے سامان اٹھا کر گاڑی کی طرف بڑھا۔ گھر جا کر بھی وہ اسی کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ وہ لڑکی اسے بہت مختلف لگی تھی۔

”نہیں“ وہ شرمندہ شرمندہ سی بولی !

”کہاں جا رہی ہو آؤ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں“ علی اس کے گھبرائے گھبرائے چہرے کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا ایسے پیس کی یورپ موجودگی علی کو حیران کر رہی تھی۔

”شکریہ میں چلی جانوں گی“ اس نے جھک کر سڑک سے اپنے بیگ کو اٹھایا۔

”بارش بہت تیز ہے تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی بھیگ رہا ہوں آؤ پلیز بیٹھو“ علی نے فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی وہ تذبذب کا شکار دھیرے دھیرے چلتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ علی کو اچانک خیال آیا تھا سو پوچھ بیٹھا۔

اگلے بہت سارے دن بے حد مصروف گزرے تھے۔ وہ احمر کے گھر بھی نہیں جاسکا تھا۔ اس دن بھی آفس سے واپسی پر اس نے اپنی کولیگ مسٹر سیماتھ کی عیادت کے بارے میں سوچا مگر بھلا ہو اس بارش کا جو ساون کی بارشوں کی یاد دلاتی تھی۔ ایسی ٹوٹ کر بارش برسی اور بادل بھی گرجی۔ وہ اپنے ہی دھیان میں گاڑی چلا رہا تھا کہ روڈ کراس کرنے کے چکر میں وہ لڑکی عین سڑک کے وسط میں آن کھڑی ہوئی۔ اگر علی بروقت بریک نہ لگاتا تو یقیناً اس نے بری طرح اسکی گاڑی کے نیچے آکر کچلا جانا تھا اور پھر یہاں کے قانون بھی بہت سخت تھے۔ یہ لڑکی خود تو مرتی ساتھ اسے بھی پھانسی کے

”پہلے سو بیٹا تھا اب عائشہ ہوں“

”کیا مطلب —؟“ علی نے کچھ چونک اس کی طرف دیکھا۔

”پہلے عیسائی تھی اور اب مسلمان ہوں“ علی کے ہاتھ سے سٹیرنگ چھوٹنے لگا تھا۔

”تم مسلمان ہو چکی ہو“ علی کو فطری خوشی ہوئی۔

”ہاں“ وہ مختصر جواب دیکھ کر ادھر ادھر کے نظارے دیکھنے لگی۔

”کب سے؟“

”ڈیڑھ سال ہو گیا“

”تم نے اسلام کو کیسا مذہب پایا؟“

”مکمل اور جامع — یہ ایسا مذہب ہے جو فلاح کی طرف لے کر جاتا ہے“

”تمہیں اسلام کی طرف کس نے مائل کیا تھا؟“ وہ سوال پر سوال کئے جا رہا تھا اس پل علی کے دل کی حالت عجیب سی تھی۔ وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پارہا تھا۔

”میرے دل نے اور ثریا آنٹی نے وہ مسلم لیڈی تھیں اب انکا انتقال ہو چکا ہے“

”جب تم نے اسلام قبول کیا تو تمہاری فیملی کا کیا رد عمل تھا؟“ علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد آہستگی سے کہا تھا۔!

”میری فیملی نہیں ہے“ عائشہ اسی بے نیازی سے بولی۔!

”تم کس کے ساتھ رہتی ہو—؟“

”تنہائی کے ساتھ میرا مطلب ہے اکیلی رہتی ہوں“ بارش اب بھی برس رہی تھی ٹھنڈک میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔



”بس یہیں اتار دو“ عائشہ نے نرم لہجے میں کہا پھر شکریہ ادا کر کے باہر نکل گئی علی نے چند پل اسے دیکھنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

گھر پہنچ کر اس نے تمام سامان کچن میں رکھا تھا۔ پہلی مرتبہ علی کو گھر میں چھائے ہوئے سناٹے سے وحشت ہوئی۔ وہ لاشعوری طور پر عائشہ کے متعلق ہی سوچتا رہا تھا۔ رات کو بستر پر لیٹا تو چھم سے اس کا نازک سراپا آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ کچھ گھبرائے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اس بستر پر کچھ عرصہ پہلے عائشہ کا بے ہوش وجود پڑا تھا۔ علی اچانک وہ واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ یاد آگیا تھا۔ حالانکہ وہ انگریز لڑکی اس کے دماغ سے بالکل غائب ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ پہلی نظر میں ہی اسے پہچان چکا تھا۔ پھر ایک دم کلک سے اس کے دماغ میں کچھ روشن ہوا تھا۔ وہ سرعت کے ساتھ اٹھا اور کچن کی طرف بڑھا۔ مختلف کیبنٹ کھولتے ہوئے اس کی نگاہوں کی زد میں وہ کاغذ آگیا جس پر عائشہ نے اپنا نمبر لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے عائشہ سے ہونیوالی تمام باتیں یاد آ گئیں۔

”تو کیا عائشہ اردو سمجھتی ہے“ وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں تمام باتیں سوچتا رہا۔ احمر اور وہ اردو میں باتیں کر رہے تھے اور عائشہ اس وقت کچن میں تھی۔ وہ ان کی تمام باتیں سن اور سمجھ چکی تھی۔ اسی لئے اس نے علی سے احمر کی بیٹی کی گورنس کی جاب کی بات کی تھی۔ آج کی رات ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ اور وہ پہلی مرتبہ کسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

مسٹر پال کے سٹور پر اسے جاب مل گئی تھی۔ اس کے لئے یہ معمولی سی جاب بھی بہت تھی۔ وہ صبح نماز پڑھ کر آنٹی روتھ کا ناشتہ بناتی گھر سمیٹی اور جاب پر چلی جاتی تھی۔ آنٹی روتھ ساٹھ سالہ معذور خاتون تھی۔ اور انہوں نے ایک کمرہ عائشہ کو کرائے پر دے رکھا تھا۔ وہ بڑا مناسب سا کرایہ لیتی تھیں کیونکہ عائشہ انکے گھر کا سارا کام خود ہی کرتی تھی۔ اس کا دن

بہت ہی مصروف گزرتا تھا۔ آج جب وہ گھر آئی تو پہلے کی طرح ہشاش  
بشاش نہیں تھی۔

مختلف سوچوں نے اس کو الجھایا ہوا تھا۔ وہ علی کے بارے میں سوچ رہی  
تھی۔ وہ ایشین کس قدر مہربان تھا اس نے ناصر سے ایک رات اپنے گھر  
میں رکھا بلکہ اسے چند سے ڈالر ادھار بھی دیئے۔ عائشہ اس وقت بہت بے  
بس تھی اسکے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس کے پرس میں جتنے  
ڈالر تھے وہ چند سفید فام لڑکوں نے چھین لئے تھے۔ وہ کس مشکل سے جان  
بچا کر تاریکی میں چھپی بیٹھی تھی۔ اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور  
وہ دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے اللہ سے حفاظت طلب  
کر رہی تھی۔ قرآن پاک کے تیسویں پارے کی کچھ سورتیں آنٹی ثریا نے اسے  
یاد کروا دی تھیں۔ اس نے بہت

جلد چھوٹی چھوٹی سورتیں حفظ کر لی تھیں وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے  
آیات کا ورد ضرور کرتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسکے حافظے میں محفوظ ہو گئی  
تھیں۔

ثریا آنٹی نے ہی اسے نماز پڑھنی سکھائی تھی۔ شروع میں بہت غلطیاں کرتی  
تھی۔ سلام پھیرنے سے پہلے ہی بول پڑتی تھی یا پھر رکعتیں بھول جاتی تھی۔  
جب عائشہ نے پہلی بار روزہ رکھا تو وہ دن بھر نقاہت کے باعث بستر سے  
نہ اٹھ سکی تھی۔ ثریا آنٹی اسے صبر کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔ اور عائشہ تو  
اس وقت بھی بہت صابر تھی جب وہ سویٹا تھی۔ بھوک اس کیلئے کوئی نئی  
چیز نہیں تھی اس نے چھلی تمام زندگی ایک وقت کا کھانا کھایا تھا۔ اور  
دوسرے وقت نہیں ملا تو صبر کیا۔ کبھی کبھی جینی بہت حیرانی سے کہتی تھی  
۔

”سویٹا تم سے بھوک کیسے برداشت ہوتی ہے“



جینی اس قسم کے سوالات اکثر کرتی رہتی تھی۔ جینی کی یاد میں اکثر اس کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

”آئشہ تم روئی ہو؟“ آنٹی روتھ اس کی بھگی پلکوں کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھا کرتی تھیں اور وہ بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیتی تھی اس وقت بھی وہ جینی کو یاد کر کے بے اختیار رو دی تھی۔ آنٹی روٹھ نے وہیل چئیر گھسیٹتے ہوئے اسکے کمرے میں جھانکا۔

”اے آئشہ تم نے کھایا؟“ آنٹی روتھ نے اس سے نرمی سے استفسار کیا عائشہ نے ہاتھ کی پشت سے پلکیں صاف کر کے ان کی طرف دیکھا۔

”آنٹی میں تھوڑی دیر بعد کھالوں گی ابھی دل نہیں چاہ رہا۔“ آنٹی کو ٹال کر وہ بستر پر لیٹ گئی تھی اور چادر سے منہ ڈھانپ لیا تھا۔ آنٹی سر ہلاتی پلٹ گئیں۔

اگلی صبح وہ معمولی کے کام نبٹا کر جاب پر چلی گئی تھی وہ روزانہ اس امید پر سٹور میں داخل ہوتی تھی کہ آج وہ ضرور آئے گا۔ بڑی آس بھری نظروں سے سٹور میں داخل ہو کر ہر کسٹمر کو دیکھا کرتی تھی۔

اس ایشین کی پاکیزہ نگاہیں اور دلکش لب و لہجہ یاد آتا دل نجانے کیوں ایک پل کیلئے دھڑکنا بھول جاتا تھا۔

پہلی ملاقات میں وہ اسے کافی مغرور اور خود پسند سا لگا تھا مگر وہ ایسا نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ بے خیالی میں علی کے متعلق ہی سوچے جا رہی تھی کہ وہ اچانک اس کے بالکل سامنے آگیا۔ عائشہ کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔

”میں دو گھنٹے میں تمہیں لینے آؤں گا“ علی دھیمی سے آواز میں بولتا ہوا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر جب وہ اس کے ہمراہ ایک معیاری ریسٹورنٹ میں گئی تو اس کا دل خوشی کے احساس سے لبریز تھا۔ وہ بار بار چور نگاہوں سے علی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”کیسی ہو عائشہ؟“ علی نے اسکے گلابی مائل سفید چہرے کو نگاہوں میں

مقید کر کے اردو میں بات کا آغاز کیا عائشہ نے بے حد حیرانی سے علی کی طرف دیکھا اور پھر قدرے جھپٹتے ہوئے بولی !

”ٹھیک ہوں“

”میں نے تمہاری خیریت دریافت کی ہے میری خیریت نہیں پوچھو گی؟“

”تم کیسے ہو علی“ اس نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا !

”تم نہیں، آپ ہمارے ہاں بڑوں کو بلانے کا الگ طریقہ ہے ادب لحاظ کے دائرے میں رہ کر بات کرتے ہیں“ وہ آنکھوں میں شرارت لئے اسکے چہرے کے بدلتے رنگوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”جواب کیسی جارہی ہے تمہاری؟“

”اچھی“ وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے حد درجہ نروس تھی علی نے مسکراتے

ہوئے اپنے لہجے کی ٹون کو بدلا اور انگریزی میں بولا !

”مجھ سے شادی کرو گی؟“ اب وہ بوکھلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی مرد نے اس سے ایسی بات کی تھی۔

”تم سوچ کر جوات دینا“ صرف چند دنوں میں علی کی دنیا بدل گئی تھی۔ چند لمحے لگے تھے اسے فیصلہ کرتے ہوئے۔

”چلیں؟؟“ وہ نظریں چراتے ہوئے آہستگی سے بولی تھی۔ اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا گویا ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

گھر آکر بھی وہ آنٹی روتھ سے چھپتی پھر رہی تھی۔ مبادا وہ اس کے چہرے پر پھیلے حسین رنگوں کو نہ دیکھ لیں۔

وہ کچن میں گھسی کھانا بنا رہی تھی اور اس دوران اس کے ہاتھ سے دو پلیٹیں اور تین کپ گر کر ٹوٹے تھے۔

اب تو آنٹی روتھ کو بھی تشویش لاحق ہو گئی تھی۔

”آشہ تم ٹھیک تو ہو نا؟“



”مم میں ٹھیک ہوں آنٹی“ اس نے بوکھلاتے ہوئے آہستگی سے کہا پورے دو دن کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اسکے سامنے تھا۔

”تمہارے حضور ایک درخواست پیش کی تھی“

”کیا؟“ عائشہ اس کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔ اتنی خالص اردو اس کے سر پر سے گزر گئی تھی۔ علی نے اسکی مادری زبان میں اپنا سوال ایک مرتبہ پھر دہرایا۔ عائشہ کی پلکیں لرزنے لگی تھیں۔ علی بے حد دلچسپی سے اسکے حسین چہرے کی طرف دیکھتا رہا علی کو جواب مل چکا تھا وہ مسکراتے ہوئے اٹھا تو عائشہ نے بھی اسکی پیروی کی۔

☆☆☆

ان کا نکاح احمر کے گھر میں ہوا تھا۔ احمر کی بیوی فارینہ نے اسے مکمل دلہن کی طرح سجا ڈالا تھا۔ ریڈ کلر کے دیدہ زیب سوٹ میں سچی بنی وہ انتہائی خوبصورت لگ رہی تھی۔ فارینہ نے بے ساختہ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

علی اور احمر کے کچھ جاننے والوں اور دوستوں کی فیملیز کو انوائٹ کیا گیا تھا۔ نکاح کے بعد کھانا کھا کر وہ سب تو چلے گئے اب علی بھی اجازت مانگنے کے چکر میں تھا۔

”بہت چھپے رستم نکلے علی تم نے تو حتیٰ کہ یاروں کو بھی خبر نہیں ہونے دی“ احمر نے مصنوعی خفگی سے چوتھی مرتبہ کہا تھا اور علی جواباً مسکراتا رہا۔ جب وہ عائشہ کے ہمراہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو ڈھیروں گلاب کی پتیاں انکے سروں پر برسنے لگیں۔ فارینہ نے گھر کی سیٹنگ یکسر بدل دی تھی۔ بیڈروم کو بھی پھولوں سے سجایا گیا تھا۔

”آج اس سر زمین پر مجھ سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں ہو گا اہل مغرب کی عورتوں میں سے سب سے منفرد عورت اللہ نے مجھے بخش دی ہے“ وہ اس کا نرم و گداز ہاتھ تھام کر بڑی محبت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ اگلی صبح بے حد روشن اور حسین تھی۔ فارینہ اور احمر ان کا ناشتہ لے کر آئے تھے اور پھر لُچ اور ڈنر بھی انہوں نے انہی کی طرف کیا تھا۔

وہ ہنی مون منانے کیلئے لندن گئے تھے اور پھر پندرہ دن بعد انکی واپسی ہوئی۔ گھر آکر ایک مرتبہ پھر روٹین لائف شروع ہو گئی۔ علی صبح آفس جاتا تو پھر رات کو ہی اس کی واپسی ہوتی۔ عائشہ سارا دن گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں خود کو مصروف رکھتی تھی۔ اگر فارغ ہوتی تو فارینہ کی طرف چلی جاتی یا پھر فارینہ اور مونا ادھر آجاتے۔ ان دنوں وہ فارینہ سے پاکستانی کھانوں کی ریسپیز سیکھ رہی تھی۔ پہلی بار فارینہ نے اسے دہی بڑے بنانے سکھائے تھے اور پھر حلیم اور کوفتوں کے بعد وہ کڑھی بنانا سیکھ رہی تھی۔ گھر کو سجانے سنوارنے کے علاوہ اسے علی کا انتظار کرنا بھی بے حد پسند تھا۔ وہ بار بار گلاس ونڈو سے بھاری کرٹن اٹھا کر نیچے پارکنگ میں جھانکتی۔ کبھی کلاک کی طرف دیکھتی یا پھر فون پر فارینہ سے باتیں کر کے ٹائم گزارتی۔ اس وقت بھی وہ علی کے جانے کے بعد معمول کے کام کر کے علی کی شرٹس پریس کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف کوئی لڑکا تھا جو بہت اچھی انگلش میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ آپ کیسی ہیں کیا کرتی ہیں، بھائی خوش ہیں؟ انہیں خوش رکھا کریں۔ وہ بہت باتونی لڑکا تھا عائشہ کو بولنے کا موقع ہی

نہیں دے رہا تھا۔ البتہ عائشہ کو اس سے بات کر کے کافی اچھا لگا۔ رات کو علی آیا تو اسکے ہاتھ سے کوٹ اور بریف کیس تھامتے ہوئے وہ بڑے جوش سے اسے زین کے فون کے متعلق بتانے لگی۔ علی دلچسپی سے سنتا رہا۔

”آج باتیں ہی کھانے کو ملیں گی؟ پہلے زین کا فون سنتی رہی پھر کپڑے پریس کرتی رہی“ وہ شرمندگی کے عالم میں بولتی ہوئی کچن کی طرف بھاگی علی بھی اس کے پیچھے ہی آگیا تھا۔

”کیا پکائوں“ وہ پریشانی کے عالم میں فریج میں سرگھسائے ہوئے بولی تھی۔ علی نے فریج سے تین انڈے نکالے اور پیاز اس کے ہاتھ میں پکڑائی۔

”تم پیاز کاٹو اور میں اتنے میں انڈے پھینٹتا ہوں“ عائشہ سر ہلا کر پیاز اور چھری سنبھالے بیٹھ گئی تھی۔ علی نے انڈے پھینٹ کر ٹماٹر کاٹے کالی مرچیں، نمک انڈے میں ڈال کر اسے مکس کیا پھر عائشہ کی تلاش میں لائونج کی طرف آیا تو وہ آنسو بہا کر سوس سوس کرتے ہوئے پیاز کاٹنے میں ہلکان ہو رہی تھی۔



”لاؤ مجھے دو“ علی نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ سے پیاز اور چھری پکڑ لی پھر اس نے آملیٹ بنایا اور عائشہ نے روٹی پکائی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد علی کمپیوٹر کے سامنے جم کر بیٹھ گیا۔ وہ وضو کر کے قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگی تھی۔

ثریا آنٹی کا یہ معمول تھا کہ وہ سونے سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت ضرور کرتی تھی۔ عائشہ نے بہت سے عادتیں ثریا آنٹی کی اپنائی تھیں۔

جب اس نے اسلام قبول کیا تھا تب بہت سی مشکلات کا اسے سامنا کرنا پڑا تھا۔ جس ہوٹل میں وہ جاب کرتی تھی ناصر وہاں کے مینجر نے اسے جاب سے نکالا بلکہ دو مہینے کی تنخواہ تک نہیں دی تھی۔ بہت عرصہ تک وہ سڑکوں پر ماری ماری پھرتی رہی۔ نئی جاب کیساتھ کچھ پریشانی کم ہوئی تو ثریا آنٹی کی طبیعت خراب رہنے لگی پھر چھ ماہ کے قلیل عرصے میں وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔ ثریا آنٹی کی وصیت کے مطابق انکی بیٹی انہیں پاکستان

دفنانے چلی گئی تھی اور جانے سے پہلے انہوں نے عائشہ کو گھر خالی کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔

اس نے قرآن پاک جزدان میں لپیٹ کر الماری میں رکھا اور اپنے بیڈ روم میں آگئی علی نے اس کو دیکھ کر فائلیں بریف کیس میں رکھ دی تھیں۔ عائشہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

”علی ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے؟“

”میری جان تم ایک نہیں سو باتیں کہو“ علی نے سر اسکی گود میں رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں۔

”آپ نے کبھی محبت کی ہے؟“ وہ بے خیالی میں اسکے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے آہستگی سے بولی تھی۔

”محبت —“ علی نے اس کا نرم و ملائم ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا تھا پھر دائیں ہاتھ سے اسکے ریشمی گال کو چھو کر بولا !

”ہاں — تم سے محبت کی ہے میں نے“

”علیٰ آپ مجھے یوں ہی چاہتے رہیں گے“ وہ اس سے نجانے کون سی یقین دہانی چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے سے لہراہے تھے۔

”ہاں“ اس کی نرم و ملائم انگلیوں میں نجانے کون سا جادو تھا کہ علی کو نیند کے جھونکے آنے لگے۔

”آپ مجھے کبھی چھوڑیں گے تو نہیں؟“ عائشہ نے سرسراتے لہجے میں ایک اور سوال کیا مگر علی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نیند کی دیوی چند ہی لمحوں میں اس پر مہربان ہو گئی۔ عائشہ بڑی چاہت سے اس کے دلکش نقوش کو دیکھتی رہی اور دھیرے دھیرے بڑبڑاتی رہی۔

”میں آپ کو بے انتہا چاہتی ہوں علی آپ بھی بس مجھے یوں ہی چاہتے رہنا — ورنہ میں رابرٹ کی طرح جان دے دوں گی۔ نانی کہتی تھیں کہ سویٹا بالکل رابرٹ جیسی ہے۔ ویسی ہی خوش اخلاق محبت کرنیوالی اور بے حد جذباتی۔ میرے باپ نے اپنی محبوبہ کی جدائی میں جان دیدی تھی جس دن آپ نے

مجھے چھوڑا میں بھی اپنے باپ رابرٹ جان کی طرح پانی میں ڈوب جاؤں گی“

☆☆☆

ویک اینڈ پر فارینہ نے پکنک کا پروگرام بنا لیا تھا۔

لیکن اچانک ہی مونا کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی تھی لہذا انہوں نے پروگرام کینسل کر دیا۔ وہ مونا کی خیریت معلوم کرنے فارینہ کی طرف گئی واپسی پر اس نے ونڈو شاپنگ کرنے کا سوچا۔ ضرورت کی چیزیں کر وہ شاپر سنبھالے باہر نکلی تو۔



”ایگو“ پر نگاہ پڑی۔ عائشہ کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نکلی اور پھر وہ سرعت سے ایگو کی طرف بڑھی۔ ایگو نے بھی اسے دیکھ لیا اور لبوں پر زبردستی ہی سہی مسکراہٹ بھی سجالی۔

”کیسی ہو سوٹا“ ایگو نے رسماً پوچھا۔ وہ اسکی اکلوتی دوست جینی کی ماں تھی جینی کے مرنے کے بعد نیویارک شفٹ ہو گئی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں آنٹی، آپ کیسی ہیں“

”تم یہاں لیوسٹی کے پاس ہوتی ہو“ ایگو اس کے حسین چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں بولی!

”نہیں“ ایگو کے روکھے پھیکے انداز کو محسوس کر کے عائشہ نے انتہائی بے دلی سے مختصر جواب دیا تھا۔

ایگو چونکہ جلدی میں تھی اس لئے ”بائے بائے“ کرتی ہاتھ ہلاتی تیز تیز قدم اٹھاتی پلٹ گئی جبکہ عائشہ حیرانی کی تصویر بنے وہیں کھڑی رہی۔

”ایگو آنٹی بہت بدل گئی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ انہیں جینی کی موت کا صدمہ ہے کتنی امیر ہو گئی ہیں اور ماڈرن بھی“ عائشہ نے آزر دگی سے سوچا۔

”کیا یورپ کی ساری مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں لیزا جیسی لیوسٹی جیسی اور ایگو جیسی“ اسی کی پلکیں نم ہونے لگی تھیں اس لگا لوگوں کے ہجوم میں ننھا ایزن چیخ چیخ کر رو رہا ہے اس پکار رہا ہے مگر کوئی بھی اس کی التجا نہیں سن رہا۔

”ساری مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں گندی اور بری چاہے وہ پھر لیزا ہو لیوسٹی ہو یا پھر ایگو“ اس نے تنفر سے سوچا تھا اور بے اختیار نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

”نہیں ایگو ایسی نہیں ہے جینی کی ماں تو بہت اچھی عورت ہے اس نے جینی کی خاطر اپنی زندگی کے سولہ سال برباد کئے اسے جینی سے بے حد محبت تھی وہ جینی کے غم میں گلیوں میں نکل کر دھاڑیں مار کر رویا کرتی تھی اور پھر اسے پیٹر گالیاں دیتا تھا“

اسے لوئیس ول کی وہ شامیں یاد آنے لگی تھیں۔ جب وہ اور جینی تمام کاموں سے فراغت کے بعد پیٹر کے چھوٹے سے گارڈن میں بیٹھ کر رنگ برنگے مہکتے پھولوں کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھیں۔ پیٹر کو اپنے گارڈن میں لگائے پھولوں سے بے حد محبت تھی۔ اس پورے بلاک میں کسی کو کبھی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ پیٹر کے گارڈن سے کبھی ایک پھول بھی توڑ لے۔ مگر پیٹر ان دونوں کو منع نہیں کرتا تھا۔ وہ ناصرف پھول توڑتیں بلکہ ہر تہوار پر بوکے بنا کر ایک دوسرے کو دیتیں۔ کبھی کبھی جینی پیٹر کے گلدان میں بھی تازہ پھول سجا دیتی۔ ان کی گلی کے تمام بچے پیٹر سے بچتے اور بچوں کی ماؤں نے پیٹر کو ”پاگل بڑھے“ کا خطاب دے رکھا تھا۔

اسے یاد تھا جب وہ اور جینی سکول سے تھکی ہاری آتیں تو اپنے اپنے بیرونی دروازے کے باہر بنی سیڑھیوں پر ہی بیگ رکھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگتیں اور ایک دوسرے پر ہنستیں۔

”سوئیٹا تم بہت جلد تھک جاتی ہو“ وہ جینی کے اس الزام پر تڑپ اٹھتی تھی۔ اپنے وزنی بیگ کے ساتھ جب اسے جینی کی دالوں اور سبزیوں کا تھیلا بھی اٹھانا پڑتا تو اس کی کمر اینٹھ جاتی تھی۔ ایسا اکثر ہی ہوتا تھا جب کبھی جینی گھر سے بغیر ناشتہ کئے گھر سے نکلتی تھی تو وہ اصرار کر کے اس کا بیگ اٹھا لیتی تھی۔ اور بدلے میں جینی کو اپنی پاکٹ منی میں سے اسے کچھ پیسے دینے پڑتے تھے۔

جب کبھی وہ کوئی ہفتہ وار پروگرام بناتیں تو اپنے گھروں کیساتھ گلی کو بھی صاف کر دیتیں۔ اس دوران اگر پیٹر اپنی مخصوص چیئر پر لان میں بیٹھا ہوتا تو انہیں چاکلیٹ کے ساتھ ساتھ شاباش بھی دیتا۔

کبھی لیوسٹی یا ایگو میں سے کوئی پیٹر کے مکان کے سامنے سے اتفاقاً گزرنے کی غلطی کر لیتیں تو پھر پیٹر کے عتاب سے بچ نہیں سکتی تھیں۔ پیٹر کے لبوں سے مغلظات کا ایک طوفان ابل پڑتا تھا۔ وہ انہیں گالیاں دیتا چیختا چلاتا رہتا تھا ایگو تو کان دبائے گھر کی راہ لیتی البتہ لیوسٹی پیٹر سے الجھ پڑتی۔ پھر ان دونوں

کو جھگڑا طویل ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کے نانی کو کھڑکی سے جھانک کر سیز فائر کروانا پڑتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو طعنے اور بددعائیں دیتے تھے۔ نانی ہی کیا اس گلی کے رہنے والے سب لوگ دعائیں کرتے تھے کہ یا تو پیٹر مر جائے یا پھر کسی اور شہر میں دفع ہو جائے مگر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

نانی بیچاری اس خواہش کو سینے میں دبائے ایک رات سوئیں تو پھر دوبارہ نہ اٹھ سکیں۔ نانی کے مرنے کا سب سے زیادہ صدمہ سویٹا کو ہی ہوا لیوسٹی تو گھڑی دو گھڑی کیلئے آئی تھی اور پھر آخری رسومات ہونے سے پہلے ہی چلی گئی۔ روتی بلکتی سویٹا پنکھوں میں ڈھیروں آنسو لئے لیوسٹی کو جاتا دیکھتی رہی۔ اس پل پیٹر نے اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ سویٹا کے سر پر رکھا تھا۔ سویٹا نے بھیگی پلکیں ہاتھوں کی پشت سے صاف کر کے پیٹر کی طرف دیکھا تھا۔ پیٹر کی بوڑھی گدلے پانی والی آنکھیں بھی نم تھیں۔ وہ اسکے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔

”یہ سب بری عورتیں ہیں، بیچ اور گھٹیا، یہ دنیا گندی ہے بس سویٹا اچھی ہے سب سے اچھی“

پیٹر اسے دلا سے دے رہا تھا اور صبر کی تلقین کر رہا تھا۔

”تمہارے آنسو قیمتی ہیں سویٹا، انہیں یوں بے مول مت کرو۔ یہ عورتیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر رویا جائے“

پھر اس نے نانی کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں۔ اس پل پیٹر اسے بہت برا لگا تھا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے پیٹر کا ہاتھ جھٹک دیا۔ نا صرف پیٹر کی بلکہ ان کے خاندان میں کئی لوگوں کی نانی سے نہیں بنتی تھی۔ کیونکہ نانی نے دوسری شادی ایک سیاہ فام سے کی تھی اسلئے لیوسٹی سمیت باقی خاندان وہ نجانے کن سوچوں میں گم سڑک کے کنارے کھڑی رہی بارش کی پہلی بوند اس کے چہرے پر پڑی تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے فلیٹ تک آئی۔ شولڈر بیگ میں سے چابی ڈھونڈتے ہوئے وہ بے حد جھنجلا سی گئی تھی پھر اچانک اسے یاد آیا کہ چابی



تو وہ فارینہ کے گھر بھول آئی ہے۔ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر فارینہ کے گھر آگئی۔ دروازہ فارینہ نے ہی کھولا تھا وہ مونا کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے اب مونا کی؟“

”پہلے سے کچھ بہتر ہے آؤ بیٹھو“ وہ مونا کو ایک مرتبہ پھر لوری سنا کر سلانے کی کوشش کرنے لگی۔ خرابی طبیعت کے باعث وہ ناصرف کمزور بلکہ بہت چڑچڑی سی بھی ہو رہی تھی۔

”بچہ جب دانت نکالتا ہے اسی طرح چڑچڑا اور بے زار رہنے لگتا ہے“

فارینہ اس کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔ عائشہ نے بے دھیانی میں سر ہلا دیا۔

”میرا بیٹا میری جان اب سو جا“

فارینہ اب مونا کو فیڈ کروانے لگی تھی۔ عائشہ عجیب سے احساس سے دوچار اسے دیکھتی رہی فارینہ کے چہرے پر ممتا کو نور پھیلا ہوا تھا بچی کی بیماری نے اسے بے حد نڈھال کر دیا تھا اس کا حلیہ بے حد ابتر تھا۔ الجھے بال، میلے کپڑے، آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈورے اس کے باوجود وہ بڑی خوشدلی سے عائشہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

”فارینہ تمہیں مونا سے بہت پیار ہے؟“ اس کے عجیب اور غریب سوال نے فارینہ کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

”ہاں؟۔“ اس نے بمشکل اپنی حیرت پر قابو پایا۔

”دنیا کی ہر چیز سے زیادہ“ عائشہ نے لب کانپتے ہوئے ایک اور سوال کیا۔

”ہاں، بالکل“

”احمر بھائی سے بھی زیادہ تم مونا سے محبت کرتی ہو؟۔“ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد اس نے فارینہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اولاد کی محبت ہر دوسری محبت پر غالب آجاتی ہے“ فارینہ نے بے اختیار مونا کی پیشانی پر لب رکھ دیئے۔

”تم؟— تم مونا کی خاطر اپنی نیند کی قربانی دے سکتی ہو؟“

”صرف نیند —“ فارینہ نے حیرانی سے کہا اور پھر مونا کو بہت احتیاط سے لٹانے لگی۔

”میں اپنی بیٹی کیلئے اپنا چین سکون سب کچھ نچھاور کر سکتی ہوں۔ پتہ ہے

عائشہ اللہ نے ماں کے دل کو محبت کے احساس سے بھر دیا ہے“

”اللہ نے یہ محبت لیزا اور لیوسٹی کے دل میں کیوں نہیں ڈالی؟“ اس نے بے چینی سے ہونٹ کچلتے ہوئے سوچا تھا۔

”مجھے پاک پیغمبر ﷺ کی وہ حدیث یاد آگئی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ

”میرے پاس ایک عورت آئی اس نے دو بچیوں کو اٹھا رکھا تھا اور وہ کچھ

کھانے کیلئے مانگ رہی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں ان کے لئے

تین کھجوریں لے آئی میں نے وہ تین کھجوریں اس عورت کی طرف بڑھا دیں

اس نے دونوں کھجوریں اپنی بیٹیوں کو دے دیں جبکہ تیسری کھجور خود کھانے لگی تھی اس کی بچیوں نے ماں سے اس کھجور کو بھی مانگ لیا اس عورت نے کھجور کے دو حصے کئے اور ایک ایک دونوں بیٹیوں کو دیدیا۔ حضرت عائشہؓ

نے فرماتی ہیں اللہ کی قسم مجھے عورت کی ادا اتنی پسند آئی کہ جب آپ ﷺ گھر تشریف لائے تو میں نے ان سے یہ واقعہ بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا اے عائشہؓ تم نہیں جانتیں اس عمل کے بدلے اللہ نے اس عورت پر

جنت واجب کر دی ہے“ فارینہ دھیمے انداز میں کہہ رہی تھی۔ عائشہؓ کی آنکھوں

کے فرش گیلے ہونے لگے تھے۔ ثریا آنٹی کہتی تھیں کہ اللہ نے ایمان والوں

کے دل موم کر دیئے ہیں۔ جب انہیں اللہ کی آیات اور اس کے پیغمبر ﷺ

کی احادیث سنا کر ڈرایا جاتا ہے تو ان کے دلوں میں گداز اور آنکھیں خوف

کے احساس سے بہنے لگتی ہیں۔ عائشہؓ کا دل بھی پگھلنے لگا تھا۔ اور جب وہ

فارینہ کے گھر سے باہر نکلی تو اس کے دل میں بھی ایک خواہش انگڑائی لے

کر جاگ اٹھی تھی۔

”ماں بننے کی خواہش ، علی کے بچے کی ماں بننے کی خواہش ، ایک بہترین ماں بننے کی خواہش“

...☆☆☆...

زین کی طبیعت زیادہ بگڑنے لگی تھی 'زمینہ اس کی حالت دیکھ کر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتیں اس بیٹے پر انہیں کتنا مان تھا۔ زین پیدا ہوا تو ان کا وجود ہوائوں میں ہی اڑنے لگا تھا حارث کو بیٹا دیکھ کر وہ کتنی مطمئن اور شاد تھیں۔ علی کی حیثیت تو انہوں نے بالکل زیر و کردی تھی حارث کی نگاہوں میں۔

تہمینہ کے ساتھ پلاننگ کر کے نا صرف علی کو حارث کی نظروں سے گروایا بلکہ گھر سے بھی نکلوا دیا وہ تمام جائیداد پر اپنا قبضہ چاہتی تھیں۔ مگر اس سے بھی پہلے تہمینہ اپنی اوقات دکھا گئی۔ رات کی تاریکی میں سب کچھ سمیٹ کر وہ ایسی غائب ہوئی کہ وہ اب تک اس کا سراغ نہیں لگا سکی تھیں۔

جس جائیداد کے لالچ نے انہیں اندھا کر دیا تھا وہی مال و دولت روپیہ ، پیسہ ریت کی طرح انکے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ یہاں تک کہ زین کے علاج کیلئے بھی کچھ نہیں بچا تھا۔ احمر کی مہربانی کی وجہ سے انکا علی سے رابطہ ہو گیا تھا اور وہ انہیں ناصر زین کے علاج کیلئے پیسے بھجواتا رہا بلکہ گھر کے اخراجات کیلئے بھی بھاری رقم اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتا تھا۔

اب وہ چاہتی تھیں کہ زین علی کے پاس چلا جائے تاکہ اس کا علاج اور آپریشن وغیرہ علی اپنی نگرانی میں کروائے۔ وہ جانتی تھیں کہ علی ان سے چاہے جتنی بھی نفرت کرے وہ زین سے کبھی نفرت نہیں کر سکتا

زمینہ نے احمر سے بات کی تھی کہہ وہ علی سے کہ کر زین کے پیپرز وغیرہ بنوائے۔ جب تمام قانونی کارروائی مکمل ہو گئی تو زین نے امریکہ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ بہت خوفزدہ تھا اس بیماری نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ امریکہ جانے کی سوچ سے ہی اس پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ پھر علی نے اس سے خود بات کی اور اسے بہت پیار سے سمجھایا سوما اور سوبا نے زین کو



علی کے تصور سے بھی ڈرا دیا تھا۔ وہ علی کو بہت غصیلا، سخت مزاج اور مغرور انسان سمجھتا تھا۔ اور اسکی ماں نے جو کچھ علی کیساتھ کیا تھا زین ان سب باتوں سے واقف تھا۔ اس لئے وہ علی کے پاس جانے سے کترانے لگا تھا۔ زین نے جب انٹرنیٹ پر علی سے باتیں کی تو اسے فخر سا محسوس ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنی ماں سے کتنی ہی دفعہ جھگڑا کیا۔

”مجھے شرم آتی ہے آپ کو ماں کہتے ہوئے میں کس منہ سے بھائی کا سامنا کروں گا؟“ وہ چیختا چلاتا رہا تھا اور زرمینہ مارے شرمندگی کے سر نہیں اٹھا پارہی تھی۔

زین کی طبیعت دن بدن گرتی جا رہی تھی! ڈاکٹرز کا یہی مشورہ تھا کہ فوری آپریشن کر دیا جائے۔ زرمینہ کی راتوں کی نیند اڑ چکی تھی زین کو دیکھ کر انکا دل کٹتا تھا۔ مکافات عمل شاید اسی کو کہتے ہیں۔ زین کی آنکھوں میں بجھتی زندگی دیکھ کر وہ پہروں رویا کرتی تھیں۔

اب کے انہوں نے زین کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اسے امریکہ جانے کیلئے تیار کیا تھا اور پھر سوما کی شادی کے تیسرے روز وہ امریکہ چلا گیا۔ ایئر پورٹ پر علی اسکے گلے لگ کر کتنی ہی دیر روتا رہا تھا۔ علی نے نم آنکھوں سے اسکی پیشانی کو چوما۔

”یار! تم تو اتنے لمبے ہو گئے ہو“

”آپ سے تھوڑا کم ہوں“ زین آنکھیں پونچھتا مسکرا کر بولا!

”ویسے بھائی آپ تصویروں سے زیادہ ہینڈسم ہیں“

”آپ کی آنکھوں کا کمال ہے کہ ہم اتنے حسین نظر آ رہے ہیں آپ کو۔“ علی نے لہجے میں ڈھیروں انکساری سمو کر کہا تھا۔ ”میری بھابی کیسی ہیں؟“

”خود جا کر دیکھ لینا“

ادھر عائشہ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کوئی چوتھی مرتبہ گلاس ونڈو میں سے پارکنگ میں جھانکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں اسے آتے ہوئے دکھائی دیئے عائشہ نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ وہ بہت محبت سے زین سے ملی تھی۔ اس نے سفید پھول اس کے اوپر نچھاور بھی کئے تھے۔ زین کی آنکھیں خوشی سے جگمگانے لگیں۔

اگلے دو تین دن تک علی نے احمر کے مشورے سے سرجن ایرتھ سے ٹائم لے لیا تھا۔ زین کو دیکھ کر اسے بہت دھچکا لگا تھا۔ زرد رنگت ”اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں کمزور اور دبلا پتلا سے سراپا۔

وہ اس زین سے قطعاً مختلف تھا۔ گیارہ سال بعد اپنے بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل لہو لہو ہو گیا تھا۔

زین کی ٹریمنٹ شروع ہو چکی تھی۔ وہ باقاعدگی سے زین کا چیک اپ کروا رہا تھا۔ علی نے زین کیلئے ڈائٹ چارٹ بنوایا تھا۔ اور عائشہ بہت ہی ذمہ داری سے اس پر عمل کروا رہی تھی۔ زین صبح علی کیساتھ جاگنگ کیلئے نکلتا تھا۔

عائشہ اور زین واک کرتے جبکہ علی معمول کے مطابق ایکسرسائز کرتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد انکی واپسی ہوتی علی آفس کیلئے تیار ہوتا جبکہ وہ دونوں ناشتا بناتے زین بہت اچھی کوکنگ کر لیتا تھا۔ ان کی ڈائٹنگ ٹیبل پر کافی خوش ذائقہ اور مزیدار کھانے نظر آنے لگے تھے۔ علی زین کو اکثر چھیڑتا تھا۔

”مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم پاکستان میں کسی کے ہاں باورچی رہے ہو“ اس دن علی کی چھٹی تھی اس لئے وہ بڑی فرصت کے عالم میں ٹی وی پر چلنے والے کرکٹ میچ کو انجوائے کر رہا تھا۔ عائشہ اور زین کچن میں لنچ کی تیاری کر رہے تھے۔

وہ اپیل جیلی سیلڈ اور گرین ویجیٹبل سیلڈ تیار کر چکا تھا۔ اب وہ عائشہ کو اوپن گرلی سینڈوچز بنانے سکھا رہا تھا۔

”پہلے چکن کے چھوٹے چھوٹے پیس کر کے ابال لیں“ عائشہ اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی جبکہ وہ خود اسٹول پر چڑھا ایک ہاتھ میں اورنج جوس کا گلاس پکڑے ننگٹس کی ٹکڑے ڈبو ڈبو کر کھانے میں مصروف تھا۔

”اب آپ یوں کریں کے فراننگ پین میں تھوڑا سے بٹر ڈال دیں! باقی کام میں خود کرتا ہوں“ اس نے جوس کا خالی گلاس ٹیبل پر رکھا۔ باتوں ہی باتوں میں مزیدار سینڈوچز تیار ہو گئے تھے۔

”کچھ کھانے کو دے دو، بڑی سخت بھوک لگی ہے“ علی نے کچن میں جھانک کر کہا تھا۔

”آپ باہر تشریف رکھیں خادم کھانا لے کر آرہا ہے“ زین مسکراتے ہوئے بولا۔

زین اور عائشہ نے برتن ٹیبل پر لگائے تھے۔ کھانے کے دوران علی وقفے وقفے سے زین کو سراہتا رہا۔

”اگر آپ مجھے تگڑا قسم کا معاوضہ دینے کا وعدہ کرتے ہیں تو میں آپ کی بیگم کو ناصرف پاکستانی بلکہ چائینز، اٹالین، ایرانی اور افغانی ڈشز بنانے میں ماہر کردوں گا“

”ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے“ علی مسکرایا اور زین نے نیپکن سے ہاتھ صاف کئے اور کھڑا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے پھر آج سے میں بھابی کا استاد ہوں۔“ وہ ہنستے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ عائشہ بھی مسکراتے ہوئے برتن سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

زین اپنی ماما سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ کچھ حیرانی سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

”جی ماما میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بھائی بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ جی بھابی بھی بہت اچھی ہیں۔ یہ لیں بات کر لیں ان سے“ زین نے ریسپور اسکے ہاتھ میں تھما دیا۔ زرمینہ کو اس سے بات کرنے کا بہت تجسس تھا۔ وہ بڑے اشتیاق کے عالم میں بات کرتی رہیں۔



”علی نے تمہیں پرپوز کیا تھا یا تم نے“

”جی علی نے —“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

”تم دونوں اکٹھے کام کرتے تھے —“

”نہیں —“

”تمہیں علی نے اسلام قبول کرنے کیلئے مجبور کیا تھا؟؟؟“

”نہیں میں شادی سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکی تھی“ عائشہ کو اب انکے

سوالوں سے کچھ کچھ الجھن ہو رہی تھی۔

”بڑی حیرت کی بات ہے“ زرمینہ کو شاید اسکی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔

”ویسے انگریز عورتوں کے بارے میں کچھ اچھا نہیں سنا، خیر علی کی

مرضی“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

”علی میرا بڑا بیٹا ہے مجھ سے کچھ خفا ہے۔ تم اس سے کہنا کہ کبھی ماں سے

بھی بات کر لیا کرے“ زرمینہ کچھ آزدہ سے ہو گئی تھی۔ پھر گہرا سانس کھینچ

کر بولیں۔

”عائشہ بیٹی ازین کا بہت خیال رکھنا، ویسے ڈاکٹر اس کے آپریشن کے بارے

میں کیا کہتے ہیں“

”ڈاکٹر ایرتھ کسی کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن گئے ہوئے ہیں۔ وہ آکر ہی

ڈیٹ بتائیں گے“

عائشہ انہیں تسلیاں دینے لگی۔

”تمہیں اردو علی نے سکھائی ہے؟“ زرمینہ اس کی شستہ رواں اردو لہجے کو

سن کر حیران ہو رہی تھی۔

”نہیں —“

”تمہارے والدین نے شادی میں شرکت کی تھی؟“

ایک اور سوال آیا۔

”وہ مر چکے ہیں“ عائشہ مختصر بولی۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ کوئی خوشخبری ہے یا نہیں؟“ زرمینہ نے قدرے اشتیاق سے پوچھا عائشہ انکی بات کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔

”بھئی میں پوچھ رہی ہوں کہ ننھا مہمان تو نہیں آنے والا؟“ وہ کچھ جھنجلا سی گئی تھیں۔ عائشہ نے کچھ حیرانی کے عالم میں ریسپور کو گھورا۔

”جی مہمان تو آتے رہتے ہیں“ اس نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔ زرمینہ دوسری طرف سر پیٹ کر رہ گئی۔

”اچھا“ چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ کہ علی کب تک گھر آجاتا ہے؟“

”نو بجے تک آئیں گے“

”بیٹی اس سے کہنا کہ سوہا کے رشتے کی بات بن رہی ہے۔ اگر اس کا

بجٹ اجازت دے تو میں سوہا کا فرض بھی ادا کردوں“

زرمینہ نے لہجے میں ڈھیروں مٹھاس بھر کر کہا تھا۔ اسی پل زین نے لائونج میں جھانکا تھا۔ پھر عائشہ کے ہاتھ سے ریسپور لے کر بولا۔

”ماما اتنی گاڑھی اُردو ان کی سمجھ میں نہیں آتی آپ ایسا کریں انگلش لینگویج کا کورس کر لیں تاکہ بھابی سے بات کرنے میں آسانی ہو“

”ارے بھائی میں کیوں فرنگیوں کی زبان بولوں؟“ زرمینہ تپ اٹھیں زین نجانے کتی دیر فون پر بات کرتا رہا۔ عائشہ بے دلی سے اٹھ کر اپنے روم میں آگئی۔ علی کی ماں کی باتیں سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔ وہ نہ جانے کب تک سوتی رہتی علی نے ہی اسے جھنجوڑ کر اٹھایا تھا۔ فریش ہو کر وہ علی کیلئے چائے بنا لائی تھی علی کو زرمینہ کی فون کال کے بارے میں بتایا تھا۔ علی کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال بن آیا۔

”تم نے بھی بات کی ہے اس سے؟“

”ہاں۔“ وہ علی کے تیور دیکھ کر سہم گئی تھی۔

”کس کی اجازت سے بات کی ہے تم نے“

”وہ — زین نے کہا تھا“ عائشہ ہکلاتے ہوئے بولی ۔

”اس مکار عورت سے آئندہ بات کرنے کی کوشش مت کرنا“ علی نے کھردرے لہجے میں کہا تھا۔

”وہ آپ کی ماں ہیں“

”نہیں ہے وہ میری ماں —“ علی نے چلا کر کہا تھا۔ عائشہ دھندلائی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی ۔ علی کو اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہو گیا تھا۔

”سوری عاشی!“ وہ اس کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گیا ۔ ”میں نہیں بول رہی آپ سے“ عائشہ نے غصے سے کہا تھا۔

”نہ بولو بس رونا دھونا بند کردو“ علی نے اس کے دنوں ہاتھ تھام لئے ۔

”مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کی آپ نے؟“ وہ جو کبھی اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتا تھا اسکا چیخنا چلانا عائشہ کو سہا گیا تھا ۔ وہ بے دردی سے آنسو پونچھتے ہوئے غصے سے بولی ۔

”معاف کردو“ اس نے عائشہ کی ناک دبائی ۔

”نہیں کرونگی“

”میں کان پکڑ لیتا ہوں“ علی نے اس کے دونوں کان پکڑ لئے ۔

”آپ بہت خراب ہیں“ اس کے لبوں پر مسکان پھیل گئی تھی ۔

”تم نے ہی خراب کر دیا ہے“ وہ ہنستے ہوئے اسکے قریب سے اٹھ گئی تھی ۔ علی اس کو پکارتا رہ گیا۔

☆☆☆



”زین کے دل میں ناصرف سوراخ ہے بلکہ اس کے پیٹ میں کینسر بھی ہے“ ڈاکٹر ایرتھ نے چند رپورٹیں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا علی کے چہرے پر پریشانی کے سائے پھیل گئے۔

”زین دو دو بیماریوں میں مبتلا ہے اس کا علاج بہت سوچ بچار اور احتیاط سے کرنا پڑے گا۔ اگر کینسر کا آپریشن پہلے کیا تو دل کام کرنا چھوڑ دے گا اور اگر دل کو چھیڑا گیا تو کینسر پھیلنے کا اندیشہ ہے دونوں صورتوں میں مریض کی ڈیٹھ ہو سکتی ہے۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں میں آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں ممکن ہے دونوں آپریشن کامیاب ہو جائیں ہم صرف کوشش کر سکتے ہیں۔“

”زین کو کب ایڈمٹ کرنا ہے“ علی گہری سانس کھینچتا آہستگی سے بولا تھا۔

”ابھی فی الحال زین وہ ہی میڈیسنز یوز کریں۔“ اگلے پندرہ دن تک مریض کی حالت دیکھیں گے اس کے بعد ڈاکٹرز کا بورڈ جو فیصلہ کریگا۔ اس حساب سے آپریشن کی تاریخ مقرر کی جائیگی۔

علی بڑے بوجھل دل کیساتھ ہسپتال کے احاطے سے نکلا تھا۔

عائشہ معمول کے مطابق کام ختم کر کے بیڈروم میں آئی تو علی کو گہری سوچوں میں گم پایا۔ وہ سست قدموں سے چلتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔ لباس تبدیل کر کے جب وہ باہر آئی تو علی کروٹ بدلے شاید سو گیا تھا۔

”علی آج اتنی جلدی سو گئے ہیں“ وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے آہستگی سے بولی تھی۔ علی نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے“ اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے نرمی سے کہا

”ہوں۔ بولو کیا کہنا ہے؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”علی آپ کو بچے کیسے لگتے ہیں؟“

”یہ کیسا سوال ہے؟“ علی کچھ حیران ہو کر بولا۔

”بتائیں نا۔“ اس نے اصرار کیا۔

”ظاہر ہے اچھے ہی لگتے ہیں“

”علی میرا دل چاہتا ہے کہ ہمارا بھی بچہ ہو“ وہ سر جھکائے انگلیاں مسلتے ہوئے آہستگی سے بولی تھی۔ علی کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو آپ کو بے بی چاہئے“ اس نے عائشہ کے سرخ گال کو نرمی سے چھوا۔

”ہماری شادی کو اتنے مہینے ہو گئے ہیں“ عائشہ نے دونوں ہاتھوں کو اس کے سامنے پھیلایا۔ علی بہت محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی مختلف عورت تھی۔ وہ یورپ کی سب عورتوں سے الگ تھی اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی اور آنکھوں میں شرم و حیا کی سرخیاں۔ علی کو اس پل اپنے فیصلے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ عورت کے نام سے ہی متنفر تھا زرمینہ اور تہمینہ نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا وہ بمشکل ہی اپنے ریزہ ریزہ وجود کو جوڑ پایا تھا۔

اس نے کبھی شادی نہ کرنے کا خود سے عہد کر رکھا تھا۔ مگر عائشہ کو دیکھ کر اس سے مل کر وہ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو گیا تھا۔ اس گندے معاشرے میں عائشہ کا وجود گویا دلدل میں کنول کے پھول جیسا تھا۔ شاید ہی کسی مرد کو اپنی بیوی سے اتنی محبت ہوگی جتنی اسے عائشہ سے تھی۔ اس محبت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا عائشہ اس کی پسند کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔

”راہرٹ جان بڑا ہی خوش نصیب باپ تھا جس کے گھر عائشہ جیسی بیٹی نے آنکھ کھولی تھی“ کبھی کبھی وہ حیرت سے سوچتا تھا۔

”میں اپنا چیک اپ کروانا چاہتی ہوں“ دوسری صبح جب وہ آفس جانے کیلئے تیار ہو رہا تھا عائشہ اس کے قریب آتے ہوئے کچھ پریشانی کے عالم میں بولی تھی۔ پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے اس کے ہاتھ اک پل کور کے تھے۔

”میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں“ عائشہ نے جھنجلا کر اس کے ہاتھ سے پرفیوم کی بوتل چھین کر ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخ دی۔

”ہماری شادی کو صرف دس مہینے ہوئے ہیں۔ دس سال نہیں“ علی نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ہنسی برش اٹھا لیا۔

”چیک اپ کروانے میں کیا حرج ہے؟“

”کوئی ضرورت نہیں ہے فضول چکروں میں پڑنے کی“ علی نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ عائشہ آنسو پتی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس نے جھنجلا کر ہنسی برش صوفے پر اچھالا اور پھر عائشہ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں عاشری“ تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔

”آپ کو میری کوئی پروا نہیں ہے“ اس نے سوس سوس کرتے ہوئے کہا۔

”عاشی میں لیٹ ہو رہا ہوں پلیز رونا دھونا بند کر دو“

”ایک شرط پر“ وہ بھیگی آنکھوں سے مسکراتی ہوئی علی کے دل کے تار ہلا گئی۔

”کیا —؟“

”آج آپ ہم دونوں کو گھمانے لے کر جائیں گے“ زین نے دروازے سے جھانک کر بلند آواز میں کہا تھا۔ علی اور عائشہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

”بولیں منظور ہے؟“ اس نے گلابی ہتھیلی علی کے سامنے پھیلا دی۔

”دل و جان سے منظور ہے“ زین اس مرتبہ پھر بولا تھا۔

”تم چھپ کر ہماری باتیں سنتے ہو“ علی نے مسکراتے ہوئے زین کے سر پر

چپت لگائی۔ زین اس الزام پر اچھل پڑا۔

”جی نہیں میں تو احمر بھائی کے متعلق بتانے آیا تھا وہ نیچے ہارن پر ہارن

بجارتے ہیں یہ نہ ہو کہ اپنی کھڑکیاں اور دروازے کھول کر تمام انگریز

ڈنڈے، جوتے اٹھائے احمر بھائی کے ساتھ ہماری بھی درگت بنا دیں۔ اب



آپ جلدی سے نیچے تشریف لے جائیں ورنہ احمر بھائی خونخوار تیور لئے اوپر آنے والے ہیں“

”دھت تیرے کی“ علی نے سر پر ہاتھ مارا اور پھر جوتے ہاتھ میں پکڑے ٹائی گلے میں لٹکائے سرعت سے باہر کی طرف بھاگا۔

”علی کہاں گئے؟“ عائشہ دودھ کا گلاس پکڑے کچن سے برآمد ہوئی۔

”آفس۔“ زین کھڑکی میں سے جھانکتا ہوا اب بھی مسکرا رہا تھا۔ عائشہ نے حیرانی سے اس کی پشت کو گھورا اور پھر فکر مندی سے بولی۔

”مگر انہیں تو ٹائی کی ناٹ لگانا نہیں آتی“

”آپ فکر مند نہ ہوں انکی سہیلی یہ کام بخوشی سرانجام دے گی“ زین نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔

”کون سہیلی؟“ عائشہ ٹھٹکی۔

”احمر بھائی۔“ زین نے اس کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ اس کا سینے میں اٹکا ہوا سانس بحال ہوا۔

”تم پہلے ناشتہ کرلو“ اسے ٹی وی میں گم ہوتے دیکھ کر عائشہ نے بلند آواز میں کہا۔ زین کے چہرے پر بے زاری پھیل گئی۔ کھانے پینے کے معاملے میں وہ کافی لاپرواہ تھا۔ پکانے کا اسے بہت شوق تھا مگر کھانے کا نہیں۔ ایک مرتبہ عائشہ نے اس سے اتنی اچھی کوکنگ کا راز معلوم کرنا چاہا تو وہ بہت مزے سے بولا تھا۔

”میری بیماری اور کسی بھی وقت تکلیف ہو جانے کے ڈر سے ماما نے مجھے کبھی سکول جانے ہی نہیں دیا۔ گھر پر ہی ٹیوٹر پڑھانے آتے تھے پھر جب میں فارغ ہوتا تھا تو بوا اور دینو بابا کے ساتھ کچن میں گھسا رہتا یوں میں بہت اچھی کوکنگ کرنا سیکھ گیا۔“

”ابھی ناشتے کا موڈ نہیں“

”تھوڑا سا دودھ ہی پی لو، ابھی علی کا فون آئے گا تو میں انہیں کیا بتاؤں گی“ عائشہ نے اصرار کیا۔

”کہہ دیجئے گا کہ زین نے ناشتا کر لیا ہے“ وہ منہ بنا کر بولا۔

”میں علی سے جھوٹ بولوں —“ عائشہ نے آنکھیں پھیلانیں۔

”نہیں آپ بھائی سے کبھی بھی جھوٹ مت بولے گا۔ لائیں میں دودھ پی لیتا ہوں“ زین نے دودھ کا گلاس پکڑ لیا۔

عائشہ کچن میں آکر برتن وغیرہ دھوتی رہی اور زین نے ویکيوم لگا کر پورے

گھر کی صفائی کر ڈالی۔ عائشہ کے منع کرنے کے باوجود وہ کوئی نہ کوئی کام کرتا

رہتا تھا۔ اس کام کے بعد وہ فارینہ کی طرف چلا گیا۔ تین گھنٹے بعد اس کی

واپسی ہوئی اسکی گود میں مونا تھی۔ یقیناً وہ مارکیٹ کا چکر لگا کر گھر آیا تھا

کیونکہ مونا کے ہاتھ میں چاکلیٹ اور کینڈیز کا شاپر تھا۔

”مونا ڈارلنگ یہاں بیٹھئے اور چاکلیٹ کھائیے میں ابھی آتا ہوں“ زین اسکے

ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑا کر خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔

عائشہ اپنے ہی دھیان میں مگن ٹرانفل بنا رہی تھی کہ اچانک ہی اسے مونا کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے برنر بند کر کے لائونج میں جھانکا اور سرعت سے باہر آئی۔ مونا صوفے سے اچھلتی ہوئی کاپیٹ پر گر گئی تھی اور اب زار و قطار رو رہی تھی۔ عائشہ کے دل میں ایک ٹیس سے اٹھی تھی۔ اس نے بے اختیار مونا کو اٹھا کر سینے سے بھینچا۔ اسے لگا کہ ایزن بال کے پیچھے بھاگتے ہوئے ایکدم ہی گر پڑا ہے اور اب اسے نہ پا کر چیخ چیخ کر رو رہا ہے۔ اس کے سر پر اور ہونٹ پر چوٹ لگی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا ہے۔ ایزن کے ماتھے کا گومر، ہونٹوں سے رستا خون اور آنکھوں سے نکلتے آنسو، اس معصوم کے چیخ و پکار۔

”مے می مجھے اٹھا لو“ عائشہ کا دل لہو لہو ہو رہا تھا۔ وہ مونا کے سر کو چومتے

ہوئے مسلسل رو رہی تھی۔ اس کے لمس کو محسوس کر کے مونا خاموش ہو

گئی۔

”بھابی کیا ہوا ہے؟“ زین نے گھبرا کر عائشہ کو جھنجھوڑا۔ وہ ابھی ابھی اپنے

کمرے سے نکلا تھا۔

”مک — کچھ نہیں۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے بمشکل کہا اور پھر مونا کی

طرف اشارہ کیا۔

”یہ گر گئی تھی“

”لائیں اسے مجھے دیں۔ اور آپ پلینز چپ کر جائیں۔ بچے تو گرتے ہی رہتے

ہیں“ زین نے مونا کو گود میں اٹھایا اور باہر نکل گیا جبکہ عائشہ بے دم سی

صوفے پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

عائشہ واش روم سے باہر نکلی تو اسے ایک دم کسی کے کراہنے کی آواز سنائی

دی لمحے کے ہزاروں حصے میں وہ بھاگتی ہوئی زین کے بیڈ روم میں آئی تو اسے

بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹے پیٹ پکڑے کراہتا پایا۔ اس نے گھبرائے ہوئے بھاگم

بھاگ علی کو فون کیا اور پھر زین کو جھنجھوڑنے لگی۔

”زین آنکھیں کھولو۔“ اس نے زین کی سرد پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”اما کہاں ہیں — اما کو بلائیں“ زین دائیں بائیں سر پٹختے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

اس کی رنگت زرد اور ہونٹ کپکپا رہے تھے عائشہ نے ایک مرتبہ پھر علی کا

نمبر ملایا۔

”میں ڈاکٹر ایرتھ کو ساتھ لے کر آرہا ہوں۔ تم پریشان مت ہو“ کچھ ہی دیر

بعد فارینہ بھی آگئی تھی اور تقریباً بیس منٹ بعد علی ڈاکٹر ایرتھ کو لے کر

آگیا۔ ٹریٹمنٹ دینے سے زین کی حالت کچھ بہتر ہوئی تھی۔ اور اب وہ دوائوں

کے زیر اثر نیم غنودگی میں تھا۔

فارینہ اور علی کے جانے کے بعد وہ قرآن پاک لے کر زین کے سرہانے

بیٹھ گئی۔ اس نے مریض کی شفا کیلئے مخصوص چند آیات پڑھیں پھر انہیں

اک سادہ کاغذ پر لکھا اور شفاف پانی کی بوتل میں ڈال دیا۔

اسے یاد تھا ثریا آنٹی کی بیٹی جب بیمار ہوتی تھی تب وہ اسے بھی دم کیا پانی

پلاتی تھیں۔ پہلے پہلے عائشہ بہت حیران ہوتی تھی کہ اس دم کئے سادہ پانی



میں کیسی تاثیر ہوتی ہے کہ ثریا آنٹی کی بیٹی اگلے چند گھنٹوں میں ہی پہلے کی طرح چاق و چوبند ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ان کی بیٹی نے اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان دونوں ماں بیٹی کا اکثر اس بات پر جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ثریا آنٹی پنکی کی کفرانہ باتیں سن کر بے حد غمگیں ہوتی تھیں۔ اور پھر دھیمی آواز میں بڑبڑاتی رہتی تھیں۔

”کاش پنکی تو پیدا ہوتے ہی مر جاتی“

اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ ایک مرتبہ پھر اس کی فکر میں بے چین ہو جاتی تھیں۔ وہ بھی عجیب سے ماں تھیں۔ پنکی انہیں جھڑکتی رہتی ان پر غصہ کرتی کبھی کبھی جب بہت ہی بے زار ہوتی تو انہیں گالیاں بھی دینے لگتی۔ اس کے باوجود پنکی کے گھر سے نکلنے اور واپس آنے تک ثریا آنٹی بے قرار روح کی طرح پورے گھر میں چکراتی رہتی تھیں۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ساتھ اس کا بھی مذاق اڑاتی تھی۔

”تم انتہائی احمق لڑکی ہو جو اس بڑھی کی باتیں سن سن کر اپنا مذہب چھوڑ بیٹھی ہو“ ثریا آنٹی اس پل پتھرائی نگاہوں سے پنکی کے منہ سے نکلنے والے شراروں کو دیکھتی رہتیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہتیں۔

”احمق یہ نہیں تم ہو پنکی۔ روشنیوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے اندھی کھائی میں گر جاؤ گی“

”تمہارا فیوچر تباہ ہو جائے گا سوٹا۔“ پنکی اس خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتی۔ اس نے کبھی بھی عائشہ کو اس کے اسلامی نام سے نہیں پکارا تھا۔

”مذہب انسان کو کچھ نہیں دیتا“

”استغفر اللہ“ آنٹی نے دہل کر کہا۔

”تم نے مذہب بدلا ہے۔ کیا اس مذہب نے تمہیں تحفظ دیا ہے؟ درد کی ٹھوکریں کھا رہی ہو۔“ پنکی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے تنفر سے کہا۔

”میں پہلے ٹھوکریں کھا رہی تھی“ عائشہ نے آرزوگی سے سوچا۔

”ساری زندگی لوگوں کے برتن دھوتی رہو گی۔ اس سے بہتر جاب تو تمہیں مل نہیں سکتی“ اس نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں چھوڑا۔ آنٹی منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگیں۔ پنکی نے انتہائی ناگوراری سے ماں کی طرف دیکھا۔

”اس عورت کو تو ماسوائے رونے دھونے کے کچھ نہیں آتا“ اس نے غصیلے لہجے میں کہتے ہوئے عائشہ کی طرف رخ کیا۔

”اگر میں تمہاری طرح خوبصورت ہوتی تو نائٹ کلب کی روشنیاں میرے سامنے ماند پڑ جاتیں“ اس نے اپنے سیاہ بھدے ہاتھوں کو عائشہ کے سامنے لہرایا۔

”میری خبلی ماں کے ساتھ رہ رہ کر تم پاگل ہو جاؤ گی اب بھی وقت ہے سوچ لو۔ اپنی خوبصورتی کو کیش کرائو پیسے کمائو اور بیٹھ کر کھائو تمہاری برادری کی لڑکیاں اس عمر میں یہی کرتی ہیں اور بڑھاپے میں اولڈ ہاوسز کو رونق بخشی ہیں“ پنکی نے قہقہہ لگایا۔

”بکومت۔“ آنٹی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ غم و غصے کی شدت سے چلا اٹھیں۔

”یہ بکواس نہیں حقیقت ہے“ اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور پھر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت سے بولی۔

”تم نے میری زندگی جہنم بنا دیا ہے۔ نہ اپنا گھر بسا سکی ہو اور نہ میرا بسنے دیتی ہو۔“

”میں نے کب روکا ہے تمہیں۔ کرلو اپنے کسی ہم مذہب سے شادی۔“ وہ بے بسی سے کہتے ہوئے رو دی تھیں۔

”ہم مذہب“ پنکی نے سگریٹ پیروں تلے مسل ڈالا تھا۔

”میری جیسی شکلوں والوں کو کون منہ لگاتا ہے۔“

”خوبصورتی ظاہر کی نہیں باطن کی ہوتی ہے۔ جسم تو خاکی ہے اس نے مٹی میں رل جانا ہے۔ دنیا فانی ہے اس نے فنا ہو جانا ہے۔ کچھ نہیں بچے گا

سوائے اچھے عمل کے - ایسا عمل جو ابدی زندگی کی مسرتیں دے گا - ایسی نیکی جو موت کے بعد کام آئے گی - میں نے اسے سچا اور سیدھا راستہ دکھایا ہے - یہی قیامت کے روز میری بخشش کا وسیلہ بنے گی“ انہوں نے نرم اور دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے عائشہ کے سر کو چوما۔

”جنہوں نے سنبھلنا ہوتا ہے وہ گر کر بھی سنبھل جاتے ہیں اور جس نے بھٹکنا ہوتا ہے لاکھ کوششوں سے بھی بھٹک کر ہی رہتے ہیں۔“

”اونہہ - پنکی پاؤں پٹختے چیختی چلاتی باہر نکل گئی تھی۔“

”پپ - پانی“ وہ نجانے کن سوچوں میں گم تھی کہ زین کے کراہنے پر فوراً اس کی طرف لپکی تھی -

”زین اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”ٹھیک ہوں“ وہ نقاہت زدہ لہجے میں بولا تھا۔

”بھابی“

”کیا بات ہے زین“ عائشہ نے نرمی سے پوچھا۔

”بھائی کہاں ہیں۔“ وہ بے چینی سے بول رہا تھا۔

”آفس چلے گئے ہیں - ابھی کچھ دیر میں آجائیں گے“ عائشہ کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹتے ہوئے نرمی سے بولی - پھر زین کیلئے سوپ بنانے کیلئے کچن میں آگئی - سوپ بنا کر زین کو دیا اور ساتھ ہلکا پھلکا لچ بھی تیار کر لیا تھا - اسی اثنا میں علی بھی آگیا۔

”کھانا لگائوں؟“

”ہاں، کمرے میں ہی لے آؤ“ علی بیڈروم کی طرف بڑھ گیا تھا - وہ ٹرائی میں کھانا سجائے اندر آئی تو وہ بیڈ پر نیم دراز تھا - اسے آتا دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

”زین کو پھر تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔۔۔“

”کچھ کھایا ہے اس نے؟“



”سوپ پی کر دوبارہ سو گیا ہے“

”ڈاکٹر ایرتھ نے زین کی میڈیسن دوبارہ چینیج کر دی ہیں اب اسے پہلے والی دوا نہ دینا“ وہ اسے مختلف دوائیوں کے متعلق مکمل تفصیل سے بتاتا رہا تھا۔ عائشہ سر ہلاتے ہوئے دھیان سے سنتی رہی۔

اگلے بہت سارے دن اسی مصروفیت میں گزر گئے تھے۔ زین کے آپریشن کی ڈیٹ فائنل ہو گئی تھی۔

ایک ہفتے تک اسے ایڈمٹ کروا دینا تھا۔ زین ان دنوں بہت چپ چپ اور اداس رہنے لگا تھا۔ عائشہ اسے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی مگر وہ ہوں ہاں سے زیادہ نہیں بولتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یاسیت نے گویا ڈیرے جما لئے تھے۔ رات رات بھر وہ جاگتا رہتا تھا۔ علی کے ڈانٹنے پر وہ ایک دن بے اختیار رو دیا تھا۔

”مجھے موت کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں بھائی مجھے نیند سے ڈر لگنے لگا ہے“

”میری جان تم تو بہت بہادر ہو — یہ خوف اور آنسو تم پر سوٹ نہیں کرتے۔ ابھی تو تم نے بہت جینا ہے“ علی نے اس کی پیشانی کو چوما۔

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں ہم زندگی میں لاتعداد چھوٹے بڑے گناہ کرتے ہیں۔ کبھی کسی کا دل دکھایا کبھی غیبت کی، کسی کا مال ہڑپ کر لیا، کسی پر جھوٹے الزام لگائے دوسروں کی راہوں میں کانٹے بچھاتے ہوئے ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان میں سے کوئی کانٹا ہمیں بھی چبھ سکتا ہے ماما نے صرف پیسے کی خاطر آپ کو گھر سے نکالا۔ وہ میرے لئے مال اکٹھا کرنا چاہتی تھیں مگر نہ وہ مال رہا نہ دولت رہی اور نہ ہی میری صحت“ زین نے ایک طویل سانس لے کر آرزوگی سے کہا تھا۔ علی اس کے بال سہلاتا رہا۔

”فضول سوچوں میں خود کو نڈھال نہ کیا کرو“

”سوچوں پر کون پہرے بٹھا سکتا ہے۔ جو کچھ ماما نے کیا وہ اس کا پھل پارہی ہیں میری تکلیف کی صورت میں۔ مگر دکھ اس بات کا ہے کہ وہ ابھی تک

نہیں سمجھیں۔ آج مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میری ماں کا دل کالا ہو چکا ہے۔“

اس نے تکیے پر سر پٹنا علی نے بمشکل ہی اسے قابو کر رکھا تھا۔ پھر اس کی طبیعت سنبھلی تو علی لائٹ آف کر کے اسے آرام کرنے کی تاکید کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ جبکہ زین کو ایک مرتبہ پھر ناگن جیسی سوچیں ڈسنے لگی تھی۔

کل شام اسے نے ماما سے فون پر بات کی تھی۔ وہ ماما کو بے حد مس کر رہا تھا۔ آپریشن سے پہلے وہ ایک مرتبہ ماما سے ملنا چاہتا تھا۔ انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے یہی بات ماما سے بھی کی تھی۔ دوسری طرف ماما خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔

”میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی۔ اللہ کرے تمہارا آپریشن کامیاب ہو جائے۔ تم صحت مند ہو جاؤ۔ پھر تم علی سے بات کرنا کہ وہ مجھے امریکہ بلا لے سوہا کی شادی کے بعد میں مزید تنہا ہو جاؤں گی۔ اور ویسے بھی بیٹا پاکستان میں میرے لئے اب رکھا ہی کیا ہے۔ علی سے کہنا وہ تمہیں چھوٹا

موٹا کاروبار کروا دیگا۔ پڑھ تو تم سکے نہیں ہو اس موٹی بیماری کی وجہ سے مناسب سا سٹور بنا دے تو ہم ماں بیٹے کا خوب گزارا ہو جائے گا سنا ہے خود تو وہ امریکہ میں خوب ٹاٹھ کے ساتھ رہ رہا ہے۔ بڑی اچھی نوکری ہے اس کی تم اس کے چھوٹے بھائی ہو۔ کچھ نہ کچھ تو اسے تمہارے بارے میں سوچنا چاہیے“ ماما نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں وہ دم بخود سنتا رہا۔ دکھ، حیرت اور صدمے کی وجہ سے اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

”ارے زین کیا سو گئے ہو؟“ زرمینہ کچھ پریشانی سے بولیں۔

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تم ابھی سے ہی علی بات کرلو۔ گیارہ بارہ سالوں سے امریکہ میں ہے خوب پیسہ جمع کر رکھا ہو گا۔ کہیں وہ میم ہی سب کچھ ہڑپ نہ کر لے۔ ان انگریز عورتوں کا کیا بھروسہ۔“ وہ تیز تیز بولتے ہوئے کچھ پل کو رکیں۔

”نجانے کون ہے، کیسی ہے میں نے تو ادھر اتنی اچھی لڑکی علی کیلئے تلاش کی تھی مگر اس نے تو اچانک ہی میم سے شادی کر لی۔ خیر چھوڑو اس بات کو

اللہ تمہیں صحت یاب کرے جلد از جلد تم بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تو ہمیں علی کے سامنے یوں بار بار ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں رہے گی، پیسے تو اس طرح بھجواتا ہے جیسے خیرات دے رہا ہو۔ یہ بھی دن دیکھنے تھے میں نے، انہوں نے خوا مخواہ لہجے میں افسردگی بھر لی۔

”اچھا ما ما اللہ حافظ“ زین نے بے دلی سے کہا۔

”آں — ہاں ٹھیک ہے اللہ حافظ - اپنا خیال رکھنا بیٹا - میرا دل تو مانو پتے کی طرح لرزتا رہتا ہے - نجانے میرے بیٹے کا وہاں کوئی خیال بھی رکھتا ہوگا یا نہیں - میری نظروں کے سامنے ہوتا تو بے چینی کم ہوتی - تمہارے آپریشن سے پہلے آجائوں گی میں پریشان مت ہونا۔“

زرینہ کی گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی - زین نے جھنجلا کر ریسور کریڈل پر بچ دیا - اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے - مادہ پرستی، ہوس اور خواہشات انسان کی عقل پر پردے ڈال دیتی ہیں - اس بات سے بے خبر کے

عمر کی پونجی لٹنے کے قریب ہے زرینہ مزید اور مزید پانے کے چکروں میں تھیں۔

زندگی کی مختصر شاہراہ پر انسان اندھا دھند بھاگتا ہے اگر کوئی اس کے قدموں تلے آکر روندنا جائے تو اسکی بلا سے - ہر شے سے بے خبر انجان اپنی خواہش اپنے خواب اور اپنی ضروریات اسے عزیز ہوتی ہیں اور پھر نجانے کس موڑ پر آکر کوئی گاڑی کوئی ٹرک یا پھر کوئی حادثہ اس کی جان لے لیتا ہے - بعض ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتے ہیں اور بعض ز ر پرست صرف اور صرف اپنے عیش و آرام کو محبوب رکھتے ہیں کوئی حادثہ کوئی دکھ انہیں تکلیف نہیں دیتا - انہیں زندگی سے پیار ہوتا ہے - خود سے وابستہ رشتوں سے نہیں۔

☆☆☆

رات کو اس نے عجیب سا خواب دیکھ تھا - بہت ہی گھنا اور قد آور درخت ہے - اس کی شاخیں پتوں سے خالی ہیں - درخت کے نیچے ایک صحت مند بچہ کھڑا ہے وہ زمین پر گرے پتوں کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ رہی ہے -



عائشہ بہت تیزی سے اس بچے کی طرف بڑھتی ہے۔ بچہ اسے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے اس کے ہاتھ سے تمام پتے بھی گر جاتے ہیں۔ قریب سے دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچہ رو رہا ہے۔

عائشہ اس بچے کہ پہچاننے کی کوشش کرتی ہے مگر پہچان نہیں پاتی۔ کچھ مایوسی کے عالم میں جب وہ پلٹنے لگتی ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بچہ اسکے پیچھے آرہا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر بچے کی طرف دیکھتی ہے۔ بچہ اس کے قریب آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور بلند آواز میں رونے لگتا ہے۔

”مے می۔ مجھے چھوڑ کر مت جائو“

وہ اس بچے کو پہچان لیتی ہے۔ وہ اس بچے کی آواز کو پہچان لیتی ہے۔ وہ بچہ ایزن تھا۔ عائشہ ایزن کو پیار کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایزن کے رخسار کو چومنا چاہتی ہے مگر ایزن نجانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔

تین دن مسلسل اسے خواب میں ایزن دکھائی دیتا رہا تھا۔ کبھی وہ اندھے کنویں میں گرنے لگتا تھا۔ کبھی اسے سانپ ڈسنے لگتا تھا اور کبھی وہ تاریکی میں گم ہو کر اسے پکارتا تھا۔ عائشہ بہت مضطرب تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں اس سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہو رہا تھا۔

”ایزن کو یقیناً کوئی تکلیف ہے“ اس نے بے قراری سے سوچا اور پھر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

”میں تمہیں کہاں تلاش کروں میری جان۔“

عائشہ روتے ہوئے فون سٹینڈ کی طرف بڑھی۔ اب وہ مسز ریٹ کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ مسز ریٹ بے بی کیئر سینٹر کی انچارج تھیں۔

فون مسلسل بزی جا رہا تھا تھک ہار کر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اسی پل اسے لائونج میں سے علی کے اونچا اونچا بولنے کی آواز آئی تھی وہ گھبراتے ہوئے سرعت کیساتھ باہر کی طرف بھاگی۔

”انہیں یہاں بلانے کی ضرورت نہیں ہے“ زین پست آواز میں بولا۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا، ایک دو دن میں انکی سیٹ کنفرم ہو جائے گی“ علی نے ترشی سے کہا تھا۔

”آپ مجھ سے پوچھ تو لیتے“ زین کچھ کچھ خفا خفا سا لگ رہا تھا۔

”تمہاری ماں کی موجودگی میں تمہارا آپریشن ہوگا“

”ماما کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے“ زین کی آواز بھرا گئی۔

ماما کی باتیں ان کے خیالات ان کی سوچ کس قدر گھٹیا تھی وہ نئے سرے سے سلگ اٹھا۔

ادھر زرینہ بہت خوشی کے عالم میں امریکہ جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

انہوں نے اپنے لئے اور زین کیلئے ڈھیر ساری شاپنگ کی، علی کیلئے بھی ایک

دو سویٹر اور دو تین شرٹس خرید لیں۔ البتہ عائشہ کیلئے کچھ خریدنے کی

انہوں نے زحمت نہیں کی تھی پیکنگ کر لینے کے بعد اب وہ فون سیٹ گود میں

رکھے تمام سہیلوں کو فرداً فرداً اپنے امریکہ جانے کے متعلق بتا رہی تھیں۔

”تمہاری تو بڑھاپے میں لاٹری نکل آئی ہے“ فریدہ نے حاسدانہ لب و لہجہ میں کہا تھا۔

”لو ابھی میری عمر ہی کیا ہوئی ہے“ زرینہ کو بڑھاپے کا طعنہ خنجر کی طرح

لگا تھا۔ اسی لئے ناگواری سے بولیں۔

”فینشل کروانے اور بال رنگنے سے جوانی لوٹ کر نہیں آتی“ فریدہ نے گویا

اگلے پچھلے حساب بے باق کئی۔ زرینہ نے دو تین کھری کھری سنا کر فون بند

کر دیا۔

”جل بھن گئی ہے بیچاری“ انہوں نے تنفر سے کہہ کر فرح کا نمبر ڈائل کیا۔

ان کے امریکہ جانے کا سن کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔

”واپس کب آؤ گی؟“

”یہاں بھوک کے علاوہ ہے ہی کیا۔ سب کچھ تو حکمرانوں کے پیٹ میں

گھس رہا ہے۔ کم بختوں کے پیٹ بھی نہیں پھٹتے واپسی کا تو سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا“ وہ تفاخر سے بولیں۔

”وطن تو اپنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ تم کہاں سمجھو گی نیا نیا امریکہ جانے کا خمار ہے خیر سے جلد ہی اتر جائے گا“ فرح بے اختیار سوچے گئیں۔

”امریکہ جا کر ہمیں نہ بھول جانا اور ہاں اپنے بھانجے کیلئے بھی کوشش کرنا۔ بے چارہ جاب کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے“ فرح کا لہجہ خود بخود خوشامدی ہو گیا تھا۔ جواباً زمینہ نے انتہائی خوشدلی سے ہامی بھر لی۔

”ہنہ بھانجا۔۔۔“ فون بند کرنے کے بعد وہ اطمینان سے سونے کی تیاریاں کرنے لگیں۔

پورے دو دن بعد وہ امریکہ میں موجود تھیں ایئر پورٹ سے لے کر گھر تک وہ بڑی خوشگوار مسکراہٹ سجائے ارگرد کے حسین مناظر دیکھنے میں مصروف رہی تھیں۔۔۔ جوں ہی انہوں نے انتہائی خوبصورت فرنشڈ فلیٹ میں قدم رکھا ازلی حسد انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھا۔ علی کو دیکھ کر تو انکی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں کہاں وہ دبلا پتلا غصیلا جذباتی سا لڑکا اور کہاں یہ صحت مند انتہائی وجیہ و شکیل باوقار مرد۔ علی کا انداز کافی روکھا پھیکا تھا البتہ عائشہ بہت

محبت سے ملی تھی۔۔۔ فارینہ اور احمر بھی آئے تھے اس لئے کھانا کافی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ ان کے جانے کے بعد علی اور زین بھی اٹھ گئے تھے۔

وہ بے حد تھکن محسوس کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ عائشہ کا انٹرویو لینے کیلئے بیٹھ گئیں۔ عائشہ دھیمے دھیمے لہجے میں ان کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ عائشہ کا سادہ لباس، لب و لہجے میں ٹھہرائو گفتگو کا انداز دیکھ کر وہ بہت حیران ہو رہی تھیں۔

عائشہ گھر کا کام خود کرتی تھی۔ صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، وہ صوفے پر لیٹی سارا دن ادھر سے ادھر بھاگتے دوڑتے مختلف کام سرانجام دیتے دیکھتی رہتیں عائشہ کی اتنی فرمانبرداری انہیں ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ انگریز عورتوں کے بارے میں ان کا الگ سے تصور تھا۔ جبکہ عائشہ کو دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ علی کی بیوی جینز کسے ٹی شرٹ پہنے فر فر انگلش بولتے سارا دن گھر سے باہر رہتی ہو گی۔ اس کے کم از کم دو تین تو بوائے فرینڈ ہونگے۔ اور پھر صبح و شام ان دونوں کی لڑائی ہوتی ہو گی۔ مگر یہاں



آکر انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ لڑنا جھگڑنا تو دور کی بات وہ اونچی آواز میں بولتی تک نہیں تھی۔

زرینہ بہت جلد اس روٹین سے بور ہو گئی۔ وہ ہلے گلے کی شوقین، شور ہنگامے کی شیدائی دن بھر سہیلیوں کے گھروں کی ٹوہ لینے کی عادی تھی۔ اس بند فلیٹ میں اسکا دم گٹھنے لگا تھا۔

اس دن فارینہ کو فٹے بنا کر لائی وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔

”نوکری شوکری تو نہیں کرتی ہو۔؟ اتنے دن بعد چکر لگایا ہے“

”نہیں آنٹی جاب کا تو نام ہی مت لیں بس مونا بہت مصروف رکھتی ہے اس لئے نہیں آسکی۔ آپ کیسی ہیں اور یہ عائشہ کہاں ہے؟“

”برتن دھو رہی ہے“ انہوں نے بے زاری سے کہا۔

”آپ آجائیں زین کے ساتھ ہماری طرف“ فارینہ نے اخلاقاً کہا اور پھر بائول سمیت کھڑی ہو گئی۔

”میں ذرا عائشہ سے مل لوں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں“ انہوں نے چبا چبا کر کہا اور پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”علی بھائی کی امی کچھ عجیب سی ہیں“ فارینہ منہ بنا کر بولی تھی۔ عائشہ نے برتن خشک کرتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

”تم کب آئیں؟“

”دس منٹ پہلے، اگر تم فارغ ہو تو ذرا مارکیٹ کا چکر لگا آئیں؟“

”ہاں، تم ذرا آنٹی کے ساتھ بیٹھو میں چینیج کر کے آتی ہوں“ عائشہ بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

”کہاں جارہی ہو؟“ زرینہ ان دونوں کو کھسر پھسر کرتے دیکھ کر ناگواری سے بولی تھی۔

”مارکیٹ۔“ عائشہ کے بجائے فارینہ نے جواب دیا۔

”کب تک آؤ گی“

”دو تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے“ فارینہ نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، گھر میں بور ہوتی رہیں گی“ وہ علی کے والٹ سے پیسے نکالتے ہوئے دھیرے سے بولی تھی۔

”نہ تم ہی جاؤ۔ میں گھر میں ہی ٹھیک ہوں“

زرمینہ ایک مرتبہ پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ان کے جانے کے بعد وہ پہلے تو چینل سرچنگ کرتی رہی۔ پھر ریموٹ پھینک کر پورے گھر کا جائزہ لیتی رہی۔ اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ عائشہ کہیں گئی تھی۔ اور وہ بھی پہلی مرتبہ بے حد آزاد محسوس کر رہی تھیں۔

کچن، اسٹڈی روم، ڈائننگ روم اور گیسٹ روم اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ اب علی کے بیڈ روم میں آ گئیں۔ عادت سے مجبور ہو کر ادھر ادھر جھانکتے ہوئے انہوں نے مختلف دراز کھنگالنا شروع کر دیئے۔ آخری دراز لاکڈ تھا۔

انہوں نے چابی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں گھمائیں پھر مایوس ہو کر اٹھ گئیں۔

اپنے ہی دھیان میں مگن وہ باہر نکلنے لگی تھیں جب کارنر پر رکھے گلدان سے ان کی چادر کا پلو الجھا دوسرے ہی پل گلدان زمین بوس ہو گیا۔ انہوں نے کچھ جھنجلا کر ٹوٹے کانچ کے ٹکڑوں کو دیکھا اور پھر جھک کر اٹھانے لگیں۔ دوسرے ہی پل وہ کھل سی اٹھی تھی۔ ان کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔ ننھی سے چابی کو مٹھی میں دبائے وہ دراز تک آئیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد دراز کھل گیا تھا۔ مگر دراز میں چند ایک کاغذات کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ انہوں نے ایک دو کاغذ اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر پٹخنے کے انداز میں پھینک دیئے۔ وہ سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے اٹھنے ہی لگی تھیں جب نیلے رنگ کے منہ بند لفافے کو دیکھ کر چونک سی گئیں۔ کچھ سوچ کر انہوں نے لفافہ احتیاط سے کھولا تھا اور پھر ان کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹ سی

گئیں۔ زرینہ کے ہاتھ میں تصویر تھی۔ تصویر میں عائشہ نے آٹھ ماہ کا بچہ اٹھار کھا تھا۔

”یہ بچہ کون ہے؟؟“ زرینہ نے بے حد حیرانی سے زیر لب کہا۔

☆☆☆

وہ فارینہ کیساتھ جا کر ڈاکٹر مارگریٹ سے اپنا چیک اپ کروا آئی تھی۔ رپورٹس ایک ہفتے بعد ملنا تھی۔ اس نے علی کو چیک اپ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اب وہ شدت سے رپورٹس کا انتظار کر رہی تھی۔

زین کا آپریشن تین دن بعد ہونا تھا۔ علی تمام مصروفیات کو پس پشت ڈال کر ان دنوں پورا وقت زین کے ساتھ گزار رہا تھا۔ تقریباً روز ہی وہ دونوں سیر کرنے کیلئے نکل پڑتے۔

رات گئے علی اور زین واپس آئے تو پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ زین چونکہ بہت تھکا ہوا تھا اسلئے فوراً ہی جا کر سو گیا۔ البتہ علی آفس سے لائی فائلز چیک کرنے لگا۔ اسٹڈی روم کی لائٹ آن دیکھ کر زرینہ نے دروازہ کھول کر

تھوڑا سا جھانکا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اندر آگئیں۔ علی نے چونک کر ناگواری سے زرینہ کی طرف دیکھا تھا تاہم کچھ بولا نہیں تھا۔

”علی بیٹے میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“

اس کی مصروفیت میں مغل ہو کر وہ بڑے بھولپن سے پوچھ رہی تھیں۔

”ڈسٹرب تو آپ کر چکی ہیں خیر بولے کیا کام ہے؟“ علی نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں وہ مجھے تم سے کہنا ہے“ زرینہ!

”فرمائیے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا علی کو اس عورت سے شدید ترین نفرت تھی۔ وہ زین ماں تھی اسی لیے وہ اس عورت کے وجود کو برداشت کر رہا تھا ورنہ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوئوں کو ڈال دے۔



”علی بیٹا! میں تم سے اپنے گزشتہ روئے کی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ شیطان

مردود نے بہکا دیا تھا مجھے اسی لئے اپنی نادانی اور بے وقوفی میں تمہارے

ساتھ زیادتیاں کرتی رہی ہوں“ زرینہ نے آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں

ڈھیروں افسردگی سمو کر دل گیر انداز میں کہا تھا۔

”آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں اگر میں آپ کو معاف نہ کرتا تو آپ

اس وقت میرے گھر میں موجود نہ ہوتیں“

”تو کیا تم مجھے معاف کر چکے ہو؟“ زرینہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”جی“ وہ لب بھیج کر فائل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ زرینہ نے مزید کچھ

کہنے سے خود کو روکا۔ علی کا رکھا پھیکا انداز دیکھ کر وہ بے دلی سے اٹھ گئیں

۔

”تمہارا غرور اور خود پسندی دیکھنا کیسے خاک میں ملتی ہے“ اپنے بیڈ روم میں

آکر انہوں نے تنفر سے سوچا۔

زخمی ناگن کی طرح کمرے میں چکراتے ہوئے وہ حسد کی آگ میں جل کر

خاک ہو رہی تھیں۔

انہوں نے تو علی کو تباہ کرنے کا پکا پلان بنایا تھا۔ رات کے دوسرے پہر اسے

اس حال میں گھر سے نکالا جب اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی نہ

ہاتھ میں کوئی ہنر تھا اور نہ ڈگری۔

حادث سے کہہ کر ناصر ف اسے عاق کروادیا تھا بلکہ علی کی ممی کے تمام

خاندانی زیورات پر بھی قبضہ کر لیا۔

نفیسہ بیگم کی پورے چار سال خدمت کے دوران انہوں نے حادث کو دام

میں جکڑ لیا۔ تھا۔

ان کا منصوبہ بڑا کامیاب رہا تھا مگر تقدیر نے انہیں منہ کے بل گرا دیا۔ فیکٹر

ی میں آگ لگ گئی ساتھ میں کمپنی بھی دیوالیہ ہو گئی۔ گھر اور زیورات بک

گئے۔

حادث کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ ایک دفعہ پھر اندرون شہر کے خستہ حال مکانوں والے محلے میں آگئی۔ اچھا پہننے اور اچھا کھانے کا چسکا ایسا پڑا کہ دال روٹی اور اچار چٹنی زہر سے بھی بدتر لگنے لگی۔ آسائشات کا عادی وجود مئی، جون کی گرم ترین دوپہروں میں جھلس جاتا۔ بریزے سے شاپنگ کرتے کرتے ایک مرتبہ پھر سیل سے ”ٹوٹے“ لینے کی نوبت آگئی۔

صبح صبح فریش اور نچ جوس کی جگہ باسی کھٹی لسی یا پھر سادہ پانی پینے کو ملتا تو طبیعتیں بوجھل اور جی متلانے لگتا پھر تینوں ماں بیٹیوں میں زبردست قسم کی تکرار ہوتی۔ فاسٹ فوڈ اور اٹالین کھانوں کا ذائقہ بھولتا نہیں تھا۔ پیزا برگر اور سی فوڈز کا عادی معدہ آلو بینگن اور کریلوں کی خوشبو سونگھ سونگھ کر کبھی کبھی احتجاج بھی کرنے لگتا۔ کہاں تو سرسبز و شاداب بھیگی بھیگی نرم گھاس پر صبح ایکسر سائز کی جاتی اور کہاں اس اکھڑے پلستر والے چھوٹے سے صحن کو کوسا جاتا۔ اور بھر سبزی لو، چاٹ لو، کی بھدی آوازیں سن سن کر دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا تھا۔

اتنی طویل آزمائش کے بعد ایک مرتبہ پھر زمینہ کے دن پھر گئے تھے۔ وہ خود کو قسمت کا دھنی سمجھتی تھیں۔

نیویارک کی صاف شفاف کشادہ سڑکوں، اونچی عمارتوں اور ہر طرف پھیلے حسن و رعنائی کے شاہکاروں کو دیکھتے ہوئے انکا وجود گویا ہوائوں میں اڑتا تھا۔ ان کی خواہشات لا محدود تھیں۔ نگری نگری گھومنے کا شوق ابھی تک زندہ تھا۔ حادث ان کی بس یہی خواہش پوری نہیں کر سکے تھی۔

اب جبکہ وہ آزاد تھیں خوب ہی گھومنا پھرنا چاہتی تھیں۔ مگر ان کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ علی اور زین دونوں اکیلے ہی نکل جاتے تھے کبھی انہیں ساتھ چلنے کیلئے نہیں کہا۔ دن بھر نجانے کہاں کہاں کی سیر کرتے۔ کبھی کبھی ”میم“ بھی انکے ہمراہ چلی جاتی اور وہ پیچھے سے تنہا جلتی بھنتی انہیں کوستی رہتی۔ اس دن بھی وہ کہیں جارہے تھے کہ عائشہ نے انہیں ساتھ چلنے کو کہا مگر زمینہ نے انکار کر دیا۔

زرمینہ کو زین پر شدید تائو آرہا تھا مگر اس وقت وہ بے بس تھیں۔ علی اور زین میں پھوٹ ڈلوا کر وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہیں مارنا چاہتی تھیں۔ سو لب سی بیٹھی تھیں۔

عائشہ گھر سے کھانے پینے کا تمام سامان ساتھ لائی تھی۔ جس پکنک اسپاٹ اور نیویارک کی مخصوص تفریح گاہوں میں انہیں جانا تھا وہاں سے حلال چیزیں ملنا بہت مشکل تھا۔

ابھی انہیں آئے تقریباً آدھا گھنٹا ہوا تھا جب زین کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی۔ وہ فوراً ہی اسے ہسپتال لے آئے تھے۔ ڈاکٹر ایرتھ نے زین کو ایڈمٹ کر لیا تھا۔ اٹھائیس گھنٹوں بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ علی چاہ رہا تھا کہ عائشہ اب گھر چلی جائے احمر کے آنے کے بعد وہ عائشہ کو ساتھ لئے لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور پر آیا۔ اپنے ہی دھیان میں باتوں میں مگن وہ چلڈرن وارڈ کے قریب سے گزرے جب اک معصوم سے چہکار سنائی دی۔ جہاں علی ایک دم ٹھٹک گیا وہیں عائشہ نے بھی دیوانہ وار مڑ کر دیکھا۔ اسے

گویا زمان و مکان بھول گئے تھے۔ بس ہر طرف ایک ہی آواز کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

”مے می ! رک جائو —“

”مے می کہاں جا رہی ہو“ وہ بھاگتا ہوا اس کی کھلی بانہوں میں سما گیا تھا۔ ایزن کا سر بگال، آنکھیں ماتھا چومتے ہوئے وہ مسلسل رو رہی تھی۔

”میری جان، میرا پرنس میرا ایزن — میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں تلاش کیا۔ تم کہاں کھو گئے تھے ایزن، میرے بچے، میرے چاند“۔ اب وہ ایزن کے ہاتھ چوم رہی تھی۔ علی نے بہت بے یقینی کے عالم میں پہلے عائشہ اور پھر اس انگریز بچے کی طرف دیکھا۔ اس کے سر پر گویا دھماکہ ہوا تھا۔ دل میں کانچ سا ٹوٹا تھا۔ وہ حیرت، دکھ، صدمے اپنے اعتماد کے ریزہ ریزہ ہو جانے اور اس عظیم دھوکے پر پھٹی پھٹی نگاہوں سے عائشہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

علی کو یوں محسوس ہوا کہ ان تین منٹوں اور بارہ سیکنڈوں میں اس کا پورا وجود مردہ ہو گیا ہے۔ دل کا شہر چند لمحوں میں ہی اجڑ گیا تھا۔ ہر طرف دھول اڑ رہی تھی۔ نیویارک کی سب سے بلند عمارت گویا اس کے اوپر آن گری تھی۔ اس کی محبت، چاہت، جنون، عشق، دیوانگی اس بلے کے نیچے سک رہی تھی، بین کر رہی تھی۔ علی نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ڈاکٹرز روم کی طرف مڑتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھند چھا رہی تھی۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتا بمشکل پارکنگ تک پہنچا۔ اس وقت وہ کسی شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

زرینہ اسے تنہا آتا دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں چھائی وحشت دیکھ کر اس نے علی سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیا ضرورت تھی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی۔ وہ حیرت پریشان سی اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد انہیں عجیب سا شور سنائی دیا تھا۔ وہ لشم لشم لائونج کی طرف دوڑیں عائشہ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے دائیں

ہاتھ کو پانچ سالہ بچے نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ علی نجانے انگریزی میں کیا کیا کہہ رہا تھا انکے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ حق دق سی سامنے والے منظر کو دیکھتی رہیں۔

”گھٹیا، ذلیل، کمین عورت میرے ساتھ دھوکا کرتی رہی ہو“ اب وہ عائشہ کو لاتوں اور ہاتھوں سے پیٹ رہا تھا۔

”نجانے کون ہو تم۔ کہاں سے آئی ہو“ وہ چیخا۔

”مجھ جیسا احمق شاید اس دنیا میں کوئی نہیں ہو گا۔ جو اندھا دھند تم پر اعتماد کرتا رہا۔ تمہاری ہر جھوٹی بات پر یقین کر لیا۔“ علی نے اسے بالوں سے جکڑ کر کھڑا کیا۔

”کون ہے یہ حرامی؟؟“ اس کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے وہ اپنے آپے میں نہیں لگ رہا تھا۔

”میں بھول گیا تھا کہ تم بھی اسی معاشرے کی عورت ہو“ علی کی زبان شعلے اگل رہی تھی پھر اس نے عائشہ کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر



نکال دیا۔ زرینہ کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ انہیں اب کچھ کچھ اسٹوری سمجھ میں آرہی تھی عائشہ اپنی زبان میں نجانے کیا کیا صفائیاں پیش کر رہی تھی۔ پر اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے علی کے پیروں میں اپنا سر رکھ دیا تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر علی دیوانگی کے عالم میں اسے پیٹ رہا تھا۔ اور جب اسکے ہاتھ تھک گئے تو وہ بلند آواز میں چیختا چلاتا دروازہ زور دار دھماکے سے بند کر کے اندر چلا گیا۔ عائشہ نجانے کتنی دیر دروازہ پیٹتی رہی تھی۔ پھر تین چار گھنٹوں بعد عائشہ کی اور اس بچے کی آواز آنا بند ہو گئی۔

عائشہ کے ہاتھ دروازہ بجا بجا کر تھک گئے تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا، ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ان نے آخری مرتبہ بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ جان چکی تھی کہ یہ دروازہ اب اس کیلئے کبھی نہیں کھلے گا۔ وہ زخمی وجود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے کھلے آسمان تلے آگئی۔ ایزن نیند سے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑے گھسیٹتا جا رہا تھا۔

نجانے وہ سر جھکائے کتنی دیر چلتی رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کا گھر اور اسکا ہمسفر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ خالی دل اور خالی ذہن کیساتھ چل رہی تھی۔

اس نے یوں ہی چلتے چلتے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے قدم احمر کے گھر کے سامنے زنجیر پا ہو گئے تھی۔ وہ نڈھال سی ٹھنڈے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ اسے لوئس ول کی تاریک شاہیں یاد آنے لگی تھیں۔ اس نے سر دیوار سے پٹخا اور بے آواز رونے لگی۔

”میں نے تمہیں کھو دیا ہے علی، شاید ہمیشہ کیلئے“ گلابی سرد ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے افیت سے سوچا۔

”ان ٹھوکروں سے بچنے کیلئے میں نے اتنا طویل سفر طے کیا تھا مگر سوائے خسارے کے میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔“

اس بر اعظم میں بنے تمام اولڈ ہائوسز کی عمارتوں سے اسے شدید ترین نفرت تھی مگر اس پل اس لمحے اس سرد ترین رات کے تیسرے پہر اسے یہی

محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی باقی زندگی کسی اولڈ ہائوس میں سسکتے ہی گزارے گی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے جھریوں زدہ چہرے آنے لگے۔

”نہیں کبھی نہیں۔“ اس نے ہونٹ کچلتے ہوئے ایزن کی طرف دیکھا۔

وہ اس کی گود میں سر رکھے اونگھنے لگا تھا۔ اس کا بیمار کمزور سا وجود، گالوں میں کھنڈی زردیاں اور سوکھے پیڑی زدہ ہونٹ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

عائشہ نے اپنے جسم پر موجود چادر کو اس کے ارد گرد لپیٹ کر گویا سرد ہوائوں سے محفوظ کیا تھا۔

”وہ پوچھتا ہے میں کون ہوں۔“ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر حیرانی سے بولا تھا۔

”میں بھلا کون ہوں“ عائشہ نے آتی جاتی سرد کٹیلی ہوائوں اور پھر اس بھیانک رات سے بہت سہم کر پوچھا تھا۔ جواب نہ پا کر وہ آہستہ آہستہ اپنا سردیوار سے پٹختے لگی۔ اس کی ناک سے بہتا خون تھوڑی اور گردن تک کو بھگو چکا تھا۔ مگر وہ ہر احساس سے بے نیاز دھیرے دھیرے بڑبڑا رہی تھی۔

”میں کون ہوں۔“ میں کون ہوں“ اس نے بند آنکھوں کو ایک دم ہی کھولا اور گھر کر تاریکی کے پار کچھ دھندلے عکس کھوجنے لگی۔ کچھ چہرے کچھ منظر کچھ باتیں کچھ یادیں اس کی آنکھوں کے سامنے گویا ایک فلم سی چلنے لگی تھیں۔

پورا آسمان اچانک ہی سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ بادل زور دار آواز میں گرجے اور پھر موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ لوئیس ول کی سڑکوں پر جل تھل ہو گئی تھی۔

مسلسل گرنے والے شفاف پانی نے اسے سرتاپا بھگو دیا تھا مگر وہ کڑکتی بجلی گرجتے بادلوں اور برستی بارش سے بے نیاز ناک کی سیدھ میں واک کے انداز میں چلتی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی آنسوؤں کی مٹی مٹی لکیروں کو بارش نے دھو دیا تھا۔ لیکن اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا۔ کہ وہ مسلسل رو رہی ہے۔

بارش کے ساتھ ٹھنڈی کٹیلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس لئے ٹھنڈ کی شدت میں ہو گیا تھا۔

”آج تیخ سردی ہے“

اس نے اپنی گیلی اونی ٹوپ کو اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور جینز کے پائچے اوپر ٹانگے لگی۔ اسکول بیگ پانی سے نچڑ رہا تھا۔ اور وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اندر موجود کتابوں کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔ مگر وہ ہر چیز سے لاپرواہ چلتی رہی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے تو بار بار جینی کا چہرہ آرہا تھا۔ سیاہ چہرہ اور چمکتی جگمگ کرتی روشن آنکھیں، موٹے موٹے ہونٹوں پر دلنشین مسکراہٹ اس نے افیت سے لب کچلتے ہوئے جینی کے مکان کی طرف دیکھا ہر طرف ویرانی تھی خاموشی اور سناٹا ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ بہت سی اداسی نے اس کے دل میں پیچے گاڑ لئے تھے۔

چند سفید فام وحشی لڑکوں نے اسکول سے واپسی پر جینی کو اغوا کر لیا تھا۔ وہ روتی رہی چیختی رہی مگر کوئی بھی اس کی مدد کیلئے آگے نہیں بڑھا تھا۔ رات

تک انہوں نے جینی کو قتل کر کے گٹر میں پھینک دیا تھا۔ جینی کی ماں جاب سے واپس آئی تو اسے نہ پا کر اس نے سویٹا کو فون کیا۔ سویٹا اس دن اسکول گئی ہی نہیں تھی۔ اس کے پیٹ میں درد تھا۔ ایگو کی زبانی جینی کی گمشدگی کا سن کر وہ بے حد پریشان ہو گئی۔ تمام درد و تکلیف بھول گئی۔ ایگو کے ساتھ مل کر اس نے ”ایوو“ کا چپا چپا چھان لیا۔ مگر جینی کا کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔ دو دن تک وہ اسے تلاش کرتی رہی تھیں مگر ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ ایگو کے ساتھ روتے دھوتے اسے

اچانک خیال آیا تھا۔

”ہم پولیس کی مدد لیتے ہیں“ ایگو اس کی بات سن کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

”نیکرو لوگوں کی مدد پولیس نہیں کریگی۔ الٹا مزید پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا“ سویٹا لب بھینچ کر خاموش ہو گئی۔ ایگو کی بات میں وزن تھا لہذا انہوں نے اپنی سی کوشش جاری رکھی۔

دو دن بعد پیٹر کے گارڈ ”مے بیری“ نے جینی کے مردہ وجود کو تلاش کر لیا تھا۔ اخباروں میں جینی کی تصویریں چھپتی رہیں۔ ہنسی مسکراتی زندگی سے بھرپور، ایک تصویر میں وہ سوئمنگ کر رہی تھی۔ یہ تصویر اس کی زندگی کی یادگار تصویر تھی۔ اس نے سوئمنگ کے مقابلے میں فرسٹ پرائز جیتا تھا۔ اس دن وہ بہت خوش تھی۔ اس نے مختلف پوز میں تصویریں کھینچوائیں جو کہ اب اخبار کی زینت بن گئی تھیں۔

دوسری تصویر میں اس کا سر پھٹا ہوا اور آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ جبکہ خون کے دھبوں سے مسخ گیا تھا۔ سویٹا ان تصویروں کو دیکھ کر روتی رہی، چیختی رہی، چلاتی رہی اس کی بچپن کی سہیلی ہمیشہ کیلئے اسے تنہا کر گئی تھی۔ ایگو نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔ نیویارک کے سب سے بڑے اخبار ”امریکن ٹائمز“ کی چیف ایڈیٹر مارسلنی مارک سے رابطہ کیا اور اس وقت تک جینی کو نہ دفنایا جب تک اسی کی کٹی پھٹی لاش کا دیدار مارسلنی مارک نے نہیں کر لیا تھا۔

مارسلنی نے اس ایشو کو اتنا اٹھایا، اتنا ہائی لائٹ کیا گیا، یہاں تک کہ ایگو کو امریکن حکومت کی طرف سے فرنشڈ فلیٹ اور کی فیکٹری میں جاب مل گئی۔ اور ہو چند ہی دنوں میں لوئس ول کو چھوڑ کر کر نیویارک شفٹ ہو گئی تھی۔ سویٹا اب بھی اپنی سہیلی کے اس ڈربے نما مکان کے پاس آکھڑی ہوتی تھی اور شیشوں کے پار کا بدرنگ منظر دیکھتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں دھندلا جاتی تھیں۔

اب بھی وہ اپنی سہیلی یاد کر کے رورہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں وہ منظر آکر ٹھہر سے گئے تھے۔ جب وہ اور جینی ایک ساتھ سکول جایا کرتی تھی۔ جینی ہمیشہ اس کا وزنی بیگ اٹھا لیتی تھی جبکہ سویٹا کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ جینی اپنے ساتھ اس کا بھی بوجھ اٹھائے۔ اس کا بدلہ سویٹا یوں چکاتی تھی کہ اپنا لچ بکس جینی کے حوالے کر دیتی تھی اور پھر سارا دن بھوکی پیاسی رہتی۔



وہ گھر جانے کے بجائے چرچ آگئی۔ فینسی نے اسے دیکھ کر اپنی طرف بلایا۔  
وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی فینسی کے قریب آکر احترام سے بیٹھ گئی۔ فینسی  
نے نرمی سے اس کے گال کو چھوا۔

”پیاری لڑکی! تم پھر جینی کو یاد کر کے روتی رہی ہو؟“

وہ کچھ نہیں بولی تھی کیونکہ اس کے آنسو ایک دفعہ پھر نکل آئے تھے۔ فینسی  
اس کا ہاتھ تھپک کر تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ بہت سا  
روچنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہی۔ ساتھ ہی بھینگے  
کپڑوں کی وجہ سے اسے ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔ سرخ قالین پر پانی  
کے دھبے نظر آرہے تھے۔

”اوہو یہ میں نے کیا کر دیا“ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی، فینسی  
نے اس کا ہاتھ تھام کر دوبارہ بیٹھا دیا۔

”کوئی بات نہیں پور گرل۔“ فینسی نے نرم مسکراہٹ اچھالی اور پھر اسے  
خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کیونکہ چھوٹے بچے قطار بنائے آگئے تھے اور اب

وہ ہاتھوں میں کتابیں لئے مقدس گیت گانے لگے تھی۔ فینسی کے ساتھ اس  
کے بھی لب ہلنے لگے جب وہ چرچ سے باہر آئی تو بارش تھم چکی تھی۔ وہ  
تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی طرف آگئی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔  
کچھڑ سے لت پت جوتے اتار کر اس نے سائیڈ پر رکھے۔

کوٹ کھونٹی سے لٹکایا اور پھر پکچن میں آگئی۔ لیو سٹی کافی پھینٹ رہی تھی۔  
ماں کو اس وقت گھر میں دیکھ کر سویٹا کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ تیزی سے  
اس کی طرف بڑھی اور پھر لیو سٹی سے لپٹ گئی۔ لیو سٹی نے بھی گرم جوشی  
سے اس کا استقبال کیا۔

”تم اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟“ لیو سٹی نے سرسری سا پوچھا۔

”میں چرچ گئی تھی“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اوہو۔ اچھا میں بھی جائوں گی آج عبادت کرنے چرچ میں، پرسوں فائنل  
ہے اور مجھے دعا کرنی چاہئے تاکہ میں جیت سکوں“ لیو سٹی نے لاپرواہی سے کہا

اور پھر مگ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ وہ کئی لمحے تک اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”آپ باقاعدگی سے چرچ جایا کریں آنٹی آپ پھر ہر مقابلہ جیتیں گی۔ مجھے یقین ہے“

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو مگر میرے پاس وقت نہیں ہوتا“ لیوسٹی نے کیبنٹ کھول کر بسکٹ نکالے کافی پی کر لیوسٹی اپنی معمول کی ایکسرسائز کرنے لگی جبکہ اس نے کمپیوٹر آن کر لیا۔

”جانتی ہو میرا مقابلہ کس کے ساتھ ہے“ سویٹا نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر لیوسٹی کے لچکیلے بدن کی طرف دیکھا۔ بظاہر نرم و نازک وجود دراصل فولادی وجود تھا۔ وہ لوئیس ول کے اندرونی ایریا کی پہلی عظیم ترین ریسلر، تھی۔ جس نے صرف ایک منٹ پچیس سیکنڈ میں چرچل ریڈ کو ناک آؤٹ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیوسٹی نے چار گولڈ میڈل جیتنے کے ساتھ ہیوی ویٹ چیمپئن کا اعزاز بھی حاصل کر لیا تھا۔

”روز ویلٹ کے ساتھ اسٹیڈیم کے مالک جیراڈ ولٹ کا اکلوتا بیٹا جو کہ ناقابل شکست ہے جسے دیکھ کر ہی وحشت طاری ہو جاتی ہے اور اسکے باوجود لوئیس ول کی عورتیں اس پر مرتی ہیں“ لیوسٹی کھنکتی آواز میں بولی جبکہ سویٹا کے خیالات کا سلسلہ بھی ٹوٹا تھا۔

”روز ویلٹ کے ساتھ“ وہ بڑبڑائی۔

”آپ اس مقابلے میں حصہ مت لیں“

”وہ کیوں؟“ لیوسٹی حیران ہوئی۔

”ہیوی ویٹ چیمپینس کا اعزاز چھن جائے گا آپ سے —“ اس کی پریشانی کی وجہ جان کر لیوسٹی مسکرائی۔

”یہ فائٹ بہت ضروری ہے ڈیر۔ اگر روز ہارا گیا تو وہ اپنے قول کے مطابق مجھ سے شادی کرے گا اور ویٹ کی فیملی کا حصہ بننا میرا خواب ہے“

”مگر —“ وہ الجھی۔

”کوئی اگر مگر نہیں، بس تم روزانہ چرچ جاکر عبادت کیا کرنا اور میرے لئے گاڈ سے دعا کرنا کہ روز ویٹ ہار جائے۔ روز کی ناکامی کے ساتھ ہی جیراڈ کو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور پھر اسٹیڈیم کا مالک روز ویٹ۔“

لیوسٹی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا۔ سویٹا کو پہلی مرتبہ اس کی سوچ سے وحشت ہوئی تھی اس کے مسکراتے لب سکڑ کر رہ گئے تھے۔

”شاید اس دفعہ میں دعا نہ کر سکوں“ سویٹا نے آرزوگی سے سوچا تھا اور پھر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

لیوسٹی جانے سے پہلے اسے کافی رقم تھما گئی تھی۔ یہ اس کا معمول تھا۔ مہینے کے شروع میں وہ چند ہزار ڈالر اسے منی آرڈر کے ذریعے بھیج دیا کرتی تھی یا پھر خود ہی کبھی کبھار آجاتی تھی۔

سویٹا نے اسکول سے واپسی پر اپنے علاقے کے یوٹیلیٹی سٹور سے مختلف ضرورت کی اشیا خریدیں۔ اس قسم کی شاپنگ کا اسے بچپن سے تجربہ تھا۔

چاول، دالیں، کوکنگ آئل اور واشنگ پاؤڈر کے بھاری بھر کم تھیلے اٹھائے وہ بمشکل گھر پہنچی تھی۔ پھولی سانسوں کو ہموار کر کے اس نے پانی پیا۔ دالیں، چاول وغیرہ جار میں ڈالے واپسی پر اسے قدم قدم پر جینی یاد آئی تھی۔ اس کا بوجھ اٹھانے والی، دکھ درد اور تنہائیوں کو بانٹنے والی۔ اس کی خوشیوں پر خوش ہونے والی۔

جینی کے مرنے کے بعد وہ سچ مچ تنہا ہو گئی تھی۔ جب تک لیوسٹی تھی تو اطمینان تھا۔ اب تو سوتے میں بھی دھڑکا ہی لگا رہتا تھا۔ پتہ ہلتا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی اور پھر باقی کی رات آنکھوں میں ہی کٹ جاتی تھی۔ اس نے جاتے سے لیوسٹی کو روکا تھا مگر وہ رکتی بھی تو کیسی۔ لیوسٹی کے سامنے ایک جہان آباد تھا۔ محبت کا، شہرت کا، چاہنے والوں کا اور دولت کا، وہ کیونکر ایسی بھانجی کیلئے رکتی جس کی ماں اسے پیدا کر کے بوائے فرینڈ کے ساتھ

فرانس بھاگ گئی تھی۔ یہی بہت تھا کہ لیوسٹی اسے پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کیلئے رقم فراہم کر دیتی تھی۔ ورنہ شاید اسے بھی جینی کی طرح پیٹر کے برتن دھونے پڑتی۔ وہ دن چھٹی کا تھا۔ اسی لیے سویٹا نے بوریت سے بچنے کیلئے پورے گھر کی صفائی شروع کر دی۔

صبح اس نے ناشتہ نہیں کیا تھا اور لنچ کے نام پر بھی صرف دو عدد سینڈویچ نگلے تھے۔ اب بھوک کی وجہ سے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ کچھ پکانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی بیل گونج اٹھی۔

”ہائے سویٹی کیسی ہو؟“

دوسری طرف لیوسٹی تھی۔ سویٹا شرسا سی ہو گئی۔

”میں آپ کو مس کر رہی ہوں آنٹی“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”اور — میں بھی“ لیوسٹی کا موڈ کافی اچھا تھا۔ وہ کافی دیر اس سے بات

کرتی رہی۔ لیوسٹی نے اسے نیویارک بلوایا تھا تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے روز اور

لیوسٹی کا مقابلہ دیکھ سکی۔ سویٹا نے سرشاری کے عالم میں فون رکھ دیا تھا۔

اسے ریسنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو لیوسٹی سے ملنے کیلئے بے تاب تھی۔

دوسرے دن وہ مکمل تیاری کے ساتھ لیوسٹی کے شاندار آفس میں آگئی تھی۔ لیوسٹی نے اس کا بہت اچھا استقبال کیا۔ کافی مہنگی شاپ سے اس کیلئے ضرورت کی چیزیں خریدیں۔ اچھے پزا ہٹ سے پزا کھلایا۔

رات کو جگمگاتے، لوگوں سے کھچا کھچ بھرے اسٹیڈیم میں اس نے قدم رکھا تو حیران ہی رہ گئی۔ آوازیں، شور، ہنگامہ روز اور لیوسٹی کے بڑے بڑے پوسٹرز لہرتے منچلے، ویلٹ کی دیوانی ناچتی تھرکتی لڑکیاں۔ وہ اسکول سے گھر کے علاوہ کبھی کہیں نہیں گئی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے طویل سفر کیا تھا۔ وہ اس طلسماتی، جگمگاتی دنیا کو دیکھ کر ساکت کھڑی تھی۔ لیوسٹی نے اس کا شانہ ہلایا اور سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ کونے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔



اسی وقت مائیک سے آواز گونجی اور روز ویلٹ کے شیدائیوں نے ہنگامہ مچا دیا۔ لیوسٹی تیزی سے ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔

کچھ دیر بعد ہی کھیل شروع ہو گیا ریفری نے سیٹی بجائی۔ دونوں ایک دوسرے پر تاک تاک کر حملے کر رہے تھے۔ سویٹا کا چڑیا جتنا دل سہم گیا۔ اس نے سرعت سے آنکھیں میچ لیں۔

”تم ہار جاؤ گی آنٹی اور —“ پہلا رائونڈ اختتام پذیر ہو گیا اور سوٹا کی دعا بھی۔ دوسرا رائونڈ شروع ہوا۔ ویلٹ اپنے مضبوط ہاتھوں سے لیوسٹی کے منہ پر مکے برسا رہا تھا۔ سویٹا تو اس کے دیو ہیکل وجود کو دیکھ کر ہی تھرا گئی تھی۔ وہ سر جھکائے لیوسٹی کے جیت جانے کی دعا کر رہی تھی۔ اسی پل کسی منچلے نے اس کے بالوں کو چھیڑا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ کوئی سفید فام لڑکا تھا۔ جو کہ اسے ”رنگ“ میں دیکھنے کیلئے کہہ رہا تھا اس نے آنسو پونچھ کر دیکھا کھیل اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ پورے رنگ میں لیوسٹی دیوانوں کی طرح ناچ رہی

تھی۔ جبکہ روز قریب بے سدھ پڑا کراہ رہا تھا۔ ریفری نے ججز کے ووٹ لیکر اعلان کیا۔

”لیوسٹی جیت گئی۔ روز ویلٹ ہار گیا“ جیراڈ غصے سے بے قابو ہو کر رنگ کی طرف بڑھا پھر اس نے اپنے ہی دھیان میں تھرکتی ناچتی لیوسٹی کی کمر پر مکا برسایا۔ لیوسٹی کے چہرے پر ہلکی سی تکلیف کے آثار نمودار ہوئے اور پھر اس نے مڑ کر جیراڈ کے منہ پر مکوں کی برسات کردی۔

وحشیانہ، نعروں بلند آوازوں اور چیخوں کی وجہ سے جیراڈ کا احتجاج دبتا رہا۔ ”ایک عورت نے ویلٹ خاندان کو شکست سے دوچار کر دیا۔“ نعروں کی آوازیں بڑھتی رہیں۔

لیوسٹی ڈریسنگ کی طرف بڑھ گئی تھی جبکہ سویٹا اس کی پشت کو تکتی رہ گئی۔ رات دو بجے وہ گھر آئی تھیں۔ لیوسٹی کو تو آج جشن منانا تھا۔ سو وہ ساری رات جاگتی رہی تھی اور شراب کے جام پیتی رہی۔

اگلے دن سویٹا واپس آگئی تھی۔ وہ خوش بھی تھی اور اداس بھی، خوش اس لئے تھی کہ لیوسٹی نے اپنی منزل کو پالیا۔ اداس اس لئے کہ اس کی پیاری آنٹی عنقریب اس سے دور ہونے والی تھی۔

دنیا میں اسے صرف ایک محبت میسر آئی تھی لیوسٹی کے علاوہ اس کا کوئی نہیں تھا اس کے سارے رشتے لیوسٹی کے ساتھ ہی جڑتے تھے۔ وہ اس کی خالہ تھی۔ لیوسٹی نے ہی سویٹا کو اس کے باپ کے متعلق بتایا تھا۔ ورنہ اس نے تو ماں اور باپ دونوں کی شکلیں تک نہیں دیکھی تھیں۔

اس کا باپ قومی فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔ اسے ایک مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی تھی رابرٹ نے اس کی خاطر اسلام قبول کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مگر وہ اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکا تھا کیونکہ ایک کار ایکسیڈنٹ میں وہ انتقال کر گئی تھی۔ اس شدید صدمے کے باعث رابرٹ نیم دیوانہ ہو گیا تھا اور ایک شدید برفانی رات میں ندی کے

کنارے بیٹھا اپنی محبوبہ کو یاد کر رہا تھا کہ پائوں پھسلنے کی وجہ سے وہ ندی میں جا گرا اور پانی کی گہرائیوں میں ہمیشہ کیلئے ڈوب گیا تھا۔

اس کی ماں لیزا کے متعلق کوئی بھی اچھے الفاظ میں بات نہیں کرتا تھا۔ جبکہ رابرٹ کو ہمیشہ بہترین الفاظ میں یاد کیا جاتا تھا۔

اس کی نانی کہتی تھی کہ رابرٹ بہت اچھا اور نہایت ہی بااخلاق نوجوان تھا۔ فطری طور پر اسے باپ سے انسیت تھی۔ ماں کے لفظ سے اسے شدید نفرت تھی۔ لیوسٹی بتاتی تھی کہ لیزا اور رابرٹ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہتے تھے۔ رابرٹ لیزا کی ان حرکتوں کی وجہ سے کبھی گھر نہیں آتا تھا۔ اور پھر جب سویٹا پیدا ہوئی تو لیزا اسے نانی کے پاس چھوڑ کر خود فرانس بھاگ گئی وہ ماں کے متعلق جب بھی اس قسم کی باتیں سنتی تھی اس کا دل دکھ اور صدمے کے احساس سے بھر جاتا۔

”ماں بہت گھٹیا ہوتی ہے“ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتی۔

”نہیں سوٹا ماں بہت اچھی ہوتی ہے ماں چھانوں ہے، ٹھنڈک ہے، روشنی ہے“ جینی کسی اور ہی جہان میں کھو جاتی تھی۔ اس لمحے سوٹا کو خود پر ترس آنے لگتا تھا۔

”ہاں تمہاری بہت اچھتی ہے“ اس کی آرزوگی بڑھ جاتی تھی اور جینی کی آنکھوں کی چمک بھی۔

”ایگو بہترین عورت اور محبت کرنے والی ماں ہے۔ اس نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ وہ بلند عورت ہے۔“ عقیدت کے جذبات سے سوٹا کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

اسے ایگو بہت پسند تھی۔ بے حد کالی، موٹی اور بھدی سی ایگو کا دل بہت قیمتی تھا۔ اس کی اچھائی کی اس سے بڑی کیا مثال ہو سکتی تھی کہ وہ خود اپنے مکان میں تنہا رہتی اور جینی کو ہمیشہ اس کے پاس سونے کے لئے بھیج دیتی تاکہ سوٹا اکیلے گھبرا نہ جائے۔ نانی کے مرنے کے بعد ایگو اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھی۔ اس کا سودا سلف بھی لادیتی۔ بل وغیرہ بھی جمع کروا دیتی ان

کے اسی قسم کے احسانوں کی وجہ سے اس نے لیوسٹی سے کہہ کر جینی کا داخلہ اپنے اسکول میں کروا دیا تھا۔ اس طرح ان دونوں کو ایک دوسرے کا طویل ساتھ میسر آ جاتا تھا۔ جینی کے بعد ایگو کے چلے جانے نے اس کی رنجیدگی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ اس دہشت ناک تنہائی کی وجہ سے اس نے لیوسٹی سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے اپنے پاس بلا لے۔ مگر لیوسٹی نہ جانے کیوں ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ سوٹا سمجھ نہیں پا رہی تھی اس کے مزاج کو اتوار کے دن فینسی نے بطور خاص اسے بلایا تھا یہ دن پرانے کلیسا اور کیمینٹ کے گرجا کے سرپرست استقف کے تہوار کا دن تھا۔ گرجا کے باہر کھلے میدان میں بچوں اور بوڑھوں نے دائرہ سا بنا رکھا تھا۔ عورتیں نغمے گنگنا رہی تھیں۔ شام تک لوگ تھک ہار کے اپنے گھروں میں چل دیئے تھے۔ فینسی نے اسے روک لیا تھا۔

”سوئیٹا مجھے تم سے بات کرنی ہے، ذرا رکو تم۔“ فینسی کیتھی کی تبلیغی جماعت کو الوداع کر کے اس کے قریب چلی آئی تھی۔ فینسی کے احترام میں سوئیٹا رک گئی۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں مجھ سے؟“ وہ آہستگی سے بولی تھی۔ فینسی نے اس پر پڑھ کر پھونکا تھا۔

”تم اب اکیلی ہوتی ہو اور میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں ہمارے پاس آ جاؤ بچوں کو صبح سیر بھی کروانا اور ان کی دیکھ بھال بھی کرنا۔“ ٹھیک ہے نا۔“ فینسی نے اس کے چہرے پر پھیلی الجھن کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سوئیٹا چونک گئی تھی اس نے کبھی باقاعدہ نن بننے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اگرچہ اسے مذہب سے بہت لگاؤ تھا مگر۔

”میں چند دن تک سوچ لوں“ اس نے فینسی کو ٹالا تھا۔ گھر آ کر بھی وہ اس کے اس کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ اور الجھتی رہی تھی۔

اگلے دن وہ پیٹر کے پاس آگئی تھی۔ پیٹر اپنی لائبریری میں موجود کتابوں پر جی گرد جھاڑ رہا تھا اسے آتا دیکھ کر کھل اٹھا۔

”کتاب چاہئے؟“ پیٹر اس کے جنونی شوق کے متعلق جانتا تھا۔ وہ اسی وقت ہی اس کے گھر آئی تھی جب اسے کوئی کتاب چاہئے ہوتی تھی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مختصر بولتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے سوئیٹا تم کچھ پریشان لگ رہی ہو“

”ہاں۔۔۔ نن، نہیں۔ انکل کوئی نئی کتاب خریدی ہے۔“ وہ بے خیالی کے انداز میں ہکلاتے ہوئے بولی۔

”چار کتابیں لایا ہوں۔ ایک کارلائل کی ’ہیروز اینڈ ہیروز شپ‘ ہے۔ دو جین آسٹن کی ایک آسکر وائلڈ کی پرنس، جبکہ یہ والی کتاب بالزاک کی ”بوڑھا گوریو“ ہے۔ میں تمہیں یہ کتاب پڑھنے کیلئے ضرور دیتا مگر یہ فرانسیسی مصنف کی لکھی ہے اور تم اہل فرانس سے خواہ مخواہ ہی چڑتی ہو۔“



پیٹر جوش کے عالم میں تفصیلاً بتانے لگا تھا۔ پیٹر کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا مگر اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی تھی کہ وہ کوئی اچھی کتاب خرید سکے۔ وہ پیٹر سے کتابیں لے کر اپنا شوق پورا کرتی تھی۔ پیٹر کے پاس انگریز مصنفین کے علاوہ جرمن، فرانسیسی اور یونانی مصنفین کی بہترین کتب کو ذخیرہ تھا۔ پیٹر کو تقریباً تیرہ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ سویٹا نے بھی اس سے چند ایک زبانیں سیکھی تھیں جس میں اردو سرفہرست تھی۔

”کچھ پیوگی؟“

”ہاں، میکسیکو کافی“ وہ بے تکلفی سے بولی۔

پیٹر سر ہلاتے ہوئے اٹھ گیا تھا اور پھر اپنے لیے چائے اور اس کے لئے چھوٹا مگ کافی کا لے آیا۔

”آپ ڈینی سے ملکر آئے ہیں“

”ہاں— پیٹر نے برا سا منہ بنایا۔“

”اب کیسی طبیعت ہے ڈینی کی؟“

”زندہ ہے— اتنی جلدی نہیں مرے گا“ پیٹر نے غصے سے کہا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے ڈینی سے بے حد اکتایا ہوا تھا۔

”تم بتائو چرچ جاتی ہو؟“

”ہاں—“ اس نے خالی مگ ٹیبل پر رکھا۔

”شباباش—“ وہ ایک دم خوش ہو گیا تھا۔

”انگل میں نے سکول چھوڑ دیا ہے“ سویٹا نے کچھ پل خاموش رہنے کے بعد آہستگی سے کہا۔

”کیوں؟“ پیٹر ایک مرتبہ پھر کتابیں ترتیب سے رکھنے لگا تھا۔

”دل نہیں کرتا سکول جانے کو— جب بھی سکول جاتی ہوں۔ پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں تو جینی کا چہرہ سامنے آجاتا ہے“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”بھول جائو سب کو کسی کو یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔“ پیٹر کی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

”بھلانا آسان نہیں ہوتا۔“ سویتا بے بسی سے بولی۔

”ہاں — تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ پیٹر نے بے خیالی میں سر ہلا دیا تھا اور پھر جارج برنارڈ شاہ کی ”مین اینڈ سپر مین“ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ لے جاؤ۔ یادوں سے چھٹکارا پانے کیلئے کتابوں سے بہترین چیز کوئی نہیں۔“

”آپ کا شکریہ، اگر میرے پاس کتاب کا سہارا نہ ہوتا تو میں تنہائیوں سے لڑتے لڑتے شاید مرجاتی۔“

سویتا نے کتاب تھام لی تھی اور پھر اس کے عنوان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ متجسس لہجے میں بولی۔

”انگل! یہ سپر مین کون ہونا ہے؟“

”سپر مین“ پیٹر چند لمحے حیرانی سے سوچتا رہا اور پھر آہستگی سے بولا تھا۔

”سپر مین وہ ہوتا ہے جو ہر لحاظ سے بہترین اور مکمل ہو۔ جس میں کوئی خامی

نہ ہو۔ جو ہر گناہ سے پاک اور معصوم ہو۔ جس نے اپنی ذات سے کسی کو کبھی تکلیف نہ دی ہو، جس کی ذات دوسروں کیلئے باعثِ رحمت ہو۔“

”اور ایسا شخص کون ہے؟“ سویتا نے بے چینی سے پوچھا۔

”عیسیٰ علیہ السلام۔“ پیٹر مضبوط لہجے میں بولا تھا۔ وہ بہت دیر پیٹر کے پاس بیٹھی رہی۔ پھر جب پیٹر اونگھنے لگا تو وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل دی تھی۔

☆☆☆

اسے دو دن سے بخار تھا اس لئے وہ چرچ نہیں جاسکی تھی۔ تیسرے دن ویسا، نینسی کا پیغام لے کر آگئی تھی۔ ویسا کی پوری فیملی نے دو سال پہلے ہی عیسائیت کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے چرچ آنا شروع کیا تھا۔ وہ لوگ بدھ مت کے پیروکار تھے۔

اگلے دن وہ چرچ آئی تو نینسی کو خفا خفا پایا۔

”فادر ٹائی سن آئے تھے۔ میں تمہیں ان سے ملوانا چاہتی تھی۔“

”تو کیا وہ چلے گئے ہیں؟“ سویٹا بے قراری سے بولی۔

”نہیں۔“

”میں ان سے مل سکتی ہوں؟“ اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ نینسی نے اس کا اشتیاق محسوس کر کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کمرے میں چلی جاؤ۔“ سویٹا ماتھے پر آیا پسینہ صاف کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔ فادر ٹائی سن اپنا مخصوص لباس پہنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اپنی نشست پر بیٹھے تھے۔

فادر ٹائی سن پندرہ روزہ دورے پر آئے تھے۔ ابھی انہوں نے لوئیس ول کے تمام قصبوں اور ارد گرد کے دیہاتوں میں بھی تبلیغی جماعتوں کیساتھ جانا تھا۔ کل انہیں واپس جانا تھا اسی لئے سویٹا آج چرچ آگئی تھی۔ فادر ٹائی سن

اپنی مخصوص نشست پر بیٹھے نظر آئے۔ سویٹا قدرے الگ تھلگ کونے میں بیٹھ گئی۔ فادر نے اپنا وعظ مکمل کرنے کے بعد لوگوں کے مختلف سوالات کے جوابات دیئے۔ آہستہ آہستہ لوگ جانے لگے تھے۔ ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ سویٹا ان کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ اپنی الجھنیں واضح کرنے لگی۔

”فادر کیا ہمارا مذہب مکمل اور جامع ہے؟۔ اگر ہے تو ہماری مقدس کتاب میں اتنی الجھنیں کیوں ہیں؟۔ بائبل کا مطالعہ میری تشنگی کو بڑھا دیتا ہے۔ بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں نے ایک جگہ پڑھا ہے کہ نصرانی مذہب سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے جو کہ عبرانی زبان جانتے تھے اور عبرانی میں ہی انجیل لکھا کرتے تھے۔ انہیں نے بائبل کا اصل ترجمہ کیا اور بتایا کہ عنقریب سر زمین عرب جو کہ کھجوروں کی سرزمین مشہور ہے وہاں پر ایک نبی آنے والے ہیں ان پر الہامی کتاب اترے گی۔ ان کا مذہب سچا اور خالص ہو گا۔ اس مذہب کا نام کیا ہے؟۔ اس پیغمبر کا نام کیا ہے؟“

فادر نے بے حد حیرانی کے عالم میں اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس کے آنکھوں میں کچھ پانے کی، کچھ تلاش کرنے کی چمک تھی۔ ایسے لوگوں کو تھوڑی سی برین واشنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر انہیں اپنے من پسند راستے پر چلایا جاسکتا ہے۔

”دیکھو سویٹا“ فادر نے کچھ پل سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔

”مذاہب تو بہت سے ہیں مگر ہمیں صاف شفاف اور حق کے راستے پر چلنا ہے۔ یوں تو یہودی ”تورات“ کو مانتے ہیں، ہندو مت کی مقدس کتاب ”وید“ ہے جبکہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں ہمارے پیغمبر نے بہت سے مشکلات، تکلیفیں جھیلنے کے بعد بھی گاڈ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ ہماری مقدس کتاب میں اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں مگر اس کے باوجود ہماری کتاب اصلی حالت میں موجود ہے۔ تمام گرجا گھروں میں بائبل کا مطالعہ دن رات کیا جاتا ہے۔ مگر ہم اس —“

”فادر جس پر آخری الہامی کتاب اتری، ان پیغمبر کا نام کیا ہے۔ اور مسلم کس کتاب کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں؟“ اس نے فادر ٹائی سن کی بات کاٹ کر آہستگی سے پوچھا۔ فادر جو دانستہ اس کتاب کا ذکر کرنا بھول گئے تھے ہکا بکا رہ گئے۔

”بتائیں نا۔“ اس کا اضطراب لب و لہجے سے، آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

”ہاں مسلمانوں کا مذہب اسلام ہے اور ان کی مقدس کتاب ”القرآن“ ہے

ان کے پیغمبر محمد ﷺ ہیں“ فادر کو مجبوراً اس کے اصرار پر بتانا پڑا تھا۔

”گاڈ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بعد محمد ﷺ کو بھیجا۔ اس کا مقصد کیا ہو سکتا

ہے۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات نامکمل تھیں جنہیں مکمل کرنے کیلئے گاڈ

نے محمد ﷺ کو بھیجا“

”نادان لڑکی کیوں گناہ گار ہو رہی ہو۔ تم آہستہ آہستہ عیسائیت کے دائرے

سے نکلتی جا رہی ہو۔ تمہیں بہت زیادہ رہنمائی کی ضرورت ہے۔“ فادر ٹائی

سن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ نینسی نے فادر کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر



اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چرچ کی عمارت سے نکل رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جب کے دل کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

”لیوسٹی نے روز ویلٹ سے شادی کر لی ہے“ پیٹر نے اخبار رول کر کے اس کی طرف پھینکا۔ سویٹا کے چہرے کا رنگ یک لخت بدل گیا۔

”آئی نے مجھے اپنی خوشی میں شریک کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔“ اس نے آرزوگی سے سوچا۔

”یہ روز، جیراڈ ویٹ کا بیٹا ہے نا؟۔“

”ہاں۔“ سویٹا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیوسٹی نے بھی لیزا کی طرح اونچی اڑان بھری ہے۔“ پیٹر تنفر سے بولا۔

”اچھا تم پریشان مت ہو۔ آؤ ہم آسکریم کھا کر آتے ہیں“ اسے روتا دیکھ کر پیٹر نے نرمی سے کہا تھا۔

”آئس کریم وہ بھی اس موسم میں۔“ سویٹا آنسو پونچھ کر حیرانی سے بولی۔

”کیوں موسم کو کیا ہوا ہے۔ بس ہلکی ہلکی برف باری ہے اور ہم لوگ ایسے موسموں کے عادی ہیں۔ چلو اٹھو۔“ پیٹر نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”مگر انکل آپ بیمار پڑ جائیں گے باہر اتنی ٹھنڈ ہے۔“

”پہلے کون سا تندرست ہوں۔ سو بیماریاں جان کو چمٹی ہیں۔“ وہ لاپرواہی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا سویٹا بھی کوٹ اٹھا کر پیٹر کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ آسکریم کھاتی رہی تھی اور پیٹر نے اس دوران دو بڑے کپ کافی کے پی لئے تھے۔

”ایک وقت تھا جب میں ”امریکن براڈ کاسٹنگ کمپنی“ کا منیجر تھا۔ اس وقت لوگ میرے قدموں میں گرا کرتے تھے اور اب لوگوں کی ٹھوکروں پر ہوں۔ تاکاشی سے لے کر ایوونک لوگ سفارشیں لے کر جاب کے حصول کیلئے میرے پاس آیا کرتے تھے اور اب کوئی بھول کر بھی پیٹر والش کے مکان

کے قریب سے نہیں گزرتا۔ وینس کی موت کے بعد میرا ہر شے سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اور یہیں نوکری چھوڑ کر

مکان بیچ کر اپنے آبائی شہر آگیا، پیٹر پرانی یاد تازہ کرنے لگا تھا۔ سویٹا دلچسپی سے سنتی رہی۔ وینس، پیٹر کی ایک ہی بیٹی تھی پیٹر کو اپنی بیٹی وینس سے بے حد محبت تھی وہ جب بھی پیٹر کے پاس آتی تھی۔ وہ ضرور وینس کا ذکر چھیڑ لیتا تھا۔

سویٹا کو گیارہ ستمبر 2001 کی ہولناک صبح یاد آگئی تھی جب نیویارک کی بلند ترین عمارتوں میں سے ایک ”ورلڈ ٹریڈ سنٹر“ کے دونوں ٹاورز یکے بعد دیگرے زمین بوس ہو گئے تھے۔

ٹاور کی ایک سو ساتویں منزل سے پورے نیویارک کا نظارہ ہوتا تھا۔ ہر ٹاور میں اکیس ہزار کھڑکیاں تھیں۔ ورلڈ ٹریڈ ٹاورز دنیا بھر میں تجارتی، کاروباری سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ پرل ہاربر کے بعد یہ دوسری بدترین دہشت گردی نے امریکی شہریوں اور قصبوں میں رہائش پذیر افراد تک کے

دلوں کو دہلا دیا تھا۔ اس بلند ترین عمارت کے ملبے کے نیچے پیٹروینس بھی دب کر ہلاک ہو گئی تھی۔ اس کی بے حد قابل، لائق اور حسین بیٹی۔ اس شدید صدمے نے پیٹر کو نڈھال کر دیا۔ پھر ایک اور پیٹر نے جنم لیا بے حد جھگڑالو، غصیلا اور بد مزاج۔

”میں پوری دنیا گھوما ہوں، طرح طرح کے لوگوں سے ملا ہوں۔ خوب دولت بھی اکٹھی کی ہے۔ ڈالرز سے لے کر لیک، شلنگ، روبل، فرانک، پائولہ، پیسو، ڈینش کرونے، لیرا، کرون اور دینار غرض ہر ملک کی کرنسی جمع کی ہے۔ جائیدادیں بھی بنائی ہیں۔ دوشادیاں بھی کیں۔ بچے بھی تھے مگر پھر بھی ”سکون“ نہیں ملا“ پیٹر بہت اداس لہجے میں کہ رہا تھا۔

”تیس سال پہلے میں خود کو کامیاب ترین انسان سمجھتا تھا مگر اس وقت میں خود کو سب سے ناکام، ناکارہ اور فضول آدمی سمجھ رہا ہوں“ پیٹر کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ شاید ہر بوڑھا آدمی اس سٹیج پر اسی طرح سوچتا ہے۔

”کل کو میرے بھی پیٹر جیسے ہی حالات ہونگے۔“ سویٹا نے آرزوگی سے سوچا۔

”ایشیا میں بوڑھے تنہا نہیں ہوتے۔“ اب پیٹر ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سویٹا نے حیرانی سے اس کے جھریوں زدہ چہرے کی طرف دیکھا۔

”سارے بوڑھے خبلی ہو جاتے ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے مسکرانے لگی تھی۔

”تقریباً سترہ سال پہلے میں پاکستان گیا تھا۔ ہم چار لوگ تھے۔ ان میں سے

ایک بیمار ہو گیا اور وہ ہوٹل میں ٹھہرا رہا جبکہ ہم تین لوگ سوات، کاغان

کی طرف نکل گئے۔ ہم سفر میں ہی تھے کہ شدید طوفانی بارش برسنے لگی

تھی۔ ایک مقامی نوجوان نے ہمیں رات اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ تم سن کر

حیران ہو گی کہ اس گھر میں چار بوڑھے لوگ تھے۔ اور ان چاروں کی

حیثیت کسی وزیر اعظم سے کم نہ تھی۔ وہ یوں گرج گرج کر اپنے بچوں پر

غصے کا اظہار کر رہے تھے کہ ہم تینوں ہی حیران رہ گئے۔“ پیٹر کی آنکھوں

میں دور کہیں حسرتیں کروٹ لے رہی تھیں۔

”پاکستان میں اولڈ ہاؤس نہیں ہیں؟“ سویٹا نے اشتیاق سے پوچھا۔

”نہیں اور وہاں کے لوگ اپنے بوڑھے والدین کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان

کی عزت کرتے ہیں اور انہیں کام بھی نہیں کرنا پڑتا۔“ پیٹر نے رنجیدگی سے

کہا تھا۔ وہ دونوں اکٹھے ہی واک کرتے ہوئے چرچ آئے تھے۔ پیٹر اپنے

دوست تھامسن کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ سویٹا نینسی کے قریب آکر بیٹھ گئی

۔

”تم نے فادر ٹائی کو ناراض کر دیا ہے“ نینسی نے خفگی سے کہا۔

”میں نے —؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں تم نے، فادر کہہ رہے تھے کہ سویٹا کو بہت زیادہ رہنمائی کی ضرورت

ہے۔ ورنہ یہ بھی اس معاشرے کے باقی لوگوں کی طرح بھٹک جائے گی۔“

”ہاں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے ایک اچھے رہنما کی ضرورت ہے۔“ وہ

زیر لب بڑبڑائی۔ نینسی اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اٹھیں اور تین

چار کتابیں لے آئیں۔

”یہ فادر تمہارے لئے دے کر گئے ہیں اور تمہارے لئے یہ بہت بڑے اعزاز کی بات ہے کہ فادر ٹائی سن نے تم پر خصوصی توجہ دی ہے۔ وہ اپنا دورہ مکمل کر کے ایک مرتبہ پھر آئیں گے۔“

”شکریہ۔“ سویٹا نے بے دلی سے تمام کتابیں پکڑ کر گود میں رکھ لی تھیں۔

”ایک بات پوچھوں؟“ نینسی نے اس کے چہرے پر سے نگاہیں ہٹا کر آہستگی سے کہا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟؟“

”خواہش —“ وہ منہ ہی منہ میں بد بدائی تھی اور پھر نفی میں سر ہلانے لگی۔

”کوئی نہیں۔“

”میں نہیں مانتی یقیناً تمہاری کوئی نہ کوئی ایسی خواہش ضروری ہو گی جسے تم ہر صورت پورا کرنا چاہتی ہو گی۔“

”آپ بتائیں آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟“ اس نے الٹا سوال کر دیا۔ نینسی کچھ دیر سوچتے ہوئے پر سوچ انداز میں بولی تھیں۔

”ہاں، میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں اٹلی کے شہر ویٹی کن سٹی میں واقع ”کیتھولک براسیلیکا“ کے چرچ میں عبادت کروں جانتی ہو اس چرچ کی عمارت دنیا کے تمام چرچ سے بڑی ہی۔ تمام بڑے بڑے لیڈر خاص تہواروں پر اس چرچ میں عبادت کرنے کیلئے جاتے ہیں۔“

”اب تم بتاؤ۔“ نینسی مسکرائیں۔

”میں ایک اچھی زندگی گزارنے کی خواہش رکھتی ہوں۔ مجھے کیڑے مکوڑوں سے بدتر زندگی سے نفرت ہے۔ مجھے کلب آباد کرنے والی عورتوں سے، کال گرلز سے اور اولڈ ہائوسز میں رہنے والی بوڑھیوں سے

نفرت ہے۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو جوانی عیش و عشرت میں گزار دیتی ہیں اور بڑھاپا سسکتے ہوئے میں چاہتی ہوں کہ میرا بڑھاپا اچھا گزرے اور جب میں



مروں تو میرے پاس کچھ نیکیاں ، کچھ اچھے اعمال اور بہترین سچا مذہب ہو  
 -“وہ دھیرے دھیرے نرم آواز میں بول رہی تھی - نینسی دم بخود اسے سنتی  
 رہی۔

”تم عیسیٰ علیہ السلام کی پیروکار ہو - گاڈ نے تمہیں عیسائی خاندان میں پیدا دیا  
 ہے - تمہارے پاس بہترین کتاب ہے بس تم اس پر ڈٹی رہو - یقیناً تمہاری  
 تمام بے سکونی اضطراب ختم ہو جائے گا۔“ نینسی فادر ٹائی سن کے حکم کے  
 مطابق آہستہ آہستہ اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی - اسے خاموش پا کر وہ  
 مزید بولیں۔

”تم جانتی ہو کہ عیسائیت کے پیروکار پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہیں -  
 تمام مذاہب میں عیسائیت سرفہرست ہے - ہمار مذہب ہی سچا مذہب ہے - اسی  
 لیے تو اسے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔“

”ماننے والوں کی یا...“ اس نے تنفر سے سوچا - اس کی آنکھوں کے سامنے  
 گندے غلیظ کردار والی عورتوں کے چہرے آنے لگے - لوگ آسانیاں ڈھونڈتے

ہیں - جس مذہب میں جس فرقے میں زیادہ آسانی ہو ، گنجائش ہو اس کے  
 پیروکار بن جاتے ہیں - حرام میں مٹھاس ہے ، کشش ہے - جگنو کی روشنی  
 مدہم ہوتی ہے اسی لئے آگ کی طرف بھاگتے ہیں - شعلوں کی طرف لپکتے  
 ہیں - چاہے بھڑکتی آگ کے شعلے جلا کر راکھ ہی کر دیں - انہیں جلنا منظور  
 ہے صبر کرنا نہیں۔

دوسرے دن ایک مرتبہ پھر نینسی نے اسے بلوا بھیجا تھا۔ سوٹا کا مارے کوفت  
 و جھنجلاہٹ کے ، برا حال ہو گیا - مجبوراً گھر لاک کرنے کے بعد چرچ آگئی  
 تھی۔ نینسی اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح مسکرائیں - سوٹا کو نہ جانے کیوں یہ  
 مسکراہٹ مصنوعی محسوس ہوئی تھی۔

”تمہارے اندر ایک بہت اچھی سوٹا موجود ہے - تمہیں دلدل سے محفوظ  
 رہنا ہے - لو سفید لباس پہن لو“

”مجھے نن نہیں بننا“ سوٹا نے کڑوے لہجے میں کہا۔ نینسی کے چہرے پر  
 کر خنگی پھیل گئی۔

”کیوں—؟“

”مجھے منافقت نہیں آتی۔“ وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔

”کیا بکواس کر رہی ہو۔“ نینسی نے ترشی سے کہا۔

”یہی سچ ہے۔“ سویٹا نے سر د آواز میں کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”نن نہیں بننا تو جائو اپنی قوم کے لوگوں کی طرح گمراہ ہو جائو۔“ نینسی زہر

خند ہوئیں۔

”آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ یہ قوم گمراہ کیوں ہو رہی ہے“ وہ سخت آواز

میں بولی تھی۔

”بتائیں بھی۔“ نینسی کو خاموش پا کر وہ چلائی۔

”اپنے عمل کی وجہ سے۔“ نینسی کی آواز پست تھی۔

”نہیں—“ سویٹا نے نفی میں سر ہلایا اور پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

”یہ قوم اس لئے گمراہ ہو رہی ہے کہ اسے اچھی ماں نہیں ملی، انہیں بہترین

تربیت میسر نہیں آئی، انہیں رہنما نہیں ملا۔“

”آہستہ بولو۔“ نینسی نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ سویٹا کے لبوں استہزائیہ

مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے منافقت نہیں آتی۔“

”کل فادر ٹائی سن آرہے ہیں۔ تم ضرور آنا۔“ نینسی نے کچھ سفید پھول اس

کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے اب جانے دیں۔“

وہ بے زاری سے بولی تھی۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چرچ کی

عمارت سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

وہ مارکیٹ جا رہی تھی جب پیٹر نے بھی ایک لسٹ اسے تھمائی - ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ لدی پھندی سی پہلے گھر آئی - تمام سامان ٹھکانے لگایا اور پھر پیٹر کا سوادا لے کر اس کے مکان کی طرف چل دی -

”اے - پیٹر کے گھر جا رہی ہو تو واپسی پر سرخ گلابوں کا بکے بنا لانا میں نے کسی کو تحفہ دینا ہے - سرخ اینٹوں والے مکان کی کھڑکی کھول کر سیاہ فام لڑکی کرسٹی نے چلا کر کہا تھا -“ سوئیٹا نے پلٹ کر دیکھا اور پھر مسکرا دی -

”میں واپسی پر پھول لے آؤں گی“

”شکریہ -“ کرسٹی نے تشکر بھری مسکان اچھالی اور پھر کھڑکی بند کر دی - سوئیٹا پیٹر کے گارڈن کے قریب سے گزری تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی - وہ سر جھٹکتی اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی - پیٹر حسب معمول اپنی لائبریری میں تھا - سوئیٹا کچن میں سامان رکھ کر لائبریری میں آگئی -

”کسے پڑھ رہے ہیں؟“ وہ اس کے قریب کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے دلچسپی سے بولی -

”آں - ہاں تم کب آئیں؟“ پیٹر نے کتاب سے نگاہیں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا - سوئیٹا اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر بولی -

”دس منٹ پہلے -“

”کیا کچھ خریدا ہے؟؟“

”وہ سب کچھ جو لسٹ پر درج تھا -“

”سوئیٹا! تم مجھے کچھ کھانے کیلئے لادو - میری رات بھر طبیعت خراب تھی - صبح سے بھوکا بیٹھا ہوں -“

پیٹر نے التجائیہ لب و لہجے میں کہا تھا سوئیٹا سر ہلاتے اٹھ گئی - پیٹر ایک مرتبہ کتاب میں گم ہو چکا تھا - آدھے گھنٹے بعد وہ ایگ فلاور سوپ بنا کر لے آئی تھی - پیٹر کی آنکھیں تشکر کے احساس سے نم ہو گئیں -

”اس کا ذائقہ کیسا ہے؟“

”بہت اچھا -“ پیٹر مسکرایا -

”میں نے اس میں ویجی ٹیبل بروتھ ڈالی ہے“ وہ جوش کے عالم میں بتانے لگی۔

”اسی لئے تو یہ بہت مزیدار سوپ بنا ہے“ پیٹر بد ذائقہ سوپ کو شوق سے پیتے ہوئے بولا۔ سویٹا نے مسکراتے ہوئے کتاب اٹھالی۔

”ولیم شکسپیئر کو پڑھ رہے ہیں“ اس نے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ پیٹر نے خالی باؤل میز پر رکھا اور ایک مرتبہ پھر کتاب پکڑ لی۔

”ہاں، ولیم شکسپیئر کو بین الاقوامی طور پر انگریزی کا سب سے بڑا عظیم ترین شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر کافی حیران ہوا ہوں۔“

”زبردست، میں گھر جا کر اسے پڑھوں گی۔“

”اگر کچھ پانا چاہتی ہو، حاصل کرنا چاہتی ہو سویٹا! تو ان عورتوں کی طرح مضبوط بن جاؤ۔ میدان مارلو۔ دنیا کو اپنے سامنے جھکانے والا کامیاب نہیں

ہوتا بلکہ دنیا کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والا کامیاب ہوتا ہے۔“ پیٹر نے اپنا کپکپاتا ہاتھ اسکے ہاتھ پر رکھ کر نرمی سے کہا تھا۔

”تم نہیں جانتے پیٹر انکل! کہ میری خواہشات ان عورتوں سے بہت مختلف ہیں! میں نے کوئی میڈل نہیں جیتنا۔ کسی ملک کی وزیر اعظم نہیں بننا میں تاریخ میں اپنا نام لکھوانے کی خواہش نہیں رکھتی۔ مجھے لیوسٹی کی طرح دولت جمع کرنے کا شوق بھی نہیں ہے۔ میری خواہشات بہت محدود ہیں۔ ایک بہترین ساتھی، چھوٹا سا گھر میرے خواب شگنائی ہوٹل کی عمارت سے بلند نہیں ہیں۔ مجھے جگ مگ کرتی روشنیوں، قہقہوں اور اجالوں کی خواہش نہیں ہے۔ مجھے تو صرف اک ننھے سے جگنو کی تلاش ہے جو مجھے منزل تک لے جائے۔“

وہ نم آنکھوں سے سوچتی چلی گئی تھی۔ پیٹر اسے رنجیدہ دیکھ کر خود کو ڈانٹنے لگا تھا پھر اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولا تھا۔

”میں بہت تنہائی محسوس کرنے لگا ہوں“



”آپ کو آج سے بیس سال پہلے شادی کر لینا چاہئے تھی۔“ سویٹا نے چونک کر آنکھیں صاف کیں اور دھیرے سے بولی تھی۔ پیٹر نے مصنوعی آہ بھری۔

”میں تیسری شادی ضرور کرتا اگر الزبتھ ثانی مان جاتی۔ جانتی ہو سویٹا! وہ دنیا کی امیر ترین عورت تھی۔“ پیٹر نے قہقہہ لگایا۔ وہ بھی ہنس پڑی۔

”اوکے اب میں چلتی ہوں“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی تھی۔

”جاتے ہوئے دروازہ بند کر جانا۔“ پیٹر نے پیچھے سے بلند آواز میں کہا تھا۔ سویٹا سر ہلاتے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

لیوسٹی پچھلے دو مہینوں سے نہیں آرہی تھی۔ سویٹا شدت سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ان دنوں وہ بے حد پریشان رہنے لگی تھی۔ لیوسٹی نے اس ماہ پیسے نہیں بھجوائے تھے۔ اور راشن بھی تقریباً ختم ہونے والا تھا۔ دودن مزید اسی پریشانی کے عالم میں گزر گئے۔ تیسرے دن لیوسٹی آگئی۔ اس کے ساتھ

روز بھی تھا۔ لیوسٹی کی شاندار گاڑی دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ گاڑی کی چمک دمک نے آتے جاتے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دیں۔

لوگوں نے دروازوں اور کھڑکیوں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ بچے روز اور لیوسٹی کو دیکھ کر چیخنے لگے تھی۔

”یہ دیکھو، لیوسٹی اور روز ویلٹ — ریسلنگ کی دنیا کے چمکتے ستارے“ کچھ نوجوانوں نے روز کی گاڑی پر پتھر برسائے اور فضول فضول قسم کے نعرے بھی لگائے۔

”روز عورت سے ہار گیا۔ ہا ہا ہا۔“

وہ قہقہے لگا رہے تھے آوازیں کس رہے تھے۔ روز نے تنفر سے لیوسٹی کے کان میں کچھ کہا۔ وہ شدید غصے میں لگ رہا تھا۔ لیوسٹی نے بمشکل اسے روکا۔ وہ لوگوں کو بچوں اور بوڑھوں کو گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ سویا سن سی سنتی رہی۔ پھر لیوسٹی نے چند ایک ضروری کام نمٹائے اور سویٹا کے روکنے کے باوجود جلد ہی چلی بھی گئی تھی بغیر خرچہ دیئے۔

یہ دن سویٹا کی زندگی کے انتہائی تکلیف دہ دن تھے۔ راشن ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کے پاس اتنے روپے بھی نہیں تھے کہ وہ پیٹ کے دوزخ کو بجھانے کیلئے برگر شاپ سے سستا سا برگر بھی خرید لیتی۔ وہ رات تک بھوکی بیٹھی رہی۔ جب پیٹ میں بھوک کی وجہ سے درد ہونے لگا تو وہ سست قدموں سے چلتی ہوئی پیٹر کے مکان تک آگئی۔ اس رات وہ بے انتہا روئی تھی۔ اپنی تنہائی اور بے بسی پر۔ لیوسٹی کے روئے نے اس

کے نازک دل کو بے حد ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس دن پہلی مرتبہ اس نے جینی کی طرح پیٹر کا کام کیا تھا چند سو ڈالرز کی خاطر، پیٹر کے کپڑے بھی دھوئے اور بدبو دار جرابیں بھی۔ اس کے چہرے پر آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے۔ پیٹر نے تاسف سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”لیوسٹی بری ہے اور تمہاری ماں اس سے بھی بری بلکہ بدترین ہے۔“ پیٹر نے موٹی سی گالی دی تھی اگلے چار دن کافی اچھے گزر گئے تھے۔ وہ روزانہ پیٹر کے برتن اور کپڑے دھوتی تھی۔ پیٹر بہتر سالہ خبلی بوڑھا تھا۔ بولتے رہنے کا اسے خبط تھا اور طبیعت بھی کافی جھگڑالو تھا۔ شاید اسی لئے کوئی بھی اس کا کام کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس دن بھی وہ پیٹر کا کام کر کے واپس آرہی تھی کہ اپنے مکان پر چند لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ نہایت باریک بینی سے مکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ سویٹا کا حلق خشک ہو گیا۔ مرے مرے قدم اٹھاتی وہ ان کے قریب آئی تھی۔

”مس سویٹا! آپ کل تک مکان خالی کر دیں۔“ ان میں سے ایک رکھائی سے بولا تھا۔

”لیوسٹی یہ مکان بیچ چکی ہے۔“ اس کی حیران صورت دیکھ کر ادھیڑ عمر انگریز نے نرمی سے کہا تھا۔ سویٹا اثبات میں سر ہلا کر اندر گھس گئی۔ وہ جانتی تھی کہ لیوسٹی ایسا قدم اٹھا سکتی ہے۔ مگر اتنی جلدی کا اس نے تصور نہیں کیا تھا۔

اس نے جوتے اور جیکٹ اتار کر پھینکی اور خود صوفے پر ڈھے گئی۔ اگلے دن وہ لوگ دوپہر تک آگئے۔ سویٹا نے ان کے آنے سے پہلے ہی تیاری کر رکھی تھی۔ اس گھر میں سوائے ضرورت کی چند چیزوں کے اور تھا ہی کیا۔ وہ اپنا مختصر سامان لے کر اپنی آخری پناہ گاہ سے نکل آئی۔ اس نے آنسو بھری نگاہوں سے آخری مرتبہ اپنے مکان کی طرف دیکھا اور تھکے تھکے قدموں سے نامعلوم منزل کی طرف چل دی۔

چلتے چلتے اس نے اک پل کیلئے رک کر چرچ کی عمارت کی طرف دیکھا۔ نینسی کے الفاظ بھی یاد آئے مگر نہ جانے کون سی قوت تھی جس نے اسے چرچ کی طرف جانے سے روک دیا تھا۔

☆☆☆

نیویارک پہنچ کر اس نے ایک پی سی او سے لیوسٹی کو فون کیا تھا مگر مسلسل بڑی ٹون سنائی دے رہی تھی۔ تنگ آکر وہ خود ہی چل پڑی۔ لیوسٹی کا ایڈریس اس کے پاس موجود تھا اسی لئے اسے کسی بھی مشکل کا سامان کرنا

نہیں پڑا تھا۔ وہ لیوسٹی کے شاندار گھر میں آئی تو روز نے اس کا بہت اچھا استقبال کیا۔ وہ جو بے حد خوفزدہ اور ڈری سہمی ہوئی تھی ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی۔ روز نے اس کی آمد پر بے حد خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وہ لیوسٹی کو برا بھلا کہہ رہا تھا جو معصوم بھانجی کو تنہا چھوڑ آئی۔ روز نے لہجے پر بے حد اہتمام کروایا تھا۔ سویٹا خوا مخواہ ہی شرمندہ ہوتی جا رہی تھی۔ لیوسٹی رات بہت دیر سے گھر آئی تھی۔ سویٹا کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا پھر ایک دم وہ سنبھل گئی۔

”ہائے سویٹی! کیسی ہو، میں کل تمہیں بلوانے ہی والی تھی“ لیوسٹی اس کا گال چوم کر مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولی۔

”کل تک —“ سویٹا منہ ہی منہ میں بدبدائی تھی اور پھر لیوسٹی کے لاپرواہ انداز کو ملاحظہ کرنے لگی۔

”تم مجھے کل تک بلوانے والی تھی آنٹی۔ اور آج رات میں کہاں جاتی کہاں سوتی اس ٹھٹھرا دینے والی ٹھنڈ میں پیٹر کے گیراج میں، لوئیس ول کی گلیوں میں یا پھر نیویارک کے فٹ پاتھ پر۔“ اس نے تنفر سے سوچا تھا۔

لیوسٹی اور روز گھر میں کم کم ہی نظر آتے تھی۔ ان کی اپنی بہت سی مصروفیات تھیں۔ کلبز، پارٹیز، ہنگامے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فنکشن تیار رہتا تھا۔ ان دونوں کا سوشل سرکل کافی وسیع تھا۔ ڈانس پارٹیز میں جب لیوسٹی اپنے پھیلے وجود کے ساتھ کسی نہ کسی کی بانہوں میں جھولتے ہوئے ڈانس کرتی تو سویٹا کو بے حد کراہت محسوس ہوتی۔

آہستہ آہستہ سویٹا نے خود کو گھریلو کاموں میں مصروف کر لیا۔ سودا سلف سے لے کر کھانا پکانا، اگرچہ اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کم ہی ان دونوں کو پسند آتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑے شوق سے کھانہ پکاتی تھی۔ تاکہ خود کو مصروف رکھ سکے۔ اس نے لان کی کانٹ چھانٹ کی ذمہ داری بھی اپنے سر

لے لی تھی۔ لیوسٹی کو اب سویٹا کے وجود سے کافی فائدے حاصل ہو رہے تھے۔ اس نے آرام سے مسز ایوا کی چھٹی کروا دی تھی۔

سویٹا معمول کے مطابق صبح اٹھتی تھی اور دن بھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ گھر میں ہونے والے فنکشن، ہنگاموں اور ہلے گلے سے ہمیشہ کی طرح سویٹا کا دل گھبراتا تھا۔ وہ روز اور لیوسٹی کے بے حد اصرار کے باوجود بھی ان کی کسی گید رنگ میں شرکت نہیں کرتی تھی۔ اس پل وہ تنہا کونے میں بیٹھ کر پیٹر اور جینی کو یاد کرتی تھی۔ اسے اپنا گھر اور گلیاں بہت یاد آتی تھیں۔ یہاں آکر اس نے دو مرتبہ پیٹر کو فون کیا تھا۔ پیٹر اس کے فیصلے کو سراہتا تھا۔

پیٹر اور جینی کے علاوہ کوئی بھی ایسا ہمدرد نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ ڈھیر سارا رو لیتی۔ اپنی عزیز از جان سہیلی کی یاد اسے ہر وقت تڑپاتی تھی۔ اور وہ سارے ہنگاموں سے بے نیاز پہروں روتی رہتی تھی۔ بچپن میں وہ اور جینی مٹی کے گھروندے بہت شوق سے بنایا کرتی تھیں۔ جب



لوئیس ول کے اندرون ایریا کی سیاہ فاموں کی کیلئے مخصوص بستی میں بارش پورے جلال کے ساتھ برستی تو سویٹا کی نانی ٹین کی چھت ٹپکنے کی وجہ سے بارش کو خوب کوستی۔ ایگو کام رک جانے کی وجہ سے بارش کو گالیاں دیتی اور وہ دونوں ٹوٹی پھوٹی سڑک کے کنارے کھڑے گدے پانی میں اچھلتی کودتی رہتیں۔

اس کی نانی کا دوسرا شوہر ایگو کا چچا تھا۔

جب تک ”روسیو ڈینس“ زندہ رہا لیوسٹی نے کبھی ادھر جھانکا بھی نہیں تھا۔ اسے ماں کی دوسری شادی سے سخت شک پہنچا تھا۔ روسیو ڈینس مرا تو وہ ایک مرتبہ پھر ماں سے ملنے لگی تھی۔ لیوسٹی کی واپسی کم از کم سویٹا کیلئے بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جو بغیر سہارے کے چل نہیں سکتی تھی۔ پہلے نانی اور پھر لیوسٹی۔ اس میں اعتماد کی بے حد کمی تھی۔ اور کچھ احساس کمتری نے اس کی شخصیت کو دبا کر رکھ دیا تھا۔ لیوسٹی اس کی شخصیت کو پالش کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہر پل اسے اس کی خوبصورتی کا احساس

دلالتی رہتی تھی۔ اس کیلئے خوبصورت لباس خریدتی مگر یہ سب چیزیں سویٹا کو خوش نہیں کرتی تھیں۔ وہ دن بہ دن پہلے سے بھی کم گو اور تنہائی پسند ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے لیوسٹی سے مزید پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

”تم پڑھنا چاہتی ہو؟؟“ لیوسٹی کو گویا یقین نہیں ہو رہا تھا۔ ہو بے حد حیرانی سے سویٹا کو دیکھ رہتی تھی۔ سویٹا نے مجرموں کی ط

”ہاں۔ تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ روز نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ لیوسٹی کی آنکھوں میں سختی اتر آئی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے سویٹا کی آنکھوں میں چمکتے امید کے دیئے کو بجھا دیا۔ سویٹا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

”بچپن میں یہ اتنی کند ذہن تھی کہ ایک پونم تک تو اسے یاد نہیں ہوتی تھی۔ ایک ایک کلاس میں اس نے دو دو سال لگائے ہیں۔“

لیوسٹی اب روز سے مخاطب تھی۔ سویٹا کے حلق میں گویا گولا سا اٹکنے لگا تھا۔ آنکھوں میں اڈ آنے والی نمی کو چھپانے کیلئے اس نے سر جھکا لیا تھا۔

”مگر اب یہ پڑھنا چاہتی ہے۔“ نہ جانے کیوں روز لیوسٹی سے الجھ رہا تھا۔ سویٹا جانتی تھی کہ لیوسٹی نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ وہ اپنے فیصلے بدلتی نہیں تھی۔ ایک دم ہی اس کا ہر شے سے دل اچاٹ ہو گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور اپنے مخصوص کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ لیوسٹی چونکہ سارا دن گھر سے غائب رہتی تھی بلکہ اکثر تو وہ راتوں کو بھی گھر نہیں آتی تھی۔ شاپنگ کرنا گھومنا پھرنا، جم، کلب۔ سویٹا اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھی کہ نہ جانے یہ کیسی عورت ہے جو تھکتی نہیں۔

اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی اس کی لیوسٹی سے ملاقات پندرہ پندرہ دن بعد ہوتی تھی۔ لیوسٹی کی غیر موجودگی میں روز کئی مرتبہ اسے بصد اصرار باہر گھمانے لے کر گیا تھا۔ دو مرتبہ وہ مروتاً روز کے ہمراہ نیشنل پارک چلی گئی تھی۔ وہ بہت کم بولتی تھی اور روز اسے بے تکان بولنے پر اکسایا کرتا تھا

۔ وہ بے تکلفی کی حد تک خوش اخلاق تھا جبکہ سویٹا کو اس کی عادت سے خوف محسوس ہوتا تھا وہ روز سے کترانے لگی تھی۔

روز ایک گھاک قسم کا مرد تھا۔ وہ اس معصوم چڑیا کے خوف سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آنا چاہتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسے اب لیوسٹی کے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ بعض عورتیں جب تخلیق کے مراحل سے گزرتی ہیں تو بالکل لیوسٹی جیسی ہو جاتی ہیں انتہائی بد صورت اور بھدی۔ روز کو بھی اب لیوسٹی اور اپنے ہونے والے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز یہی کم گو حسینہ تھی جسے دیکھ کر اس کا دل بے قابو ہو گیا تھا۔

سویٹا روز کی نگاہوں سے بچنے کیلئے اب زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی اور سارا دن ان دو کتابوں کو مطالعہ کرتی تھی جو کہ پیٹر نے اسے کی سالگرہ کے موقع پر تحفتاً دی تھیں۔

روز جانتا تھا کہ اسے کتابوں سے بہت دلچسپی ہے۔ ایک دن وہ موقع پا کر اسے اپنے ساتھ ایک بک اسٹور پر لے گیا۔ سویتا اپنے پسندیدہ مصنفین کی کتابیں دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئی تھی۔ اس نے ”برٹریڈرسل“ کے ناولز خریدے۔ روز اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ایسی عجیب لڑکی اس نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ جسے ڈانس، کلبرز، پارٹیز سے نفرت ہے جو شور اور ہنگاموں سے دور بھاگتی تھی اور جسے صرف اور صرف تنہائی اور کتاب سے لگاؤ تھا۔ روز نے اس کے شوق اور جنون کو دیکھ کر دل ہی دل میں ان تمام مصنفین، جنہوں نے اتنے بور بور ٹاپکس پر اتنی موٹی موٹی کتابیں لکھیں کو گالیاں دیتے ہوئے سراہا۔ ژاں پال، سارتر اور شالٹ پرانے کی دانت پیستے ہوئے تعریف کی، اسٹور میں گھومتے ہوئے اس نے بمشکل ہی ان دو ناموں کو ذہن نشین کیا تھا۔

سویتا آج بہت خوش تھی۔ اس نے روز کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اتنی مہنگی مہنگی کتابوں کو خریدنے کا محض سوچ سکتی تھی۔ روز نے اس کی سب سے بڑی خواہش بن کہے ہی پوری کر دی تھی۔

☆☆☆

”دس منٹ میں ریڈی ہو جائو۔ ہم لاس ویگاس جا رہے ہیں“

وہ معمول کے مطابق سو کر اٹھنے کے بعد اپنے لئے کافی بنانے کچن کی طرف جا رہی تھی جب لیوسٹی نے اسے پیچھے سے ہانک لگا کر کہا۔ سویتا نے مڑ کر دیکھا لیوسٹی اب فون پر مصروف ہو گئی تھی۔ سوال جواب کرنے کی عادت اسے بالکل نہیں تھی۔ وہ خاموش ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ لاس ویگاس کے ہوٹلز دنیا بھر میں جوئے خانوں کیلئے مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک قدرے سستا ہوٹل اب لیوسٹی کی ملکیت تھا۔ یہ انکشاف لیوسٹی نے یہاں آکر کیا تھا۔ اور ساتھ میں سختی سے تاکید کی تھی کہ روز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

”آئی۔! اتنا مہنگا ہوٹل تم نے کیسے خریدا؟“ کانچ کی دیواروں اور چکنے فرش پر پہلا قدم رکھتے ہی سویٹا نے سہم کر پوچھا۔ لیوسٹی نے گھور کر اسے دیکھا اور گویا نگاہوں ہی نگاہوں میں تنبیہ کی کہ فضول سوال مت کرو۔

لیوسٹی اب اپنے دوستوں سے مل رہی تھی۔ لیوسیٹی کی آمد کا سن کر ہوٹل انتظامیہ نے چھوٹا سا فنکشن ارنج کیا تھا۔ شراب اور شباب کی اس محفل میں اس کا دم گٹھنے لگا تھا۔ سویٹا ایک کونے میں گم سم سی بیٹھی لیوسٹی کو اونچے اونچے تھقبے لگاتے دیکھ رہی تھی۔ پہلے کھانا کھایا گیا تھا اس کے بعد شراب کے جام پیئے گئے اور پھر ناچ گانا شروع ہو گیا تھا اور اب جوئے کی محفل جم گئی تھی۔ اسی ہوٹل کے ٹاپ فلور کے سب سے تاریک کونے میں بیٹھی سویٹا پر اس لمحے ایک اور انکشاف ہوا تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں مسٹر ڈینی اور پھر لیوسٹی کی پشت کو گھورا۔ مسٹر ڈینی، لیوسٹی کو بانہوں کے گھیرے میں لے کر بڑے واہیات انداز میں کہہ رہا تھا۔

”تم بڑی کمال کی عورت ہو۔“ ماسگریو (اس ہوٹل کا سابق مالک) کو جوئے میں منہ کے بل گرا کر صرف بیس منٹوں میں ہی بھکاری بنا دیا تھا تم نے“ لیوسٹی نے مسکرا کر سامنے بیٹھے تین مردوں کی طرف دیکھا اور پھر تفاخر سے بال جھٹکے۔

”کرونا اور والا سی کو جیبوں میں بھر کر تم لیوسٹی کے ساتھ جوا کھیلنے آئے ہو۔ ڈالرز اور پونڈز کی بات کرو یا پھر پراپرٹی کی۔“

ان تین ادھیڑ عمر مردوں کو گھور کر لیوسٹی نے تنفر سے کہا تھا۔

وہ ان تینوں کے چہرے پر پھیلی مظلومیت و مسکینی کو دیکھ کر ان کی مالی حالت اندازہ لگا چکی تھی۔ انہیں باہر کا راستہ دکھا کر لیوسٹی نے سہولت سے لیوسٹی کے گود میں سر رکھ دیا تھا۔

سویٹا نے اس منظر سے وحشت زدہ ہو کر نگاہیں چرائیں اور پھر سرعت سے ایک بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس پل سے لیوسٹی کی اور بھی بہت سی پوشیدہ خوبیوں کا پتا چلا تھا اور اس کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔



لیوسٹی کو جواء کھیلنے کی لت بھی لگ چکی تھی اور اس نے بہت سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کی پراپرٹی ہتھیا لی تھی۔ اس کی ہو شر با ادائیں اور بے باک حسن اچھے بھلے ہوش مند آدمی کو دیوانہ بنا دیتے دیتے تھے۔

دو دن بعد وہ نیویارک واپس آگئی تھی۔ روز اسے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔ لیوسٹی اپنے بیڈروم میں گئی تو روز اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”میں نے تمہیں بہت مس کیا ہے سوئی۔“ روز نے دو انگلیوں سے اس کے نرم رخسار کو چھوا تو وہ ایک دم ہی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”آئندہ لیوسٹی کے ساتھ کہیں مت جانا۔“ وہ محبت بھری دھونس سے کہہ رہا تھا سوئیٹا نے بے خیالی میں سر ہلا دیا اور دو قدم مزید پیچھے ہٹ گئی تھی اسے ویسے بھی روز کے پہاڑ جیسے وجود کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔ روز دس منٹ مزید اپنی بھدی آواز میں اس کی تعریفیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کا ایک دوست آیا تو وہ اس کے ساتھ ہی دفعہ ہو گیا تھا۔ سوئیٹا نے آزادی بھرا سانس خارج کیا اور صوفے پر ڈھے سی گئی۔

سوئیٹا کی چھٹی حس اسے خطرے کا الارم سنا کر الرٹ کر رہی تھی۔ اسے روز کی بدلتی نگاہوں کے ”تقاضوں“ سے وحشت ہونے لگی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی گھٹیا حرکتوں کا عملی مظاہرہ بھی شروع کر دیتا۔ مگر اس سے پہلے ایک عجیب واقعہ ہو گیا تھا۔ روز جو کہ محض سوئیٹا کی قربت حاصل کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت گھر میں گزارنے لگا تھا اچانک ہی ایک مرتبہ پھر راتوں کو غائب رہنے لگا۔ لیوسٹی اور روز کے جھگڑے ایک مرتبہ پھر شروع ہو گئے تھے۔ اور لیوسٹی، روز سے لڑ جھگڑ کر لاس ویگاس چلی گئی تھی اور پھر ڈینی کی سنگت میں چند دنوں تک اپنا گھر، شوہر اور بھانجی سب کو بھول بیٹھی تھی۔ ڈیڑھ ماہ بعد جب وہ آئی تو ایک ایشین لڑکی کو اپنے بیڈ روم اور گھر میں موجود پاکر آگ بگولا ہو گئی تھی۔

ویلٹ نے اس سے شادی کر لی تھی۔ لیوسٹی اور روز کے جھگڑوں نے سوئیٹا کو از حد پریشان کر رکھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگاتے رہے، بہتان باندھتے اور گندی گندی گالیوں سے نوازتے رہے۔

صرف اور صرف اکتیس گھنٹوں کے اندر اندر لیوسٹی اور روز نے ایک دوسرے سے تمام تعلق توڑ لئی۔ لیوسٹی ٹی پر چیختے ہوئے اپنا تمام سامان سمیٹتی رہی۔ اس دروان ایک مرتبہ بھی لیوسٹی نے سویٹا کی طرف نہیں دیکھا تھا جو کہ لائونج کے ایک کونے میں کھڑی بے آواز روتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”میں تھوکتی ہوں تمہارے گھر پر۔“ لیوسٹی سوٹ کیس کو ایک جھٹکے سے بند کرتے ہوئے چلائی۔

”اور میں تھوکتا ہوں تم پر۔“ روز نے بھی گرج کر کہا تھا۔ لیوسٹی نے اک نفرت بھری نگاہ ٹی اور پھر روز پر ڈالی اور پھر تیز تیز قدموں سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ سویٹا نے لمحہ بہ لمحہ لیوسٹی کو خود سے دور ہوتے دیکھا۔ اس کے مردہ تن میں گویا خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اور وہ دوسرے ہی پل لیوسٹی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگنے لگی تھی۔

”آئی مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو۔ رکو پلیز۔“ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں چیخ کر کہا تھا۔ لیوسٹی نے گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے اک نظر سویٹا پر ڈالی اور پھر بے حد اطمینان کے عالم میں گاڑی سٹارٹ کر کے اس کی دھندلائی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سویٹا بیچ سڑک میں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ نہ جانے وہ کب تک یوں ہی سڑک کے عین وسط بیٹھی روتی رہتی اور ایک مرتبہ پھر پھر بے آسرا ہو جانے کا ماتم کرتی۔ لیوسٹی کی خود غرضی نے ایک مرتبہ پھر اسے روڈ پر بٹھا دیا تھا۔ روز نے گلاس ونڈو سے سویٹا کو روتے چلاتے دیکھا اور پھر تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

”اٹھو سویٹا! آؤ میرے ساتھ۔“ روز نے اس کا لرزتا کانپتا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بمشکل اٹھایا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ چلنے لگی۔

پہلے یہ گھر آنٹی کی ملکیت تھا اب اس کی مالک ٹٹی تھی۔ نہ جانے ٹٹی نے بھی کب تک روز کے ساتھ رہنا تھا۔

صرف ایک ہفتے کے اندر اندر سویٹا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ٹٹی کی موجودگی میں اس گھر کی چھت کے نیچے رہنا کتنا دشوار ہے۔ روز کے گھر سے چلے جانے کے بعد ٹٹی اس کے ساتھ بدترین سلوک کرتی تھی۔ وہ اپنا جھوٹا کھانے کو دیتی۔ سارا دن وہ ٹٹی کے اشاروں پر ناچتی تھی۔

ٹٹی اور روز کی ملاقات ڈسکو کلب میں ہوئی تھی۔ روز، ٹٹی کی سیاہ آنکھوں پر فدا ہو گیا تھا۔ ادھر ٹٹی، روز جیسے امیر ترین انگریز کو اپنے طرف متوجہ پا کر ہوائوں میں اڑنے لگی تھی۔ پچھلے نو دس سالوں کی اذیتیں، تکلیفیں ایک دم ہی ختم ہوتی نظر آنے لگی تھی۔ ڈسکو کلب کے واش روم دھونے کا کام وہ پچھلے تین سالوں سے کر رہی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے اتنی گندگی میں جینا پڑے گا۔

روز ویلٹ ایک بہترین ریسلر تھا۔ اس کے باپ کا اپنا اسٹیڈیم تھا۔ روز کے پاس بہت دولت تھی اور ٹٹی کو بھی بہت دولت مند بننا تھا۔

ٹٹی بہت مطمئن خوش اور سرشار تھی۔ اسے بس سویٹا سے بہت چڑ تھی ان دنوں وہ سویٹا کو گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکالنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی۔ جس دن وہ پوری پلاننگ کے ساتھ سویٹا کو باہر کا راستہ دکھانے والی تھی ٹھیک اسی دن ایک ادھیڑ عمر سیاہ فام عورت گلابی کمبل میں لپٹے روتے چلاتے بچے کو اٹھا لائی۔

یہ بچہ لیوسٹی کا تھا۔ آٹھ دن کے اس بچے کو دیکھ کر ٹٹی پر گویا وحشت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے چیخ چیخ کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ ٹٹی اس سیاہ فام عورت سے جھگڑ رہی تھی۔ اس نے روز کے بچے کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

”تم بے شک اس بچے کو کوڑے کے ڈرم میں پھینک دو یا پھر اس کا گلا دبا دو۔ ہمیں یہ بچہ نہیں چاہئے۔“

ٹٹی نے نفرت حقارت بھرے لہجے میں کہا تھا - سوٹا کے نرم گداز دل کو گویا کسی نے آرے سے چیر ڈالا تھا - اس نے انتہائی صدمے کے عالم میں اس پتھر دل عورت کو دیکھا -

”سنا نہیں تم نے - اسے لے جاؤ میری نظروں سے دور اور آئندہ اسے گھر میں آنے کی جرأت مت کرنا“

ٹٹی نے چلا کر کہا -!

”میڈم نے کہا تھا کہ میں بچے کو اس کے باپ کے حوالے کر کے آؤں - میں اسے واپس نہیں لے جاسکتی -“

”لاؤ میں اسے خود پھینک آتی ہوں -“ ٹٹی نے زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے کبل کو اپنی طرف کھینچا - سوٹا بے ساختہ آگے بڑھی تھی -

”خبردار جو تم نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی“ نہ جانے اتنی طاقت اس میں کہاں سے آگئی تھی - ٹٹی کو دھکا دے کر اس نے نہایت نرمی سے اس معصوم نو مولود کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا -

”میں تمہیں دیکھ لوں گی -“ ٹٹی نے خونخوار نگاہوں سے اسے گھورا تھا - سوٹا سنی ان سنی کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی -

ٹٹی کے ہزار مرتبہ دھمکانے کے باوجود وہ ننھے ایزن کو خود سے الگ نہیں کر پائی تھی - روز بھی ایزن کے وجود سے انکاری تھا - اسے ایزن سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں تھا - صرف اور صرف سوٹا کی بچے کے ساتھ جذباتی وابستگی کی وجہ نے اس کے لب سل گئے تھے - سوٹا ایزن کو پا کر بے انتہا خوش تھی -

اس کی آنکھوں کی چمک ہونٹوں کی مدہم مسکراہٹ نے روز کو یہ کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور کر دیا تھا - جو بھی تھا سوٹا کو وہ اپنی محبوبہ سمجھتا تھا - وہ سوٹا کے گھر اپنے احسانات کا گھیرا تنگ کر کے مکمل اسے اپنا زیر بار رکھنا چاہتا تھا -

ٹٹی کے بعد وہ سوٹا سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا -

سوٹا اس کے شیطانی ارادوں سے انجان ایزن کے وجود میں گم ہو چکی تھی - اس کی پوری کائنات ایزن تھا - وہ ایزن سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتی تھی - وہ چاہت جو ایک ماں کے دل میں اپنے بچے کیلئے ہوتی ہے - وہ ایزن سے



اس لئے پیار نہیں کرتی تھی کہ وہ لیوسٹی کا بچہ ہے۔ اس نے کبھی بھی ایزن کو لیوسٹی کے حوالے سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے خود ہی ایزن کے ساتھ اپنا رشتہ بنا لیا تھا۔

ماں اور بچے کا رشتہ - وہ ایزن کی ماں بن گئی تھی - کیا حرج تھا کہ وہ ایک ایسی بد کردار عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو گندگی کی دلدل میں پوری پوری ڈوبی ہوئی تھی - اسے پالنے والی ایسی کم سن انگریز لڑکی تھی جس نے کبھی زنا نہیں کیا تھا کبھی شراب نہیں پی تھی - جو نہیں کھیلا تھا - چوری نہیں کی تھی - کسی کا دل نہیں دکھایا تھا - ایزن کے وجود نے اس کی تنہائی کو دور کر دیا تھا نہ جانے کیوں وہ خود کو مکمل مکمل سا محسوس کر رہی تھی - پھر جب پہلی مرتبہ ایزن نے تو تلی زبان میں اسے می می یعنی می پکارا تو اس کی خوشی کو کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا - ایزن اسے می می پکارتا تو روز نجانے کیوں نثار ہو جانے والی نگاہوں سے سویٹا کو دیکھنے لگتا۔

ٹمی اور روز کی شادی کو پورے اڑھائی سال رہی تھی - پہلی دراڑ اس وقت پڑی جب روز کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ پورے تین ماہ بستر پر پڑا تنہا کراہتا رہا - اس پل نہ کوئی اسکا فین اس کی عیادت کیلئے آیا اور نہ ہی کوئی گرل فرینڈ - روز کا کیریئر بھی اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے دائو پر لگ گیا تھا - اگرچہ تین ماہ بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل تو ہو گیا تھا مگر گھٹنا ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ ریسلنگ کی چمکتی دمکتی دنیا سے دور ہوتا چلا گیا - روز کے زوال کے ساتھ ہی اس کے باپ جیراڈ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور یوں وقتی طور پر اسٹیڈیم پر ٹمی نے اپنا تسلط جما لیا - وہ دولت کی پجارن تھی - بے انتہا دولت اکٹھی کرنا چاہتی تھی - سو وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی -

ان ہی دنوں روز نے دبے دبے لفظوں میں ایزن کو بے بی کئیر سنٹر بھجوانے کی بات کی تو سویٹا کے دل میں کنڈلی مائے خاموش بیٹھا خوف انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھا تھا - روز نے بے بی کئیر سنٹر کی انچارج مسز ریٹا سے بات بھی کر لی تھی -

روز نے اپنے اوپر جو اچھائی کا خول چڑھا رکھا تھا اب وہ چٹخنے لگا تھا۔ اب وہ اپنے اور سویٹا کے درمیان موجود فاصلے ختم کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے موقع پا کر اپنی خواہش کا اظہار کیا تو سویٹا کئی لمحے بول ہی نہ پائی تھی۔

”میں اور تم اب ایک ہو جاتے ہیں سویٹا!“ وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ سویٹا کی آنکھیں مارے غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔

”انکل تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟؟“ وہ چلا کر بولی تھی۔ روز کے ماتھے پر سلوٹوں کا جال سا بن آیا۔

”میں تمہارا انکل نہیں ہوں“ اس کے لہجے میں کرختگی نمایاں تھی۔

”مم — میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ سویٹا نے بے ربط سے چند جملے بمشکل بولے تھے۔

”تم یہاں سے کہیں بھی نہیں جاؤ گی سنا تم نے۔“ روز نے گرج کر کہا تھا۔

”تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے۔؟“

”میں۔“ روز نے اپنا دایاں بازو ہوا میں لہرایا اور ای بے ہنگم قسم کا قہقہہ لگایا۔

”میں تمہارا عاشق ہوں“ وہ اک پل کو رکا اور پھر بولا۔

”پورے چار سال تم میرا کھاتی رہی ہو۔ اگر حساب لوں تو ایک پائی بھی نہیں چکا سکو گی۔“

”اور پورے چار سال جو میں نے اس گھر میں نوکروں کی طرح کام کیا ہے تم بھی میرا معاوضہ نہیں دے پاؤ گے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تنفر سے بولی تھی۔

”واہ — اب تو بولنا بھی آگیا ہے۔“ روز استہزائیہ ہنسا۔

اگلے دو دن اسی پریشانی کے عالم میں گزرے تھے۔ وہ جب بھی یہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ کرتی ایزن کی معصوم صورت اس کے قدموں میں زنجیر کر لیتی تھی۔

چار جولائی امریکہ میں قومی تعطیل تھی تمام سرکاری اور نجی ادارے بند تھے۔ اس دن تمام ڈسکو کلب لوگوں سے کچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ روز بھی دل بہلانے کو کلب چلا گیا تھا اس کے جانے کے بعد سویٹا

نے بہت سکون سے اپنی تمام تیاری کر لی۔ اگلی صبح وہ ایزن کو اپنے ساتھی ہی لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ روز کو ایزن کے وجود سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اپنے ایزن کو ایسے بے غیرت باپ کے پاس چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا۔ عجیب نامانوس شور اور گانے کی بھدی آواز سن کر سویٹا کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ ہمیشہ دروازہ لاک کر کے سوتی تھی مگر اس وقت نا صرف لاک کھلا تھا بلکہ روز بڑے اطمینان سے ہاتھ میں وہسکی کی بوتل پکڑے صوفے پر بیٹھا اسے بغور دیکھتے ہوئے گھونٹ پر گھونٹ پی رہا تھا۔

”ہائے ڈارلنگ، تم اٹھ گئی ہو“ روز چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا تھا۔ سویٹا ایک دم ہی خوف و دہشت کے احساس سے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ روز اب لڑکھڑاتا ہوا اس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”بہت انتظار کروایا تم نے، روز ویلٹ اتنا صابر ہر گز نہیں ہے۔“ اس نے سویٹا کا بازو پکڑ کر پوری بوتل خالی کر کے کارپٹ پر پھینک دی تھی۔ سویٹا نے اپنا بازو چھڑوانے کی ناکام کوشش کی۔

”تم بہت — اچھی ہو — سویٹی —“ روز نے مسکرا کر اس کے ہاتھ کو چوما۔ سویٹا ایک جھٹکے سے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔

”چار سال — اس کی محبت میں تڑپتا رہا ہوں —“ روز نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا تھا۔ سویٹا کو یہی لمحہ غنیمت لگا تھا۔ وہ ننگے پاؤں سرعت سے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ روز بھی اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔ سویٹا اندھا دھند بھاگتے بیرونی دروازہ عبور کر گئی تھی اس نے پیچھے روز کی خوفناک آواز سنی۔ وہ اسے گالیاں دے رہا تھا۔ سویٹا نے مڑ کر دیکھا روز

سڑک پر کھڑا کتوں کی طرح بھونک رہا تھا اور اس کے پیچھے ایزن دھواں  
دھار روتے ہوئے اسے پکارتا جا رہا تھا۔ سویتا نے آخری مرتبہ ایزن کو دیکھا  
اور گھور تاریکی میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

بھوک نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ پینتیس گھنٹوں میں اس نے آٹھ مرتبہ پانی  
پیا تھا۔ اسوقت بھی وہ پانی پی کر سڑک کے کنارے بیٹھے بھکاری کے بالکل  
پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر تھکن نے جال بن رکھا تھا۔ جبکہ  
آنکھیں بے حد سرخ تھیں۔ اس کے قریب بیٹھے بھکاری نے گردن موڑ کر  
نڈھال گھٹنوں میں سر چھپائے ہوئے ہولے ہولے لرزتی ہوئی لڑکی کو دیکھا  
تھا۔ شاید وہ اسے بھکاری سمجھ رہا تھا۔ اسی لئے بوڑھے بھکاری کے چہرے پر  
ناگواری پھیلتی چلی گئی۔

”ہو— ہو لڑکی“ بھکاری نے گلے سے عجیب و غریب آواز نکال کر شاید اسے  
پکارا تھا۔ سویتا نے سر اٹھا کر دائیں طرف دیکھا۔

”یہاں سے اٹھ جاؤ۔ یہ میرا ایریا ہے“ وہ غصے سے بولا تھا۔ سویتا نا سمجھی کے  
عالم میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بھکاری جھنجلا اٹھا تھا۔  
”میں کہہ رہا ہوں۔ اس مارکیٹ کے سامنے میں مانگتا ہوں۔ تم اپنے لئے  
کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈو۔“

”اوہو— اچھا۔“ سویتا کے لب مسکرا اٹھے تھے۔

اسی اثنا میں ایک ادھیڑ عمر عورت بہت سے شاپرز ہاتھوں میں پکڑے پھولی  
سانسوں کے ساتھ ان کے قریب سے گزری تھی۔ دو قدم مزید چلنے کے بعد  
وہ کچھ یاد آنے پر رک گئی۔ شاپرز نیچے رکھنے کے بعد اس نے ہینڈ بیگ میں  
سے چند سکے نکالے اور بھکاری کی طرف بڑھا دیئے۔ اسی پل اس کی نگاہ اس  
بے حد حسین لڑکی پر پڑی جو نجانے کس بات پر مسکرائے جا رہی تھی۔  
”نی ثریا! دو منٹ رکنا ذرا“ ثریا نے مڑ کر دیکھا—وینا بھی ہاتھوں میں  
مختلف اشیاء سے بھرے تھیلے اٹھائے تقریباً بھاگتے ہوئے ان کے قریب آئی  
تھی۔



”تم مارکیٹ آئی ہو بھلا مینوں وی پتا ہوندا تو میں وی تمہارے نال ای آجاتی“

وینا نے کمال بے تکلفی کے ساتھ چند تھیلے ثریا کو زبردستی تھام کر طویل سانس خارج کی اور بالکل ثریا کے انداز میں ہی ایک سکہ پرس میں سے نکال کر بھکاری کی طرف بڑھا دیا۔ اسی پل وینا کی نگاہ فٹ پاتھ پر بڑے پرسکون انداز میں بیٹھی سویٹا پر پڑی۔

”نی ثریا! ادھر ویکھ (دیکھ)۔ ہائے نی میں مرجاواں، کوئی حال اے نو جوان جان کڑی ایڈی سوہنی فقیرنی بن کر بیٹھی اے۔ کوئی کم کاج کر۔ ہائے نی امریکہ۔ آ کے وکھرے وکھرے نظارے ای ویکھن نوں ملدے سن۔“ وینا نے باقاعدہ ہاتھ ملتے ہوئے چلا کر کہا تھا۔

”شکل سے بھکارن تو نہیں لگتی۔“ ثریا نے بغور اس خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

”نا۔ کسے دی شکل تے کش نہیں لکھیا ہوندا۔“ وینا نے دائیں بائیں سر ہلایا۔

”کیا نام ہے بیٹا تمہارا اور یوں فٹ پاتھ پر کیوں بیٹھی ہو؟“ ثریا نے کچھ سوچتے ہوئے اس کے تھکن زدہ چہرے پر نگاہیں جما کر نرم آواز میں پوچھا تھا۔

اس نے اپنا نام بتایا تھا اور وجہ بھی۔ وہ آپس میں انگلش میں بات کر رہی تھیں۔ وینا کچھ دیر تو صبر کے ساتھ سنتی رہی اور پھر قدرے ناراضی سے بولی تھی۔

”مینوں وی کج دسو جی۔“

”تم میرے ساتھ آؤ۔“ انہوں نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

”ایہہ ساڈے نال کیوں جارہی اے جی؟“ وینا نے بے چینی سے پوچھا۔

”یہ اب ہمارے ساتھ رہے گی۔“

”نئی ثریا بہن تسی کی آکھدے ہو - میرے پلے تے کج نئی پیا - میم ساڈے نال کس طرح رہوے گی -“ وینا فکر مندی سے بولی تھی - دراصل ثریا نے اپنے نچلے پورشن کو وینا اور وکرم سنگھ کے حوالے کر رکھا تھا۔

”جس طرح تم لوگ میرے ساتھ رہتے ہو اسی طرح اب یہ بھی رہے گی -“ ثریا نے نرم آواز میں کہا تھا۔

وہ ثریا آنٹی کے گھر میں داخل نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک مضبوط پناہ گاہ میں آگئی تھی - یہاں آکر اسے اگرچہ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر دل و روح میں ایک اطمینان بھی اتر گیا تھا۔ وہ جھیل میں ٹھہرے پانی کی طرح پرسکون ہو گئی تھی۔

ثریا آنٹی کی ذات اس کیلئے بہترین درس گاہ ثابت ہوئی تھی اس نے ان سے وہ کچھ پالیا تھا جس کی اسے تلاش تھی -، چاہ تھی اور جب کوئی انسان کوئی کام کر لینے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود ہی اس کیلئے آسانیاں پیدا فرما دیتا ہے - اس نے حق کو جاننے کی کوشش اور حق کے راستے پر چلنے کا ارادہ

کیا تھا۔ اللہ نے اس کے ذہن اور دل کو کھول دیا تھا۔ اس نے قرآن پاک کی آیات اور احکامات کو دل سے پڑھا سمجھا اور ان پر عمل کیا۔

”قرآن پاک ایک مقدس کتاب ہے“

”قرآن ایک مقدس کتاب ہے“

وہ اپنے ہی دھیان میں مگن پودوں کو پانی دیتے ہوئے زیر لب بڑبڑا رہی تھی - جب وکرم سنگھ نے بے انتہا حیرانی سے اس انگریز لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کام کے سلسلے میں پچھلے چار پانچ ماہ سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی نے اسے ایک ایسی لڑکی کے بارے میں فون پر باخبر کر دیا تھا جو کچھ عرصے پہلے میڈم ثریا کو فٹ پاتھ پر بیٹھی ملی تھی - پھر وہ لڑکی میڈم ثریا کے ساتھ ان کے گھر آگئی اور کچھ ہی عرصہ میں اس کی بیوی نے اسے بتایا کہ وہ انگریز لڑکی اسلام قبول کر چکی ہے۔

”کون ہو تم؟“ وکرم سنگھ کچھ سوچتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اس نے کچھ چونک کر اس درمیانی عمر والے آدمی کی طرف دیکھا اور بولی۔

”میں عائشہ ہوں اور تم؟“

”مجھے وکرم سنگھ کہتے ہیں“ وکرم نے اپنا تعارف کروایا۔ عائشہ نے مسکراتے ہوئے اخلاقاً اس سے حال احوال پوچھا۔ وہ وینا کا شوہر تھا۔ اسی لئے عائشہ کیلئے قابل احترام تھا۔

”وینا اور آنٹی ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔ تم بیٹھو میں تمہارے لئے کافی لے کر آتی ہوں“

میزبانی کے مکمل آداب بھی اس نے ثریا آنٹی سے سیکھے تھے۔ وہ جب تک کافی بناتی رہی تھی وکرم سنگھ اسے بغور دیکھتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ عائشہ کو اس کے یوں ایک ٹک دیکھنے سے الجھن ہونے لگی تھی۔

”تم کہاں سے آئی ہو؟“ اس نے وکرم کو کافی کا گپکڑایا تھا اور خود پلٹنے لگی تھی جب وکرم کے بے تکلفانہ سوال کو سن کر ٹھٹک گئی۔

”میں نے اس قسم کا کوئی سوال تم سے پوچھا ہے؟“ عائشہ نے سنجیدگی سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ وہ حیرانی سے بولا تھا۔

”پھر تمہیں بھی کوئی حق نہیں پہنچتا مجھ سے کوئی بھی سوال پوچھنے کا۔“ عائشہ رکھائی سے کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

”سنو۔“ وکرم بلند آواز میں بولا۔

”کیا ہے۔“ وہ کرخت لب و لہجے میں کہہ کر اک لمحے کیلئے رکی تھی۔ وکرم نے کافی کا بڑا سا سپ لیا اور بولا۔

”تم اچھی لڑکی ہو۔“

”مجھے پتا ہے۔“ وہ تنک کر بولی اور اپنے کمرے میں گھس گئی۔ ان دنوں وہ

نماز یاد کر رہی تھی اور قرآن پاک کے تیسویں پارے کی آخری سورتیں بھی حفظ کر رہی تھی۔ پھر اس نے جائے نماز بچھایا اور نوافل ادا کئے۔ وہ دن

میں کئی کئی مرتبہ نوافل ادا کرتی تھی۔ تاکہ اسے نماز کا طریقہ نہ بھول جائے۔ نفل ادا کرنے کے بعد اس نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے تھے۔ پہلے پہل وہ

نماز پڑھنے کے بعد بغیر دعا کئے ہی اٹھ جاتی تھی۔ پھر ثریا آنٹی نے ہی اسے دعا مانگنے کا طریقہ بتایا تھا۔

”دعا عبادت کا مغز ہوتی ہے۔“ ثریا آنٹی نرمی سے بتاتی تھیں۔ یوں اب وہ بہت طویل دعا مانگنے لگی تھی۔ اس دعا میں صرف اور صرف ایزن کا ذکر ہوتا تھا۔ اس کا دل ایزن کی یاد میں ہر وقت تڑپتا رہتا تھا۔

پنکی کے اونچا بولنے اور رونے چلانے کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گئی تھی اور پھر سر جھٹکتے ہوئے باہر آگئی۔

”تم نے گھر کو گیسٹ ہاؤس بنا لیا ہے“

”بکو مت۔“ ثریا آنٹی بے زاری سے بولی تھیں۔

”میری باتیں تمہیں زہر سے بھی بری لگتی ہیں۔“ بس اس ”سکھنی“ کی ہر

بات پسند ہے یا پھر اس گوری کی پنکی تنٹنا اٹھی تھی۔ غصے کے عالم میں اس

کے چہرے کا رنگ مزید سیاہ ہو جاتا تھا۔

”چلی جا۔ اپنا کام کر میرا دماغ نہ کھاؤ“

”مجھے بھی تمہارے پاس بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں ہے میں کہہ رہی ہوں کہ اس میم کو یہاں سے چلتا کرو می ! ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“ پنکی نے ثریا آنٹی کو دھمکانا چاہا۔

”تجھ سے برا کوئی ہو بھی کیسے سکتا ہے۔“ ثریا آنٹی آرزوگی سے بولی تھیں۔ پنکی دھپ دھپ کرتی باہر نکلتی چلی گئی۔

...☆☆☆...

”میں جاب کرنا چاہتی ہوں آنٹی۔“ اگلی صبح ناشتے کی میز پر اس نے ثریا آنٹی سے اجازت طلب کی تھی۔ ثریا آنٹی کا گویا سیروں خون بڑھ گیا۔



”شوق سے کرو بیٹی! بلکہ میں وکرم سے بات کرتی ہوں۔ وہ جس ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ وہاں تمہارے لئے بھی جگہ بنا دے گا۔“

صرف ایک ہفتے بعد وکرم سنگھ کی مہربانی سے اسے ایک معیاری ہوٹل میں جاب مل گئی تھی۔ ڈیوٹی جوائن کرنے کے بعد وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ پھر جب اس نے پہلی تنخواہ لا کر ثریا آنٹی کی ہتھیلی پر رکھی تو انہوں نے بے ساختہ اس کی پیشانی کو چوم کر تمام پیسے واپس کر دیئے۔

”عائشہ ان پیسوں کو تم جمع کرو۔ مشکل وقت میں کام آئیں گے۔ مشکل وقت بھی تو بغیر آہٹ کئے دبے پاؤں آجاتا ہے۔“ ثریا آنٹی نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔

ثریا آنٹی کے کہنے پر ہی وہ وکرم سنگھ کے ساتھ آنے جانے لگی تھی۔ ورنہ پہلے ہفتے تو وہ لوکل بس کے ذریعے ہی آتی جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ وکرم سنگھ کی شرافت اور اخلاق سے متاثر ہو گئی تھی۔

وہ دن چھٹی کا تھا۔ امریکہ کے اس خوبصورت شہر میں سنہری دھوپ نے پر مارا تو گویا ہر شے چمک اٹھی تھی۔ وہ ٹیرس پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ اب وہ قرآن پاک کو عربی زبان میں پڑھنے لگی تھی۔ تلاوت کرنے کے بعد اس نے قرآن پاک کو چوما آنکھوں سے لگایا اور احترام سے اپنے کمرے کی الماری کے اوپر رکھ آئی۔ ایک مرتبہ پھر نرم گرم دھوپ کا مزا لیتے ہوئے وہ اپنی گزشتہ زندگی کو سوچنے لگی۔ اور پھر ایکدم ہی جھرجھری سی لے کر خود کو تمام سوچوں سے آزاد کر کے خوشنما پھولوں کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وکرم ہاتھ میں چائے کا مگ پکڑے آگیا۔

”چائے پیو گی عائشہ؟“

”نہیں۔“ اس کے ہاتھ میں موجود اکلوتے کپ کو دیکھ کر اس نے انکار کر دیا۔ وکرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا تھا۔

”تم انڈیا کب جا رہے ہو؟“ اس معنی خیز خاموشی سے بے زار ہو کر عائشہ نے سرسری پوچھا۔

”پرسوں وینا چلی جائیگی۔“ وہ بے خیالی میں بولا تھا۔

”تم نہیں جانو گے؟۔“

”نہیں۔“

”عائشہ میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں“ کچھ پل مزید خاموش رہنے کے بعد وکرم نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا۔“ عائشہ نے چونک کر وکرم سنگھ کی طرف دیکھا۔

”یہ لو — اسے بہت غور سے پڑھنا اور پھر کوئی بھی فیصلہ کرنا۔ دراصل

میں تمہیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری راہنمائی ٹھیک سے نہیں ہوئی۔ تم

نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ ثریا میڈم نے تم سے کہا اسلام قبول کرلو اور

تم نے کر لیا۔ تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا۔ پھر۔“ کچھ دیر بعد وہ ایک سفید

کپڑے میں لپیٹی کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ عائشہ نے ناگواری سے کہا تھا۔

”یہ ہماری مقدس کتاب ہے اگر تم —“

”وکرم سنگھ —“ ثریا آنٹی نہ جانے کب ٹیرس پر آئی تھیں۔ مارے غصے اور

اشتعال کے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وکرم بوکھلا کر ایک دم کھڑا ہو گیا

تھا اور پھر نہ جانے کتنے گھنٹے وہ ثریا آنٹی سے معافی مانگتا رہا تھا۔ جنہوں نے

اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ اس مشرک کو مزید ایک پل بھی

اپنے گھر میں نہیں ٹھہرانا چاہتی تھیں۔ وکرم اور وینا کے جانے کا سن کر پنکی

بہت خوش ہوئی تھی۔

”چلو دو بلائیں تو ٹل گئیں۔“ وہ سارے گھر میں تھرکتی پھر رہی تھی۔

”تو نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے پنکی! کیوں ماں کو اتنا ستاتی

ہو؟ تیرے غم میں کڑھ کڑھ کے میں ایک دن ختم ہو جاؤں گی“ رات کو

پنکی کا موڈ خوشگوار دیکھ کر ثریا نے ایک مرتبہ پھر اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”میرے ساتھ تو نہ جانے کون سا بیر باندھ رکھا ہے تم نے می! میری

خوشی برداشت ہی نہیں ہوتی تم سے۔“ وہ غصے سے چلائی تھی۔

”میں ماں ہوں تیری۔“ ثریا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”جانتی ہوں۔“ پنکی نے برا سا منہ بنا یا۔

”سنو سویٹا! آج میرے ساتھ کلب چلو گی؟“ پنکی نے بہت عرصے بعد اسے براہ راست مخاطب کیا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیوں۔“ پنکی کو عادتاً ایک مرتبہ پھر غصہ آگیا تھا۔

”زیادہ نیک پروین بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو میرے ساتھ۔“ وہ ضدی لب و لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”کہا نہ میں نہیں جائوں گی۔ ابھی نماز پڑھوں گی، پھر قرآن پاک کی تلاوت کروں گی۔ اس کے بعد ایک طویل نیند لینے کا ارادہ ہے میرا۔“ اس نے مختصر اپنا شیڈول پنکی کو بتایا تھا۔

”اس بڑھی نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ پاگل کردے گی تمہیں یہ عورت۔“ پنکی نے ہمیشہ والے الفاظ دہرائے تھے۔ ثریا آنٹی ک

”مجھے شور ہنگاموں سے نفرت ہے۔ میں آنٹی کے پاس سکون محسوس کرتی ہوں۔“ وہ پنکی کے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی۔

”کاش کہ تمہارے معاشرے کی ساری لڑکیاں تمہاری طرح سوچنے لگیں۔“ پنکی نے طنزاً کہا تھا۔

”ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ ملانی بننے سے پہلے تو تم کلبز، پارٹیز اٹینڈ کرتی ہو گی۔ ایک بات تو تم مجھے سچ سچ بتانا کتنے لڑکوں کے دلوں کو لوٹا ہے تم نے“ پنکی کا احساس کمتری عود آیا۔

”کاش کہ تم سدھر سکو پنکی۔“ ثریا نے رنجیدگی سے کہا تھا۔

”اوکے می، میں چلتی ہوں۔ تم لوگ بیٹھ کر باتیں کرو“ پنکی نے ہنسی دبائی اور یہ جا وہ جا۔

”آئی! میں آپ کا سر دباؤں۔“ ثریا کو سر پکڑ کر کراہتے دیکھ کر وہ فوراً ان کی طرف لپکی تھی۔

”عائشہ میری دراز سے دوا لے کر آؤ۔“ انہوں نے کنپٹیاں دباتے ہوئے مدہم آواز میں کہا تھا۔

عائشہ جب تک پانی اور دوا لے کر آئی ثریا آئی ہمیشہ کیلئے تمام تکلیفوں سے نجات پاگئی تھیں۔ عائشہ نے ساکت نظروں سے ثریا کے پر سکون چہرے کی طرف دیکھا اور ان کے قدموں سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ رات کے اڑھائی بجے چکراتے سر اور سرخ آنکھوں سے روتی دھوتی عائشہ کو دیکھا تو اک پل کیلئے اسے بھی زمان مکان بھول گئے تھے۔

”ممی مر گئی ہیں۔“ پنکی منہ ہی منہ میں بدبدائی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگی۔

☆☆☆

ثریا آئی کے مرنے کے بعد پنکی نے بھی آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ پنکی اپنی ماں کو پاکستان دفنانے کے بعد واپس آئی تو عائشہ کو ابھی تک گھر میں موجود پا کر اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

”تم نے ابھی تک میرا گھر خالی نہیں کیا؟“

”مجھے تھوڑی سی مہلت دے دو۔“ عائشہ نے سر جھکا کر آنسو پیتے ہوئے کہا۔

”کتنی مہلت — ایک گھنٹے دو گھنٹے یا پھر ایک رات؟“ پنکی نے کٹھور پن کی انتہا کردی تھی۔

”اس وقت تک کہ مجھے نئی جاب کے ساتھ ٹھکانہ بھی مل جائے۔ میں اسی گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔“

عائشہ نے لرزیدہ آواز میں کہا تھا۔ وکرم سنگھ نے ناصرف ہوٹل کے مالک کو یہ بتادیا تھا کہ سویٹا نامی یہ لڑکی مسلمان ہے بلکہ اس کی جاب ختم کروانے میں بھی وکرم سنگھ کا ہاتھ تھا۔ ثریا آئی کے گھر سے ہمیشہ کیلئے نکل جانے سے پہلے وہ اسے بہت دھمکتا رہا تھا۔ وہ دس سالوں سے ثریا کے گھر میں



بغیر کرایہ دیئے ٹھاٹ سے رہ رہا تھا۔ صرف اور صرف اسی لڑکی کی وجہ سے اسے گھر سے نکالا گیا تھا۔

ان دنوں عائشہ نئی جاب کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس کے پاس جتنی بھی رقم جمع تھی وہ سب ختم ہو گئی تھی۔ پینکی صبح کچن کو لاک کرنے کے بعد گھر سے نکل جاتی تھی اور رات گئے اس کی واپسی ہوتی۔ اپنے کھانے پینے کا سامان اسے خود لانا پڑتا تھا۔ بجلی کے بل وغیرہ سے لے کر کمرے کے کرائے تک پینکی نے بالکل بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔ پہلی تاریخ کو وہ ڈھیٹوں کی طرح اس سے کرایہ مانگنے کیلئے آگئی تھی۔

”تم کچھ انتظار نہیں کر سکتیں؟“ عائشہ نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی۔ پینکی کی بھنویں تن سی گئیں۔

”نہیں۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”میں اس گھر سے جب جائوں گی تو تمہارا حساب بے باک کردوں گی۔ اس بات کی فکر مت کرو عائشہ تمہیں دھوکہ دے کر بھاگ جائے گی۔ مجھ پر

اعتماد کرو اور مجھے یوں پریشان مت کرو۔“ اس کے آنسو گالوں پر لڑھک آئے تھے۔

تین مہینے کی نجل خواری کے بعد اسے مسٹر پال کے سٹور میں جاب مل گئی تھی۔ اگلے دو مہینے دن رات کام کرنے کے بعد اس نے پینکی کا قرض اتارا اور آنٹی ڈیزی کے مکان میں شفٹ ہو گئی۔ آنٹی ڈیزی بھی اس کیلئے بہت مخلص ثابت ہوئی تھیں مگر وہ تین مہینے سے زیادہ ان کے گھر نہیں ٹھہر سکی وجہ ان کا بیٹا لکی تھا جس کے بے جا التفات اور گھٹیا حرکتوں نے عائشہ کو بددل کر دیا تھا۔

جس دن وہ ڈیزی کو الوداع کہہ کر آنٹی روتھ کے گھر میں آئی تھی۔ اس دن وہ بے انتہا روئی تھی۔ نہ جانے ابھی کتنا سفر باقی تھا۔ کہاں کہاں مزید بھٹکنا تھا۔ کتنی اذیتیں اپنے ناتواں دل پر سہنی تھیں۔ ماضی سے حال تک کا سفر انتہائی کٹھن تھا۔

رات بیت گئی تھی۔

افیت بھرا دن طلوع ہو رہا تھا۔

صبح نوخیز کے ہرے پر کتنے زخم تھے۔

پیر آبلہ پاتھے، آنکھوں میں حیرت چمک رہی تھی اور ہاتھ خالی تھی۔ دل رو رہا تھا۔ محبت وحشت زدہ آنکھیں نوحہ کناں تھیں۔

رات بھر برف باری ہوتی رہی تھی۔ ہر شے برف کی سفید چادر کے نیچے چھپ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر بمشکل دیکھا۔ ایزن اس کی گود میں سر رکھے گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اکڑی گردن کو سیدھا کرنا چاہتی تھی مگر اس کی گردن دائیں جانب کو لڑھک گئی تھی وہ اپنی گزشتہ زندگی کو سوچتے سوچتے تھک گئی تھی۔ اک گہری پرسکون نیند اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

☆☆☆

”بیوی یار! اب اٹھ بھی چکو۔ آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔ ناشتہ بنا دو مجھے۔ اگر آج بھی لیٹ پہنچا تو وہ انگریز کا پتر کان سے پکڑ کر نکال باہر کرے گا۔ دفتر میرے باپ کا تھوڑی ہے کہ جب دل کرے منہ اٹھا کر چلا جائوں۔ اب اٹھ بھی جائو ڈیئر فارینہ۔“ احمر نے ٹائی کی ناٹ کسنے کے بعد پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور سوئی ہوئی فارینہ پر بے فکری سے اسپرے کرنے لگا۔ اس کی توقع کے عین مطابق فارینہ نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسے ”خوشبو“ سے الرجی تھی۔ اور احمر اسی بات سے ہی فائدہ اٹھاتا تھا۔ ورنہ فارینہ تو گویا مردوں سے شرط باندھ کر سوتی تھی۔

”کیا مصیبت ہے۔“ وہ ناک دباتے ہوئے واش روم کی طرف بھاگی۔ احمر نے مسکراتے ہوئے موبائل اٹھا کر علی کو ایس ایم ایس بھیجا۔ مس کالز کیں مگر فون آف تھا۔

”خیر تو ہے۔“ احمر نے فکر مندی سے ماتھے پر ہاتھ مار اور پھر بے دلی کے ساتھ بال بنا کر باہر نکل آیا۔ ناشتہ بھی اس نے برائے نام کیا۔ فارینہ اس کا

کوٹ اور بریف کیس اٹھا کر بیرونی دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئی تھی۔

احمر نے جوں ہی باہر پہلا قدم رکھا۔ وہ ایک دم چوکا، ٹھنکا اور پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

یہ نظر کا دھوکہ نہیں تھا، بلکہ وہ واقعی عائشہ تھی جو کہ ہوش و خرد سے بے گانہ ٹھنڈے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے قریب ہی چار ساڑھے چار سال کا بچہ منی منی آنکھوں کو کھولے احمر کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

”عائشہ یہاں اس حالت میں کیسے پہنچی ہے؟“

فارینہ کے لبوں نے بے آواز حرکت کی تھی اور پھر وہ احمر عائشہ کو جھنجھوڑنے لگے تھی۔

”احمر! اسے ہسپتال لے چلتے ہیں۔“ فارینہ پریشانی سے بولی۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ احمر لب بھینچتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

عائشہ کو فوراً ہی ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ز کے کہنے کے مطابق اس کا نروس بریک ڈائون ہو گیا تھا اور اگلے چھتیس گھنٹے اس کیلئے بے حد خطرناک تھے۔ اگر اسے ہوش نہ آیا تو وہ کوما میں چلی جائیگی۔ کومے کا دوسرا نام بھی موت تھا ہی ہے۔ وہ ایسی زندگی جیسے گی جو موت کی طرح ہو گی۔

کوئی بڑا صدمہ، دکھ یا غم جس نے اس کے دماغ کو مفلوج کر دیا تھا۔ اس کی یہ حالت کیسے ہوئی؟۔ علی کا نمبر کیوں بند ہے؟ کیا ان دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ اور یہ بچہ کون ہے؟۔

ان ڈھیر سارے سوالیہ نشانوں نے احمر کو چکرا کر رکھ دیا۔ عائشہ آئی سی یو میں تھی۔ فارینہ کو بتا کر ہسپتال کے احاطے سے نکل آیا تھا۔

احمر کو اچانک خیال آیا تھا کہ علی کو یقیناً ڈاکٹر ایرتھ کے کلینک میں ہونا چاہئے۔ زین ڈاکٹر ایرتھ کے کلینک میں ایڈمٹ تھا۔ احمر نے کیتھی (نرس) سے فون پر رابطہ کیا۔

”مسٹر علی کل رات سے کلینک نہیں آئے۔“ نرس پروفیشنل لب و لہجے میں بولی تھی۔

”زین کے پاس اس وقت کون ہے؟“ علی اپنی گھبراہٹ پر بمشکل قابو پا کر بولا۔

”زین کی مدر۔“ کیتھی نے مطلوبہ معلومات دینے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔ احمر کچھ سوچ کر علی کے فلیٹ کی طرف آگیا۔ راستے بھر عجیب و غریب خیالات نے اسے حد درجہ متوحش کر رکھا تھا۔

فلیٹ کا دروازہ لاکڈ تھا۔ علی اٹے قدموں واپس مڑا۔ وہ کلینک میں بھی نہیں تھا۔ گھر میں بھی نہیں تھا تو پھر علی تھا کہاں۔ گیا اسے نہیں پتا کہ اس کی بیوی رات بھر میرے دروازے پر زخمی حالت میں پڑی کراہتی رہی ہے۔

اس وقت عائشہ کی کتنی بری کنڈیشن ہے۔ وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے کیا علی اس تمام صورتحال سے انجان ہے؟

”نہیں، ہر گز نہیں۔“ احمر نے دائیں بائیں سر ہلایا اور ایک مرتبہ پھر ہسپتال کی طرف گاڑی کا رخ کر لیا۔

علی کہاں تھا یہ تو خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ اس برفانی رات کے تیسرے پہر وہ اپنی ذات میں گم ہو جانے والے حصے کو اندھیرے میں تلاش کر رہا تھا وہ خود اپنے آپ کو تلاش کر رہا تھا۔

صرف اور صرف پینتیس سیکنڈز نے اسے زندوں سے مردوں کی صف میں لاکھڑا کیا تھا۔

وہ خود کو اسی پل اسی لمحے مٹی کا ڈھیر محسوس کر رہا تھا۔ ایسا ڈھیر جس میں سانس باقی نہیں رہی تھی جس کی نمی چند لمحوں میں ہی خشک ہو گئی تھی۔

”میں نے تم پر اعتماد کیا، اعتبار کیا، تمہیں گھر دیا، سائبان دیا، محبت دی اور بدلے میں مجھے کیا ملا صرف اور صرف دھوکہ۔“ وہ آنکھیں موندے عائشہ کے پیکر سے مخاطب تھا۔



”تم کون تھیں کہاں سے آئی تھیں؟ میں نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا۔  
کچھ بھی نہیں پوچھا۔ کیا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی احمق ہو گا۔“ اس کی آنکھ  
سے ایک ستارہ ٹوٹا تھا۔ وہ چہرہ صاف کر کے زیر لب بڑبڑاتا رہا۔

”میں تم سے نفرت کرتا ہوں، شدید ترین نفرت، سنا تم نے۔“ وہ بلند آواز  
میں چلایا تھا۔ اور پھر تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا اپنے گھر کی طرف آگیا۔  
وہ گھر جو اب ایک دفعہ پھر ان کا ہو گیا تھا۔

اس گھر میں کل تک وہ پورے استحقاق سے چلتی پھرتی چھوٹے چھوٹے کام  
نبٹاتی نظر آتی تھی۔ اب وہ کہیں نہیں تھی مگر اس کی یادیں، باتیں اس کی  
ہنسی کی جھنکار اسے ہر سمت سنائی دے رہی تھی۔ وہ بے دھیانی کے عالم میں  
ہر شے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں گویا جھماکا ہوا تھا۔ اسے یاد  
آیا کہ آج زین کا آپریشن ہے۔ وہ تو چند گھنٹے پہلے گویا دنیا بھلائے بیٹھا تھا۔  
اپنے ہی غموں پر ماتم کرتے ہوئے وہ یکسر بھول چکا تھا کہ اس کا بیمار کمزور  
بھائی رات سے اس کی راہ تک رہا ہی۔

وہ اپنی ٹوٹی، بکھری ذات کی کرچیاں سمیٹتے خود پر بے حسی کا خول چڑھائے  
جب ڈاکٹر ایرتھ کے کلینک میں پہنچا تو زین کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا  
جاچکا تھا۔

زیرینہ اسے کوریڈور میں بیٹھی نظر آگئیں۔ ان کی نگاہیں بھی آپریشن تھیٹر کے  
دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ زین کا آپریشن ساڑھے آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ اک  
طویل صبر آزما انتظار کے بعد ڈاکٹر ایرتھ نے کامیابی کی خوشخبری سنا کر اسے  
پھر سے زندہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد زین کو پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا۔  
ایک گھنٹے بتیس منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

زین نے سب سے پہلے اپنے بھائی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر اس نے  
عائشہ کے متعلق استفسار کیا۔ وہ عائشہ کو نہ پا کر بے حد حیران تھا۔  
”بھابی کیوں نہیں آئیں؟“

”تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ علی نے سنی ان سنی کر کے بے حد پیار  
سے اس کی پیشانی کو چوما تھا۔

”ٹھیک ہوں“ وہ آہستگی سے بولا تھا۔

”میں چلتا ہوں اب اور ماما کو بھیجتا ہوں۔ وہ تم سے ملنے کو بے تاب ہو رہی

ہیں۔“ علی مزید سوالات سے بچنے کیلئے فوراً ہی باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد

زرینہ آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لئے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

”میرے چاند، میرے بیٹے“ زرینہ نے چٹا چٹ کئی بوسے اس کے سر اور منہ

کے لے ڈالے تھی۔

”میری دعائیں قبولیت کا درجہ پاگئیں۔ اللہ نے تمہیں نئی زندگی سے نوازا ہے

۔“ وہ آنکھیں رگڑتے ہوئے بولیں۔

”درد تو نہیں ہو رہا؟“ اسے مسلسل خاموش دیکھ کر زرینہ نے فکر مندی سے

کہا تھا۔ زین نے نفی میں سر ہلایا۔

”ماما بھائی کو کیا ہوا ہے۔ یہ اتنے چپ چپ کیوں تھے؟“ نگاہوں میں مچلتا

سوال نوک زبان پر آگیا تھا۔

زرینہ نے کچھ پل کیلئے سوچا اور پھر بولیں۔

”ہونا کیا ہے۔ میم کا فراڈ کھل گیا۔ تمہیں کیا بتائوں زین اسکا تو چار پانچ سال

کا بیٹا ہے۔ علی کو تو کل پتا چلا ہے۔ بے چارے کی حالت دیکھ کر میرا دل

کٹنے لگا ہے۔ بلا کیا ضرورت تھی میم سے بیاہ کرنے کی“ زرینہ نے مصنوعی

تاسف سے کہا۔ وہ تو کل رات سے ہی بے انتہا خوش تھیں عائشہ نام کا

کانٹا خود بخود ہی نکل گیا۔ انہیں کسی قسم کی کوئی پلاننگ کرنے کی ضرورت ہی

محسوس نہیں ہوئی۔

”آپ کیا کہہ رہی ہیں ماما۔“ زین کمزور آواز میں گھبرا کر بولا۔

”یہی سچ ہے۔ پوچھ لینا اپنے بھائی سے۔“

”بھابی اب کہاں ہیں؟“

”علی نے اسے گھر سے نکال دیا ہے بے غیرتی کی حد دیکھو بچے کو لے کر

آگئی تھی۔ علی نے خوب بے عزت کیا مارا پیٹا اور گھر سے نکال دیا۔ اب نہ

جانے کہاں چلی گئی ہے بچے کو لے کر۔“ زرمینہ چٹخارہ لے کر من و عن سارا قصہ سنانے لگی۔

”میرا دل نہیں مانتا۔ وہ ایسی نہیں ہیں۔“ زین نے افسردگی سے کہا تھا۔ زرمینہ کو بہت برا لگا تھا۔

”اب تم علی کے سامنے یہ ذکر نہ لے کر بیٹھ جانا۔“

”اما! میں گھر جانا چاہتا ہوں۔“ زین بے چینی کے عالم میں چھت کو گھورنے لگا تھا۔

”ہاں — ہاں دو ہفتے دو ہفتے تک ڈاکٹر تمہیں چھٹی دے گا۔“

”یقیناً بھائی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے عائشہ بھابی سے ملنا چاہئے مگر وہ ہیں کہاں۔“ زین پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ گہری نیند میں جانے سے پہلے وہ مسلسل عائشہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔

ادھر زرمینہ جل بھن رہی تھی بیٹے کا بھائی اور میم کیلئے اتنا کانشیسی ہونا انہیں سخت زہر لگ رہا تھا۔

”علی زین کی کوئی بھی بات نہیں مالتا۔ کہیں وہ زین کے کہنے پر میم کو واپس نہ لے آئے۔“ انہوں نے فکر مندی سے سوچا تھا۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی بھی نہیں۔“ زرمینہ نے تنفر سے زیر لب کہا اور صوفے پر نیم دراز ہو گئیں۔

رات کو احمر آگیا تھا۔ وہ بے حد پریشان اور الجھا الجھا سا تھا۔ زین چونکہ سو رہا تھا اسی لئے وہ زرمینہ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”آنٹی علی کہاں ہے؟“

”اس وقت تو گھر پر ہی ہو گا۔“ انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

”میں ابھی گھر سے ہی ہو کر آرہا ہوں۔ موبائل اس کا آف ہے۔ خود نہ جانے کہاں ہے۔“ اس نے اپنے الجھے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”آئی ! علی اور عائشہ کا کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے؟“ زرمینہ کو امید نہیں تھی کہ وہ براہ راست اس سے یہ سوال کر ڈالے گا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ صاف مکر گئیں۔

”علی نے عائشہ کو مارا ہے اس کے سر پر شدید چوٹ آئی ہے اور وہ ہسپتال میں ہی۔“

”تو میں کیا کروں۔“ زرمینہ نے تنفر سے سوچا۔

”ان کی لڑائی کی وجہ کیا وہ بچہ ہے؟؟“ احمر نے بغور زرمینہ کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ شاید۔“ زرمینہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ احمر نے ایک طویل سانس کھینچا۔ وہ بچہ جو اپنا نام ایزن بتاتا ہے ان سب کیلئے ایک معمہ بن گیا تھا۔ ایزن کے بقول ایک انکل نے اس کی مے می کو بہت مارا تھا۔ گالیاں بھی دیں اور پھر دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔

ایزن بتا رہا تھا کہ مے می سویٹا اس کی ماں ہے۔ اس کے باپ کا نام روز ویلٹ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔

یہ انکشاف کم از کم احمر کے قدموں کے نیچے سے زمین سر کا گیا تھا۔ کبھی وہ شیشے کے پار بمشکل سانس لیتی عائشہ کو دیکھتا اور کبھی اس کے تصور میں علی کا چہرہ لہراتا۔ احمر کے دل پر گویا منوں بوجھ آپڑا تھا۔ اگر یہ سچ تھا تو انتہائی شرمناک تھا۔ اگر جھوٹ تھا تب بھی افیت سے بھرپور تھا۔

اس معمے کو کون حل کرتا۔ اس حقیقت سے پردہ اٹھانے والی خود زیست کی کشمکش میں مبتلا ہوش و خرد سے بے گانہ تھی۔

تو کیا اب ہمیں اس کے ہوش میں آنے تک اک طویل صبر آزما انتظار کرنا پڑیگا؟ کیا علی اتنا انتظار کر سکتا ہے؟ وہ تو جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

علی اس کا بہترین دوست، احمر اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس کے مزاج سے آشنا تھا۔ علی بے حد شدت پسند تھا۔ نفرتوں میں بھی اور محبتوں میں بھی



- علی کو اپنے باپ سے بے انتہا محبت تھی۔ مگر جب اس کے باپ نے اس سے نگاہیں بدلیں تو اس کے بعد علی نے کبھی بھی باپ سے محبت اور توجہ کی بھیک طلب نہیں کی تھی۔

تہمینہ نے خود علی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا پھر جب اس کی شخصیت کی پر تیں کھلیں تو علی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

گیارہ سال امریکہ جیسے ملک میں رہنے کے باوجود اس نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ تھا۔

گیارہ سال بعد اس نے شادی کا ارادہ بھی کیا تو ایک انگریز عورت کے ساتھ احمر اور فارینہ دونوں ہی حیران تھے۔ علی نے اپنے نکاح سے تین گھنٹے پہلے فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ شادی کر رہا ہے۔۔۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟ کہیں کچھ پی تو نہیں بیٹھے ہو۔“ احمر حیران پریشان سا چیخا تھا۔ وہ اور فارینہ اسے شادی کیلئے کہہ کہہ کر تھک چکے تھے مگر اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

”یہی سچ ہے۔“

”کون ہے وہ نیک بخت؟“

”کچھ دیر بعد خود بخود ہی پتہ چل جائے گا۔“

علی نے جواباً سسپنس پھیلانے کی کوشش کی تھی۔

”زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جلدی سے پھوٹو کون ہے وہ۔“

”مجھے نہیں پتا کہ کون ہے وہ۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ ساٹھ گھنٹے اور بارہ

منٹ پہلے تمہارے یا ر کو اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہی۔ مجھے یوں محسوس

ہونے لگا ہے کہ اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں ادھورا رہ جاؤں گا۔“

علی اتنے دلنشین انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا کہ احمر حیران ہی تو رہ گیا۔

”تم عائشہ کے بارے میں کتنا جانتے ہو؟“ اس کی شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد

احمر اس سے پوچھ رہا تھا۔ جواباً وہ لاپرواہی سے بولا۔

”کچھ بھی نہیں۔“

”تم نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے نا؟“

”سوچا تو بہت ہے مگر دماغ سے نہیں دل سے۔“ وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔  
احمر تپ اٹھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہ عائشہ کا ماضی کیا ہے؟“

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہاں اتنا ضرور یقین ہے کہ اس کا ماضی بے داغ ہے۔ اس کا کردار مضبوط ہے وہ شبنم کے قطرے کی طرح پاکیزہ اور مقدس ہے۔ صبح صادق کی تمام پاکیزگی اس کی آنکھوں میں حیا کی لالی بن کر پھیلی ہے۔ اس کی سابقہ زندگی کے بارے میں سوال کر کے خود کو اس کی نگاہوں میں گرانا نہیں چاہتا۔“ علی نے مضبوط لب و لہجے میں کہہ کر بات کو سمیٹ دیا تھا۔ یوں کہ احمر مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا اور اب اس وقت اس لمحے احمر، علی کے یقین ٹوٹنے، اعتماد کے ریزہ ریزہ ہو جانے پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

”میں کس طرح اپنے دوست کا سامنا کروں گا۔“ اس نے آرزوگی سے سوچا۔

☆☆☆

تین دن بعد علی خود ہی اس کے گھر آگیا تھا اور پہلی مرتبہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کچھ کہنے کیلئے الفاظ ڈھونڈنے پڑ رہے تھے۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔ فارینہ مونا کو ساتھ لئے ہسپتال جا چکی تھی۔ یزن مونا کے کمرے میں کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔

”زین کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ کافی دیر سوچنے کے بعد احمر کو بولنے کیلئے الفاظ مل ہی گئے تھے۔ علی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ مختصر بولا۔

احمر بغور علی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صرف چند دنوں میں ہی اس کے چہرے کی شگفتگی ماند پڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی سوچی سوچی سی تھیں۔

”اتنا شدید رد عمل دکھانے کی کیا ضرورت تھی اتنا مارا ہے تم نے اسے اگر پولیس شکایت کر دیتی، مر جاتی تو؟۔۔۔۔۔“

”اچھا تھا نا — پھانسی کے تختے پر لٹک جاتا۔ ذلت کے اس بوجھ سے تو نجات مل جاتی۔“ علی نے جلتی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر افیت سے کہا۔

”وہ ہسپتال میں ہے۔“ احمر دھیمی آواز میں بولا تھا۔

”تو میں کیا کروں۔“ علی کے اندر بھانپھڑ جل رہے تھے۔ وہ نچلا لب دانتوں سے کچل رہا تھا یہاں تک کہ خون کی ننھی سی بوند چھلک پڑی۔

”تم اسے دیکھنے نہیں جاؤ گے؟“

”کیا مجھے جانا جاہئے۔“ اس نے کیٹلی نگاہوں سے احمر کو گھورا۔

”علی ! ہمیں غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے“ احمر نے اس کے شانے پر نرمی سے دباؤ ڈال کر کہا تھا۔

”اونہ — غلط فہمی۔“ علی نے تنفر سے سر جھٹکا۔

وہ گھر آیا تو زین اور زرینہ پہلے سے موجود تھے۔ وہ ان دونوں سے نگاہیں چرائے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”بے چارہ علی —“ زرینہ لبوں میں ہنسی دبائے مصنوعی زنجیدگی سے بولی تھیں۔ زین نے غصے سے ماں کی طرف دیکھا۔

”ان مغربی عورتوں کا بھلا کیا بھروسہ، شکر ہے روپیہ پیسہ لے کر فرار نہیں ہوئی۔“ زرینہ نے ٹی وی آن کر کے آواز قدرے اونچی کر لی تاکہ علی تک ان کے نادر خیالات نہ پہنچ جائیں۔

”توبہ — توبہ چار پانچ سال کا بچہ چھوڑ کر دوسرا بیاہ رچا لیا۔ ان عورتوں کی حیا تو نہ جانے کہاں سوئی ہے۔“

وہ مسلسل گوہر افشانی کئے جا رہی تھیں۔ زین کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

”ماما! برا بولنے سے خاموشی بہتر ہے۔ آپ کسے سنا رہی ہیں۔ ان دیواروں کوئی وی کو یا پھر مجھے؟“

”میرے بیٹے کو تو میری ہر بات ہی بری طرح چبھتی ہے۔ کیا منہ پر ٹیپ چپکا لوں یا زبان کاٹ ڈالوں اپنی۔“ انہوں تنک کر کہا اور ریموٹ کارپٹ پر پھینک دیا۔

”یہ مت بھولیں کہ آپ بھائی کے گھر میں بیٹھی ہیں اور انہی کے متعلق فضول گوئی کر رہی ہیں۔“ زین نے انہیں سمجھانا چاہا۔

”ویسے تو بڑے عقلمند بنتے ہو۔ اپنے مستقبل کے بارے میں ہی بھائی سے بات کر لو۔ جب اس کے پاس کچھ نہ رہا تو پھر تم منہ ہی دیکھتے رہنا۔ یہی تو مناسب موقع ہے۔ اب خیر سے تم تندرست ہو۔ مسلسل دوائیوں کے استعمال سے بھلے چنگے ہو جائو گے دنوں میں ابھی سے اس کے کان میں بات ڈالو گے تو بات بنے گی کب تک اس کے در پر پڑے رہنا ہے۔“ زرینہ نے جلدی کر کر دل کی بھڑاس نکالی۔ زین تاسف سے ماں کی طرف دیکھتا رہا۔

زین کا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ اگر نہ بھی ہوتا تو تب بھی انہیں یہاں سے جانا نہیں تھا۔ اب تو خیر زین کے قریب رہنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ زین جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ زین تو کم عمر تھا ناسمجھ تھا۔ اس کے پاس کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف زین کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتی تھیں۔ انہیں صرف کاروبار کرنے کیلئے علی سے

سرمایہ درکار تھا۔ وہ اپنے قدم امریکہ میں جمانے کے بعد سوہا اور سوما کو بھی اپنے پاس بلانا چاہتی تھیں۔ جنہوں نے صرف دو مہینے ہی بمشکل شوہروں کو بھگتایا تھا۔ اب خیر سے دونوں ہی ہاسٹل میں رہ رہی تھیں۔

دراصل زرینہ کا جس ”قبیلے“ سے تعلق تھا وہاں بیٹیوں کو بڑھاپے کا سہارا سمجھا جاتا ہے۔

زرینہ کی ماں بھلے وقت میں بیٹی کو لے کر اندرون شہر کے ایک شریفوں کے محلے میں آن بسی تھی مگر یہ شرافت اسے کچھ راس نہیں آئی تھی۔ ادھر بیٹی نے نرسنگ کا کورس مکمل کیا اور ادھر ماں اپنے کسی سابقہ عاشق کے ساتھ فرار ہو گئیں۔ زرینہ ماں کے اس عمل سے سخت دلبرداشتہ ہوئی تھی۔ تاہم وہ بھی ماں کے ہی نقش قدم پر چل رہی تھی۔ خوبصورتی اسے وراثت میں ملی تھی۔ اس حسن و دلکشی کو زرینہ نے خوب کیش کروایا تھا۔ پہلے ڈاکٹر منیر جیسے شریف آدمی کو حسن کے جال میں پھانسا اور پھر سیٹھ حارث جیسے مالدار بندے پر لٹو ہو گئی۔ اس دوران اس کی ماں تہمینہ کو اس



کے حوالے کر کے وفات پاگئی تھی۔ ساری رات وہ مستقبل کی پلاننگ میں مصروف رہی تھیں۔ زین دوسرے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔

اگلے دن وہ ایک مرتبہ پھر اس کے روبرو تھیں۔

”زین بیٹا! آج تم ضرور علی سے بات کر لو۔“ انہوں نے لہجے میں ڈھیروں مٹھاس بھر کے زین کو پچکارتے ہوئے کہا تھا۔ زین ان کی بار بار کی تکرار سن کر زچ ہو اٹھا۔

”اما! مجھے ٹھیک تو ہونے دیں۔ ابھی میں اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ بغیر سہارے کے چل نہیں سکتا۔ کاروبار کیا خاک کروں گا۔ مجھے خود بھی بھائی پر بوجھ بننا پسند نہیں ہے۔ پہلے ہی میرے علاج پر انہوں نے اتنی بھاری رقم خرچ کر ڈالی ہے۔“

”لو یہ تو اس کا فرض تھا۔ تم اس کے چھوٹے بھائی ہو۔“ زرمینہ نے منہ بنا کر کہا۔

”ہاں سارے حقوق و فرائض انہی کے کھاتے میں ڈالتے جائیں۔ ہمارا تو کوئی فرض نہیں بنتا۔“ زین غصے سے بولا تھا۔

”ہمیں کون سا اس نے کبھی اپنا سمجھا ہے۔ میری تو ہمیشہ اس نے توہین تذلّیل کی ہے۔ مجھے کبھی اس نے ماں نہیں سمجھا۔“

”آپ نے بھی تو کبھی ماں بننے کی کوشش نہیں کی۔“

زین آرزوگی سے بولا تھا۔ زرمینہ نے ایک کٹیلی نگاہ اس پر ڈالی۔

”آج تم ہر صورت علی سے بات کرو گے۔“

”میں فی الحال بھائی سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کروں گا۔“ زین دھیمے مگر سخت لہجے میں بولا تھا۔

”تم میری بات نہیں مانو گے۔“ زرمینہ نے تیوری چڑھا کر زین کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ اس کے دو ٹوک انکار پر زرمینہ کو ایک مرتبہ پھر اپنے لہجے کو نرم کرنا پڑا تھا۔

”تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تو میں بھی چین سے مروں ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بچہ کامیاب ہو۔ میری خواہش انوکھی تو نہیں۔“

”میں بھی علی بھائی جیسی کامیابی چاہتا ہوں انہی کی طرح مضبوط بننے کی خواہش ہے میری، وہ اپنی محنت سے آج اس مقام پر ہیں۔ میں بھی۔“

”اچھا۔ بس بس سن لیا ہے میں نے مزید تقریر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم کنویں کے مینڈک بنے رہنا چاہتے ہو تو شوق سے بنو، میں کیا کر سکتی ہوں سوائے تمہاری عقل پر افسوس کرنے کے۔“

زرمینہ دانت پیس کر بولی تھیں پھر غصے میں بڑبڑاتے ہوئے اس کے کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔ زین نے تھک ہار کر سر تکیے پر پٹخ دیا۔

”ماں! مجھے یوں میری نظروں سے مت گرائو۔“

☆☆☆

”احمر بھائی میں بھابی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں، کیوں نہیں میں تمہیں عائشہ سے ملوانے لے چلوں گا مگر ابھی نہیں۔ ایک دو ہفتے تم مزید ریست کرو۔“ احمر نے خوشدلی سے کہا تھا وہ آج آفس جانے کے بجائے سیدھا ادھر آگیا تھا۔

”بھائی! ڈاکٹر ز بھابی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“ وہ عائشہ کے لیے کس قدر پریشان تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے اس کے باطن کی کیفیت عیاں ہو رہی تھی۔ عائشہ کیلئے دعا کرنے والے ہاتھ موجود تھے۔ احمر نے نرمی سے تسلی دینے والے انداز میں زین کے گال کو تھپکا اور پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”ڈاکٹر ز کے کہنے کے مطابق وہ غیر معینہ مدت تک کومے میں چلی گئی ہے۔ اس کی بے ہوشی کا وقفہ طویل بھی ہو سکتا ہے۔ چھ ماہ سے لے کر چھ سال تک یا اس سے بھی زیادہ۔“

”مجھے علی بھائی کے کٹھور روئے پر سخت حیرت ہو رہی ہے۔ جو سچ ہے وہ تو ایک دن ضرور کھلے گا مگر بھائی کو یوں عائشہ بھابی پر بہتان نہیں باندھنا چاہیے تھا۔“

”شاید میں یا تم اس کی جگہ ہوتے تو پھر یہی کرتے۔ انسان ایسے مقام پر بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔“ احمر پرسوچ انداز میں بولا تھا۔ وہ حد درجہ ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ کل رات اس کی اور فارینہ کی شدید جھڑپ ہوئی تھی۔

”احمر اس بچے کو بے بی کیئر سنٹر چھوڑ آئیں یا پھر اس کے باپ کا اتا پتا معلوم کر کے اس کے حوالے کر آئیں۔ میں کب تک ایزن کو سنبھالوں گی۔ خود تو وہ ہسپتال میں پڑی ہے جبکہ مجھے اس ”علت“ کو سنبھالنا پڑ رہا ہے۔ یہ ہمدردیاں مہنگی بھی پڑ سکتی ہیں۔ وہ نہ جانے اب ہوش میں آتی ہے بھی کہ نہیں۔ برے اعمالوں کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ جھوٹ اور گناہ کبھی پوشیدہ رہ سکتے ہیں۔ اپنے تئیں تو اس نے کمال کا ڈرامہ رچا کر بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے ہم سب کو، مجھے تو لگتا ہے اس نے اسلام بھی قبول نہیں کیا۔ اس

جیسی عورتوں کا بھلا کیا بھروسہ بہر حال میں آپ سے یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ ایزن کو میری نظروں سے دور کر دیں۔ آپ کو یہ نزاکتیں سمجھ میں کیوں نہیں آرہی ہیں۔ کل کو اس نے بھی بڑا ہونا ہے اور ہماری ایک بیٹی بھی ہے۔“ احمر تو حق دق اس کی فراٹے سے چلتی زبان کے جوہر دیکھتا رہا۔

”علی بھائی کو تو اب اسے بسانا نہیں ہے ایک ایسی عورت جو شادی شدہ ہو ایک بچے کی ماں بھی ہو اور ہمیں کیا معلوم کہ خیر سے بغیر شادی کے ہی ایزن۔“

”بکواس بند کرو فارینہ۔ شرم نہیں آئی تمہیں ایسی گھٹیا باتیں کرتے ہوئے۔“ احمر نے چلا کر کہا تھا۔ فارینہ کے نقوش تن سے گئے۔

”یہ حقیقت ہے اور آپ اس سے نگاہیں نہیں چرا سکتے۔ اس وقت ہمدردی کا بخار چڑھا ہوا ہے آپ کو۔ کل کو اگر کوئی اونچ پنچ ہو گئی پھر۔“

”تمہیں اس غم میں گھلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ اور ہاں ایک بات سن لو۔ ایزن عائشہ کے صحت یاب ہونے تک یہیں رہے گا۔“ احمر نے ترشی سے کہا تھا۔

”اگر وہ بیس سال تک کوما میں رہی تو پھر —“ فارینہ زہر خند ہوئی۔

”بیس تو کیا تیس سال بھی میں ایزن کو رکھ سکتا ہوں۔“ اس نے چیلنج بھری نگاہوں سے فارینہ کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ کے دماغ میں خناس بھر چکا ہے۔ اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو میں یہاں نہیں رہوں گی“ فارینہ اس کے دو ٹوک انداز کو ملاحظہ کر کے دھمکاتے ہوئے بولی۔

”فارینہ! تم یہ چاہتی ہو کہ میں ایزن کو اس معاشرے کی گندی دلدل میں پھینک دوں۔ ایک اور شگفتہ پھول کیچڑ سے لت پت ہو کر کملا جائے۔ کیا تم اپنے اعمال میں چند نیکیوں کا اضافہ نہیں کرنا چاہتی۔ کیا تم ایک غیر مسلم کو کلمہ حق کا سبق یاد کروا کے اپنے لئے بخشش و کامیابی نہیں چاہتی۔ تم اسے

روشنی دو اللہ تمہاری قبر کو روشنیوں سے بھر دے گا۔ تم اسے صراطِ مستقیم دکھاؤ۔ اس کی راہوں کو دین و اسلام کی روشنی میں آسان کر دو۔ اللہ ہمارے لیے آخرت کی منزلوں کو آسان کر دیگا۔ یہ تو ابھی گناہ سے پاک اور معصوم ہے۔ تم نے اسے اچھوت سمجھ کر اس کے برتن الگ رکھے ہیں۔ تم مونا کے کھلونے اس سے چھپا کر رکھتی ہو تاکہ وہ ناپاک

نہ ہو جائیں۔ تم اس کے کپڑے نہیں دھوتی۔ اسے اپنا بچا کھچا کھانا دیتی ہو۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کھا سکتا۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تم اسے نجس سمجھتی ہو، اس کی نجاستوں غلاظتوں کو دھو کیوں نہیں دیتی؟۔ اس پاک کیوں نہیں کر دیتیں۔ کیا تمہار دل سیاہ ہو چکا ہے؟۔“

فارینہ حیرت سے بت بنی یک ٹک احمر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پہلے حیرت، بے یقینی اور پھر پشیمانی کے سائے پھیل گئے تھے۔ اس کا سر جھگ گیا تھاندامت کے بوجھ سے۔



”آج سے ایزن ، احمد ہے ۔ وہ کسی کا بیٹا نہیں ہے بلکہ وہ میرا بیٹا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ احمد کی طرف انگلی اٹھائے خواہ وہ تم ہی کیوں نہ ہو۔“

”سوری احمر! میں ذرا جذباتی ہو گئی تھی“ وہ آہستگی سے انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی تھی ۔ ایک ماں ہونے کے ناتے اس کے خدشات بھی تو بجا تھے مگر وہ احمر کی طرح نہیں سوچتی تھی ۔ اس پل اسے اپنے شریک سفر پر فخر سا محسوس ہوا تھا ۔

وہ اور احمر دونوں باقاعدگی سے عائشہ کو ہسپتال دیکھنے کیلئے جاتے تھے ۔ اس کی حالت میں ذرا برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ زندہ تھی مگر ایک لاش کی طرح ۔ آج صبح احمر کی عائشہ کے معالج سے تفصیلی بات ہوتی تھی ۔ ڈاکٹر جوز کا راسے کو مے کے مریضوں کے متعلق بتا رہے تھے ۔ ڈاکٹر جوز کارنے اپنے دراز میں سے ایک فائل نکالی ۔

”اس فائل میں تمام مریضوں کے نام درج ہیں ۔ جو معجزانہ طور پر ”کو مے“ سے باہر آگئے تھے کوما ایک ایسی بے ہوشی ہے جس میں مریض کا شعور مردہ ہو جاتا ہے مگر اس کے باوجود وہ ہماری باتیں سنتا ہے مگر بول نہیں سکتا ۔ جیسا کہ جب ہم خواب دیکھتے ہیں ۔ خواب میں لاشعور ہم پر حاوی ہو جاتا ہے ۔ ہم بولنا چاہتے ہیں مگر بول نہیں پاتے ۔ بھاگنا چاہتے ہیں مگر بھاگ نہیں سکتے ۔ اسی طرح ”مریض“ کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بولے مگر وہ بے بس ہوتا ہے ۔ اگر آپ زیادہ سے زیادہ وقت مریض کے ساتھ گزاریں تو وہ جلد زندگی کی طرف آئیگا ۔“

”عائشہ کے ہوش میں آنے کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے؟“

”نہیں۔۔۔“ ڈاکٹر جوز نے چشمہ اتار کر فائل بند کی ۔

اس دن کے بعد احمر نے زیادہ سے زیادہ وقت ہسپتال میں گزارنا شروع کر دیا ۔ وہ عائشہ کو اخبار پڑھ کے سناتا۔ ٹی وی کی ہر نئی خبر ، فلم یا پھر ڈرامے کی چیدہ چیدہ باتیں بتاتا ۔ وہ اسے اسپورٹس نیوز کے بارے میں باخبر کرتا تھا۔

اس دوران احمر کی نگاہیں عائشہ کے سپاٹ چہرے پر کسی بھی قسم کا تاثر ڈھونڈنے کی کوشش میں رہتی تھیں۔ مگر یوں محسوس ہوتا تھا کہ عائشہ کو ان باتوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

کچھ دنوں سے وہ احمد کو اپنے ساتھ لے کر آرہا تھا۔ احمد بہت بے تابی کے عالم میں عائشہ کی طرف لپکتا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ چومتا اور پھر پیشانی پر اپنے لب رکھ کر آہستہ سے آواز میں کہتا۔

”مے می! اب اٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ چلو۔ اتنا نہیں سوتے۔“

احمر دانستہ عائشہ کے پاس بیٹھ کر احمد کو اس کے سابقہ نام سے پکارتا تھا۔ پھر ایک دن عجیب بات ہوئی۔ وہ احمد کو اسکول سے لے کر سیدھا ہسپتال چلا آیا تھا۔ اس نے احمد کو لپچ کر دایا اور پھر اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگا۔ اچانک خیال آنے پر وہ احمد کو ڈپٹتے ہوئے بولا تھا۔

”آج آپ نے مجھے کلمہ نہیں سنایا۔“

”ابھی سناتا ہوں۔“ احمد نے جوس کا ٹن خالی کیا اور ٹشو سے منہ صاف کر کے اس کی گود میں بیٹھتے ہوئے جذب سے بولا۔

”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ پہلے وہ اٹک اٹک کر پڑھتا تھا۔ اب وہ روانی سے کلمہ پڑھ سکتا تھا۔ احمد نے فخریہ انداز میں ہاتھ لہرا کر احمر کا شانہ ہلایا۔

”اچھا ہے نا۔۔۔۔۔“

”بہت اچھا۔“ احمر نے اس کے گولڈن بالوں کو نرمی سے چوما اور پھر بولا۔

”ہمیں کس نے پیدا کیا؟“

”اللہ تعالیٰ نے۔“

”ہمارے نبی کون ہیں۔؟“

”حضرت محمد ﷺ۔“ احمد نے مونا کی طرح انگوٹھا چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”محمد ﷺ پر کون سی کتاب اتری؟“

”قرآن پاک۔“ وہ اس کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیل رہا تھا۔

”نماز ہمیں کن باتوں سے روکتی ہے؟۔“

”بے حیائی اور اور برائی سے۔“

”کن باتوں سے خود کو محفوظ رکھنا چاہئے؟“ احمر کی نگاہیں عائشہ کے چہرے پر تھیں۔

”نمبر ایک جھوٹ سے نمبر دو غیبت سے اور — اور“ احمد انگلیوں پر گنتے

ہوئے جھنجھلایا اور پھر رخ موڑ کر احمر کی طرف دیکھنے لگا۔

”نمبر تین — آہا — یاد آگیا، بہتان سے۔“ وہ خوشی سے اچھلا تو احمر نے

چونک کر ایک مرتبہ پھر عائشہ کی طرف دیکھا۔ اس کی برائون پلکیں لرزی

تھیں۔ احمر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ کئی لمحے اس کے چہرے پر نگاہیں

جمائے کھڑا رہا۔

گھر آکر اس نے یہ خوشخبری فارینہ کو بھی سنائی۔ اور فارینہ کے مشورے کے

مطابق وہ دونوں اب صبح شام سورہ یسین اور سورۃ محمد ﷺ، سورۃ الرحمن کی

تلاوت کرتے تھے۔ پھر ایک دن فارینہ، احمد کو کلمہ توحید یاد کروا رہی تھی۔

”بیٹا! پڑھو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں

۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کیلئے سب تعریف ہے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا

ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہے۔ جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ عظمت

اور بزرگی والا ہے۔ بہتری اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

۔“ فارینہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

”وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ ہر طرف اندھیرا تھا، گھور تاریکی ہر سو چھائی ہوئی

تھی۔ ایسا سکوت تھا اتنا سناٹا تھا۔ خاموشی، خاموشی چہار سو پھیلی خاموشی۔ کبھی

کبھی ڈاکٹرز کی نرم آوازیں سنائی دیتیں اور کبھی نرس کی کرخت آواز اور پھر

سناٹا پھیل جاتا۔ اس سناٹے کو اک جانی پہچانی آواز توڑتی تھی۔ وہ اس آواز کو

پہچانتی تھی - وہ آواز احمر کی تھی - پھر ان آوازوں میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا گیا۔

ایزن ، فارینہ اور احمر - پھر اس نے فارینہ کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے سنا۔ پھر احمر قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگا۔ اس کی آواز بہت پیاری تھی مگر وہ علی کی طرح تلاوت نہیں کر سکتا تھا۔

خالص عربی آواز اور لہجے میں۔

”علی —“ وہ اسے پکارنا چاہتی تھی مگر شاید پکار نہیں سکتی تھی۔ اس کی زبان شاید مفلوج ہو گئی تھی یا پھر اسے تمام الفاظ بھول گئے تھی۔ بے بسی کے احساس نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ اس کی بنجر آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

فارینہ نے بے یقینی کے عالم میں عائشہ کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

وہ قدرے تاریکی گوشے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھا گلاس ونڈو سے باہر کی تاریکیوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

وہ کلی موٹی اور بھدی سی تیس اکتیس سال کی عورت پچھلے تیس گھنٹوں سے مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس درمیانے درجے کے ہوٹل میں ملازمت کرتی تھی۔ اس عورت کا قد لمبا، رنگت سیاہ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس نے سر پر اسکارف لے رکھا تھا۔ آتے جاتے، بھاگتے دوڑتے کام کے دوران بھی مسلسل اس کے لب ہل رہے تھے۔ وہ درود شریف کا ورد کر رہی تھی۔ آج سے پہلے اس کی ہمیشہ توجہ اپنے کام پر ہوتی تھی۔ کون آرہا ہے کون جارہا ہے۔ ٹاپ فلور پر کس قسم کی محفل جمی ہے۔ وہ ہر شے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ روشنیاں، ہنگامے اب اسے اپنی طرف نہیں بلاتے تھے۔ ہر شے گویا اپنی کشش کھو چکی تھی۔ اب وہ کسی بھی خوبصورت کپل کو دیکھ کر حسد محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس حسین چہرے اب متاثر نہیں کرتے تھے۔ وہ جان گئی تھی کہ اصل حُسن کیا ہے۔



وہ جو کوئی بھی تھا بے پناہ خوبصورت تھا۔ وہ اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہرگز نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے تحیر میں مبتلا کر دینے والی اس نوجوان کی آنکھیں تھیں۔ سیاہ حسین بھیگی بھیگی آنکھیں۔ پر نم گھنی گھنی پلکیں اور چہرے پر پھسلتے آنسو وہ حق دق سی یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مرد کو یوں روتے دیکھا تھا۔ وہ شاید کسی تکلیف دہ یاد کے زیر اثر تھا۔

اسی لیے اسے اس بات کی خبر نہیں تھی کہ کوئی بہت ہی حیرانی سے اسے دیکھ رہا ہے، پڑھ رہا ہے۔

اس کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ وہ کھانا پیک کروا کر اب گھر جانیوالی تھی مگر نہ جانے کیوں اس کے قدم زنجیر ہو گئی۔

”کیا مرد بھی روتے ہیں“ وہ چند پل مزید سوچنے کے بعد چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس تاریک گوشے میں آکر ہولے سے بڑبڑائی تھی۔ علی نے چونک کر

نگاہیں گلاس ونڈو سے ہٹا کر اپنے سے محض دو قدم کے فاصلے پر کھڑی اس سیاہ فام عورت کی طرف دیکھا تھا۔ اسے اس کی ماں سے محبت ہو گئی تھی اور اس محبت نے اسے اذان حیدر بنا دیا تھا۔

وہ اپنی شادی کے محض چار مہینے بعد چند سفید فام پولیس افسروں کی غلط فہمی کا نشانہ بن گیا تھا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ اس کی ماں نے اذان حیدر کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس کی ماں بہت اچھی عورت تھی۔ بہت بلند کردار اور مذہبی۔ اسے اپنے مذہب اور وطن سے عشق تھا۔ وہ اپنے شوہر کو اپنی سرزمین میں ہی دفن کر آئی تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ہی اس نے اپنے لیے جگہ بھی رکھ چھوڑی تھی۔

”کیا مردوں کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر فٹ ہوتا ہے۔ انہیں کوئی غم نہیں ہو سکتا۔ کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوتی۔“

”ہاں، کیوں نہیں۔ دلوں کو ویسے بھی موم کی طرح ہونا چاہئے اور جب دل بگھلتے ہیں تو آنکھیں خود بخود چھلکنے لگتی ہیں۔“ اس نے نرمی سے کہتے ہوئے

بھرپور تائید میں سر ہلایا اور اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ علی نے سر کے اشارے سے اسے بیٹھنے کی اجازت دیدی۔

”میں تمہار نام پوچھ سکتی ہوں؟“

”علی حارث۔“ وہ مختصر بولا۔

”کیا کرتے ہو؟“

”متیشو ڈیشی ٹاور میں جاب کرتا ہوں“ علی نے ایک مشہور جاپانی کمپنی کا نام لیا۔

”پھر تو امریکہ میں بہت ٹھاٹ سے رہ رہے ہو۔“ وہ اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ اپنا ورد مکمل کرنے کے بعد اس نے خود پر مزید پڑھ کر پھونکا اور پھر علی کو بغور دیکھنے لگی۔

”کس ملک سے آئے ہو؟“

”پاکستان۔“ وہ ایک مرتبہ پھر گلاس ونڈو کے پار جگمگاتے منظر کو دیکھنے لگا۔

”میری ماں کا تعلق بھی پاکستان سے تھا۔“ نہ جانے کیوں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

”میں تم سے دوبارہ ملنے کی خواہش رکھتی ہوں۔ کیا تم مجھ سے ملنا پسند کرو گے؟“ علی نے اک نظر اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھا۔ وہ صاف لفظوں میں انکار کر دینا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکا۔ والٹ میں سے ایک سلور رنگ کا کارڈ نکال کر اس نے سامنے کھڑی عورت کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ اور پھر خود کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔

”تم نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں ہے۔“ اسے مڑتا دیکھ کر وہ سرعت سے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

علی سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے پنکی کہتے ہیں۔“

”غلط ہی کہتے ہیں۔“ وہ اردو میں بولا تھا۔ اس تمام گفتگو کے دوران پہلی مرتبہ علی کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی تھی۔ وہ حیرانی سے اسے مسکراتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

اس نے لائونج میں قدم رکھا ہی تھا جب نگاہ سامنے دیوار پر لگی فل سائز عائشہ کی تصویر پر گویا جم کر رہ گئی۔ وہ اس کی ہنستی مسکراتی تصویر سے نگاہیں چراتا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ زین نے کچن کی کھڑکی میں سے جھانکا اور پھر مختصر سا لنچ ٹیبل پر سجا دیا۔

”بھائی کھانا کھالیں۔“ کچھ دیر بعد وہ اس کے کمرے میں موجود تھا۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔ تم کھاؤ۔“ علی نے بے زاری سے کہا۔

”آپ کھانا نہیں کھائیں گے تو پھر میں بھی نہیں کھاؤں گا۔“

”ضد نہیں کرتے یار! جاؤ شاباش کھانا کھا کر دوا بھی کھالو۔“ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

”مجھے پتا ہے آپ کو بھابی کی یاد آرہی ہے“ زین نے گویا اس کے زخموں پر نمک کا چھڑکاؤ کر دیا تھا۔ علی آنکھوں میں سرخی لئے اس دیکھتا رہا۔

”میں کیوں اس دھوکے باز، جھوٹی عورت کو یاد کروں گا۔“

”آپ خود کو بہلاتے ہیں ایسی باتیں کر کے۔ آپ انہیں یاد کرنا نہیں چاہتے مگر وہ پھر بھی آپ کو یاد آتی ہیں۔ کیونکہ ان کی محبت ابھی بھی آپ کے دل میں موجود ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں بے حد تکلیف میں ہیں اور پھر چین سکون تو آپ کو بھی نہیں ہے۔ رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ یہ محبت نہیں تو کیا ہے۔“

”یہ محبت نہیں تو کیا ہے“ زین کے جانے کے بعد بھی یہی چند الفاظ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی مانند لگ رہے تھے۔

”یہ محبت نہیں تو کیا ہے“ کمرے کی دیواریں چھتیں چلا کر کہہ رہی تھیں۔ علی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔

”ہاں میں تمہیں چاہتا ہوں۔ میں تمہاری محبت کو اپنے دل سے کھرچ نہیں سکتا۔“ علی نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی عائشہ کی تصویر کو اٹھا کر بے ساختہ چوما۔

”میں تمہیں بھلا نہیں سکتا کبھی بھی نہیں کیونکہ میرے دل پر تمہاری محبت کا پہرہ ہے۔“ وہ بے آواز رو رہا تھا۔ نہ جانے کتنے پل، منٹ سیکنڈز اور گھنٹے گزر گئے۔ معاً فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ وہ بھگے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے صاف کر کے فون کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف آپریٹر تھی۔ وہ اسے زرمینہ کی سیٹ کنفرم ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔

علی کچھ پل سوچتا رہا تھا پھر گہری سانس خارج کرتا زرمینہ کے کمرے میں آگیا۔ وہ ان کے تین مہینوں کے قیام کے دوران پہلی مرتبہ ان کے بیڈ روم میں آیا تھا۔ زرمینہ علی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

”مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ آپ کے ویزے کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ تین دن صرف رہ گئے ہیں۔ اگر آپ سوما، سوہا کیلئے کچھ خریدنا چاہتی ہیں تو میں آپ کو مارکیٹ لے جائوں گا۔“ وہ دل پر بھاری سل رکھے بمشکل بولا تھا۔ زرمینہ کے تو گویا قدموں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ وہ حیران پریشان اس کی پشت کو گھورتی رہ گئیں۔

”یہ علی کیا کہہ رہا ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے صوفے پر ڈھے سی گئی تھیں۔

”میں اور پاکستان جائوں اونہ۔“ انہوں نے تنفر سے سر جھٹکا۔ مگر پریشانی کسی طور کم نہیں ہو سکی تھی۔

”مجھے جلد از جلد کچھ کرنا ہے۔ ورنہ وقت ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل جائے گا۔“ ان کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

”میں نے تمہارا ایڈمیشن کالج میں کروا دیا ہے“



اگلی صبح ناشتے کی میز پر علی، زین کو اطلاع دے رہا تھا۔

”اچھا۔“ زین خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

”کلاسز کب تک اسٹارٹ ہونگیں“ اس نے دودھ کا گلاس علی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ایک ہفتے بعد۔“ علی اپنا کوٹ اور بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا۔ ناشتا کرنے کے بعد زین نے برتن سمیٹے، دوا کھائی اور پھر تیار ہو کر احمر کی طرف چلا گیا۔ اسے اور فارینہ کو آج ہسپتال جانا تھا۔

زیرینہ جب اپنے بیڈ روم سے نکلیں تو گھر میں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے بہت سکون کے ساتھ تمام کمرے چیک کئے، بیرونی دروازہ لاک کیا اور پھر علی کے بیڈ روم کی طرف آگئیں۔

رائٹنگ ٹیبل کے اوپر ٹیبل لیمپ پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی لاکر کی چابیاں رکھی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے چابیاں اٹھائیں اور لاکر کھول لیا۔ ان

کے اندازے کے عین مطابق کافی ساری رقم موجود تھی۔ انہوں نے فوراً پر س میں تمام رقم ٹھونسی اور تیزی سے فلیٹ کا بیرونی دروازہ عبور کر گئیں۔ شام کو زین علی سے پہلے گھر آگیا تھا، دروازہ کھلا تھا۔ وہ ماما کی لاپرواہ طبیعت پر دل ہی دل میں خفا ہوتا لائونج میں آکر صوفے پر ڈھے گیا۔ اک طائرانہ نگاہ پورے گھر پر ڈالنے کے بعد وہ ماما کو آوازیں دینے لگا مگر جواب ندارد۔ اس نے کچن، ماما کا بیڈ روم اور واش روم تک دیکھ ڈالے۔ گھر کی حالت کافی ابتر تھی۔

”یعنی ماما نے آج صفائی بھی نہیں کی۔“ اس نے سوچتے ہوئے علی کے بیڈ روم میں جھانکا۔ اسکی پہلی نگاہ لاکر پر پڑی تھی جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ زین دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس کے تمام خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ لاکر خالی پڑا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

”کیا گھر میں چور گھس آئے تھے؟“ وہ خوفزدہ سے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ پھر اٹے قدموں باہر کی طرف بھاگا۔

”اما کہاں ہیں؟“ وہ ایک مرتبہ پھر تمام کمرے دیکھ رہا تھا۔ زرمینہ کا بیڈروم خالی تھا۔ ان کے تمام کپڑے اور ضرورت کی اشیاء بھی موجود نہیں تھیں۔ زین کا سانس حلق میں ہی اٹک گیا۔

”تو کیا ماما نے؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر افیت سے سوچا۔ علی کب گھر آیا اور وہ کس طرح اس کے سینے سے لگا دھاڑیں مار مار کر روتا رہا تھا۔ علی کے دلا سے، تسلیاں بھی اس کے دل میں چھپی پھانس کو نہیں نکال سکے۔ ماما اتنی گری ہوئی حرکت کرینگے۔ اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔

ماما پر غصہ وقتی جگہ مگر وہ ساری رات سو نہیں سکا تھا کہ نہ جانے تمام راستوں سے ناآشنا اس کی ماں کہاں کہاں بھٹک رہی ہو گی۔

اور یہ تو اس کی خام خیالی تھی! زرمینہ ٹرین کے ذریعے مشی گن پہنچ چکی تھی اور وہاں جا کر انہوں نے ایک پچپن سالہ بوڑھے ریٹائرڈ کلرک سے شادی کر لی تھی جو کہ رومن کیتھولک مذہب کا پیروکار تھا۔

☆☆☆

اس نے بیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک نو عمر لڑکا تھا۔

”کس سے ملنا ہے؟“ زین نے شائستگی سے پوچھا۔

”علی سے۔“ پنکی دلچسپی سے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھتی رہی۔

”آپ آجائیں پلیز۔“ زین دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ اس کی نظریں پنکی کی موٹی موٹی سیاہ انگلیوں پر لیٹی تسبیح کے جگمگاتے موتیوں پر تھیں۔ زین نے ایک مرتبہ پھر سر تا پا پنکی کی طرف دیکھا۔ اس کے سر پر اسکارف تھا جبکہ ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ پھر اس نے ایک دم ہی پنکی کو ٹھٹک کر رکتے دیکھا۔ وہ ایک دم چونکتے ہوئے پلٹی۔

”یہ تصویر کس کی ہے؟“ پنکی کے چہرے پر حیرت و بے یقینی کے سائے لہرائے تھے۔ وہ لائونج کی دیوار پر لگی عائشہ کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کپکپائی آواز میں بولی۔

”یہ علی بھائی کی بیوی کی تصویر ہے۔“

”اوہو — میرے اللہ، میں نے کہاں کہاں نہیں اسے ڈھونڈا۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”آپ انہیں کیوں ڈھونڈتی پھر رہی ہیں؟“ زین نے دھڑکتے دل سے بے حد گھبرائے ہوئے سوال کیا تھا۔

پنکی نم آنکھیں پونچھ کر آہستگی سے بولی۔

”مجھے عائشہ سے معافی مانگنا تھی۔ میں مجرم ہوں اس کی“

”کیا آپ مجھے تفصیل بتانا پسند کریں گی؟“ زین نے بے تاب سے کہا تھا۔

”ہاں کیوں نہیں“ پھر اس نے سارا واقعہ من وعن سنا ڈالا۔ اپنی ماں کی

عائشہ سے والہانہ محبت سے لے کر اپنا تلخ و گھٹیا رویہ، عائشہ کی مشکلات

پریشانیاں کہ کس کس طرح اس نے عائشہ کو گھر سے نکالا تھا نہ جانے وہ

بے چاری کہاں کہاں بھٹکتی رہی تھی۔

”اس نے میری ماں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ نئی نئی دائرہ اسلام میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے مذہب بدلنے کے بعد بہت سی تکلیفوں، اذیتوں اور مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ تم یقین جانو جب سے عائشہ کو میں نے گھر سے نکالا ہے ایک دن بھی پر سکون نیند نہیں لے سکی۔ مجھے ایک بات کا شدید خوف تھا کہ کہیں وہ مشکلات سے گھبرا کر ایک مرتبہ پھر نہ بھٹک جائے اگر ایسا ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتی

اللہ کا شکر ہے کہ وہ ایک محفوظ جگہ پر زندگی گزار رہی ہے وہ بہت اچھی ہے اسی لیے اسے اتنا اچھا ہم سفر ملا ہے۔ مجھے سوینا نامی اس لڑکی پر فخر محسوس ہوتا ہے جس نے سوینا سے عائشہ تک بہت کامیابی سے طے کیا یقیناً اللہ کی اس پر خاص رحمت ہے۔“

پنکی بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ علی دم بخود سا اپنے بیڈروم کے دروازے میں کھڑا اسے سنتا رہا۔ اس سے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔

مونا کو سلا کر اس نے احمد کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے ہوم ورک میں مصروف تھا۔ فارینہ اسے بتا کر مطمئن سی دروازہ لاک کر کے ڈاکٹر مارگریٹ کے کلینک آگئی تھی۔ پچھلے تین چار دن سے اس کی کمر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ تفصیلی چیک اپ کروانے کے بعد وہ تجویز کردہ دوائیوں کا پرچہ لیے اٹھنے ہی والی تھی جب ڈاکٹر مارگریٹ نے کچھ یاد آنے پر دراز میں سے ایک فائل نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”یہ رپورٹس تمہاری دوست عائشہ کی ہیں۔ اس دن کے بعد وہ دوبارہ آئی ہی نہیں۔ کم از کم اسے اپنی رپورٹس تو لینا چاہئے تھیں۔ افسوس کہ میرے پاس اس کیلئے کوئی خوشخبری نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے اس سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔“ ڈاکٹر مارگریٹ سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ جبکہ فارینہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی رپورٹس کی فائل کو مضبوطی سے پکڑے بمشکل گھر آئی تو اس کی رنگت زرد تھی جبکہ

جسم کپکپا رہا تھا۔ اس رپورٹ کو بغیر پڑھے بھی وہ جانتی تھی کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

”عائشہ بانجھ تھی۔“

”وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔“

”اگر عائشہ بانجھ تھی تو ایزن کون ہے؟“

”عائشہ کا ایزن سے کیا تعلق ہے؟“

اتنے ڈھیر سارے سوالیہ نشان اسے منہ چڑا رہے تھے۔ وہ احمر کے آنے تک اسی طرح گم سم سی بیٹھی رہی تھی اس نے رپورٹس کی فائل احمر کی طرف بڑھا دی۔ کم و بیش اسی قسم کے تاثرات احمر کے بھی تھے۔

وہ علی کو فون کر کے بلانا چاہتا تھا۔ اسے یہ حقیقت بتانا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ خود آگیا۔ نم آنکھیں لیے جھکے ہوئے سر کے ساتھ۔ ندامتوں کے بوجھ نے اس کی گردن جھکا دی تھی۔ وہ افسردہ تھا۔ آزرده تھا۔



آزمائش کی اس بھٹی میں جل جل کر وہ چھوٹی سی لڑکی کندن بننے میں کامیاب ہو گئی تھی اللہ نے اسے سرخرو کر دیا تھا سب کی نگاہوں میں۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ لطافت، طبع وقت قلب اور اثر پذیری ایک نیک باکردار انسان کا حاصل ہیں۔ اور ان کے ذریعے ہی سے وہ پند و موعظت، اسلامی تعلیمات، حق اور شاد و ہدایت کو قبول کر سکتا ہی۔ پھولوں کی پنکھڑیاں نسیم صبح کی خاموش حرکت سے مل جاتی ہیں۔ لیکن تناور درخت کو باد صرصر کے جھونکے نہیں ہلا سکتے۔ روشنی، نور، ہلکی سی کرن نگاہ آئینہ کے اندر سے گزر جاتی ہے۔ مگر پتھروں پر فولادی تیر بھی اثر نہیں کرتے۔ وہ دل جو عائشہ کے سینے میں دھڑکتا تھا بے حد نرم اور گداز تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ایمان لے آئی تھی۔ کلمہ حق پڑھا جبکہ لیزا، لیوسٹی اور زرینہ جیسی عورتیں جن کے دل سیاہ دھویں کی لپیٹ میں ہیں۔ وہ مزید پانے کی تلاش میں اسی طرح بھٹکتی رہیں گی۔

ان عورتوں کو دولت، شہرت، مقام مل گیا تھا۔ انہوں نے ہر چیز پالی تھی جن کی انہیں چاہ تھی اور عائشہ کو وہ سب مل گیا تھا جس کی اس نے چاہ کی تھی۔ ہدایت ان کو ملتی ہے جو ہدایت طلب کرتے ہیں۔ اور اللہ ان راہ پر چلنے والوں کیلئے آسانیاں فرما دیتا ہے۔

امریکہ کے شہر نیویارک میں رات اپنے جو بن پر تھی۔ ڈسکو کلب ہر رات کی طرح آج بھی لوگوں سے کچھا کھچ بھرے تھے۔ آج انگریزوں کا خاص تہوار تھا۔ عورتیں، مرد، بچے سب گھروں سے باہر سڑکوں پر تھرک رہے تھے۔ ناچ رہے تھے۔ ہنگامے شور، آوازیں۔

علی کا فلیٹ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات کے تیسرے پہر وہ ہر شے سے بے نیاز اپنے رب کی بارگاہ میں جھکا اپنے گناہوں کی بخشش طلب کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ گر گڑا کر رو رہا تھا۔ وہ رب تعالیٰ سے اپنی بیوی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور اللہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔



”میں زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارے لوٹ آنے کا انتظار کروں گا“ کل شام اس کی سماعتیں کتنے عرصے بعد کس قدر محبوب ترین آواز کو سن رہی تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بول اٹھے وہ آنکھیں کھول لے۔ وہ اس چہرے کو دیکھنا چاہتی تھی وہ اپنے محبوب کے چہرے کو دیکھنا چاہتی تھی۔

”عاشی مجھے معاف کر دو۔“

”یہ کیوں بار بار مجھ سے معافی مانگ رہا ہے“ وہ اپنے ذہن پر دبائو ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ علی کو روک دے۔ وہ علی کو روکنا چاہتی تھی کہ تم کیوں مجھ سے معافی مانگ رہے ہو۔ ایسا مت کرو، میرا دل دکھتا ہے۔ اسی اثناء میں اس کے لبوں سے ہلکی سے کراہ نکلی۔ اس نے دایاں ہاتھ اٹھا کر کنپٹی پر دبائو ڈالا۔

”عاشی! تم ٹھیک ہو۔ عاشی پلیز آنکھیں کھولو۔“ علی کی پر جوش، محبتوں کے جذبات سے گرمائی آواز اس کے کانوں کے قریب گونجی تھی۔ پھر علی

نے اس کی پیشانی کو چوما۔ اس نے لرزتی پلکوں کی چلمن اٹھائی۔ پورے سات ماہ بعد وہ آنکھیں کھولے دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی پوری دنیا ”علی“ تھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی اگرچہ چھ رہی تھی مگر وہ یک ٹک علی کو دیکھتی رہی۔ جس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔



”اب بس بھی کرو۔ جو کچھ رہ گیا ہے کل پھر سے آکر خرید لینا۔ میں شاپنگ بیگ اٹھائے تھک چکا ہوں۔“ ڈیپارٹمنٹل سٹور میں اسے گھستے دیکھ کر علی چلا کر بولا تھا۔ یوں کہ آتے جاتے لوگوں نے بغور اسے دیکھنا شروع کر دیا۔

”آپ تمام شاپنگ بیگز آرام سے گاڑی میں رکھ کر آئیں۔“ اس کے مشورے پر علی جلتے کلسٹے واپس مڑ گیا۔ کچھ دیر بعد علی اور احمد دونوں کھلونوں والی دکان میں گھس گئے۔ اب کے جلنے کلسنے کی باری عائشہ کی تھی۔

”پہلے ہی پوری دکان گھر میں اکٹھی کر رکھی ہے۔ کیا ضرورت ہے اس فضول خرچی کی۔“

”تم جلتی رہو۔“ علی نے اسے چڑایا۔

”بابا! میں نے نئے کلرز بھی لینے ہیں۔“ احمد اس کے کان میں منمنایا۔ پھر اس نے اپنی اور مونا کی شاپنگ کی، ببلز، چاکلیٹ، اور کنڈیز کے پیکٹ۔

”بابا! آپ مجھے آنٹی کے گھر چھوڑ دیجئے گا۔“ وہ اپنا پروگرام علی کے گوش گزار کر رہا تھا۔ مونا اور اسکی دوستی پکی تھی۔

عید کی تیاریاں دونوں گھروں میں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ فارینہ نے تو پورے گھر کی سیٹنگ بھی بدلی تھی۔ عائشہ نے بھی اپنے فلیٹ کو نئے سرے سے سجایا تھا۔

اس کی صحت یابی کی خوشی میں علی نے چھوٹا سا فنکشن اریج کیا تھا۔ جس میں احمر کی فیملی کے علاوہ پکنی شرکت کی تھی۔ اسے مکمل طور پر صحت مند ہونے میں کافی عرصہ درکار تھا۔ اب بھی کبھی کبھار اس کے سر میں درد کی

ٹپسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ اس کے ہسپتال سے گھر آنے تک علی کتنی ہی مرتبہ اس سے معافی مانگنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہر دفعہ خفگی سے اسے دیکھ کر رہ جاتی تھی یا پھر ناراضی کا اظہار منہ پھلا کر کرتی۔

”میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔ اس لیے آپ سے التجا کرتی ہوں کہ خدارا آپ بھی بھلا دیں ان تمام تلخیوں کو۔“

علی اگر اس سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی نہ بھی مانگتا وہ پھر بھی اسے معاف کر دیتی۔ کیونکہ اس کی زندگی میں صرف وہی تو ایک رشتہ بچا تھا۔ اور وہ کسی بھی صورت علی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

وہ غلط فہمیوں کا شکار تھا۔ جب اس کی تمام تر بدگمانیاں دور ہو گئیں تو وہ ایک مرتبہ پھر پہلے والا علی بن چکا تھا چاہنے والا، خیال رکھنے والا۔ عائشہ کو کبھی کبھی اپنی قسمت پر رشک آتا تھا کیا تھا جو اگر اس میں ایک کمی تھی۔ کیا تھا جو اس کے پیروں تلے جنت نہیں آسکی۔ اس کے بانجھ پن میں بھی اللہ کی مصلحت تھی۔ بے شک اس کی حکمتیں صرف وہ ہی جانتا ہے۔

احمد کا وجود اس کی ممتا کی سیرابی کیلئے کافی تھا اور پھر جس طرح علی ، احمد سے والہانہ پیار کرتا تھا ۔ اس کے تمام گلے شکوے خود بخود دور ہو گئے ۔

اور اب تو احمر اور فارینہ نے مونا اور احمد کیلئے بھی ایک فیصلہ کر لیا تھا ۔ بس وہ لوگ اس خوبصورت وقت کا انتظار کرنے لگے تھے ۔

عائشہ جب گھر سے نکلتی تھی۔ ارد گرد کے تمام مناظر کو بغور دیکھتی رہتی ، فٹ پاتھ ، شاپنگ مال ، مارکیٹیں ، روڈز جہاں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچ سکتی تھی وہ ہر چہرے کو کھوجنے کی کوشش کرتی کہ شاید کوئی سویٹا منزل کی تلاش میں بھٹکتی کہیں مایوسی کو گلے کا ہار نہ بنالے ۔

”تم اپنی شاپنگ نبٹا لو اتنے میں ، میں اور احمد آئس کریم سے لطف اندوز ہوتے ہیں“ اسے دالیں اور چاول خریدتے دیکھ کر علی اور احمد برا سا منہ بنا کر باہر نکل گئے تھی۔

”بابا ! تھوڑی سی آئسکریم مونا کیلئے بھی پیک کروالیں گے۔“ احمد اس کے گلے میں جھولتا ہوا راز داری سے بولا تھا۔ جواباً علی نے اس کے سر پر ہلکی سے چپت لگائی تھی ۔

”بہت بد معاش ہو تم —“ علی بے ساختہ مسکراٹھا تھا ۔

عائشہ تمام شاہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی ہی جھونک میں گاڑی تک آئی تھی جب ایک جانی پہنچانی آواز نے اس کے قدم روک لئے ۔ وہ آنکھوں میں خوشی اور ہونٹوں پر مسکان لیے بے ساختہ پلٹی ۔

”پیٹر انکل ! تم اور نیو یارک میں؟“ اتنے عرصے بعد اپنے اتنے قریبی جاننے والے شخص کو دیکھ کر اسے فطری سی خوشی محسوس ہوئی تھی۔

”ہاں، تم سناؤ کیا کر رہی ہو آج کل؟ اور لیوسٹی کیوں منظر سے غائب ہو گئی ہے۔“ پیٹر یہی سمجھا تھا کہ وہ لیوسٹی کے ساتھ ہی رہ رہی ہو گی ۔

”شہرت اور دولت صدا باقی رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ روز اور لیوسٹی کے عروج کا سورج زوال پذیر ہو گیا ہے۔“



وہ تھکے تھکے لہجے میں آہستگی سے بولی تھی۔ اب وہ دونوں اخباروں میں لگنے والی معمولی خبر ہی تو رہ گئے تھے۔

”میں نے اپنی لائبریری کی تمام کتابیں ردی میں دے دی ہیں۔“ عائشہ کے پوچھنے پر پیٹر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

”در اصل میرا دل اب کتاب میں نہیں لگتا۔ عجیب بے سکونی نے دل کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔“ پیٹر نہ سہی عائشہ اس بے سکونی کی وجہ جانتی تھی۔ اس نے اللہ کا ایک مرتبہ پھر شکر ادا کیا تھا جس نے اسے لادین نہیں رکھا۔

”پتا ہے پیٹر انکل! تم ایگو آئی سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟“

”وہ ہے ہی اسی قابل۔ غلیظ، گھٹیا، بدترین۔ تم نہیں جانتیں۔ ایگو قاتلہ ہے اس نے جینی کو قتل کیا ہے۔ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کو قتل کر کے گٹر میں پھینکوا دیا تھا صرف اور صرف پیسے کی خاطر۔“

وہ پیٹر کے منہ سے نکلنے والے شعلوں کو سن کر ششدر رہ گئی۔ اسی اثناء میں علی اور احمد ان کے قریب چلے آئے۔

”یہ کون ہے؟“ پیٹر نے پہلے علی اور پھر احمد کو بغور دیکھ کر حیرانی سے پوچھا تھا۔ عائشہ نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا ہی تھا

”یہ ہمارا بیٹا ہے احمد۔“

”اوہو — اچھا اچھا۔“ پیٹر کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر خوشی کے تاثرات اٹھ آئے۔ عائشہ کے چہرے پر پھیلا سکون، آنکھوں کی چمک، پیٹر بغیر پوچھے ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ جو کچھ پانا چاہتی تھی جس چیز کی اسے تمنا تھی سو بیٹا یہ سب سو بیٹا حاصل کر چکی ہے۔

”تو تم نے اپنی منزل کو پالیا ہے“ پیٹر مسکرایا۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہجوم میں غائب ہو گیا۔ ”او مے می، چاچو کیلئے پڑا تو لیا نہیں۔“ احمد نے بے حد پریشانی کے عالم میں پچھلی سیٹ سے اچھل کر عائشہ کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”اب تم اور چاچو خود ہی جا کر لے آنا۔“ علی نے اس کی پریشانی کم کرنا چاہی۔

ہاں ٹھیک ہی۔ احمد کے مدبرانہ لب و لہجے میں کہنے پر وہ دونوں بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

تمہیں دل نے پکارا ہے

طوفان آنے والا ہے، یہ رات خوشیوں، مسکراہٹوں اور خوشبوؤں میں بسی اک ایسا پیغام دینے والی ہے جس کا تصور ہی دل و روح کو رگید دینے کے لئے کافی تھا۔

خوشیوں کی عمر اتنی تھوڑی ہوگی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا، ابھی تو اتنے عرصے بعد خواب اپنی تعبیر پانے کے بعد پوری طرح خوش بھی نہیں ہوپائے تھے کہ زندگی نے اپنا کریہہ روپ ایک دم ہی دکھا کر اسے افق سے زمین کی کسی گہری، اندھی، ڈراؤنی اور بھیانک کھائی میں پھینک دیا تھا۔

آنے والے خوبصورت لمحات کا تصور ’بُننے‘ عمار کا بے چینی سے انتظار کرتے، خوش رنگ کونیل خواب آنکھوں میں بسائے کان اس کی آہٹوں اور دل اس کی محبت سے لبریز، پہلو میں دھک دھک کرتے دل کو ڈپٹتے ہوئے اس نے

سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا محبوب شوہر آج کی خوبصورت، روشن چمکیلی ہزاروں ارمانوں اور دلکش خوابوں سے سچی رات کو اس کے پاس آئے گا ہی نہیں۔

عمار تو اس کا دیوانہ تھا اور اس دیوانے کو نہ جانے کیا ہوا تھا کہ آج اس کے پاس آنے کے بجائے کسی اور دیس نکل گیا تھا۔

بھلا اتنا بڑا دھوکہ بھی کوئی دے سکتا ہے۔

عمار اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر میلے میں لایا، ڈھیروں وعدے کیے، قسمیں کھائیں ساتھ نباہنے کی آس دلائی اور پھر بے دردی سے بغیر بتائے ہاتھ چھڑا کر اس سے بہت دور چلا گیا اور وہ بے یقینی، حیرت اور ڈھیروں آنسو لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس اجنبی لوگوں کی بھیڑ کو دیکھتی رہ گئی۔

رونے کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بلند آواز آمنہ آپی کی تھی، ایمان نے بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتے ہوئے بھاری لہنگا سمیٹ کر

خود کو گھسیٹتے ہوئے دروازے کی جھری میں سے آمنہ آپنی کے جھٹکے کھاتے وجود کو دیکھا تھا، امی کو شاید کمرے میں بھیج دیا گیا تھا، وہ ابھی تک بیہوش تھیں، لاؤنج میں آتے جاتے لوگ، علی اور زین کے سرخ چہرے اور بھیگی آنکھیں، عباد بھائی اور ولید کے نڈھال وجود، بابا کی جھکی کمر۔

ایمان نے لڑکھڑاتے ہوئے دروازے کو تھاما، مگر دوسرے ہی پل وہ لہراتے ہوئے زمین پر آگری تھی۔

سامنے والا منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی کیونکہ عمار کے بھائی اسے لینے آئے تھے اور اسے اپنے پیروں پر چل کے تو نہیں جانا تھا۔

”میرے عمار کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔“ عمار کی خالہ روبینہ بھی غش کھا کر گر پڑی تھیں، ہر آنکھ نم تھی ہر دل غمزدہ تھا۔

کیونکہ آج عمار حسین کا جنازہ ”حسین ہاؤس“ سے اٹھنا تھا اور آج کے دن ہی تو وہ بڑے ارمانوں سے اپنی چاہت کو بیاہ کر لایا تھا۔

آسمان بھی گویا ان کے غم میں شریک ہو چکا تھا، کیونکہ ایک تو اتر سے بارش برسنے لگی تھی۔

”ارے کوئی دلہن کو تو دیکھو۔“ کسی بڑی بی نے بھی چلا کر کہا تو آمنہ آپنی کی لہورنگ سرخ نگاہیں عمار کے بیڈ روم کی طرف اٹھ گئیں۔

☆☆☆

”مہارانی صاحبہ ابھی تک سو رہی ہے، اتنا نہیں کہ اٹھ کر بھائی اور بچوں کو ناشتہ ہی بنا دے، بے چارے بھوکے ہی چلے گئے ہیں، ایک دن کیا بستر پر پڑی ہوں، پورے گھر کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے، نہ کچن کی حالت درست ہے اور نہ ہی بچوں کے کمروں کی، گھر گویا مچھلی بازار کا نقشہ پیش کر رہا ہے، مگر یہاں تو احساس نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں، نہ جانے لوگ اتنے بے حس کیوں ہوتے ہیں۔“ حرا بھابی کچن میں کھڑی زور زور سے برتن پٹختے ہوئے تقریباً چلا رہی تھیں، یوں کہ لاؤنج سے ملحقہ چھوٹے سے کمرے میں موجود بخار میں پھنکتی ایمان بغیر کسی تردد کے سن سکے۔

”افشاں کی نند کیا کمال کی پھرتیلی اور ہمدرد لڑکی ہے، مجال ہے جو کبھی بھابی کو اٹھ کر کام کرنے دیا ہو، جب بھی افشاں کے گھر گئی ہوں، اسے پھر کی طرح پورے گھر میں گھومتے اور کام کاج سمیٹتے ہی دیکھا ہے، اپنے اپنے نصیبوں کی بات ہے، یہاں پر تو اگر میں ذرا بیمار پڑ جاؤں تو کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ ایک گلاس پانی کا ہی پلادیا جائے یا پھر پرہیزی کھانا ہی علیحدہ سے بنا دیا جائے۔

رات کو بھی جلتے سڑتے گلے میں دوپہر کا سالن انڈیل لیا تھا، پوری رات کھانتے ہی گزر گئی تھی میری مگر کہوں کس سے، یہاں سنتا ہی کون ہے، گویا کانوں میں روئی ٹھوس رکھی ہے یا پھر جان بوجھ کر انجان بننے کی ناکام کوشش، آلیں ذرا عمیر بتاتی ہوں انہیں، اللہ جھوٹ نہ بلوائے گھنٹہ بھر سے بولے جارہی ہوں، مگر مجال ہے جو شہزادی صاحبہ اپنے حجرے سے باہر نکلی ہوں۔“ حرا بھابی کو تو گویا پتنگے ہی لگ گئے

تھے، اپنی اتنی طویل تقریر اور مسلسل بولنے کا اثر زائل ہوتا دیکھ کر، انہیں تو گویا یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح ان کی تلخ و ترش باتیں سن کر ایمان فوراً ہی منمناتے ہوئے ان کے سامنے گردن جھکا کر کھڑی ہو جائے گی مگر آج تو گویا انہیں بھی حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”میری دوا کا بھی وقت ہو رہا ہے، کچھ زہر پیٹ میں انڈیلوں گی تب ہی میڈیسنز لوں گی نہ۔“ حرا بھابی کی ایک مرتبہ پھر چنگھاڑتی آواز ایمان کے کانوں سے ٹکرائی تھی، بے بسی اور تحقیر کے احساس سے اس کی آنکھوں کے گوشے بھینگنے لگے، اس نے درد سے پھٹتے اور بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتے ہوئے کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی مگر اس زور سے دماغ گھوما کہ آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے اور وہ ایک مرتبہ پھر بے سدھ سی بستر پر ڈھے گئی، بھابی کا بھونپو مسلسل بج رہا تھا۔

”بے شرمی اور ہڈ حرامی تو اس لڑکی پر ختم ہو چکی ہے۔“ حرا بھابی نے شاید غصے کے عالم میں کانچ کا کوئی برتن توڑا تھا، مگر چھن کی آواز تو اس کے



بائیں پہلو سے آئی تھی، تکلیف اور درد و کرب پر اب ذلت کا احساس حاوی ہو گیا تھا، یعنی کہ اس کی اہمیت صرف اتنی ہی تھی کہ وہ اس گھر میں ملازموں کی طرح کام ہی کرتی رہے اور جب بیمار پڑے تو بھابی کے طعنے اور طنز کو سنے سنتی رہے۔

بھابی کی بیماری کا قصہ بھی کچھ نیا نہیں تھا، آئے دن بیماری کا بہانہ کر کے سارا سارا دن بیڈ روم میں بند ہو کر آرام کرنا، موویز دیکھنا یا پھر میکے والوں سے گھنٹوں ٹیلی فون پر گفتگو کرنا، ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، بچوں کے سکول سے آنے کے کچھ دیر بعد ہی وہ بیڈ روم سے نکلتی تھیں اور پھر بچوں کو کھلا پا کر دوبارہ اپنے کمرے میں ہائے وائے کرتی گھس جاتیں اور پھر جب عمیر بھیا آفس سے آتے تو ایک دم ہی خوبصورت اور نہایت سمارٹ سی حرا بھابی کی تمام بیماری اڑنچھو ہو جاتی، فریش، تروتازہ مسکراہٹیں بکھیرتی وہ کمرے سے باہر تشریف لے آتی تھیں اور ایمان حق دق بس حرا بھابی کے بدلتے موڈ کو دیکھتی ہی رہ جاتی۔

حرا بھابی کو اس گھر میں آئے ہوئے تیرہ سال ہو گئے تھے اور وہ عمیر بھیا کی پسند سے ہی اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھیں، ایمان سات برس کی تھی جب عمیر بھیا کی شادی ہوئی، نہایت گوری چٹی تیکھے نقوش اور سنہری بالوں والی حرا بھابی ایمان کو بے حد پسند آئی تھیں، حرا بھابی بھی اس سے بہت پیار کرتی تھیں، اتنی چھوٹی اور معصوم سی بے ضرر نند سے انہیں بھلا کیا پر خاش ہو سکتی تھی۔

ایمان کو بہت اچھی طرح یاد تھا کہ حرا بھابی نے کبھی بھی اس کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی تھی نہ کبھی ڈانٹا نہ جھڑکا اور نہ ہی کبھی بلاوجہ کاموں کے لئے آواز دی، بلکہ وہ تو اس کا بہت خیال رکھتی تھیں، اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنا کر لنچ باکس تیار کر کے اسے سکول بھیجتیں اور ان کے پیار کرنے کا جو مخصوص اسٹائل تھا یعنی کہ ماتھے پر بوسہ دینا، وہ تو دل ہی موہ لیتا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ اور بے تحاشا چمکیلے بالوں کی موٹی موٹی چوٹیاں بناتے ہوئے وہ مسلسل بولتی رہتی تھیں۔

”اف عمیر! ایکی کے بال کس قدر خوبصورت اور گھنے ہیں اور اتنے سلکی گویا ریشم“ عمیر بھیا مسکرا کر ایمان کی طرف دیکھتے اور پھر اخبار کی طرف متوجہ ہو جاتے، جبکہ بھابی کی تعریفوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ اس کی وین کا ہارن سنائی نہیں دیتا تھا۔

چھٹی والے روز تو وہ ضرور زبردستی اسے گھسیٹ گھساٹ کر گود میں دبائے تیل کی مالش کرتی تھیں اور پھر انڈے اور دہی کو مکس کر کے لگانے والا انتہائی تکلیف دہ کام بھی وہ بخوشی سرانجام دیتیں۔

”بالوں کی حفاظت کی اس سے بہترین ٹپ کوئی نہیں۔“ بالوں کی مالش کرنے کے بعد وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کے ناخن تراشتیں۔

”دیکھو کتنے گندے نیلز ہو رہے ہیں تمہارے۔“ وہ خفگی سے اسے گھورتیں اور پھر بہت پیار سے اس کے ناخن تراشتیں تاکہ ایمان کو تکلیف نہ ہو، بھابی کی مہربانیوں کا سلسلہ حمزہ، حماد اور بسمہ کی آمد کے بعد بھی اول روز کی طرح ہی تھا، اسکول میں لڑکیاں اس کی بھابی کے قصے سن سن کر رشک

بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی تھیں، ایک دن اس کی کلاس فیلو عیشہ نے تو بڑے معصومانہ حسد بھرے انداز میں کہہ بھی دیا تھا۔

”یار ایمان! تم تو اتنی پیاری بھی نہیں ہو تب بھی تمہاری بھابی تم سے اتنا پیار کرتی ہیں، جبکہ میں تو اتنی کیوٹ ہوں پھر بھی بھابی کو زہر سے بری لگتی ہوں۔“ کچھ لڑکیاں اس کی بے وقوفانہ بات سن کر ہنس پڑی تھیں اور بعض نے اسے قدرے دبی آواز میں ڈانٹا۔

”تم میں تو عیشہ عقل کی کمی ہے، اسی لئے تمہاری بھابی تمہیں زہر کی پڑیا سمجھتی ہیں۔“ عیشہ احمقوں کی طرح قل قل کرتی ان لڑکیوں کو گھورتی رہی اور پھر پاؤں پٹختی چلی گئی جبکہ عیشہ کے الفاظ ایمان کے دل کے کسی گوشے میں گھس کر رہ گئے تھے، گھر آکر بھی وہ کتنی ہی دیر گم سم رہی، بہانے بہانے سے کئی مرتبہ واش روم جا کر آئینہ کو دیکھا اور پھر قدرے مایوس سی منہ لٹکائے باہر آگئی، بھابی نے اس کی رونی صورت دیکھی تو حیرانی سے اس کے قریب آکر بولیں۔

”ایمی! کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں“ اس نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔

”کوئی بات تو ضرور ہے، اتنی غمگین صورت بنا کر کیوں بیٹھی ہو۔“ بھابی بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے کر بولیں۔ ایمان نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا بس اک نظر انہیں دیکھ کر چہرہ جھکا لیا۔

”ٹیچر نے ڈانٹا ہے؟“

”نہیں“

فرینڈز سے جھگڑا ہوا ہے؟“

”نہیں“

”بھیا نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں“

”تو پھر بات کیا ہے۔ اتنی چپ چپ کیوں ہو؟“ بھابی اس کی ”نہیں نہیں“ کی گردان سے زچ ہو گئی تھیں۔ ایمان کی آنکھیں پل بھر میں ہی چھلک پڑیں اور حرا بھابی ارے ارے ہی کرتی رہ گئیں۔

”کیا بات ہے گڑیا! کچھ بولو بھی تو“

”بھابی! کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟“ اس کے غیر متوقع سوال نے حرا بھابی کو ششدر سا کر دیا تھا۔ وہ کئی پل تو کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں اور پھر کچھ سوچتے ہوئے جب وہ بولیں تو ان کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

”کیوں نہیں“ ہماری ایمان بہت خوبصورت ہے، بہت ہی پیاری بلکہ سب سے پیاری، انتہائی معصوم، دلکش اور یہ بڑی بڑی سحرا انگیز آنکھوں والی۔ پتا ہے ایمان تمہاری ساری خوبصورتی ان آنکھوں میں سمٹ آئی ہے۔“ بھابی نے کتنے پیار سے اس کے دکھے دل پر مرہم رکھا تھا کہ دل کا بوجھ قدرے کم ہو گیا۔ اس نے بہت آرام سے عیشہ کی گفتگو بھابی کے گوش گزار کر دی تھی بھابی کئی لمحے ہنستی رہیں اور پھر ایک دم ہی سنجیدہ ہو گئیں۔

”دیکھو ایمان! اب تم بچی نہیں ہو میٹرک کی سٹوڈنٹ ہو، اگلے سال کالج چلی جاؤ گی۔ اب تمہیں بہت سمجھداری سے چلنا ہوگا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے ہوں گے۔ زیادہ دوستیاں ترک کر دو کہ کبھی کبھی یہ ”دوستی“ بھی عذاب بن جاتی ہے۔ اور ہاں اب منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور بچے بھی انتظار کر رہے ہیں۔“ اس کے دل کا بوجھ ختم ہو چکا تھا سودہ ہلکی پھلکی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ کالج پہنچی تو اک نئی دنیا سے تعارف ہوا مگر بھابی کی نصیحتیں اس کے ہمقدم تھیں۔ کالج کے چار سال بھی گزر گئے۔ آگے پڑھنے کا خیال اس نے دل سے نکال کر گھر داری میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ بھابی اور بھیا کے بے حد اصرار پر بھی اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں لیا تھا۔

بھابی کے روئے میں کب، کیسے اور کہاں سے تبدیلی آنا شروع ہوئی تھی۔ زیادہ سوچنے کا تردد اسے نہیں کرنا پڑا تھا۔

عمار کے ساتھ منگنی کے بعد بھابی کے لہجے میں کڑواہٹ سی گھلنے لگی تھی۔ بات بے بات طنزیہ گفتگو، طعنے اور ہمہ وقت جلی کٹی سنانا۔ وہ پہلے والی حرا بھابی سے یکسر مختلف ہو گئی تھیں۔ وہ حرا بھابی جن پر ایمان فدا تھی نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ ان کے لہجے کی شائستگی، مٹھاس اور لبوں کی میٹھی سی مسکان بھی غائب ہو چکی تھی۔ نفرت کا یہ ڈھکا چھپا اظہار اب آواز بن کر ارد گرد بھی گونجنے لگا تھا۔

عمار، حرا بھابی کی سگی خالہ کا بیٹا تھا اور ان کی چھوٹی اور انتہائی لاڈلی بہن زونہ کا کلاس فیلو بھی، زونہ اور عمار کی دوستی بھی بہت تھی اور ان کی دوستی کے قصے بھابی اکثر ہی اسے سنایا کرتی تھیں۔

انہوں نے ہمیشہ زونہ اور عمار کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھا تھا مگر غیر متوقع عمار کے پہلو میں ایمان جا کھڑی ہوئی تھی۔ یہ زندہ جاوید حقیقت نہ تو ان کا دل قبول کر رہا تھا اور نہ ہی دماغ۔ ان کے ارد گرد چنگاریاں سی پھوٹ پڑی تھیں۔ زونہ کو ماں کے مرنے کے بعد بالکل بسمہ کی طرح ہی انہوں نے



شفقت و محبت دی تھی۔ اس کی ہر خواہش پوری کی اور پایا بھی آٹھ ماہ پہلے چل بسے تو زونیہ انہیں اور بھی زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ وہ تو ابھی تک اس وقت کو کوستی تھیں کہ کیوں اپنی ماموں زاد بہن عموریہ کی شادی میں ایمان کو لے کر گئیں۔ نہ یہ کلمو ہی شادی میں جاتی نہ عمار کی نگاہ اس پر پڑتی اور نہ ہی وہ اس حد تک اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا۔

وہ تو حیران تھی کہ عمار نے بھلا اس میں دیکھا کیا ہے۔ حرا بھابی کا پورا خاندان ہی خوبصورتی میں بے مثال تھا اور عمار اپنے خاندان کی انتہائی حسین لڑکیوں کو چھوڑ کر ایک معمولی لڑکی خاطر اپنے پورے خاندان سے لڑ پڑا۔

سب سے پہلے تو عمار کی امی مہر بیگم نے شدید قسم کا احتجاج کیا تھا انہیں بہو کے روپ میں ایمان جیسی لڑکی پسند نہیں آئی تھی۔ انتہائی خاموش، سادہ اور دبوسی۔ انہیں تو عباد کی بیوی انابیہ جیسی بہو کی تلاش تھی اور اگر ایمان بھی انابیہ کی طرح حسین اور چنچل سی ہوتی تو وہ بخوشی اسے بہو بنا لیتیں مگر ایمان کو دیکھنے کے بعد ان کے دل میں دراڑ سی پڑ گئی تھی۔

عمار کی بڑی بہن آمنہ آپنی کو خبر ہوئی تو وہ بھی جلتی کلمستی فوراً میکے پہنچ گئیں اور پھر عمار کے خوب ہی لتے لئے۔

”یہ پڑھتے پڑھتے کیا خناس بھر گیا ہے تمہارے دماغ میں۔ آرام سے پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو اور پھر اس بارے میں بھی سوچیں گے۔“ آمنہ آپنی نے اپنے تئیں بات مکمل کردی تھی مگر عمار شاید اسی موقع کی تلاش میں تھا کہ کب یہ ذکر خیر چھیڑا جائے اور کب وہ اپنے مضبوط دلائل سے ان سب کو قائل کرے۔

”یہ میرا ماسٹرز کا آخری سال ہے۔ امید ہے کہ بابا کی کرم نوازی کے بعد فوراً ہی جاب بھی مل جائے گی اور میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد یقیناً اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔“

”عمار! ہمیں وہ لڑکی قطعاً پسند نہیں آئی۔“ مہر بیگم نے لگی لیٹی بغیر ترشی سے کہا تو عمار کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے۔

”امی! پلیز“ اس نے بمشکل ہی کوئی سخت لفظ کہنے سے خود کو روکا۔

”زونیہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“ آمنہ آپنی اس کا بگڑتا موڈ دیکھ کر حلاوت سے بولی تھیں۔ عمار نے اک طویل سانس کھینچا۔

”زونیہ کے بارے میں مجھ سے نہیں ولید سے پوچھیں۔ وہ آپ کو ٹھیک ٹھیک جواب دے گا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا“ آمنہ آپنی نے ٹھٹک کر پوچھا تو عمار کے لبوں پر مسکان کھل اٹھی۔

”مطلب بھی وہ ہی صاحب آپ کو بتائیں گے“

”عمار! ایک بات کان کھول سن لو، پہلے حاشر اور ولید کی بات طے ہوگی، پھر تمہارا سوچیں گے۔ اس سے پہلے ہم اس لڑکی کے گھر جانے والے نہیں“ مہر بیگم جو ٹیلی فون کی بیل سن کر اٹھ گئی تھیں۔ واپس آکر اسی سخت لہجے میں بولیں تو عمار مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”او... تو پہلے ولید کی نیا پار لگانی ہوگی مگر حاشر والا معاملہ تو میرے بس کی بات نہیں۔ وہ اڑیل گھوڑا، ضدی، ڈھیٹ اور بددماغ سا بندہ میری کہاں سنے

گا“ وہ سوچتے ہوئے اٹھا اور سیدھا ولید کے آفس جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس کے روبرو تھا۔

”کیوں آئے ہو؟“ ولید کافی مصروف تھا اسی لئے قدرے جھنجلا کر عمار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ عمار نے کان کھجا کر شرارت سے کہا تو ولید کی تیوری چڑھ گئی۔

”پانچ بجے تک میں نے گھر آہی جانا تھا کیا ضرورت تھی دفتر میں آنے کی“

”بس تمہیں دیکھے ہوئے سات گھنٹے ہو چکے تھے۔ دل دیدار کو مچلا تو میں دوڑا چلا آیا“ عمار نے مسکراہٹ دبائی تو ولید کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

”بکواس نہ کر اور کام بتا۔“

”کام تمہارے ہی مطلب کا ہے“ عمار نے ذرا تجسس پھیلانے کی کوشش کی تو ولید نے فوراً ہی ہاتھ جوڑے۔

”اب دس گھنٹے فضول کی بک بک کر کے میرا دماغ مت چاٹنا“

زونہ کے متعلق بات ہے“ عمار کی توقع کے عین مطابق ولید صاحب پہلے چونکے پھر ٹھٹھکے اور پھر خوشامدی سی مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔

”یار عمار! یہ گاڑی کی چابی لے اور چل کر گاڑی میں بیٹھ۔ میں ابھی بیس منٹ میں یہ فائل بخاری صاحب کے متھے مار کر آتا ہوں۔ پھر پی سی چلیں گے۔ ڈنر کے بعد ہی اس اہم ترین معاملے کو ڈسکس کیا جائے گا“ ولید کے کہنے پر عمار گاڑی کی چابی جھپٹ کر کھڑا ہو گیا اور پھر مسکراتے ہوئے جاتے جاتے پلٹا۔

”بہت ”مطلبی“ ہو تم ولید!“

”پر تم سے کم“ ولید نے بھی ترنت جواب دیا تھا اور پھر فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

ویٹر کو آرڈر نوٹ کروانے کے بعد وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ ولید کو تمام بات بتانے لگا تھا۔ ولید بھی چونکہ امی کی ضد سے واقف تھا لہذا پر سوچ انداز میں سر ہلاتا رہا۔

”امی کی ضد فضول ہے۔ شادی نہ سہی کم از کم رشتے کی بات تو کریں نا۔ ظاہر ہے وہ لڑکی والے ہیں۔ عمیر بھائی ان دنوں میں اس کی کہیں بات وغیرہ نہ چلا دیں۔ اب حرا آپا گھر تو نہیں بٹھائے رکھیں گی۔“

”یہی بات تو میں آمنہ آپا کو سمجھاتا رہا ہوں مگر ان لوگوں کی بھی ایک ہی رٹ ہے کہ پہلے ولید اور حاشر پھر میں۔ کاش میں تم دونوں سے چند سال پہلے ہی اس دنیا میں آجاتا۔“ ولید اور حاشر دونوں ٹونز تھے اور عمار سے صرف چند سال بڑے۔ عمروں میں چونکہ اتنا فرق نہیں تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا اسی لئے ان دونوں میں خوب دوستی بھی تھی جبکہ حاشر ان سب سے الگ تھا۔ ساری زندگی ابو ظہبی میں گزری تھی کیونکہ جب یہ دونوں پیدا ہوئے تھے تب ہی امی اور بابا نے ابو ظہبی میں مقیم ان کے تایا جو کہ بے

اولاد تھے ان کی گود میں اپنے بیٹے حاشر کو ڈال دیا تھا اور یوں حاشر ان سے الگ ابو ظہبی تایا، تائی کی مہربان گود میں پلا بڑھا۔

تقریباً چھ سال پہلے تایا تائی کا بھی انتقال ہو گیا تھا مگر حاشر ان سب کے بے انتہا اصرار، محبت بھرے بلاؤں پر بھی واپس نہیں آیا تھا۔ صرف تین سال پہلے جب بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تو محض ایک مہینے کے لئے آیا تھا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا“ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد ولید نے آہستگی سے کہا تو عمار نے کافی خفگی بھری نگاہوں سے اپنے پیارے بھائی کو گھورا، جو کہ ان سب بھائیوں میں سے سب سے زیادہ نرم مزاج اور حلیم طبع تھا۔ اس کی خوب روئی کو یہ معصومیت بھری شرافت چار چاند لگا دینے کے لئے کافی تھی۔

”گھا مڑ! تم امی کو زونیہ کے متعلق بتاؤ۔ تاکہ کم از کم تمہارا بوجھ تو میرے نازک کندھوں سے ہٹے اور رہی حاشر کی بات تو وہ میں خود ہی معاملہ نبٹالوں گا۔“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر“ ولید سعادت مندی سے سر ہلا کر بولا۔

”اب پیٹ پوجا کر لی جائے“ ویٹر کو آتا دیکھ کر عمار نے بے صبری سے کہا اور پھر دونوں ہی آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔

گھر آکر عمار نے سب سے پہلے ایمان کو فون کھڑکایا تھا اور اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ فون ایمان نے ہی اٹھایا۔

”کیسی ہو ایمان؟“ اس محبت بھرے لہجے کا وہ جواب دیتی بھی تو کیا۔ وہ تو عمار کی اس درجے محبت پر ہی پریشان تھی کہ اوپر سے بھابی کی تلخ و ترش باتیں۔

”ہیلو، ایمان سن رہی ہو۔ پلیز فون بند مت کرنا میری بات سننے بغیر“ دوسری طرف بے حد التجائیہ لب و لہجے میں درخواست کی گئی تھی۔ ایمان بے بسی کے عالم میں ہونٹ چبا کر رہ گئی۔

”میں بہت لمبی بات نہیں کروں گا نہ ہی کسی تمہید باندھنے میں وقت ضائع کروں گا۔ صرف اتنا بتا دو تمہیں میرا ساتھ قبول ہے۔ اگر میں امی بابا کو

بھیجوں تو تمہاری طرف سے انکار تو نہیں ہوگا کیونکہ حرا آپا کی طرف سے



مجھے انکار کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ بس دھڑکا ہے تو تمہاری اس چٹ کا۔ مجھے یہ خاموشی ”خوف“ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ تمہاری طرف سے انکار کا خوف، پلیز یار کچھ تو بولو۔ ہاں یا نہ میں جواب دے

دو۔ اگر میں تمہیں پسند نہیں تب بھی صاف صاف بتا دو۔ زبردستی تھوڑی ہے۔

دیکھ لینا پھر میں کبھی تمہیں فون نہیں کروں گا اور نہ ہی کبھی اس بات کا دوبارہ ذکر ہوگا اور پھر کبھی زندگی میں دوبارہ ملے بھی تو اجنبی بن کر ہی ملیں گے۔ یہ عمار کا تم سے وعدہ ہے، ”عمار نہ جانے اور بھی کیا کیا کہہ رہا تھا۔ ایمان تو بس اس کی آواز کے سحر میں ہی کھو گئی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ جسے لاکھ کوششوں کے باوجود بھی دل میں بسنے سے نہیں روک پائی تھی۔ وہ ایمان سے محبت کرتا تھا۔ اس کی شدید محبت اس کے لفظ لفظ میں پوشیدہ تھی۔ عمار کی محبت اس کی دیوانگی کی شدت نے اسے پگھلا دیا تھا۔

وہ بھی اسے چاہنے لگی تھی۔ اسی شدت سے جس کی تمنا عمار کو تھی۔ ایمان کا اقرار عمار کے دل پر پھوار بن کر برسا تھا اور پھر نہ جانے کیسے اس نے اپنے گھر والوں کو منایا وہ جب بھی پوچھتی عمار ٹال جاتا یا پھر خفگی دکھانے لگتا۔ ”یہ میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں“ عمار نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ ایمان دل مسوس کر رہ جاتی۔

ادھر اگر عمار کی بے تحاشہ محبت تھی تو دوسری طرف عزیز از جان بھابی کی بے رخی دل و روح کو بے چین کیے رکھتی۔

اس کی منگنی اور نکاح کے درمیانی عرصہ تک حرا بھابی کو اک گہری چپ نے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا تھا اور اس کے بعد ان کی زبان کے جوہر کھلنے لگے۔ ان کا لفظ لفظ گویا زہر میں ڈوبا ہوتا تھا۔

”مردوں کو رجھانے کی ادائیں نہ جانے کہاں سے سیکھی ہیں۔“ ایمان آنسو پیتی خاموشی سے ہنستی رہتی۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ سارا دن کاموں میں مصروف رہنا اور پھر رات کی تاریکی میں گھٹ گھٹ کر رونا۔ عمیر بھیا کے

سامنے ان کی زبان پہلے کی طرح ہی شہد ٹپکانے لگتی تھی۔ حرا بھابی کا یہ منافقانہ رویہ اور خوشامدی انداز بھی اس نے اب ملاحظہ کیا تھا۔

”عمار کی ضد کی وجہ سے خالہ جان مجبور ہو گئی ہیں ورنہ ایمان تو انہیں قطعاً پسند نہیں۔“ اس وقت بھی وہ ٹیلی فون گود میں رکھے نہ جانے کسی سے گفتگو فرما رہی تھیں۔ آج کل ہر وقت ایمان کا ذکر ان کے لبوں پر اور زبان اس کی ”خوبیاں“ فراٹے سے بیان کرتی تھی۔

”نہ جانے کون سا جادو کیا ہے اس گھنی میسنی نے عمار پر، نہ کسی کی سنتا ہے نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس ایک ہی تکرار... میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ دو سال سے پہلے تو رخصتی نہیں کروں گی۔ چاہے جو مرضی کرو۔“ وہ لاؤنج کی ڈسٹنگ کر رہی تھی اور حرا بھابی مسلسل اسے نگاہوں کی زد میں لیے گھور رہی تھیں۔ ایمان نے تیز تیز ہاتھ چلا کر کام ختم کیا اور پھر کچن میں گھس گئی مگر ان کی آواز تو بغیر کسی رکاوٹ کے یہاں تک بھی باآسانی پہنچ رہی تھی۔

”نہیں یار! زونہ مانے بھی تو اتنا اصرار کیا تھا میں نے کہا ادھر آکر رہ لو، پاپا کے بعد زیتون بوا کے ساتھ تنہا رہنا مناسب نہیں۔ وہ بوڑھی عورت بھلا کیا سہارا دے سکتی ہے مگر زونہ نہیں مانی۔ اب ان ”محترمہ“ کو ٹھکانے لگا کر ہی اس کے بارے میں سوچوں گی“ گفتگو کا رخ زونہ کی طرف مڑتے مڑتے ایک مرتبہ پھر اس کی ذات کے گرد گھومنے لگا تھا۔ اور اپنی ذات کا یوں موضوع بحث بننا توہین آمیز باتیں سننا کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا۔ وہ بے بسی کے احساس سے لب بھینچ کر رہی گئی تھی۔

☆☆☆

”میری جان یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ یہ الجھے بال، ستا ہوا چہرہ، زونہ! کیا بات ہے۔ کیوں اس طرح کمرے میں اندھیرا کیے بے سدھ پڑی ہو؟“ حرا، زونہ کے کمرے میں داخل ہوئیں تو اسے بستر میں بے وقت لیٹا دیکھ کر ان کے دل پر گویا گھونسا پڑا تھا۔

”عمار! تیرا بیڑا عرق ہو، میری بہن کو اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔ تیری بھی دل کی مراد کبھی نہ پوری ہو۔“ عمار کو دل ہی دل میں تین چار گالیوں سے نواز کر انہوں نے زونہ کا کمبل کھینچا تو وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا بات ہے آپا! صبح صبح جگا دیا ہے“

”یہ صبح ہے۔ گھڑی کی طرف دیکھو، بارہ بج چکے ہیں“ حرا اس کی گلابی آنکھوں میں تیرتے ڈوروں کو دیکھ کر افسردگی سے بولیں۔

”شاید رات بھر روتی رہی ہے یہ“ ان کے دل کو گویا کسی نے مٹھی میں بھینچ کر مسل ڈالا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر عمار کو دل ہی دل میں کوسا۔

”اصل میں رات میں ایک بہت اچھا ناول پڑھتی رہی ہوں۔ اسی لئے دیر سے سوئی تھی۔ لہذا اپنے وقت پر آنکھ بھی نہیں کھل سکی۔“ زونہ نے بالوں کو کچھر میں سمیٹ کر اک اور طویل سی جماہی لی تو حرا کو اس کی بات پر بالکل یقین نہ آیا۔

”یہ ایمان کمینی کتنی بخت آور ہے۔ بیٹھے بٹھائے سب کچھ مل گیا۔“ حرا کی جلن زبان پر آگئی تھی، زونہ کے منہ میں بھی گویا کڑوے بادام آگئے۔

”آپا پلیز! اس فضول سی ایمان کا ذکر کم از کم میرے سامنے مت کیا کریں۔“ زونہ کے انداز میں لاپرواہی تھی۔ حرا کے دل پر ملال کے گہرے بادل چھا گئے۔

”تم دل چھوٹا مت کرو، عمار میں ایسے بھی سرخاب کے پر نہیں لگے کہ اس کی خاطر جوگ لے لیا جائے میری تو۔“

”کیا مطلب آپا،“ زونہ کو حرا کی بات سے گویا کرنٹ لگا تھا۔ وہ ایک دم اچھل کر دور ہٹی اور پھر خفگی سے بولی تھی۔

”تم عمار سے، میرا مطلب ہے کہ...“ زونہ کا انداز ہی ایسا تھا کہ حرا ہکلا کر رہ گئیں۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں بھلا عمار سے، اف آپ نے سوچا بھی کیسے وہ میرا دوست ہے، کزن اور کلاس فیلو بس“

”اوہ اچھا میں سمجھی کہ تم عمار میں انٹرسٹڈ ہو۔“ حرا کے ذہن و دل سے بھی غبار کے بادل چھٹ گئے تھے۔

”تو پھر میں تمہیں ایک خوشخبری سناتی ہوں خالہ نے تمہارے لئے ولید کا پرنپوزل دیا ہے“

”کیا“ زونہ کو جھٹکا لگا تھا جبکہ حرا خوشی خوشی باقی تفصیل بتانے لگی تھیں کہ رات کو خالہ نے فون پر ان سے بات کی تھی جبکہ وہ پورے دل سے نہ خوش ہو پائیں اور نہ ہی انہوں نے خالہ سے ٹھیک طریقے سے بات کی۔

”ولید بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے، اپنی گاڑی بھی ہے۔ مجھے تو عمار کے مقابلے میں ولید ہی زیادہ پسند تھا مگر تمہاری وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ اب جبکہ غلط فہمی دور ہو چکی ہے تو میں خالہ کو خوشخبری سنا دیتی ہوں اور...“

”پلیز آپا خاموش ہو جائیں“ زونہ نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چلا کر کہا تھا۔ حرا یکدم ہی خاموش ہو گئیں۔

”سارے فیصلے خود بخود کر لئے ہیں۔ میری مرضی میری رضا پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔“ شدت جذبات سے اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔ حرا چونک اٹھی۔

”تمہاری مرضی“ وہ زیر لب بڑ بڑائیں اور پھر قدرے ناگواری سے بولیں۔

”ابھی تمہاری مرضی ہی پوچھنے کے لئے آئی ہوں“

”آپ خالہ کو انکار کر دیں۔“

”وجہ...؟“ حرا کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔

”مجھے ولید پسند نہیں۔“

”کیا برائی ہے اس میں۔“

”کوئی برائی نہیں، میں نے کبھی اس کے متعلق ایسا سوچا نہیں۔“

”تو اب سوچ لو۔“

”بس سوچ لیا۔“



”کیا؟“

”کہ مجھے ولید سے شادی نہیں کرنی۔“

”سو پھر کس سے کرنی ہے۔“ حرا زچ ہو کر چلا اٹھی تھیں جبکہ زونہ

اضطراری انداز میں ٹانگیں جھلاتی رہی۔

”بولو کون ہے وہ؟“ حرا نے تلخی سے کہا۔ زونہ نے اب بھی کوئی جواب

نہیں دیا تھا بلکہ سامنے لگی پینٹنگ کو بغور دیکھتی رہی۔

”میں تم سے مخاطب ہوں۔“

”کوئی نہیں۔“ اس کی نگاہوں کی بے چینیاں کسی اور راز کو فاش کر رہی تھیں۔

”جھوٹ مت بولو۔“ حرا کو قطعاً یقین نہیں آیا تھا۔

”یہی سچ ہے۔“

”یہ سچ نہیں ہے۔“ حرا نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا تھا۔

”آپ کچھ بھی سمجھتی رہیں۔“ زونہ لاپرواہی سے بولی تو حرا تنک اٹھیں۔

”میں تمہاری خاطر پریشان ہوں، تمہارا گھر بسا دیکھنا چاہتی ہوں اور تم۔“

”آپ میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔“ اس کی بے نیازی ہنوز قائم تھی۔

”تو پھر کون ہے جو تیرے غم میں گھلے گا، بھائی اپنی الگ دنیا بسا کر بیٹھ گیا

ہے۔ فکر ہی نہیں کہ بہن تنہا اکیلی اتنے بڑے گھر میں رہ رہی ہے مگر۔“

”آپا بس کریں، یہ رمیز کی زندگی ہے، اسے اپنی زندگی جینے دیں۔“

”تم اتنی بے حس کیوں ہو رہی ہو۔“

”مجھے میرے حال پر چھوڑیں۔“ اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر وہ بھیپنی آواز میں بولی تھی۔

”زونہ! یہ کیا پاگل پن ہے۔“ حرا نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار سے کہا تو

وہ نہ جانے کیوں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”بتاؤ کون ہے وہ۔“

”پوچھ کر کیا کریں گی۔“ وہ بھیگی آواز میں بولی۔

”میں پوچھ رہی ہوں کون ہے وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے۔“

”میرے دل میں رہتا ہے۔“ زونہ آنسو پونچھ کر اب مسکرا رہی تھی۔ حرا نے سر تھام لیا۔

”اس شہزادے کا کوئی نام...“ وہ جان بوجھ کر سوچنے کی ایکٹنگ کرنے لگی تھی۔ حرا نے اس کے کان کو پکڑ کر زور سے کھینچا تو وہ چیختے ہوئے بولی۔

”بتاتی ہوں آپا! پلیز کان تو چھوڑیں۔“

”بتا بھی دو“ حرا نے بے چینی سے پوچھا۔

”حاشر...“

”کیا“ حرا پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

حرا بے حد پریشان اور الجھی الجھی سی گھر آئیں تو ایمان ان کے چہرے پر پھیلے تفکر کے سائے دیکھ کر چونک اٹھی۔

”نہ جانے بھابی کو کیا پریشانی ہے۔“ اس کا صدا کا نرم دل بھابی کی اتری صورت دیکھ کر بے چین ہو اٹھا تھا۔

”پتا نہیں بات کیا ہے۔ اگر میں پوچھوں گی تو یقیناً غصہ کریں گی۔“ وہ کھانا پکاتے ہوئے مسلسل سوچے جارہی تھی اسی اثنا میں حرا کچن کے دروازے میں آکھڑی ہوئیں۔

”ایمان! ایک کپ چائے بنا دو۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور تم بھی اب کچن سے نکل کر کچھ دیر آرام کرلو۔ ویسے اب طبیعت کیسی ہے تمہاری؟“ حرا بھابی کے اتنے نرم ملائم لہجے اور میٹھی آواز کو سن کر ایمان بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔ آنکھوں میں ڈھیروں حیرت لئے اس نے اپنی طبیعت کے ”اچھا“ ہو جانے کا بتا کر دوسرے چولہے پر چائے کا پانی رکھا اور پھر کچھ ہی

دیر بعد وہ چائے کے کپ اور ہمراہ ایک عدد ٹیبلٹ کے ٹرے سمیت بھابی کے کمرے میں موجود تھی۔

”بھابی! سر بہت درد کر رہا ہے تو دبا دوں۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ ایک گھنٹے تک آرام کروں گی تو خود بخود طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“

لہجے کی نرمی ابھی تک برقرار تھی۔ ایمان حیران پریشان سی لائٹ آف کر کے باہر آگئی۔

”بھابی کو نہ جانے کیا ہوا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ان کی ”واقعی“ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے لاؤنج میں کھڑے ہو کر با آواز بلند کہا تھا اسی اثنا میں فون کی بیل گنگنا اٹھی۔ اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے آتی عمار کی آواز سن کر اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہو گئی تھیں۔

”کیسی ہو ایمان ڈیر! کبھی یاد ہی کر لیا کرو مجھے۔“

”یاد انہیں کیا جاتا ہے جو بھول چکے ہوتے ہیں۔ جو ہمہ وقت دل میں بستے ہوں۔ جن کے نام سے ہی صبح اور شام میں رنگینیاں ہوں، جن کے ذکر سے تن من پر ٹھنڈ کی پھوار برسنے لگتی ہے اگر وہ بھی ”یاد“ کرنے کا شکوہ کریں تو پھر کیا کہا جاسکتا ہے۔“ وہ بے ساختہ عمار کی بات کاٹ کر بولی اور پھر بولتی ہی چلی گئی جبکہ عمار اس کے بولنے اور ”اتنا“ بولنے پر خوشگوار حیرت میں گھر گیا تھا۔

”تم ایمان ہی ہو یا پھر میں ہی خواب دیکھ رہا ہوں۔“

”میں ایمان ہوں اور آپ کو خواب نہیں دیکھ رہے بلکہ مجھ سے گفتگو کر رہے ہیں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولی تھی۔ عمار کے لبوں پر بھی مسکان پھیل گئی۔

”مجھے پتا ہے کہ آپ ”ایمان“ ہیں اور میں بے ایمان۔ اتنے پیار سے بات مت کرو کہ دل تمام حدود کو پار کرنے کا سوچ لے اور میں نے جو حرا آپا سے عہد کر رکھا ہے اسے توڑنا پڑے۔“

”ایسا آپ سوچئے گا بھی مت، ورنہ بھابی کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔“ ایمان نے اسے دھمکانا چاہا۔

”بھابی اب کچھ نہیں کر سکتیں، کیونکہ ہم تمام حقوق اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ بھابی کا ہوا دل سے نکال دو۔“ عمار کے انداز میں لاپرواہی تھی۔

”اتنی خوش فہمی بھی اچھی نہیں۔ حرا بھابی کا موڈ بدلتے دیر نہیں لگتی۔“

”اسی لئے تو ’پکے‘ کاغذوں پر دستخط کروائے ہیں۔“ عمار نے مسکرا کر کہا۔ خوشی گویا اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”یار ایمان! میں تمہیں فون کر سکتا ہوں نا۔“ انداز بھر پور اجازت لینے والا تھا۔ ایمان کو ہنسی آگئی۔

”آپ اب بھی فون ہی کر رہے ہیں اور یقیناً فون کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے اجازت ہر گز نہیں لی تھی۔“

”لڑکی! تمہیں تو بولنا بھی آگیا ہے۔“ عمار نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”آپ کی محبت کا اعجاز ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

”ابھی تو تم نے میری محبت دیکھی کہاں ہیں۔ جو کچھ میرے دل میں تمہارے لئے ہے اگر ایک مرتبہ جھانک کر دیکھ لو میرے دل میں تو پھر تو، تم نہیں رہو گی۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔ اس کی محبت کی

شدت محسوس کرتے ہوئے ایمان کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا تھا۔

”میں اتنی خوبصورت تو نہیں ہوں۔“

”بے وقوف محبت کیا خوبصورتی دیکھ کر کی جاتی ہے۔“ عمار نے اسے خفگی سے ڈپٹا تو دل میں چبھی وہ آخری پھانس بھی دھیرے سے نکل گئی تھی۔

بچوں کی دین کا ہارن بجا تو اس نے الوداعی کلمات کہہ کر فون رکھ دیا تھا، مگر عمار کی آواز، اس کی باتیں، اس کے کانوں میں ابھی تک رس گھول رہی تھیں، وہ ابھی بھی عمار کی سحر انگیز آواز کے زیر اثر تھی، اسی لئے تو اس سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہو پا رہا تھا، برتن، پلیٹیں ہاتھ سے پھسل



پھسل جاتے تھے، بچوں کے لئے اپیل شیک بنایا تو بجائے شوگر کے ڈھیروں نمک جگ میں ڈال دیا اب تو حمزہ کو اچھی خاصی تشویش لاحق ہو گئی تھی۔

”پھوپھو! کیا بات ہے؟ کیا عمار ماما کا فون آیا تھا۔“ اس کے بارہ سالہ بھتیجے نے آنکھیں پٹیٹا کر کہا تو حماد اور بسمہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”ہوں“ یقیناً عمار ماما کا فون ہی آیا ہوگا، تبھی تو پھوپھو اتنی خوش دکھائی دے رہی ہیں۔“ حمزہ اپنے اندازے کی درستگی پر نازاں سا فخر سے چھوٹے بھائی اور بہن کو دیکھ کر بولا تو ایمان چونک اٹھی۔

”کیا میری خوشی چہرے سے چھلک رہی ہے کہ بچوں تک نے فوراً محسوس کر لیا۔“ وہ حیرت زدہ سی چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچتی رہی۔

دوسرے دن صبح صبح حرا بھابی کمرے سے تیار شیار ہو کر باہر نکلیں، اسے بڑے پیار سے چند ایک ہدایات دیں اور یہ کہتے ہوئے کہ ”میں تمہاری

سسرال جا رہی ہوں۔“ باہر نکل گئیں، اچانک کچھ یاد آنے پر وہ جاتے جاتے

پلیٹیں، اک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔

”عمار کو کوئی پیغام تو نہیں دینا۔“

”نن، نہیں تو“ ایمان نے ہکلاتے ہوئے بمشکل کہا تھا، بھابی مسکراتے ہوئے پلٹ گئیں۔ ایمان ابھی تک ششدر کھڑی تھی۔

بھابی کے روئے کی اس اچانک تبدیلی کا کوئی سرا کم از کم اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ بھابی کے جانے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد زونہ آگئی تھی۔ کافی عرصے بعد وہ ان کے گھر آئی تھی۔ لہذا ایمان کو کافی خوش اخلاقی برتنی پڑی۔

ورنہ جتنی نک چڑھی اور موڈی سی زونہ تھی، ایمان قطعاً اس سے بات کر کے اپنا مزاج برہم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی زونہ اس کے پاس بیٹھتی ہی کب تھی۔ جب بھی آتی بھابی کے کمرے میں ہی گھسی رہتی، مگر اس وقت وہ بھی ایمان کو حیران کرنے کے چکروں میں تھی۔

”آج کل کیا کر رہی ہو ایمان!“

”کچھ بھی نہیں“ ایمان نے جزبہ ہوتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

”یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیتیں۔“

”بس ایسے ہی آگے پڑھنے کا موڈ نہیں بنا تو گھر داری میں ہی دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔“ وہ اٹھ کر فریج میں سے پیپسی کی بوتل نکال لائی تھی۔

زونبیہ کے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے نازک سے گلاس میں پیپسی انڈیل کر گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

”گھرداری سیکھنا تو اچھی بات ہے۔ مستقبل میں تم نے یہی کام تو کرنا ہے۔“ نہ جانے یہ طنز تھا کہ سراہنے کا کوئی انداز، ایمان سمجھی نہیں تھی۔ تاہم بغیر برا منائے نرمی سے بولی۔

”ہر لڑکی چاہے کوئی ڈاکٹر ہو یا انجینئر کرنی تو اسے بھی گھرداری ہی ہے۔ کیونکہ شوہروں کو بیویاں کچن میں کام کرتی ہی اچھی لگتی ہیں۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ زونبیہ نے اس کی بات سے اتفاق کر کے اسے ایک مرتبہ پھر حیران کر دیا تھا۔

”ویسے کوئی کمپیوٹر وغیرہ کا کورس کر لینا تھا۔“ زونبیہ نے ایک اور مخلصانہ

مشورہ دیا۔

”ہاں کبھی سوچوں گی“ ایمان نے ٹالنے والے انداز میں کہہ کر جان چھڑانی چاہی۔

”آپا کہاں گئی ہیں؟“ یہ سوال اسے آتے ساتھ ہی کرنا چاہیے تھا، اتنی تاخیر سے آپا کی غیر موجودگی کے بارے میں اس نے بڑے لاپرواہ سے انداز میں پوچھا تھا۔

”وہ عمار کے گھر گئی ہیں۔“

”کیوں؟“

”یہ تو نہیں بتایا انہوں نے کہ کیا کرنے جا رہی ہیں، شاید کوئی کام ہو۔“ ایمان اس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔ زونبیہ کو بے چینی نے گھیر لیا۔

”خالہ جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ وہ پیشانی مسلتے ہوئے دھیرے سے بولی اور پھر فون سیٹ گھسیٹ کر گود میں رکھ لیا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”ہاں، زین یہ بتاؤ آپا تمہاری طرف آئی ہیں؟“

دوسری طرف شاید زین نے ریسیور اٹھایا تھا۔ رسمی سی علیک سلیک کے بعد زونہ نے مطلب کی بات کی۔ خالہ کا حال احوال پوچھا اور پھر فون کریڈل پر رکھ دیا۔

”اچھا ایمان اب میں چلتی ہوں۔“ وہ ایکدم ہی اٹھی تھی اور پھر تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی، جبکہ ایمان پر سوچ نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

”میرے بچے، میری جان کب تک ماں کو سزا دو گے۔ کب اپنی صورت دکھاؤ گے۔ میں تمہاری شکل دیکھنے کے لئے ترس گئی ہوں۔ اس وقت آؤ گے جب میں نہیں رہوں گی۔“ مہر بیگم ریسیور ہاتھ میں پکڑے زار و قطار رو رہی

تھیں، جبکہ دوسری طرف حاشر ماں کے رونے دھونے اور ان کی التجاؤں کی وجہ سے کافی جھنجلا رہا تھا۔

پلیز امی! رونا تو بند کریں، آئندہ میں بالکل فون نہیں کروں گا۔“ حاشر نے فون نہ کرنے کی دھمکی دی تو مہر بیگم کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی۔

”ماں تڑپتی ہے تو تڑپے بھلا تمہیں کیوں پروا ہوگی۔ تمہاری یاد میں روتے روتے ایک دن مر گئی تو پھر دوڑتے ہوئے آجانا۔“

”امی! کیوں مجھے پریشان کر رہی ہیں۔ آپ کو بتایا تو ہے کہ میں فی الحال پاکستان نہیں آسکتا۔ آج کل میں اٹلی میں ہوں اور ناصر اور عامر کے ساتھ مل کر کاروبار کرنے کا ارادہ ہے میرا۔ کام وغیرہ سیٹ ہو جائے تو پھر آپ عمار کو بھی بھیج دیجئے گا۔ میرے لئے بھی آسانی ہو جائے گی۔“ حاشر نے تفصیلاً بتا کر اپنی نہ آنے کی مجبوری بتائی۔

”میں نے یہاں تمہارے لئے کافی لڑکیاں دیکھی ہیں۔ تم کہو تو تصویریں بھیج دوں۔“ انہوں نے ممتا سے لبریز لہجے میں کہا۔

”چلو جی ایک اور سیاپا۔“ حاشر زیر لب بڑ بڑایا۔

”آپ نے اتنی لڑکیاں دیکھنے کی زحمت کیوں کی ہے شادی تو میں نے ایک سے ہی کرنی ہے، اور...“

”اور کیا؟“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا تو مہر بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

”اور یہ کہ لڑکی میں پسند کر چکا ہوں۔“

”کون ہے؟ کیسی ہے؟ پہلے تو تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔“ مہر بیگم کو اداسی نے گھیر لیا۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ حاشر کی پاکستان شادی کر دیں، اسی بہانے وہ آتا جاتا تو رہے گا۔ اس کی بات سن کر وہ کافی آزرده ہو گئی تھیں۔

”پہلے کبھی آپ نے پوچھا بھی تو نہیں۔“ حاشر نے لاپرواہی سے کہا۔

”کیا تمہارے ساتھ پڑھتی تھی؟“

”ارے نہیں تو، ناصر کی بہن ہے میرہ۔“ حاشر نے مختصر بتا کر ان سے فون

کرنے کی اصل وجہ پوچھی تو مہر بیگم کو بھی اچانک خیال آیا۔

”ہاں، میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ ولید کے لئے میں نے زونہ کو پسند

کر لیا ہے۔ خیال تو پہلے بھی یہی تھا، مگر ولید کی طرف سے خدشہ تھا مجھے،

حالانکہ میرا بیٹا تم سب سے زیادہ فرماں بردار ہے، پھر بھی میں نے سوچا اس

کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی نہ ہو، حرا سے میں نے بات کر لی ہے۔ اس

نے بھی رضا مندی دے دی ہے۔ اب باقاعدہ رسم کرنے کا ارادہ ہے۔ میرا

جی تو چاہ رہا ہے کہ منگنی کے چکر میں پڑنے کے بجائے شادی کر دی جائے،

کیونکہ ادھر عمار بھی باؤلا ہوا جا رہا ہے۔

ویسے میرا تو یہی خیال تھا کہ تمہاری اور ولید کی اکٹھی شادی ہوتی۔ مگر تم

کون سا پہلے میری بات مانتے ہو جو اب آرام سے مان جاؤ گے۔“

”تو آپ عمار کی شادی کر دیں نا۔“ حاشر نے تمام تفصیل بغور سننے کے بعد

مشورے سے نوازا تو مہر بیگم خفگی سے بولیں۔

”نکاح تو کر دیا ہے، بس رخصتی باقی ہے۔ اب ولید کی شادی سے فارغ ہو کر

ہی سوچیں گے، اتنے میں عمار کا ماسٹرز بھی مکمل ہو جائے گا۔“



”ولید کی شادی پر جتنے اخراجات ہوں گے، مجھے بتا دیجئے گا، میں پیسے بھیج دوں گا۔“

”اچھا، میرے بچے اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔“ مہر بیگم بھیگی آنکھیں صاف کر کے تخت پر بیٹھ گئیں۔ انابیہ امی کو آزرده دیکھ کر سبزی کی ٹوکری اٹھائے کچن سے باہر آگئی تھی۔

”کیا کہہ رہا تھا حاشر؟“ انابیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”کچھ نہیں“ مہر بیگم کسی سوچ میں گم تھیں، اسی لئے مختصر بولیں۔

”پاکستان نہیں آئے گا۔“

”فی الحال تو کوئی ارادہ نہیں ہے، اگر موڈ بن گیا تو آجائے گا، ورنہ...“ انہوں نے ایک طویل سانس کھینچ کر بات ادھوی چھوڑ دی تھی اور پھر اک نظر انابیہ پر ڈال کر بولیں۔

”تم نے ابھی کھانا بھی نہیں بنایا اور ابھی بچے بھوک بھوک چلاتے سکول سے آجائیں گے اور عباد اور عمار کے بھی آنے کا وقت ہو رہا ہے۔“

”پلاؤ دم پر ہے، جبکہ راستہ بھی بنا چکی ہوں، بچے آئیں گے تب ہی کباب فرائی کروں گی۔ یہ مٹر آپ چھیل دیں، تاکہ میں انہیں فریز کر دوں۔“ انابیہ نے مٹروں سے بھری ٹوکری ساس کے سامنے رکھی اور پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”امی! آج کل رافیہ کے بھی بہت اچھے رشتے آرہے ہیں، مگر میرا خیال تھا کہ...“ مہر بیگم انابیہ کی نامکمل بات کا مفہوم سمجھ گئی تھیں، اسی لئے ایک سرد آہ ان کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

”ہر خواہش پوری کب ہوتی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ حاشر کی ادھر شادی کر دوں گی، اسی بہانے وہ نظر تو آئے گا مجھے، مگر...“

”حاشر نے کچھ کہا کیا؟“ انابیہ پریشانی سے بولی۔

”ہوں“ ان کا انداز مبہم سا تھا۔ انابیہ کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔

”کیا کہا ہے حاشر نے؟“

”کہتا ہے میرے لئے لڑکی وغیرہ پسند نہ کریں۔“

”مگر کیوں؟“ انابیہ نے ٹھٹک کر ساس کا رنجیدہ چہرہ دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب تو واضح ہے، لڑکی اس نے پسند کر لی ہے، ناصر کی بہن ہے اور وہیں

اٹلی میں ہی ہوتی ہے۔ مزید اس نے کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے پوچھا

ہے۔ میرا تو پہلے ہی دل بچھ سا گیا تھا، عمار کی ضد کی وجہ ہے۔ اب حاشر نے

بھی پریشان کر کے رکھ دیا ہے، مگر خیر ہے بچوں نے زندگیاں گزارنی ہیں۔

اچھا ہے اپنی پسند سے شادیاں کریں، کل کو ماں، باپ کو تو قصور وار نہیں

ٹھہرائیں گے۔“ انہوں نے مٹر چھیلتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

”پھر بھی امی حاشر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

”بھئی کیوں نہیں کرنا چاہیے، اس نے کون سا انوکھا کام کیا ہے۔“ ان کا لہجہ

کافی روکھا ہو گیا تھا۔

”حاشر نے آپ کی خوشی کا خیال نہیں کیا۔“ انابیہ نے ہمدردانہ انداز میں کہا

تو مہر بیگم استہزائیہ ہنس پڑیں۔

”عباد اور عمار نے کیا میری خوشی کا خیال کیا تھا کہ اب حاشر سے میں امید

رکھتی۔“ انہوں نے در پردہ کیا جتایا تھا، انابیہ سمجھ کر قدرے پشیمان ہو گئی

اور دل ہی دل میں بڑ بڑائی۔

”آپ بھی جتانے، کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیجئے گا۔“

”یہ تو تمہارے نصیب اچھے تھے کہ تم جیسی حسین اور فرماں بردار بہو مل

گئی، ورنہ میری زندگی تو جلتے کھستے ہی گزرتی۔ عباد اس لحاظ سے تو عمار سے

سمجھ دار نکلا، اب دیکھو حاشر کون سا گل کھلاتا ہے۔“ اب وہ کافی سادگی سے

انابیہ کو سراہ رہی تھیں۔ انابیہ کو ہنسی آگئی۔ اپنی ساس کی حسن پرستی سے تو وہ

بخوبی واقف تھی۔ انہیں ایک ہی شوق بلکہ جنون تھا کہ ان کی بہویں بہت

خوبصورت ہوں۔

عباد نے جب اپنی کلاس فیلو انابیہ کو شادی کے لئے پسند کیا تو مہر بیگم صرف اس کے حسن کو دیکھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔ انابیہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے گھر بار اور تنگ سی گلیوں والے محلے کو دیکھ کر ان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ مگر جب انابیہ سامنے آئی تو گویا سارے گلے شکوے ختم ہو کر رہ گئے۔ اور یوں انابیہ دلہن بن کر حسین ولا میں آگئی۔

اس کی شادی کو چھ سال ہو چکے تھے۔ اریبہ اور کاظم نے ان کی فیملی کو مکمل کر دیا تھا۔ وہ اپنی ازواجی زندگی سے بہت مطمئن تھی، کیونکہ چھ سال گزرنے کے بعد بھی عباد اس کا اول روز کی طرح ہی دیوانہ تھا۔ بلکہ بچوں کی آمد نے اس محبت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ انابیہ کی یہ خواہش تھی کہ اس کی چھوٹی بہن رافیہ بھی اسی گھر میں آجائے۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پہلے عمار اور اب حاشر بھی ہاتھوں سے نکل گیا تھا، جبکہ ولید تو شروع سے ہی زونیہ میں انٹرسٹڈ تھا۔ انابیہ اس معاملے میں مکمل طور پر

مات کھا چکی تھی۔ کیونکہ چھوٹے دو دیور ابھی کافی چھوٹے تھے۔ علی فرسٹ ایئر اور زین میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔

وہ جلتی کلمستی دوبارہ کچن میں آگئی۔ رات تک اس کا موڈ کافی بگڑ چکا تھا۔ عباد بیوی کے خفا خفا انداز دیکھ کر کافی حیران ہوا تھا۔

”خاتون کے مزاج کچھ برہم نظر آتے ہیں۔“ انابیہ لب بھینچے کپڑے سمیٹتی رہی۔ عباد نے مسکراہٹ دبا کر ٹی وی آن کر لیا۔

”میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

”جو کام کر رہے ہیں وہ ہی خاموشی سے کریں۔“ انابیہ نے تنک کر کہا اور الماری کے پٹ زور سے بند کر دیئے۔

”کون سا کام۔“ عباد کا انداز پتا نے والا تھا۔ انابیہ نے مڑ کر اک گرم نگاہ اس پر ڈالی۔

”میک اپ زدہ چہروں میں لتھڑی حسیناؤں کو دیکھنے کا کام۔“

”یہ کام تو میں پوری دلجمعی سے کرتا ہوں۔“

”بس یہی کرتے رہے گا۔ گھر میں پکتی کھچڑی کا کچھ پتا ہے کہ نہیں۔“ انابیہ نے دانت پیس کر کہا تو عباد اسی لاپرواہی سے بولا۔

”کھچڑی چونکہ مجھے پسند نہیں ہے، لہذا مجھے تو معاف ہی رکھو۔“

”عباد! آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔“ انابیہ زچ ہو کر چلا اُٹھی۔

”اتنی دور سے جو باتیں تم مجھ سے کرتی ہو۔ وہ کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“ اس نے ٹی وی کا والیوم کم کر کے انابیہ کی طرف رخ کیا۔

”حاشر نے اپنے لئے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرے بھائی میرے ہی نقش قدم پر چلیں گے۔“

”آپ بس میرا دل جلانے والی باتیں کیا کریں۔“

”اور بھی اچھی اچھی باتیں آتی ہیں مجھے، آپ موقع تو دیں۔“ وہ ابھی تک

غیر سنجیدہ تھا۔ انابیہ غصے میں بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئی تھی اور عباد اسے آوازیں دیتا ہی رہ گیا۔

...☆☆☆...

”ایمان! یہ کپڑے استری کرو۔“ وہ اوپر والے پورشن کی صفائی کر کے نیچے آئی تو بھابی نے کپڑوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”جی اچھا“ وہ تابعداری سے سر ہلا کر کپڑے پریس کرنے میں جت گئی تھی۔

تین گھنٹے بعد اگرچہ کپڑے تو پریس ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں تک پہنچ چکے تھے۔ مگر اس کی کمر بالکل اکڑ کر تختہ ہو چکی تھی۔

”اف ابھی تو کھانا بھی بنانا ہے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر ہمتیں اکٹھی کر کے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اسی اثناء میں بھابی تیار شیار ہو کر باہر نکلیں، بچے بھی ان کے ہمراہ تھے۔



”میں اور بچے زونہ کی طرف جارہے ہیں۔ تمہارے بھائی بھی آفس سے وہیں پہنچ جائیں گے، رات کا کھانا کھا کر ہی واپسی ہوگی، تم آرام سے دروازے بند کر کے سو جانا۔“ بھابی اسے مختلف ہدایات دے کر سرعت سے باہر نکل گئی تھیں، جبکہ ایمان کے کندھوں سے اک بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی اس نے پہلے تو کم سیدھی کرنے کے متعلق سوچا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی میٹھی نیند کے جھونکوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ سوتی رہی تھی۔ فون کی بیل سے آنکھ کھلی۔ گرتی پڑتی وہ فون اسٹینڈ تک گئی۔ ریسپور اٹھایا تو بھابی کی آواز کان میں پڑی۔ تھوڑی دیر بات کر کے اور خیر، خیریت معلوم کر کے انہوں نے فون رکھ دیا تھا۔ ایمان نے بھی سستی و بے زاری سے ریسپور کریڈل پر پھینکا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”ابھی پانچ بجے ہیں۔ یعنی کہ میں صرف دو گھنٹے ہی سوئی ہوں۔“ واش روم میں گھس کر منہ ہاتھ دھویا، بال بنائے اور پھر کچن کی طرف آگئی۔ آملیٹ اور

پراٹھا بنا کر اس نے اپنے لئے ایک کپ چائے بنائی اور پھر لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کبھی کبھی کچھ بھی بنانے کو دل نہیں کرتا، مگر پھر بھی بنانا پڑتا ہے۔“ وہ آزر دگی سے سوچ رہی تھی۔

”کاش کبھی مجھے بھی کوئی اپنے ہاتھوں سے اس وقت کھانا بنا کر کھلائے، جب میرا کوئی بھی کام کرنے کو دل نہیں کر رہا ہو۔ مگر اپنی اتنی اچھی قسمت کہاں۔“

ایمان استہزائیہ ہنسی تو آنکھ کا کونا نہ جانے کیوں بھیگ گیا۔ اس نے بے دلی سے پراٹھا کھایا اور چائے کے سپد لینے لگی۔ ابھی انہی سوچوں میں گم تھی، جب ڈور بیل کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ پیروں میں سلیپراڈ سٹی گیٹ تک گئی۔

”کون“ ایمان نے جھری میں سے دیکھتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا۔ باہر سے اس سے بھی بلند آواز آئی۔

”کون نہیں، آئس کریم“

”عمار“ اس کے دل کے تار گنگنا اٹھے تھے۔ قدرے جھجکتے شرماتے اس نے گیٹ کھول دیا تھا۔ عمار اک طائرانہ نگار ادھر ادھر ڈال کر بولا۔

”خاموشی کیوں ہے اتنی، آپا جان اور بچے کہاں ہیں۔“

”وہ سب زونیہ کی طرف گئے ہیں۔“ وہ جو سرخ پتھروں کی روش پر اپنے دھیان میں چلتا ہوا اندر کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔

”کیوں؟“

”زونیہ نے شاید بلایا تھا۔“ وہ اس کے چہرے پر پھلتے تفکر کے سائے دیکھ کر فکر مند ہو گئی تھی۔

”آپ پریشان لگ رہے ہیں۔“

”ہوں“ عمار نے کچھ سوچتے ہوئے ہنکار ابھرا۔

”آپ اندر نہیں آئیں گے۔“ اسے وہیں جے کھڑے کچھ سوچتے ہوئے دیکھ کر ایمان نے آہستگی سے کہا۔

”آیا تو میں آپ سے ملنے تھا، مگر اب تم اکیلی مل گئی ہو...“ وہ قدرے سنبھل کر تمام سوچوں کو جھٹکتا شرارت بھرے لہجے میں بولا تو ایمان لبوں پر پھیلتی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپانے کے لئے رخ موڑ گئی۔ عمار اندر جانے کے بجائے لان چیئرز کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ایمان بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آگئی۔

”یار! میں اتنا ڈراؤنا بھی نہیں کہ تم اک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہیں۔“ اسے مسلسل اپنی انگلیوں پر نگاہیں جمائے دیکھ کر عمار نے شرارت سے کہا۔ نہ جانے کیوں اس کے گھبرائے گھبرائے چہرے کی طرف دیکھ کر بے ساختہ جی ستانے کو مچلنے لگا تھا۔

”نن، نہیں تو“ اس کی گرم نگاہوں میں مچلتے جذبے، محبت لٹاتی جگر جگر کرتی سبز آنکھیں ایمان کو بوکھلائے دے رہی تھیں۔

”کیا نہیں؟“

”آپ ڈراؤنے تو نہیں، بلکہ بہت خوبصورت ہیں۔“ ہو اسے اڑتا آنچل  
سنجھالے وہ دھیمی آواز میں بولی، تو عمار کے لبوں سے ایک دلکش قہقہہ آزاد  
ہوا۔

”اتنے خوبصورت انداز میں میری تعریف پہلی مرتبہ کسی لڑکی نے کی ہے۔“  
”میں ’کوئی لڑکی‘ نہیں ایمان ہوں“ اس کے انداز میں کافی ناراضی کا عنصر  
تھا۔

”تم ایمان نہیں میری جان ہو، میری پسند، میری محبوبہ محبت اور بیوی، اگر  
میں مزید یہاں بیٹھا رہا تو کوئی نہ کوئی گستاخی کر بیٹھوں گا، لہذا مجھے اجازت  
دو، چلتا ہوں اب۔“ اس کا بے ساختہ اظہار محبت ایمان کے دل و روح کو  
مسرور کر گیا تھا۔ وہ گیٹ کی طرف بڑھا تو اچانک ایمان کو خیال آیا، اسی لئے  
تقریباً دوڑتی ہوئی اس تک آئی۔

”آپ کو بھابی سے کیا کام تھا؟“ ایمان کے پوچھنے پر پہلے تو چند پل وہ سوچتا  
رہا، پھر کڑوے لہجے میں بولا۔

”آج میرا اور زونہ کا یونیورسٹی میں جھگڑا ہو گیا۔“

”کیوں؟“ ایمان نے حیرت سے پوچھا۔

”ولید کا پر پوزل دیا تھا، زونہ کے لئے، آپ نے اقرار کر لیا تھا۔ امی شاپنگ  
وغیرہ کرنے چل دیں، جبکہ وہ محترمہ ماش کی دال کی طرح اینٹھ گئی ہیں، نہ  
جانے کس کی وجہ ہے۔“

”شاید بھابی نے اپنے تئیں فیصلہ کر لیا ہو، زونہ سے اس کی پسند پوچھے  
بغیر۔“ ایمان چڑیوں کے غول کو ارد گرد چکراتے دیکھ کر آہستگی سے بولی۔  
”یہ آپا کا ہیڈک تھا ہمارا نہیں، اب یہ ”انکار“

کم از کم ہمیں تو کسی بھی طرح قبول نہیں ہے۔“ عمار نے غصیلے انداز میں  
کہا۔

”زونہ نے انکار کر دیا۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور ساتھ ہی زونہ کی عقل کو کوسا بھی۔

”اس کے انکار کی بھلا کیا اہمیت ہے۔“ عمار نے تنفر سے سر جھٹکا۔

”مگر اقرار یا انکار کا حق زونہ کے پاس محفوظ ہے۔“ ایمان حقیقت پسندی سے زونہ کی فیور میں بولی تھی۔

”تم تو اس کی سائیڈ لوگی، آخر مستقبل میں اکٹھے جو رہنا ہے۔“ وہ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر مسکرایا اور پھر اک الوداعی نگاہ ایمان پر ڈال کر بولا۔

”ولید راستے سے ہٹے گا تو ہماری باری آئے گی نا۔“

”میں سمجھ رہی تھی کہ آپ یہ سب اچھی نیت سے کر رہے ہیں۔“ ایمان نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

تم ہمیشہ میری ’نیت‘ پر شک کرتی ہو۔ میں تو ولید کی خاطر اس آگ میں کودنے کا پکا پروگرام بنائے بیٹھا ہوں۔ اب دیکھو زونہ جیتی ہے یا پھر ولید

کی محبت اور میری کوششیں۔“ اس نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائی اور بائیں ہاتھ سے ایمان کے گال کو نرمی سے چھو کر سرعت سے گیٹ عبور کر گیا، جبکہ ایمان نئے اور کچھ اور خوابوں کا جہاں آنکھوں میں بسائے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”تم پاگل ہو چکی ہو۔“

”ہاں میں واقعی پاگل ہو چکی ہوں۔ لہذا آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“ زونہ نے تنفر سے کہا۔

”بہت پچھتاؤ گی تم زونہ!“ حرا نے تھک ہار کر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

کل رات سے مسلسل اس کے ساتھ دماغ کھپانے، ہزاروں دلیلوں اور نصیحتوں کے ساتھ سمجھانے کا کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ سوچ سوچ کر حرا کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔ اس



کے تاریک مستقبل کا ناگ انہیں ڈستا تو وہ بے قرار ہو جاتیں۔ کون تھا جو اس کی فکر میں دبلا ہوتا یا پھر اپنے کام کاج اور گھریلو مصروفیات ترک کر کے اسے سمجھانے کے لئے یہاں ڈیرہ لگا کر بیٹھ جاتا۔ رمیز سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ مگر پھر بھی ایک آخری کوشش کے طور پر انہوں نے رمیز سے رابطہ کیا، مگر شدید حیرت کا دھچکا انہیں تب لگا جب رمیز نے ان کی پوری بات سمجھ کر ایک ہفتے کے اندر اندر آنے کا پروگرام بنا کر انہیں تقریباً دوبارہ سے زندہ کر دیا تھا۔

رمیز جب تک آ نہیں گیا تھا، انہیں اس کی بات کا یقین کرنا کافی مشکل لگ رہا تھا، مگر بھائی کو اتنے عرصے بعد دیکھ ان کی آنکھیں بہنے لگی تھیں اور تمام شکوے شکایات خود بخود مٹ گئے۔ وہ پچھلے دو دن سے میکے میں ہی مقیم تھیں اور زونہ رمیز کو دیکھ کر گوشہ نشین ہو چکی تھی۔ کیونکہ بھائی کے سامنے اس کی بھی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

رمیز نے فی الحال اس 'ذکر' کو نہیں چھیڑا تھا۔ اس مسئلے پر وہ زونہ سے اسی وقت بات کرنا چاہتا تھا، جب اسے یقین ہو جاتا کہ تمام دلائل مضبوط ہیں۔ اور زونہ کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچ سکتا۔

”تم یونیورسٹی کیوں نہیں جا رہیں۔“ اگلے دن زونہ کو ناشتے کی میز پر رمیز کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ تو اس وقت کمرے سے نکل کر پچھتائی تھی۔

”میں فارسی میں تو بات نہیں کر رہا۔“ اسے خاموش بلکہ گم سم دیکھ کر رمیز نے جوس کا گلاس زونہ کی طرف بڑھا کر کہا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ وہ بجھی آواز میں بولی تھی۔

”مجھے تو بالکل صحت مند بلکہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست دکھائی دے رہی ہو۔“ اس کے سرخ گالوں میں چھلکتی گلابیاں مکمل صحت مند ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔ زونہ نچلا لب چباتے ہوئے قدرے بوکھلائی۔

”سر میں درد ہے۔“ تھوڑی دیر سوچ بچار کے بعد اسے یونیورسٹی نہ جانے کا جواز مل ہی گیا تھا۔ ان دونوں کی گفتگو کے دوران حرا ڈائننگ روم تک نہیں

آئی تھیں، بلکہ ڈاننگ سے ملحقہ کچن کے دروازے میں کھڑی ان کی باتیں سن رہیں تھیں۔ رمیز کا اشارہ پا کر وہ گلا کھنکارتی اندر داخل ہوئیں۔

”آپا! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔“ رمیز کی اس تمہید نے جہاں حرا کو متوجہ کیا، وہیں زونہ بھی چونک اٹھی۔ رمیز انہیں اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے سر جھکائے اپنی اپنی سوچوں میں گم رمیز کے مقابل آکر بیٹھ گئیں۔

”آپا! دراصل میں جو بات آپ سے کرنے جا رہا ہوں ذرا تحمل سے سنئے گا۔ پہلے تو میں اپنے گزشتہ رویے کی آپ دونوں سے معافی مانگتا ہوں۔ پاپا کے بعد میں اپنا بھائیوں والا کردار نہیں نبھا سکا۔ مجھے اپنے غلط رویے کا بھی پوری طرح ادراک ہے۔ مگر آپ میری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ اپنی مشکلات اور پریشانیوں کی داستان سنا کر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

میرے لئے پہلا مسئلہ زونہ کی شادی ہے، جبکہ دوسرا مسئلہ میرے گرتے کاروبار کی ساکھ بحال کرنا ہے۔ یہ بات میں بعد میں کروں گا پہلے زونہ کی شادی کا معاملہ ڈسکس کر لیا جائے۔ آپ نے مجھے جو تین پروزل بتائے ہیں ان میں سب سے زیادہ اچھا اور ہر لحاظ سے بہترین پروزل ولید کا ہے۔ وہ ہمارا خالہ زاد ہے، امی کے بعد خالہ نے ہمیں بہت پیار دیا، ہمارا بہت خیال رکھا اور آپ کی شادی تو کی ہی خالہ نے تھی۔ خالہ کے ہم پر احسانات بھی بے شمار ہیں۔ میں زونہ کے سامنے ہر بات کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔ ولید کے علاوہ جو دو پروزل ہیں ان کی تفصیل بھی کچھ یوں ہے کہ ایک تو کوئی پروفیسر صاحب ہیں، عمر تیس سال اور اپنا گھر بھی نہیں ہے۔ دوسرا پروزل ایک ڈاکٹر کا ہے۔ فریش ایم بی بی ایس، خوش قسمتی سے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں جاب کر رہا ہے۔ اپنا گھر اور گاڑی بھی ہے۔ کچھ زمینیں بھی ہیں، باقی تفصیلات معلوم کر لی جائیں گی۔“ رمیز مزید کہتے کہتے اک لمحے کے لئے رکا اور پھر زونہ کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”اگر تو ولید کے علاوہ ان دونوں میں سے تم کسی ایک کے لئے ہامی بھرتی ہو تو مجھے، آپا یا پھر کسی تیسرے کو کوئی اعتراض نہیں۔ میں بخوشی تمہارا رشتہ طے کر دوں گا۔“

”مجھے ان ”تینوں“ سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ زونہ نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی اور پھر نگاہیں کارپٹ پر جما دیں۔

”وجہ“ حرا اور رمیز دونوں کے موڈ بگڑ گئے تھے۔

”آپا جانتی ہیں“ وہ منہ ہی منہ میں بد بدائی۔

”اس خیال کو ذہن سے جھٹک دو“ رمیز نے بمشکل غصے پر قابو پا کر کہا۔

”آپ ردا بھابی کا خیال ذہن سے جھٹک دیں... بلکہ یوں کریں کہ انہیں سرے سے چھوڑ دیں، کیا آپ ایسا کر سکیں گے؟“ اس کی آنکھوں میں سرخیاں سی چھا گئی تھیں، جبکہ رمیز کا بھی مارے اشتعال کے، چہرہ سرخ ہو گیا۔

”بہت بکواس کرنے لگی ہو۔ اب تو تمہارا کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“ رمیز نے کر خنگی سے کہا۔

”آپ نے جو کرنا ہے کر لیں۔“

”زونہ! کچھ شرم کرو، بڑے بھائی سے بات کر رہی ہو۔“ حرا نے اس کا ہاتھ دبا کر احساس دلانے کی ناکام سی کوشش کی۔

”اونہ بھائی“ اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

”کس بل بوتے پر اتنا اکڑ رہی ہو۔“ رمیز نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”آج اگر بھولے بھٹکے سے کوئی رشتہ آرہا ہے تو اپنی نادانی میں آرام سے انکار کرتی جاؤ۔ کل کوئی پوچھے گا بھی نہیں، کیونکہ پاپا کے دوست کے بیٹے قاسم نے پاپا کے مرنے کے بعد جو تمہیں طلاق کے پیپرز بھجوا دیے تھے۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد ویسے بھی کوئی ادھر کا رخ نہیں کرے گا، اگرچہ یہ ایک غلط فیصلہ تھا اور اس بچپن کے نکاح کی اہمیت بھی کوئی نہیں

تھی اور نہ ہی کبھی ہمارے دلوں اور ذہنوں نے اس نکاح کو قبول کیا، مگر پھر بھی دنیا کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔“

”مجھے کسی کی پروا نہیں“ وہ زہر خند ہوئی۔

”وہ پاپا کا ایک غلط فیصلہ تھا۔ اس میں میرا رتی برابر بھی کوئی قصور نہیں، نہ میں اسے جانتی تھی نہ اس نے مجھے کبھی دیکھا۔ یہ غلط فیصلہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔“

”اب تم ایک اور غلط فیصلہ کرنا چاہتی ہو۔“ حرا نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

”یہ غصہ، یہ اکڑ اور یہ تمہاری ضدیں، تمہیں اندھی کھائی میں گرا دیں گی۔“ رمیز مٹھیاں بھیجنے کر بولا تھا اور پھر کافی دیر خاموش رہنے کے بعد بہت عجیب سے لہجے میں کہنے لگا۔

”تم جانتی ہو یہ گھر کس کے نام ہے۔“ اس کی دھیمی آواز میں نہ جانے کون سا راز پوشیدہ تھا کہ دونوں بہنیں چونک سی گئیں۔

”نہیں“

”یہ گھر پاپا میرے نام کر چکے تھے، یہ ان کی وفات سے چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس گھر میں تم دونوں کا کوئی حصہ نہیں اور میں اس گھر کو بیچنے والا ہوں۔“ ”کیا مطلب“ اس خوبصورت بنگلے کی پوری عمارت گویا ان دونوں پر آگری تھی۔ وہ حق دق سی رمیز کے پتھرے تاثرات والے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

”مطلب بہت واضح اور شفاف ہے۔ میرا آئس کریم پارلر بالکل دیوالیہ ہونے والا ہے۔ پچھلی مرتبہ کچھ انگریزوں اور حبشیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اتنی توڑ پھوڑ کی کہ سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ اپنے گرتے کاروبار کو بحال کرنے کے لئے اس گھر کو بیچنا میری مجبوری ہے۔“ حرا کے دماغ سے گویا گرم دھویں کی لپیٹیں نکلنے لگی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا رہی تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم میں رمیز کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ کچھ اسی



قسم کی کیفیت زونیہ کی بھی تھی، جبکہ رمیز اپنی ہی دھن میں نہایت سفاکی سے کہہ رہا تھا۔

”جب یہ گھر ہی نہ رہا تو تم کہاں جاؤ گی۔ آپا کی طرف جانا تمہیں گوارا نہیں ہوگا اور کسی ویمن ہاسٹل میں نہ آپا تمہیں رہنے دیں گی، نہ مجھے یہ بات منظور ہے۔ تو اس کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ تمہاری شادی کردی جائے۔ خوب اچھی طرح سوچ تو ولید یا پھر کوئی اور، شادی تو بہر حال میں تمہاری کر کے ہی جاؤں گا۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں، اگر پھر بھی تم اپنی ضد پر قائم ہو تو پھر میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔“

میں اگلے ہفتے واپس چلا جاؤں گا۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہہ کر بہنوں کی طرف دیکھا۔ حرا کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ جبکہ زونیہ منہ پر ہاتھ رکھے آنسو روکتی لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گئی۔

”پھر کیا سوچا ہے تم نے۔“ اگلی صبح حرا نے زونیہ کے ستے چہرے کی طرف دیکھ کر استفسار کیا۔

”رمیز نے کچھ سوچنے کے قابل چھوڑا کہاں ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رمیز ہمارے ساتھ اس طرح کرے گا۔ ہمارے سروں سے سائبان تک چھین لے گا۔“ زونیہ نے بھرائی آواز میں کہا تھا۔ اس تین کنال کی کوٹھی پر کتنا مان تھا اسے۔

”رمیز شروع سے ہی ایسا ہے خود غرض، مطلبی اور بے غیرت۔“ رمیز کی باتوں نے حرا کا بھی کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ انہوں نے با آواز بلند رمیز کو تین، چار گالیوں سے نوازا۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔“ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے انہوں نے بھیگی آواز میں زونیہ سے کہا۔

”میں اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر چکی ہوں۔“

”زونیہ تم“ حرا آگ بگولا ہو گئی تھیں۔ غصے کے مارے ان کی بھنویں تن گئیں۔

”کیا کمی ہے ولید میں، خوبصورت، پڑھا لکھا شاندار جاب اور سب سے بڑھ کر اپنی خالہ کا گھر، آمنہ اور خالہ جان دیتی ہیں تم پر... اتنی قدر دان سسرال ملے گی تمہیں اور کیا چاہیے“ وہ ایک مرتبہ پھر پرانی دلیلوں سے اسے سمجھانے لگی تھیں۔

”ولید میں کوئی کمی نہیں، کمی تو مجھ ہے، میں اسے خوش نہیں رکھ پاؤں گی۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ ولید اتنا اچھا ہے، اسے کوئی اچھا چاہنے والا لائف پارٹنر مل جائے گا، مگر میں۔“

”مگر کیا؟ ساری زندگی حاشر کی محبت سینے سے لگائے بیٹھی رہنا، کیونکہ نہ وہ تم سے شادی کرے گا نہ تمہیں تمہاری محبت مل سکے گی۔“ حرا نے تنفر سے کہا۔

”وہ مجھ سے شادی کرے گا۔“ زونہ نے مضبوط لہجے میں کہا اور ہولے سے مسکرائی۔

”اونہہ... خوش فہمی ہے تمہاری، کیونکہ حاشر نے اٹلی میں اپنے کسی دوست کی بہن کو پسند کر رکھا ہے۔ یقیناً شادی بھی اسی سے کرے گا۔ نہ اس نے پاکستان آنا ہے نہ کبھی آئے گا۔ تم اور خالہ بس آس لگائے بیٹھی رہو۔“ زونہ کے لبوں کی مسکان پل بھر میں ہی سمٹ گئی تھی۔ اس کا چہرہ چند منٹوں میں ہی سفید لٹھے کی مانند ہو گیا تھا۔ حرا کا دل پسچ گیا۔ وہ اسی لئے زونہ کو اس تلخ سچائی کے متعلق نہیں بتانا چاہتی تھیں۔

”آپا...“ وہ ایکدم چیختے ہوئے تڑپ تڑپ کر رونے لگی تھی۔ حرا نے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔

☆☆☆

”یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں بیٹھ کر مراقبہ کرنے کا تمہیں کس نے مشورہ دیا ہے۔“ نوکیلی گھاس کو نوچتی اپنے ہی دھیان میں مگن زونہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اپنے سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑے عمار کو دیکھ کر دوبارہ سر جھکا لیا۔

”کیا تکلیف ہے، اتنی رونی صورت کیوں بنا رکھی ہے۔ اگر تم ولید سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔ میں ولید کو سمجھا دوں گا۔ ویسے رات بھر تم دونوں کے متعلق ہی سوچتا رہا ہوں میں، تم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھیک لگے مجھے، ایسے معاملوں میں زور زبردستی نہیں ہوتی، چلو اب مسکرا دو، اور مجھے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ زیادہ سوچنے کی وجہ سے پیٹ خالی ہو گیا ہے۔“ عمار نے پہلی سی بے تکلفی کے ساتھ نرمی سے کہا تو زونہ کی آنکھیں بھینگے لگیں اور سر مزید جھک گیا۔

”زونی۔“ عمار نے اس کا ہاتھ تھپتھا کر اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔

”کیا سوچ رہی ہو، اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔“

”سوچ رہی ہوں ہر کوئی محبتوں کے معاملے میں تم سا خوش قسمت نہیں ہوتا۔ اگر میں اپنے ارد گرد نگاہ دوڑاؤں تو تقریباً سب ہی بڑے خوش نصیب نظر آتے ہیں مجھے، عباد بھائی اور انابیہ بھابی، آپا اور عمیر بھائی، ردا بھابی اور رمیز بھائی، تم اور ایمان جبکہ میں...“

”زونہ! کیا تو کسی کو...“ عمار نے الجھ کر زونہ کی طرف دیکھا تو وہ بے دلی سے مسکرا دی۔

”ارے نہیں، بس یونہی ایک بات کی ہے۔“

”تو پھر اتنا پریشان کیوں ہو؟“ عمار سنجیدگی سے بولا۔

”بس ایسے ہی۔“ زونہ منہ سے نکلنے والے الفاظ سوچتے ہوئے اب پچھتا رہی تھی کہ کیوں عمار کے سامنے انجانے میں دل کے زخم کھول دیے ہیں۔

”ٹالنے کی کوشش مت کرو،“ مقابل بھی تو عمار تھا۔ بال کی کھال کھینچنے والا۔

”اف عمار! تم بھی نا“ زونہ نے زبردستی مسکرا کر لاپرواہی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

”اب بول بھی چکو کہ اصل بات کیا ہے۔ تمہارے انکار کی وجہ کیا ہے۔ مجھے بتاؤ زونہ ہم اچھے دوست بھی تو ہیں۔“ عمار نے نرم آواز میں کہہ کر اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا تو وہ جھنجلا سی گئی۔

”کوئی بات نہیں اور نہ ہی کوئی وجہ ہے۔ تمہیں تو وکیل ہونا چاہیے تھا۔ اتنی جرح کرتے ہو۔“

”تمہاری آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہیں؟ کیا رات بھر روتی رہی ہو؟“ عمار نے چونک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ نگاہیں چرا گئی۔

”شاید الرجی ہو گئی ہے۔“ زونہ نے دونوں آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر کہا۔

”تم بتانا نہیں چاہتیں تو نہ سہی، میں اب اصرار نہیں کروں گا۔“ عمار نے خفگی سے کہہ کر رخ بدل لیا تھا۔

”دراصل رمیز بھائی کی وجہ سے پریشان ہوں۔“ کافی دیر سوچنے کے بعد اسے ’وجہ‘ یاد آگئی تھی۔ لہذا وہ مزید دل سوزی سے بولی تھی، تاکہ عمار کو ذرہ برابر بھی شک نہ گزرے اور پھر اس نے رمیز بھائی کی خود غرضی کی پوری داستان سنا ڈالی تھی۔ عمار تاسف سے سر ہلاتا رہا۔

”رمیز بھائی نے توحہ کر دی ہے۔“

”یہی نہیں، وہ گھر کا قیمتی فرنیچر بیچنے کا بھی پورا پورا انتظام کر چکے ہیں۔“ زونہ نے گھاس کے تنکے اکٹھے کیے اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”زونہ! تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا؟ رمیز بھائی کے جانے کے بعد، مطلب گھر بھی جبکہ نہیں رہے گا تو پھر۔“

”تو پھر کیا، ولید کا گھر ہے نا۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں تھی، تیزی سے آگے بڑھ گئی، جبکہ عمار تحیر کے عالم میں اس کی پشت کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

”زونہ ابھی کیا کہہ کر گئی ہے۔“ اس نے حیرانی سے سوچا اور پھر جب بات سمجھ میں آئی تو لبوں سے اک کھنک دار قہقہہ آزاد ہوا۔ اس کی کلاس کے لڑکوں نے کافی حیرانی سے عمار کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جھینپ کر پلٹا اور پھر ”زونہ زندہ باد“ کا نعرہ لگاتے ہوئے ولید کے آفس کی طرف بھاگا۔

☆☆☆



”اف کوئی ان بازاروں میں بھول کے بھی نہ جائے۔ ہائے میری تو ٹانگیں شل ہو گئی ہیں، پروین! پانی تو پلا دے۔ حلق میں گویا کانٹے آگ آئے ہیں۔“ مہر بیگم نے بھاری بھر کم شاپرز صوفے پر رکھے اور خود تخت پر ڈھے گئیں۔

”آمنہ سے کہا بھی کہ آجاؤ اب، بھلا مجھ سے بازاروں کے چکر لگتے ہیں۔“ پروین کے ہاتھ سے گلاس تھامتے ہوئے انہوں نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

”بچے سکول سے ابھی تک نہیں آئے۔“ انابیہ نے پیروں کو سینڈلوں کی قید سے آزاد کیا اور گھر میں پھیلا سناٹا محسوس کر کے پروین سے پوچھا تو وہ اپنے تربوز جتنے سر کو ہلا کر بولی۔

”زین ‘پاجی‘ کے کمرے میں کارٹون دیکھ رہے ہیں۔“ پاجی جو کہ اریبہ کو گود میں اچھالتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہے تھے، پروین کے طرز تخاطب پر بھنا اٹھے۔

”موٹی، بھینس کتنی مرتبہ میں نے تمہیں سمجھایا ہے کہ مجھے ‘پاجی‘ مت کہا کرو، مگر تمہاری موٹی عقل میں یہ بات سماتی ہی نہیں۔ جب عباد صاحب اور عمار صاحب ہو سکتے ہیں تو پھر میں کیوں نہیں۔ کیا میرے لئے ‘صاحب‘ کا صیغہ لگاتے ہوئے تمہاری زبان گھس جاتی ہے۔“ زین نے اریبہ کو صوفے پر پٹخا اور پروین کو خطرناک نظروں سے گھورا۔

”لو جی، اتنے ادب سے تو بلاتی ہوں۔ ‘پاجی‘ کہہ کر۔“ پروین نے ناراضگی سے کہا تھا۔

”اسے عزت راس نہیں، کیوں پروین۔“ اندر آتے عمار نے مسکراہٹ دباتے ہوئے زین کو چھیڑا۔

”خبردار جو تم نے آئندہ مجھے پاجی کہا۔“ زین نے غصے سے کہا۔

”تو پھر کہا کہوں جی۔“ پروین نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

”زین صاحب کہا کرو۔“ زین نے ٹانگ رکھ کے رعب دار آواز میں کہا تو عمار کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

”یہ منہ اور مسور کی دال۔ یاد! پہلے ’صاحب‘ بنو اور پھر صاحب کہلوانا۔“

”تو کیا ’صاحبوں‘ کے سینگ ہوتے ہیں۔“ زین نے تنک کر کہا۔

”نہ جی، صاحب لوگ تو ٹائی لگاتے ہیں، لش پش کرتے جوتے اور نئے نکور استری شدہ کپڑے پہن کر ہاتھ میں بریف کیس پکڑے دفتر جاتے ہیں، جبکہ آپ تو...“ پروین نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بے ڈھنگی ہنسی کا گلا گھونٹا تو عمار بھی زین کو تپانے کی غرض سے بولا۔

”ہاں بھئی پروین ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پرانی بوسیدہ جینز پہنے، پھٹے ہوئے جوگرز کسے تم ’صاحب‘ تو ہرگز نہیں لگتے۔ اب بھلا پروین کا کیا قصور، ایسی شاندار ڈریسنگ والے کو پاجی ہی تو کہا جائے گا۔“

”عمار! تم اپنا منہ بند کرو“ زین نے ناگواری سے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔

”لو اب تم ہمارے منہ بھی بند کراؤ گے۔“ آؤ زین میں تمہیں اپنی شاندار

شاہنگ دکھاؤں۔“ انابیہ نے زین کا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ بھی

دلچسپی سے ولید کی شادی کے سلسلے میں ہونے والی شاہنگ کو دیکھنے لگا تھا۔ عمار نے بد مزہ سا ہو کر ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا۔

”یہ لہنگا دیکھو، کس قدر خوبصورت ہے، زونیا پر یہ کلر بہت سوٹ کرے گا۔“ انابیہ نے لہنگے کا دوپٹہ پھیلا کر زین کی آنکھوں کے سامنے کیا تو پروین بھی سب کام کاج چھوڑ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

”یہ اریہ اور کاظم کے کپڑے ہیں، یہ کاظم کی شیروانی، بارات والے دن پہنے گا۔ ولید کی شیروانی کا بھی یہی کلر ہے اور یہ آمنہ آپنی کے کپڑے اور یہ ان کے بچوں کے، اس شاپر میں امی اور بابا کے کپڑے

ہیں، کچھ کپڑے ٹیلر کو دے آئے ہیں اور...“ انابیہ بھابی مزید تفصیلات بھی بتا رہی تھیں۔ عمار نے قدرے چونک کر اس پورے پھیلاوے کو دیکھا۔ نہایت نفیس، قیمتی اور خوبصورت کپڑے آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے، مگر ان میں ایمان کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ عمار کو بہت عجیب لگا۔ وہ امی اور بھابی سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور پھر خود جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گیا۔ فون ایمان نے ہی ریسو کیا تھا۔

”کیسے یاد کیا ہے؟“ ایمان نے مسکراتے ہوئے عمار کو چھیڑا۔

”تمہاری آواز سننے کو دل چاہ رہا تھا۔“

”صاحب! عشق جھاڑنے کے لئے بڑا وقت پڑا ہے۔ ابھی فی الحال اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔“ ایمان اسے سمجھاتے ہوئے بولی تو عمار نے اک گہری سانس خارج کر کے کہا۔

”کل کا بھلا کیا پتا“ آئے یا نہ آئے۔ اپنے آج کو تو خوبصورت بنا لینے دو۔ پتا ہے ایمان! میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارے پاس اپنی اتنی یادیں چھوڑ دوں کہ تم کبھی ان یادوں کے حصار سے نکل ہی نہ سکو، میں چاہتا ہوں کہ...”

”پلیز عمار! کیسی باتیں کر رہے ہیں آ۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی نے ایمان کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

”ارے تم تو پریشان ہو گئیں، میں تو ایسے ہی ایک بات کر رہا تھا۔“ عمار نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

”جان نکال کر رکھ دی میری آپ نے، کم از کم میرے ساتھ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔“ وہ ناراضگی بھرے لہجے میں بولی تھی۔

”تو پھر کیسی باتیں کریں، اگر اپنے مطلب کی باتیں شروع کر دیں تو آپ یقیناً فون بند کر دیں گی، جو کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ فون رکھیں، کیونکہ میں آپ کی آواز سننا چاہتا ہوں۔“ عمار نے بے چارگی کے عالم میں کہا تھا۔

”اچھا“ یہ بتائیں کہ شادی کی تیاریاں کہاں تک پہنچی ہیں۔“ ایمان نے گفتگو کا رخ بدلا تو عمار نے مختصر سی تفصیل بتا دی۔

”لہنگے کا کلر کیسا ہے؟“ اس کے لہجے میں فطری سا اشتیاق تھا۔ عمار دھیرے سے مسکرا دیا اور پھر اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”تمہیں کون سا کلر پسند ہے۔“

”ریڈ“

”اچھا، تمہارا لہنگا ریڈ ہونا چاہیے۔“ عمار نے پر سوچ انداز میں کہا تو وہ شرم سے سرخ پڑ گئی۔

”میں اپنی بات تھوڑی کر رہی ہوں۔ میں تو زونیہ کے لہنگے...“

”میں چاہتا ہوں کہ تم صرف اپنی باتیں ہی کرو۔“

عمار نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے کہا تو وہ اک پل کے لئے خاموش ہو گئی۔

”عمار! مجھے اتنا مت چاہو۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

”ہیلو! کیا ہوا، نیند تو نہیں آرہی۔“

”نہیں تو، نیند بھلا اب کہاں آئے گی۔“ باقی کے الفاظ اس نے منہ ہی منہ

میں بد بدائے تھے، مگر پھر بھی عمار نے سن لیا۔

”کبھی کبھی دل خوش کر دیتی ہو۔“

”رات کافی ہو گئی ہے اب سو جانا چاہیے۔“ ایمان نے بستی رات کا احساس دلایا تو وہ بھی چونکا۔

”ایمی! کل تیار رہنا، میں پانچ بجے تمہیں لینے کے لئے آؤں گا۔“

”کہا جانا ہے؟“ ایمان نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ میں تمہیں کل ہی بتاؤں گا۔“ عمار نے تجسس پھیلانا چاہا۔

”پلیز عمار! بتادیں نا۔“ ایمان نے بے تابی سے کہا۔

”تمہیں شاپنگ کروانی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے نا سمجھی کے عالم میں ریسپور کو گھورا۔

”بھئی میں اپنی اتنی اچھی اور بہت ہی پیاری سی منکوجہ کو نکاح کے بعد کوئی

اچھا سا تحفہ دینا چاہتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں عمار۔“ ایمان نے قدرے سختی سے کہا تھا۔

”کیوں ضرورت نہیں؟“



”بس میں نے کہہ دیا نا۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

”تم آپا جان کی وجہ سے کہہ رہی ہو۔“ عمار چند منٹوں میں ہی معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

”نن، نہیں تو۔“ ایمان گھبرا گئی تھی۔

”آپا جان سے نبٹنا میرا کام ہے۔ تم بس تیار رہنا۔“ مزید دو چار باتیں کرنے کے بعد عمار نے فون بند کیا تو وہ بھی گہری سانس خارج کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ اپنے وعدے کے مطابق آگیا تھا اور حرا بھابی سے نہ جانے کیا کہہ کر اجازت لی تھی۔ انہوں نے بغیر ماتھے پر بل ڈالے اسے عمار کے ساتھ بھیج دیا۔

تین گھنٹے بعد جب وہ گھر آئی تو لاؤنج میں ہی بھابی سے سامنا ہو گیا۔ اس نے شاپنگ بیگ صوفے پر رکھا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

”عمار اندر نہیں آیا؟“ بھابی نے کافی خوشدلی سے پوچھا تھا۔

”نہیں۔ انہیں کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا، اس لئے چلے گئے ہیں۔“ ایمان نے آہستگی سے بتایا تو بھابی نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”کیا خریدا ہے، مجھے بھی تو دکھاؤ۔“

”بہت خوبصورت، عمار کی چوائس بہت اچھی ہے۔“ شاپنگ بیگز میں سے نکلنے والے خوبصورت ڈریسز کو تو صیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے انہوں نے عمار کی پسند کو سراہا تھا۔

”ولید کی شادی میں یہی کپڑے پہن لینا۔“

”ہوں... سوچوں گی۔“

”اس میں سوچنے کی بھلا کیا بات ہے۔“ بھابی تو ’لفظ‘ پکڑنے کے فن سے بہت آشنا تھیں۔ ایمان نے خود کو ڈپٹا اور بولی۔

”پہن لوں گی۔“

”ہاں، ضرور پہننا، عمار خوش ہو جائے گا۔“ بھابی مسکرائیں۔

”آپ کو عمار کی خوشی کا بڑا خیال ہے۔“ وہ دل ہی دل میں بولی تھی۔ اسے کچھ عرصہ پہلے والا بھابی کا رویہ یاد آیا تو نہ جانے کیوں پلکیں بھیگ گئیں۔

”خالہ جان نے چودہ مارچ تاریخ طے کر دی ہے۔ جہیز وغیرہ کا تو ولید نے منع کر دیا ہے، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔“ بھابی نہایت فرصت سے تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں۔ ایمان خاموشی سے سنتی رہی۔

”دن اتنے کم ہیں اور کام بے حساب، ایسا ہے کہ ایمان کل سے ہم دونوں زونیہ کی طرف چلے جائیں گے، تم ذرا پیکنگ وغیرہ کر دینا اور کچن بھی دیکھ لینا۔ اصل میں سارا دن اتنا مصروف گزرتا ہے کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی، اوپر سے رمیز کے نخرے، بھلا بتاؤ وہاں کینیڈا میں ردا کیا اسے پکا

پکا کر کھلاتی ہے، یہاں آکر اسے گھر کا بنا ہوا کھانا چاہیے۔“ وہ فوراً ہی اپنے مطلب کی بات پر آگئی تھیں۔ ایمان نے سر ہلا کر اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا۔

اگلے دن وہ بھابی کے ساتھ زونیہ کی طرف آگئی تھی۔ تقریباً روزانہ ہی ولید، مہر آنٹی اور عمار کا چکر لگتا تھا۔

بری کی خریداری میں زونیہ کی پسند کا پورا پورا خیال رکھا جا رہا تھا۔ بھابی بہت خوش اور سرشار تھیں، البتہ زونیہ کے تاثرات سپاٹ ہی ہوتے تھے۔ ایمان نے اسے ہمیشہ سوگوار کیفیت میں ہی دیکھا تھا۔

مہندی کا فنکشن کمبائن تھا۔ گھر کے لان کو برقی قہقہوں سے سجایا گیا تھا۔ مہندی کی مناسبت سے ہی اسٹیج بھی تیار کیا گیا۔ ہر طرف سیلے اور سبز آنچل لہرا رہے تھے۔ وہ جب تیار ہو کر نیچے آئی تو زونیہ بھی پارلر سے آچکی تھی۔ ایمان تو اس کے بے تحاشا حسن کو دیکھ کر سراپے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی خاموشی کو سب نے شرم پر محمول کیا تھا۔

شور، ہنگامہ، قہقہے ہر کوئی سرشار سا ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ لڑکیوں نے ڈھولک پر گیت گنگنانے شروع کر دیئے تھے اور لڑکوں نے بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔ علی اور زین ولید کو بھی گھسیٹ لائے تھے۔

سجاد حسین، عمار کے والد نے ہی رات گئے ان سب کو گھر چلنے پر مجبور کیا تھا، ورنہ یہ لوگ تو ادھر ہی رات گزارنے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔

بارات کا انتظام میرج ہال میں تھا۔ سات بجے تک سارے مہمان ہال میں پہنچ گئے تھے۔ بھابی کے حکم پر ایمان، زونہ کے ساتھ پارلر چلی گئی تھی۔

جب سچی سجائی زونہ کو تھام کر وہ باہر آئی تو عمار کو اپنا منتظر پایا۔ وہ انہیں لینے کے لئے آیا تھا۔

”ایمی یار! کہیں کسی اور کو تو نہیں اٹھا لائی ہو، یہ زونہ تو نہیں لگ رہی۔“ عمار نے مصنوعی پریشانی کے عالم میں ایمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ نظر کا چشمہ لگا کر دیکھیں یہ زونہ ہی ہے۔“ ایمان مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”زونہ! تم بالکل ’بھوتنی‘ لگ رہی ہوں۔“ عمار نے جان بوجھ کر زونہ کو چڑایا تھا، مگر خلاف توقع وہ خاموش تھی۔

”آج ہوگئی نا تمہاری بھی بولتی بند۔“ وہ اب بھی کچھ نہیں بولی تھی، بلکہ اس کا سر مزید جھک گیا تھا۔ عمار نے یہی سمجھا کہ وہ شرما رہی ہے، مگر ایسا قطعاً نہیں تھا۔ وہ تو فقط اپنے سرکش آنسو چھپانے کی غرض سے عمار کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

”ویسے ایمی! تم نے بھی لیپا پوتی کروا لینی تھی۔“ عمار نے ایمان کے میک اپ سے مبرا چہرے کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ خفگی سے بولی۔

”ہاں، پھر آپ مجھے بھی ’بھوتنی‘ کہتے۔“

”تم تو اچھی بھلی سمجھ دار بھی ہوگئی ہو۔“ عمار اس کے برجستہ جواب سے کافی محظوظ ہوا تھا اور ساتھ ہی اسے توصیفی نگاہوں سے سراہا۔ اس کی اسی سادگی اور بھولپن نے ہی تو عمار کو دیوانہ کر رکھا تھا۔

ہال ہر طرح کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ خواتین، بچے، منجلی لڑکیاں، لڑکے دلہن کی آمد کا سن کر سب ہی اپنی اپنی مصروفیات ترک کر کے دلہن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لڑکیوں نے گلاب اور موتیے کی پتیاں پھینک کر دلہن کا استقبال کیا۔

اگر زونہ بہت حسین تھی تو ولید بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اس کی معصومیت بھری شرافت نے اک انوکھا روپ بخش دیا تھا اسے اور ولید کی اسی کم گوئی اور شرافت سے زونہ کو شدید چڑ تھی۔ وہ اپنی تمام تر وجاہت کے باوجود زونہ کا آئیڈیل نہیں تھا۔ وہ تو مجبور ہو گئی تھی ولید کی بیوی بننے پر، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ اس بند گلی سے نکلنے کا واحد حل یہی تھا۔ اس نے حرا آپا کی بات مان لی۔ اس نے ولید کے ساتھ بندھن باندھ لیا۔

اس نے نکاح نامے پر دستخط کر دیئے تھے۔ اس نے رمیز کے کندھوں سے بھاری بوجھ سر کا دیا تھا۔ اس نے آپا پر احسان عظیم کر دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی خالہ امی بھی بہت خوش ہیں۔ زونہ نے

دیکھا کہ اس کے پہلو میں بیٹھا ولید بھی بہت سرشار ہے۔ مگر خود زونہ خوش نہیں تھی۔ وہ خوش ہوتی بھی کیسے، اس کے دل میں تو حاشر کی تصویر سچی تھی۔ پھر اچانک رخصتی کا شور اٹھا۔ اسی شور میں اس نے کسی بڑی بی کی دبی دبی سرگوشی میں۔

”نہیں۔“

”بھلا کیوں؟“ بڑی بی نے پُر تجسس لہجے میں پوچھا۔

”مصروف ہے شاید اسی لئے نہیں آیا۔“

”اونہ، ایسی بھی کیا مصروفیت؟“ زونہ نے تنفر سے سوچا۔ اسی پل حرا آپا نے زبردستی اسے خود سے لپٹایا تھا۔ رمیز بھائی نے اسے تھام کر گاڑی میں بٹھایا۔ اس نے اپنے دل میں شدید نفرت کی لہر اٹھتی محسوس کی تھی۔

☆☆☆



دلہن کا استقبال بہت شاندار کیا گیا تھا۔ اسے لاؤنج میں صوفے پر بٹھانے کے بعد کھیر چٹائی کی رسم کی گئی اور اس کے علاوہ نہ جانے اور کیا کیا رسومات ہوئیں۔ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی اور نہ ہی محسوس کر رہی تھی۔ اتنے شور، ہنگامے اور قہقہوں کی آوازوں کے باوجود اسے اپنے ارد گرد سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ دل کو دیمک کی طرح چاٹ لینے والا سناٹا۔

وہ جسمانی طور پر موجود تھی اس ماحول کا حصہ تھی مگر اس کا ذہن تین سال پہلے اسی آنگن میں اترنے والی سہانی شام کے ارد گرد چکرا رہا تھا۔  
 ”حاشر آیا ہے۔“ عمار نے اسے بہت خوشی کے عالم میں بتایا تھا۔  
 ”کون حاشر...“ زونہ نے لاپرواہی سے پوچھا۔

”حاشر، میرا بھائی تمہارا کزن اور کون؟“ عمار نے خفگی سے زونہ کی طرف دیکھا۔

”او... اچھا“ حاشر آیا ہے۔ میں سمجھی کسی ملک کے پرائم منسٹر کی تمہارے گھر آمد ہوئی ہے۔“ زونہ نے ہنسی دبائی تو عمار کو ایک دم غصہ آگیا۔

”ہمارے لئے وہ کسی پرائم منسٹر سے کم نہیں۔ ایسا لگتا ہے صدیوں بعد اسے دیکھا ہے۔ ہمارے گھر میں تو اس کی آمد کے ساتھ ہی گویا خوشیوں کی بارات اتر آئی ہے۔ بابا کی بیماری کی ٹینشن تک اڑنچھو ہو گئی ہے۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، میں بھی پھولوں کے ہار لے کر پہنچ جاتی۔“ وہ مسلسل عمار کو تپا رہی تھی۔

”تم بھی نا زونہ...“ عمار نے غصے سے لب بھینچے اور پھر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جا رہے ہو، مجھے بھی تو لیتے جاؤ میں میں بھی پرائم منسٹر صاحب مطلب حاشر صاحب کا دیدار کر لوں۔“ وہ بھی ہنسی دبائی، سرخ چہرہ لیے بھاگتے ہوئے عمار کے پیچھے آئی تھی۔

”بہت غلط کیا میں نے، امی کے کہنے پر خوا مخواہ تمہیں لینے کے لئے آگیا ہوں۔“ اس نے غصے سے بانیٹ اسٹارٹ کی تو زونہ اچھل کر اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے کھلکھلائی۔

”کسی فلاور شاپ سے پھول بھی لیتے جائیں گے۔“ وہ اب بھی شرارت کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔ عمار نے بانیک کی رفتار بڑھادی تھی۔ یہ مسلسل اسے زچ کرنے کی سزا تھی۔

وہ اسی طرح مسلسل حاشر کا مذاق اڑاتی اور عمار کو چڑاتی، شور مچاتی خالہ سے لپٹ گئی تھی۔ خالہ سے بچوں کی طرح ڈھیروں پیار لیتے جوں ہی اس کی نگاہ سامنے اٹھی تو پھر پلٹنا بھول گئی۔

وہ بھول گئی تھی کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔

وہ بھول گئی تھی کہ اسے خالہ سے کیا کہنا ہے۔

وہ بھول گئی تھی کہ کوئی ایسا لفظ بھی ہے جو قدرت کے اس حسین شاہکار کی تعریف میں کہا جاسکے۔

وہ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کچن کے دروازے میں ننگے پاؤں کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں پائن اپیل جوس کا گلاس تھا۔ اس نے بلیک جینز اور ڈھیلی ڈھالی سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بال منتشر تھے، بالوں کے

گچھے نے سفید پیشانی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سو جی سو جی اور بہت گلابی تھیں شاید وہ سو کر اٹھا تھا۔

زونبیہ نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں کی تراش بہت خوبصورت ہے اور نچلے لب کے بالکل پاس ہی موٹا سا سیاہ تل، زونبیہ نے ایک مرتبہ پھر اس کے پیروں کی طرف دیکھا، اس کے پیر بے حد سفید اور گلابی تھے۔

”کیا کوئی مرد اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے؟“

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ خود سے پوچھا اور ایک دم ہی پلٹ کر لاؤنچ میں چلی آئی۔

”ارے زونی تم آگئیں، کب سے یاد کر رہے تھے اپنے ساتھ لپٹایا تو جواباً وہ گرم جوشی کا اظہار بھی نہیں کر سکی تھی۔

”آج میں نے تمہاری پسند کی ڈش بنوائی یعنی کڑھی کوفتہ۔“

”اچھا..“ وہ بمشکل مسکرائی تھی۔ اسی اثنا میں عمار چلا آیا۔ زونہ کو قدرے خاموش اور گم سم سا پا کر وہ مسکرایا۔

”ہو گئی نابولتی بند حاشر کو دیکھ کر۔“

”مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“

”کیا مطلب؟“ عمار کے ساتھ ساتھ انابیہ بھابی کو بھی اچنبھا ہوا تھا۔

”پاپا اکیسے ہوں گے۔“ اس نے بمشکل بات بنائی تھی۔

”کھانا کھائے بغیر تو تم نہیں جاسکتیں۔“

”مگر...“

”اگر مگر کچھ نہیں۔“

”زونہ آئی ہے۔“ علی نے چیخ کر کہا تھا۔ زونہ ایک دم ٹھٹکی تھی۔ صرف چند

پل لگے تھے اسے حواسوں میں آتے ہوئے۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

ہتھیلیاں پسینے سے شرابور تھیں۔

”دلہن تھک گئی ہے۔ اسے کمرے تک چھوڑ آؤ۔“ کسی بڑی بی کو شاید اس پر

ترس آگیا تھا۔ اس کے من میں افیت کی تیز لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ رونا

چاہتی تھی بے تحاشا رونا، مگر نہ جانے کیوں اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔

”تو حاشر تم میرے کبھی بھی نہیں تھے، تمہارا نام میرے ہاتھ کی لکیروں

میں کہیں نہیں۔“ اس نے اپنے دو دھیا حنائی ہاتھوں کو پھیلا کر بغور دیکھا

اور تلخی سے بڑ بڑائی۔

”میری یک طرفہ محبت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔“ اس نے بیڈ کراؤن سے

سر پٹا۔

”دور دیس کے نہ جانے کون سے شہر کے باسی تجھے تو خبر بھی نہیں کہ

تیرے عشق میں کوئی کس افیت سے تڑپ رہا ہے۔“ اس کا دل کر لایا۔

”میں تجھے اب کبھی یاد نہیں کروں گی۔“ زونہ نے غصے سے کہا اور پھر خود

ہی پھیکی سی ہنسی کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ اسی پل دروازہ آہستگی سے

کھولا گیا تھا۔

”زونیہ! تم خوش تو ہونا۔“ ولید نہ جانے کون سی یقین دہانی چاہتا تھا بہر حال اسے ولید کو مطمئن کرنا ہی تھا سو اسی اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

”میں بہت خوش ہوں۔“

”پر مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔“ اس نے آہستگی سے اپنی الجھن بیان کی۔ زونیہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے اک لمحے کے لئے مڑ کر دیکھا اور پھر دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”یہ تمہارے اپنے محسوسات ہیں۔“

”تم پہلے کی طرح بولتی کیوں نہیں ہو، تم کافی بدل گئی ہو ان بیس پچیس دنوں میں۔“ ولید نے اک اور الجھن سے اسے آگاہ کیا تو وہ لاپرواہی سے بولی۔

”شادی کے بعد ہر لڑکی میں چیلنج آتا ہے۔ سو میرے اندر بھی تبدیلی آئی ہے۔ اب کیا میں ہر وقت بے وقوفوں کی طرح قہقہے لگاتی پھروں یا پھر اچھلوں کودوں۔“

”شادی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان خود پر سنجیدگی طاری کر لے۔“ ولید جو کہہ رہا تھا بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگرچہ وہ اس کی ہر بات کی نفی کر رہی تھی مگر دل ہی دل میں وہ اس کے اندازوں کی درستگی کے قائل بھی ہو رہی تھی۔ اس نے صحیح تجزیہ کیا تھا۔ زونیہ بدل گئی تھی اس نے خود پر خول چڑھا لیا تھا، بے حسی کا خول۔ ”میرا خیال ہے تم کل سے یونیورسٹی جانا شروع کر دو۔ ایگزائمز میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ اگر رمیز بھائی کے جانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو شادی تمہارے ایگزائمز کے بعد ہی کرنے کا ارادہ تھا میرا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم تمام خیالات جھٹک کر پڑھائی پر توجہ دو۔“ ولید نے خود ہی ایک بہت مناسب حل اس کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ ان تمام تکلیف دہ



سوچوں سے بچنے کے لئے کتابیں بہترین ساتھی تھیں۔ اس نے فوراً ہی ولید کی بات مان لی۔

روٹین لائف شروع ہوئی تو وہ خود بخود ہی بہل گئی بلکہ اس نے خود کو زبردستی بہلا لیا۔ صبح یونیورسٹی، دوپہر کو بھابی اور خالہ کی باتوں اور شام کو ولید کی سنگت میں وہ بہت حد تک حاوی ہو جانے والی زہریلی سوچوں سے آزاد ہو گئی تھی۔ اس نے خود کو بہلانا ہی تھا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا اس کے پاس پہ گھر واحد پناہ گاہ تھی اور یہ سائبان، آشیانہ اتنا برا بھی نہیں تھا اگر۔۔ اس اگر کے بعد کبھی کبھی اس پر پھر سے قنوطیت کا دورہ پڑ جاتا تھا۔

دراصل اب اس نے خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے خالہ کو اور ولید کو کس طرح خوش رکھنا ہے۔ خالہ تو جی جان سے اس پر فدا تھیں اور ولید بھی کم دیوانہ نہیں تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ پر جان دینے والا۔ اسے بہت اچھا سسرال اور بہت اچھا شوہر مل گیا تھا مگر وہ قدر دان عورتوں میں سے نہیں تھی۔

وہ شکر کرنے والی عورتوں میں سے بھی نہیں تھی۔ اور وہ صبر کرنے والی عورتوں میں سے بھی نہیں تھی۔

حاشر کی یادوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک ذریعہ ایمان کی ذات بھی تھی۔ اس نے روایتی عورتوں کی طرح گھریلو باتوں بلکہ ایک دوسرے کی غیبتوں اور کھٹی میٹھی دلچسپ گفتگو میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اس کام کا بھی الگ ہی مزا تھا۔

کبھی آمنہ آپ کی نند کی برائیاں۔

کبھی ان کی ساس اور دیورانی کی غیبتیں۔

کبھی انابیہ کے ساتھ مل کر خالہ کی کسی نہ کسی تلخ بات پر بحث۔

کبھی خالہ کے ساتھ بیٹھ کر ایمان کی ذات کے بنجے ادھیڑنے کی دلچسپ مصروفیت۔ وہ ہمیشہ خالہ کو ایمان کے خلاف بھڑکاتی تھی۔ نہ جانے کون سی حس کو تسکین پہنچاتی تھی وہ۔

”خالہ جان! وہ میرے اور انابیہ بھابی کے درمیان تو بالکل دب کر رہ جائے گی۔“ یہ تو مہر بیگم کا بھی پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ بھی گفتگو میں شریک ہو جاتیں۔

”نہ جانے عمار کے دماغ میں کیسا خناس بھر گیا ہے۔ بھلا خوبصورت لڑکیوں کی کوئی کمی ہے جو اس رات سے رشتہ جوڑ لیا۔ کل کو بچے بھی اگر ماں پر پڑے تو پھر۔“ انہوں نے بے حد آزر دگی سے کہہ کر ایمان کی گندمی سنہری رنگت کو کالی رات سے تشبیہ دے ڈالی۔

”ویسے کافی دن ہو گئے ہیں عمار نے شادی کی بات نہیں چھیڑی۔“ انابیہ بھی راز داری سے بولی تھیں۔

”ارے اتنی جلدی تو شادی نہیں کر سکتی میں۔ ابھی چھ ماہ پہلے زونہ کو بیاہ کر لائے ہیں اور پھر عمار بھی آج کل جاب کی تلاش میں ہے۔ ایک دفعہ نوکری لگ جائے پھر سوچیں گے۔“ مہر بیگم نے بے زاری سے کہا تھا۔

”زونہ! ذرا رات کے لئے چاول تو بنا لو، سالن اور روٹیاں تو میں بنا چکی ہوں۔“ انابیہ کو اچانک ہی خیال آیا تو کہہ اٹھیں۔ زونہ خالہ کے سامنے جز بزی ہو کر اٹھ گئی تھی جبکہ انابیہ کمر سیدھی کرنے کی غرض سے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

حرا نے صبح ہی فون کر کے خالہ جان کی پوری فیملی کو انوائٹ کیا تھا۔ یہ دعوت تھی تو ولید اور زونہ کے اعزاز میں مگر حرا نے سوچا کہ اسی بہانے مل بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔

ایمان کو ایک لمبی فہرست مینیو کی تھا کر خود تو وہ لاپرواہ ہو گئی تھیں جبکہ ایمان کی جان پر بن آئی۔

یہ کھانا صرف کھانا ہی نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے اس کا امتحان بھی تھا۔ باقیوں کی تو خیر تھی اصل ٹینشن اسے مہر بیگم کی طرف سے تھی۔ وہ نا صرف خوش خوراک خاتون تھیں بلکہ ان کے ہاتھ میں لذت بھی بہت تھی۔

وہ صبح سے کچن میں مصروف تھی اسی لئے رات آٹھ بجے تک کھانا تیار ہو چکا تھا۔ بھابی کے احساس دلانے پر وہ خود بھی ہلکا پھلکا سا تیار ہو کر آگئی تھی۔ کچن میں بھابی تمام ڈشز کو چکھنے کے بعد اب اسے کافی کھلے دل سے سراہ رہی تھیں۔

مہمانوں کی آمد کا سن کر وہ بھی ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔ پہلی مرتبہ مہر بیگم نے کافی تپاک اور محبت سے اسے ساتھ لپٹایا تھا۔ ایمان کا گویا سیروں خون بڑھ گیا۔

موسم کافی سرد تھا اسی لئے کولڈ ڈرنک کی جگہ چکن سوپ پیش کیا گیا تھا۔ عمار کی کمی تقریباً سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ ایمان بھی دل ہی دل میں اس سے خفا ہو گئی تھی جو کہ اپنے دوست کے والد کی عیادت کرنے گجرات چلا گیا تھا۔

کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے کھانے اور ان میں اٹھتی خوشبوئیں بتا رہی تھیں کہ کھانا گھر میں ہی تیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ مسالوں کی تیز مہک مفقود تھی۔

سندھی بریانی، مچھلی کے کوفتے، قورمہ، کباب، رول اور مہر بیگم کا من پسند سالن گاجر گوشت، میٹھے میں رس ملائی، کھیر اور بچوں کے لئے ٹرائفل... مہر بیگم نے ایک توصیفی نگاہ میز پر رکھے لوازمات پر ڈالی۔ اسی پل ایمان تین چار قسم کے سیلڈ ٹرائی میں سجا کر چلی آئی۔

حرا بھابی نے بھی دل پر بھاری پتھر رکھ کر ایمان کی تعریف کر ہی ڈالی تھی۔ ان کے تعریف کرنے کی دیر تھی، زونہ کا موڈ ایک دم آف ہو گیا کیونکہ مہر بیگم اب ایمان کی تعریف کرنے کے بعد اپنے پرس میں سے چار پانچ نیلے نوٹ نکال رہی تھیں یقیناً انعام کے طور پر ایمان کو یہ رقم دی گئی تھی۔ انابہ بھی دل ہی دل میں قدرے رشک کے احساس سے دوچار تھیں۔ کیونکہ کھانا پکانے کے معاملے میں زونہ اور انابہ

دونوں ہی فیل تھیں۔

کھانے کے بعد گرین ٹی کا دور چلا اور پھر مہر بیگم نے بھابی سے اجازت طلب کی، کیونکہ زونہ کی بے جینی وہ بھی نوٹ کر چکی تھیں۔

ایمان کے سر سے اک بھاری بوجھ ہٹ چکا تھا۔ مہر بیگم کا روبہ کافی حوصلہ افزا تھا۔ دن اسی طرح سبک رفتاری سے گزر رہے تھے۔

☆☆☆

عمار کو ایک اچھی کمپنی میں جاب کی آفر کیا ہوئی اس نے جھٹ سے جوائن کر لیا ولید اسے اکثر چھیڑتا تھا کہ بے چارا عمار شادی کی خاطر نہ جانے کتنے ہی پیڑ بیل رہا ہے مگر بقول عمار کے کوئی بھی پیڑ سیدھا نہیں پڑ رہا تھا۔ سب تدبیریں الٹی ہو رہی تھیں۔ وہ جب بھی امی کے خوشامدی انداز میں گٹھنے پکڑنے کی کوشش شروع کرتا کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ کھڑا ہو ہی جاتا تھا کہ اسے اپنا منہ بند ہی رکھنا پڑتا۔

پہلے آمنہ آپنی کی ساس بیمار ہو گئیں اور پھر انابیہ بھابی کے والد صاحب اچانک وفات پا گئے۔ امی بہو کی ان دنوں دلجوئی میں مصروف تھیں۔ اللہ اللہ کر کے کچھ غم کے بادل چھٹے تو راحیل بھائی ’بہنوئی‘ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ آپنی کی پریشانی کے خیال سے عمار تقریباً دو ماہ کوئٹہ بھائی جان کی عیادت میں مصروف رہا۔ اس کے اچھے اخلاق سے متاثر ہو کر راحیل بھائی بھی اس آگ میں کود پڑے اور بیگم کو منا کر ہی دل لیا۔ یوں پورے ڈیڑھ ماہ طویل بحث و مباحثے کے بعد امی کو آخر ماننا ہی پڑا۔ ان کے تمام حیلے بہانے حاشر نے اک بھاری بھر کم چیک بھیج کر دور کر دیے۔

شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی۔ انابیہ بھابی کا موڈ آف اور زونہ کا بھی مزاج برہم تھا جبکہ ولید ہر شے سے بے نیاز صرف عمار کی خوشی میں خوش تقریباً تمام باہر کے کام سنبھالے ہوئے سرشار تھا۔

”آخر دل کی مراد پا ہی لی تم نے۔“ وہ آتے جاتے عمار کو چھیڑتا۔



”عمار! تم بابا شاہ کے مزار پر دیسی گھی کے چراغ جلانا۔“ زین اور علی بھی کیوں پیچھے رہتے۔

”بعض لوگوں کے بخت بڑے بلند ہوتے ہیں۔“ زونہ کا دل جل بھن رہا تھا۔ مایوں، مہندی اور بارات کے فنکشن میں وہ کٹی کٹی سی رہی تھی۔

وہ میرج ہال سے جلدی گھر آگئی تھی۔ نہ جانے کب ایمان کو گھر لائے تھے۔ اس نے باہر نکلنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اسے ایمان سے کوئی خاص قسم کی پرخاش ہر گز نہیں تھی۔ وہ تو بس اس بات سے جلتی تھی کہ اتنی عام سی ہو کر وہ سب کچھ پاچگی ہے۔ ایمان کی آنکھوں میں چھپی عمار کی محبت اسے حسد میں مبتلا کر دیتی تھی۔

”میرا دل بھی خالی ہے اور ہاتھ بھی۔“ اس پل حاشر کی یاد، اس کی آنکھوں میں کرچیاں بن کر چھنے لگی تھیں۔

”بھلا دل پر کس کا اختیار ہے۔“ اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ باہر شور، ہنگامے اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ اسی طرح بت بنی چھت کو گھورتی رہی۔ خالہ امی کے بلاوے پر بھی باہر نہیں نکلی تھی کہ اچانک انجانا سا شور سنائی دیا۔ وہ بے حس سی پڑی رہی، باہر نکل کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اسی اثنا میں گھریلو ملازمہ پروین تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آئی اور پھولی سانسوں سمیت بولی۔

”زونی بی بی! مہوش کو کرنٹ لگ گیا ہے۔ ولید اور عباد بھائی ہسپتال لے گئے ہیں۔ آمنہ بی بی کا رو رو کر برا حال ہے صرف ایک ہی تو بیٹی ہے ان کی۔“ پروین کی اطلاع پر وہ ابھی باہر نکلنے ہی والی تھی کہ اچانک ٹیلی فون کی بیل نے گھر میں کہرام مچا دیا۔ عمار بایک پر ان دونوں کے پیچھے نکلا تھا۔ زین اور علی کے روکنے کے باوجود وہ سرعت سے ان کے پیچھے گیا۔ وہ لوگ گاڑی میں تھے۔

آمنہ آپنی کے آنسو ان کی چیخ و پکار اور مہوش کا بے ہوش وجود، اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ شادی کے نو سال بعد کتنی ہی منتوں مرادوں سے اس کی بہن کی گود میں یہ ایک پھول کھلا تھا۔

ہر طرف آوازیں تھیں، شور تھا، چیخ و پکار تھی کوئی ایمان کو منحوس اور سبز قدم کہہ رہی تھی۔ کسی نے اسے بدبخت عورت کہا تھا۔ آمنہ آپنی بھی ایمان کو کوس رہی تھیں۔ آنسوؤں کی دھند کے پار ہر منظر دھندلا رہا تھا۔ اس خوشی کا انجام آنسو ہی کیوں؟ اس رات کا اختتام اداسی ہی کیوں؟

اگر مہوش کو کچھ ہو گیا تو ایمان کو ساری زندگی کے معتبہ ٹھہرا دیا جائے گا۔ وہ سبز قدم ہے۔ منحوس ہے، بدبخت ہے اس کی آمد نے پہلے دن ہی ان کے گھر صف ماتم بچھادی۔ عورتوں کی زہریلی باتیں، امی اور آپنی کی نفرت، وہ صرف چند منٹوں میں ہی جان چکا تھا۔

اس پل ایک اور ادراک ایک اور آگہی کا در اس پر وا ہوا تھا۔ ایمان ان چاہی بہو اور ان چاہی بھابی ہے۔ اس کا مقام وہ کبھی بھی نہیں ہوگا جو انابیہ بھابی یا پھر زونیہ کا ہے۔

وہ ان حقیقتوں سے آج تک نگاہ چرا رہا تھا مگر کس گھڑی یہ تلخ حقیقتیں ذہن و دل کو آلودہ کرنے کے لئے وار دہوئی تھیں۔

”میں ایمان کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔“ اس نے آنکھ سے گرتے آنسو کو پونچھ کر دل ہی دل میں عہد کیا۔

”اگر امی کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہ رہا تو میں ایمان کو لے کر الگ ہو جاؤں گا۔ ایمان کے آنسو مجھے تکلیف دیں گے۔ ایمان میری محبت ہے، میں اسے دکھ نہیں دے سکتا۔ وہ تو پہلے ہی اپنے ماں باپ کی دائمی جدائی کے غم میں مبتلا ہے، میں اسے۔“ سامنے سے ٹرک آرہا تھا عمار نے آنکھیں رگڑ کر دیکھنا چاہا مگر ایکدم ہی زور دار دھماکہ ہوا۔ اس کی تمام سوچیں پاتال میں گر پڑیں اور وہ خود تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

”ایمان! میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارے پاس اپنی اتنی یادیں چھوڑ دوں کہ تم کبھی ان یادوں کے حصار سے نکل ہی نہ سکو۔“ اس کمرے کے در و دیوار چیخ چیخ کر روزانہ اسے یاد دلاتے تھے

”میں تمہاری یاد کے حصار سے نکلنا نہیں چاہتی عمار! میں ساری زندگی اس کمرے میں خود کو قید کر کے گزار دوں گی۔ تمہاری محبت کا حصار اتنا مضبوط ہے کہ کوئی اسے توڑ نہیں سکتا۔ کوئی اسے توڑ نہیں سکتا۔“ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ اسی طرح سارا سارا دن کمرے میں بند روتی رہتی تھی۔ وہ سہا گن بننے سے پہلے اجڑ گئی تھی۔ ابھی تو اسے عمار کی جدائی کا ماتم کرنا تھا ابھی تو اسے اپنے اجڑنے کا ماتم کرنا تھا۔ بھیا کے مجبور کرنے، ایبی کی خود ساختہ نفرت، زونیہ کی جلی کٹی باتوں کے باوجود وہ اس گھر کو اور عمار کے کمرے کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ مہمان جو ان کی خوشیوں میں شرکت کی غرض سے آئے تھے عمار کی نماز جنازہ پڑھ کر چلے گئے۔

خوشیوں کی نوخیز صبح پر غم کی سیاہ چادر پڑھ چکی تھی۔ وہ زخم زخم دل لئے سب کی ترحم آمیز نگاہوں کی زد میں دن بھر گھاگ قسم کی عورتوں سے چھپتی رہتی۔ وہ اسے بیچ منجھار میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

وہ اسے صندل کیے بغیر چلا گیا تھا۔

وہ شگفتہ کلی تھی جس کی مہک اور رس کو غموں نے چوس لیا تھا۔

وہ بکھر رہی تھی اسے سمیٹنے والا چلا گیا تھا۔ اپنی چاہتوں کا اظہار کیے بغیر، اسے زمانے کی نگاہوں میں معتبر کیے بغیر جانے والا چلا گیا تھا۔ اس کا دامن خالی تھا۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں۔ ایک مہینہ گزر گیا تھا ایسے ہی کئی مہینے گزر جانے تھے۔ مگر کوئی ان رتجگوں کی سرخی لئے آنکھوں سے پوچھتا کہ وقت کیسے گزر رہا ہے۔

عمار سے محبت کرنے والے سب اس کی دائمی جدائی کا غم دل میں بسائے دنیا داری کے تقاضوں سے مجبور روٹین کی مصروفیت میں خود کو الجھا رہے تھے۔ ان سب کے پاس جینے کا کوئی نہ کوئی جواز موجود تھا۔

مہوش کی صحت یابی کے بعد آمنہ آپی بھی اسے گھر سے بھیجنے کا مشورہ دے کر واپس چلی گئی تھیں۔

چوتھے دن حرا بھابی اسے لینے کے لئے آگئیں۔ امی نے اسے بیگ تیار کرنے کا آرڈر دے دیا تھا۔ ظاہر ہے یہاں رہنے کا بھلا کیا جواز تھا۔ اسے جانا ہی تھا۔ مگر وہ عمار کا کمرہ چھوڑ کے جانا نہیں چاہتی تھی۔ عمار چلا گیا تھا اور یہ لوگ اس کی یادیں بھی چھین لینا چاہتے تھے۔

اس نے حرا بھابی کے ساتھ جانے انکار کر دیا تھا۔ ایمان کے انکار نے گھر بھر کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

”یہاں کس امید پر رہنا چاہتی ہے۔“ مہر بیگم نے تنفر سے کہا۔

”میرے عمار کو تو اس ڈائن نے کھا لیا ہے۔ اب کون سا عظیم نقصان چاہتی ہے یہ۔ لے جاؤ اپنی منحوس نند کو حرا! میں اب مزید اسے برداشت نہیں کروں گی۔“

”بمشکل ہی تو اس بوجھ سے خود کو آزاد کیا تھا۔ اب پھر ہمارے ہی در پر آپڑے گی۔“ حرا بھابی کی زہریلی آواز نے اس کے قدموں کو زنجیر پا کر دیا۔

اس وقت انابیہ اور زونہ بھی کمرے میں موجود تھیں۔ اس ذلت کے احساس نے اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

”نکل بھی آؤ باہر شہزادی صاحبہ! زندگی عذاب بنا کر رکھ دی ہے اس نے۔“ حرا بھابی نے چلا کر کہا۔

”اپنے مسائل کیا کم ہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں اور ان لا ڈورانی کو بار بار کون بھگتائے۔“

”جہیز کا سامان بھی بھجوادوں گی۔“ مہر بیگم نے بھانجی سے کہا۔

”پروین! ایمان سے کہو، سامان سمیٹے اور دفع ہو جائے اپنا منحوس وجود لے کر کیا دھکے دے کر نکالوں کس قدر ڈھیٹ ہے یہ۔“ وہ باہر چلا رہی تھیں اور ایمان زار و قطار روی رہی تھی۔ عمار کی تصویر گود میں رکھے اس کا وجود گویا

زلزلے کی زد میں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چاروں خواتین دروازہ دھاڑ سے کھولے اندر چلی آئیں۔ مہر بیگم نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بولیں۔



”جوان بیٹا بچھڑ گیا ہے میرا۔ آج تک اس نے نافرمانی نہیں کی تھی۔ نہ جانے کون سا جادو کیا تھا تو نے اس پر کہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا تھا، جادو گرنی تو نے ہی میرے عمار کو مجھ سے جدا کیا ہے۔ جا چلی جا یہاں سے، ورنہ کچھ کر بیٹھوں گی میں۔ اس مظلومیت کا ڈھول کہیں اور جا کر پیٹنا۔“ انہوں نے جنونی انداز میں اسے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔

”امی! مجھے یہیں رہنے دیں، میں آپ کی خدمت کروں گی۔ گھر کے کام کروں گی۔ بس مجھے یہ کمرہ بخش دیں۔ مجھے اس کمرے سے مت نکالیں، یہ کمرہ میری جاگیر ہے، میری جائے پناہ ہے۔ میرا سائبان ہے۔ میں عمار کی بیوہ بن کر ساری زندگی اسی گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ امی! اللہ کے لئے مجھے ان یادوں سے دور مت کریں جو وہ جانے سے پہلے مجھے بخش گیا ہے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے سوائے ان چند یادوں کے۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں عمار کی یاد کو دل میں بسائے۔“ وہ عمار کی بیوی تھی صرف چند لمحوں بعد بیوہ بن گئی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ان کے پیر پکڑ لئے۔

”اللہ کے غضب سے ڈرو مہر بیگم! اللہ کو جان دینی ہے۔ کیسے پروردگار عالم کے حضور کھڑی ہوگی تم یہ ظلم کر کے۔ کیسے عمار کا سامنا کروگی روز قیامت۔ کیسے خود سے نظر ملاؤ گی۔ تم بھی بیٹی کی ماں ہو نہ آہ لو اس یتیم کی جو بد قسمتی سے تمہاری بہو بن گئی ہے۔ جو تمہارے عمار کی بیوہ ہے، عمار میرے جگر کا ٹکڑا تھا میں کیسے اس کی محبوب بیوی کو اس گھر سے نکل جانے دوں۔ کوئی اسے اس گھر سے نہیں نکال سکتا۔ کس کی جرأت ہے اس کے ساتھ نا انصافی کرے۔ یہ ہمیشہ کے لئے یہیں رہے گی سنا تم نے۔“ سجاد صاحب نے چنگھاڑ کر کہا تھا اور پھر بلکتی ہوئی ایمان کو سینے سے لگالیا۔ وہ گویا اس کے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تھے۔

”تاحتیات ایمان مجھے عمار کی یاد دلائے گی۔ جب جب میں اسے دیکھوں گا تو ہنستا مسکراتا عمار اس کے پہلو میں آکھڑا ہوگا۔ تمہیں کیوں بھول گیا ہے کہ عمار کو اس سے کس قدر محبت تھی اور مجھے اپنے بیٹے کی محبت سے محبت

ہے۔ آج میرے چھ بیٹوں میں صرف وہ نہیں ہے۔ اس کی کمی ایمان پوری کرے گی۔“

ان کا فیصلہ اٹل تھا۔ اس فیصلے کو کوئی بدل نہیں سکتا تھا حتیٰ کہ مہر بیگم بھی نہیں۔

ایمان کے احساس تشکر کے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے اسے زندگی کی نوید سنائی تھی۔ وہ بھابی کے ساتھ ہر گز نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ زندگی اس زندگی سے بھی بدتر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ادھر اسے کسی نے رونے بھی نہیں دینا۔ یہاں کم از کم وہ کھل کر روتو سکتی تھی۔ جب جب اس کا دل بہت آزرده ہوتا وہ عمار کی تربت پر چلی جاتی اور جب بابا کراچی سے گھر آتے تو وہ دونوں عمار کو یاد کر کے رولیا کرتے تھے۔

اس نے خود کو مصروف کر لیا تھا۔ گھر کے بے حساب کاموں میں اور عجیب بات یہ تھی کہ اسے ہر گز بھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ دن بھر ڈھیروں کے حساب سے کام کرنے کے باوجود وہ خود کو تروتازہ سمجھتی اور

پھر دن آخر ڈھل جاتا، رات سونے آنگن میں اتر آتی۔ وہ ایک سرشاری کی کیفیت میں اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ جاتی۔ آنکھوں میں رنگ اور ڈھیروں سکون لئے۔ اسے خبر نہ ہوتی کہ اس کا سکون باقی کچھ لوگوں کو کافی بے سکون کیے رکھتا ہے۔

عمار کے بیڈ پر لیٹ کر اس کی تصویر سے، اس کے تصور سے باتیں کرتے کرتے نہ جانے کب نیند کی دیوی مہربان ہو جاتی تھی۔ رات کے تیسرے پہر کے ابتدائی حصے میں اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ پھر وضو کے بعد تہجد پڑھنے، قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی لذت پورے دن بھر سرشار کیے رکھتی۔ رات کا کچھ حصہ اس کا عبادت الہی میں گزرنے لگا تھا۔ کچھ عرصے بعد ولید نے اسے مزید پڑھنے کا مشورہ دیا تو اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔ پھر ایک مخلص خاتون کے مشورے پر اس نے مدرسہ جانا شروع کر دیا۔ فقہ اور حدیث کا مطالعہ اس کی زندگی کے مقاصد میں شامل ہو گیا۔ قرآن کریم کی تلاوت معہ ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی لذت نے اسے مسرور کر دیا تھا۔

عمار کی محبت اس کے لئے ایک تحفہ تھی جس نے اسے رب کائنات کے بے حد قریب کر دیا۔

انابیہ اور زونہ اس کے اطمینان پر حیران ہوتی رہتی تھیں۔ وہ خود کو چادر میں لپیٹ کر باہر نکلتی تھی۔ گھر میں بھی یہ خیمہ نما چادر اس کے وجود کے ارد گرد رہتی۔ آمنہ آپی یا امی کی جلی کٹی باتوں کی طرف اس کا کبھی دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس کی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی اور اگر کوئی اس دنیا کی وسعت کو دیکھ لیتا تو حیران ہی رہ جاتا۔

اس نے دو سال کے عرصے میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ سنن ابن ماجہ، سنن نسائی، جامع ترمذی کا مطالعہ اس کا روز کا معمول تھا۔ اس نے بہت سی احادیث زبانی یاد کر رکھی تھیں۔

☆☆☆

بابا ان دنوں کراچی سے آئے ہوئے تھے۔ وہ اکثر ہی ملک کے مختلف شہروں میں تبلیغ و وعظ کے لئے سفر کرتے تھے۔ سال کے آٹھ ماہ ان کے سعودی عرب میں گزرتے تھے۔

بابا کی آمد کے ساتھ سب ہی اپنی اپنی جگہ محتاط ہو جاتے تھے۔ انابیہ بھابی کا رویہ قدرے اس کے ساتھ بہتر ہو جاتا۔ امی بھی طنز و طعنے دینے سے گریز کرنے لگتی تھیں اگرچہ اس نے کسی کے رویے کی شکایت کبھی نہیں کی تھی اور نہ ہی ان کی باتوں کی طرف دھیان دیا تھا۔

بابا کے آنے کے بعد اس کا زیادہ وقت اسٹڈی روم میں گزرتا تھا۔ وہ سارا دن بابا کو گرما گرم چائے بنا کر دیتی اور ان کے قیام کی تفصیل سنتے ہوئے اس کی آنکھیں عقیدت کے موتی برسانے لگتی تھیں۔

اس نے بھی مکہ دیکھنا تھا جو دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ جس کی پہلی مسجد کا نام کعبہ ہے۔ جس میں ایک سیاہ پتھر نصب ہے۔ جسے حجرا سود کہتے ہیں۔ اس نے بھی حجرا سود کا بوسہ لینا تھا۔

اس کا بھی دل بے قرار تھا منیٰ میں واقع مسجد الخیف کو دیکھنے کے لئے۔ اس کے دل کی آرزو تھی کہ وہ مسجد عقبہ میں بیٹھ کر عمار کے لئے دعائے مغفرت کرے۔ وہ مسجد نبویؐ کے تین سو سینتیس ستون، چار مینار اور دس دروازوں کو بوسہ دینے کے لئے بے قرار تھی۔ اس نے خانہ کعبہ کی چھاؤں میں بیٹھ کر نوافل ادا کرنے تھے۔ اس نے رب سے شکوہ کرنا تھا کہ اس کے عمار کو کیوں اتنی جلدی اپنے پاس بلا لیا ہے۔

اس نے میدان عرفات میں موجود اس پہاڑ کو دیکھنا تھا جسے ”جبل الرحمۃ“ کا نام دیا جاتا ہے۔ جس کی چوٹی پر فخر کائنات نے انسانیت محبت، رحمدلی، امن و آشتی اور فلاح کا آخری پیغام دیا تھا۔

بابا اس کی دلی خواہشات سے انجان نہیں تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس سال وہ ضرور ایمان کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔

وہ بیت اللہ کی زیارت کرنا چاہتی تھی اور بابا ایمان کی اس خواہش کو ہر صورت پورا کرنا چاہتے تھے۔ ایمان اللہ کی طرف سے بلاوے کی منتظر تھی۔

بابا کو اس دفعہ ایمان میں اور بھی بہت سی تبدیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ پہلے کی طرح اس نے بابا کو دیکھ کر ضبط کا دامن نہیں چھوڑا تھا بلکہ اک نرم مسکان نے ان کا استقبال کیا۔ یہ تبدیلی انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ ایمان کے شب و روز بالکل پہلے طرح تھے۔ دن بھر مصروفیت کا وہ ہی عالم تھا۔ بابا کا اس دفعہ گھر میں قیام بہت مختصر تھا۔ لہذا وہ چند دنوں کے لئے مدرسے سے چھٹی لے چکی تھی۔

وہ بابا کے لئے اتنا اہتمام کرتی مگر وہ دودھ کے گلاس اور ایک عدد کھجور کے علاوہ ٹیبل سے کچھ نہیں اٹھاتے تھے۔ آہستہ آہستہ ایمان کا بھی یہی معمول بنتا گیا۔

بابا کے جانے کے بعد گھر میں پہلے جیسے حالات ہو گئے تھے۔ ان دنوں آمنہ آپنی بھی آئی ہوئی تھیں اور طنز کے تیر برسانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔

”یہ ملائیوں والا حلیہ کب سے بنا لیا ہے۔“



جب سے دل پر چوٹ لگی ہے۔“ جو اب زونہ کی طرف سے آیا تھا۔

”جتنا صدمہ ہمیں ہے عمار کی اچانک وفات کا اتنا کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔“  
انہوں نے بھرائی آواز میں کہا۔

”تو اور کیا آپ کا تو عمار کے ساتھ خونی رشتہ ہے۔“ زونہ نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”تم کبھی میکے نہیں گئیں۔“ اچانک یاد آنے پر انہوں نے ایمان کی طرف رخ کیا۔

”نہیں۔“ ایمان نے مختصر کہا۔

”کیوں؟“

”میری مرضی۔“ وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

”مینڈ کی کو بھی زکام ہو گیا ہے۔“ زونہ نے منہ بنایا۔

”یہ سب بابا کی شہ پر ہو رہا ہے۔ کیسے پٹاخ سے جواب دے گئی ہے۔“ آمنہ  
آپ جل بھن گئی تھیں۔

”بابا نے محترمہ کو زیادہ ہی سر پر چڑھا رکھا ہے۔“ زونہ نے جلے دل کے  
پھپھو لے پھوڑے۔

”تو اور کیا، بھلا کیا ضرورت تھی آگ، تیل کو اکٹھا رکھنے کی۔“ آمنہ آپ کی  
انداز پر سوچ تھا۔

”کیا مطلب...“ زونہ ٹھٹکی۔

”گھر میں دو جوان لڑکے موجود ہیں۔“ آمنہ نے دانستہ دو شادی شدہ کا ذکر  
نہیں کیا تھا۔

”بھلا نیت بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ میں امی کو سمجھاؤں گی۔ یہ محترمہ تو  
ویسے بھی ہمدردیاں سمیٹنے کے لئے بیٹھی ہیں۔“ آمنہ دل ہی دل میں بڑ  
بڑائیں۔

”ہاں آپ! ایسا تو پہلے سوچا نہیں ہے اگر..“ زونہ نے معنی خیزی سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”ظاہر ہے کچھ کرنا تو ہوگا۔ کیا ساری زندگی اسے یوں ہی بٹھائیں گے۔ عمیر کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔ بالکل ہی گاؤ دی ہے۔ اتنا بھی حرا سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

”آپا کا بھلا کیا قصور ہے۔ وہ تو اسے لینے کے لئے آئی تھیں پر بابا ہی نہیں مانے۔“ زونہ نے فوراً بہن کی صفائی پیش کرنا چاہی۔

”عمیر زبردستی لے جاتا۔“

”انہوں نے بھی بہت کوشش کی ہے مگر ایمان نہیں مانی۔ پکی ملائی بن گئی ہے سال کے چھ مہینے روزے سے رہتی ہے۔“ زونہ نے آمنہ آپا کا دھیان بٹانا چاہا جس میں قدرے کامیابی ہوئی۔

”سب دکھاوا ہے۔“ آمنہ آپا نے تنفر سے کہا۔

”ولید کو ذرا کنٹرول میں رکھو، خوا مخواہ زیادہ ہمدرد بنتا ہے۔“ کچھ سوچ کر انہوں نے زونہ کو سمجھانا چاہا۔

”کیا مطلب...“ زونہ قدرے حیران ہوئی۔

”ایسی لڑکیوں کا بھلا کیا بھروسہ، یوں تو عمر تمام نہیں کر رہی اس گھر میں نہ جانے کیا مقصد ہے اس کا۔ شاید کوئی خاص امید لگائے بیٹھی ہے۔ اس گھر میں پھر سے جگہ بنانا چاہتی ہے۔ بابا کو ان باتوں کا بھلا کیا پتا۔ امی بھی اس نازک مسئلے کی طرف توجہ نہیں کر رہیں بلکہ وہ تو مطمئن ہیں کہ سارا گھر ایمان نے سنبھال رکھا ہے۔ ملازموں کی چھٹی کروا دی ہے۔ بچت نظر آرہی ہے، تو آنکھیں بند کر رکھی ہیں انہوں نے، تم دونوں بھی تو بلا کی نکمی ہو،“ آخر میں انہوں نے کافی سخت سست سنائیں۔ زونہ منمنا کر رہ گئی تھی۔ تاہم آمنہ کی باتیں اس کے ذہن پر نقش چھوڑ گئیں۔ اب وہ بڑے دھیان سے ایمان کا اور ولید کا جائزہ لیتی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں وہ اس کام سے بور ہو گئی۔

”آمنہ آپ نے تو خوا مخواہ وہم میں مبتلا کر دیا ہے۔ ولید ایسا ہر گز نہیں۔“ ولید ان دنوں آفس کے کام کے سلسلے میں ہالینڈ گیا ہوا تھا۔ واپسی پر اس نے سب کے لئے خوب شاپنگ کی تحائف خریدے۔ ان چیزوں میں ایمان کے لئے بھی چند گفٹس موجود تھے۔ زونہ کو پتا چلا تو ایک دم ہی سیخ پا ہو گئی۔

”ایمان کے لئے اتنا کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”کیوں ضرورت نہیں تھی۔ کیا وہ اس گھر کی فرد نہیں ہے؟“ ولید نے ازلی نرم لہجے میں کہا۔

”میں اسے ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں دوں گی۔“

”تم اتنی لالچی تو نہیں تھیں۔“ ولید کو حیرت نے گھیرا۔

”ولید! تم میرے شوہر ہو۔“ زونہ چبا چبا کر بولی۔ ولید نے آنکھیں پھیلا کر زونہ کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا اٹھا۔

”میں صرف تمہارا شوہر ہوں۔“

”تم نے ساری دنیا کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ سب کے لئے تحفے لاتے پھرو۔“ زونہ کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

”میں ساری دنیا کے لئے نہیں صرف اپنے گھر کے افراد کے لئے معمولی سے گفٹس لایا ہوں۔“ ولید تسلی آمیز انداز میں بولا تھا۔

”آئندہ تم ایمان کے لئے کچھ لاؤ گے۔“ اس نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔

”ذرا قریب آکر کہو۔“

”اونہہ۔۔۔“ وہ غصے سے بھناتی باہر نکل گئی۔

☆☆...

”امی! کیا سوچا ہے آپ نے ایمان کے بارے میں؟ کب تک اسے گھر میں بٹھائے رکھنا ہے۔“

”تو کیا کروں، دھکے دے کر نکالوں اسے؟ نہ وہ جاتی ہے نہ تمہارے بابا اسے جانے دیتے ہیں۔“ انہوں نے بے زاری سے کہا۔

”ایمان کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔“ آمنہ نے دبی آواز میں سمجھانا چاہا۔  
 ”آپ بابا سے بات کریں۔“

”کیا کہوں ان سے، وہ بھی کچھ سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔“

”بابا سے کہیں کہ وہ اس کی کہیں شادی کر دیں۔ اتنے تو ان کے جاننے والے ہیں۔“

شادی... ”مہر بیگم چونک اٹھی تھیں۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“

یہی بہتر ہے ہمارے حق میں بھی اور ایمان کے لئے بھی۔“ آمنہ نے معنی خیزی سے ان کا ہاتھ دبایا تو وہ تنک اٹھیں۔

”اس گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ کتنی سلیقہ مند ہے وہ، کیا خوب ہاتھ میں ذائقہ ہے۔ میں تو ان دو سالوں میں اس کی عادی ہو چکی ہوں۔ انابیہ اور زونہ تو انتہائی نکمی اور پھوہڑ ہیں۔“

”مفت میں کام بھی ہو رہا ہے اور تنخواہ بھی نہیں دینی پڑتی۔“ پاس بیٹھے زین نے طنزیہ کہا تو آمنہ آپنی کو پتنگے لگ گئے۔

”تم اپنے کام سے کام رکھو، زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔“ بڑی بہن کا لحاظ تھا اسی لئے وہ خاموشی سے اٹھ گیا جبکہ مہر بیگم مسلسل سوچوں میں گم تھیں۔

”آج زین کی زبان کھلی ہے، کل کو دوسرے بھی بول اٹھیں گے اور میں نہیں چاہتی کہ اس گھر میں کسی بھی قسم کی بدمزگی ہو۔ جو میں کہنا چاہتی ہوں، وہ آپ کیوں نہیں سمجھ پارہیں۔“ آمنہ نے جھنجلا کر کہا۔

دوسرے دن مہر بیگم نے ایمان کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ آمنہ بھی قریب ہی بیٹھی تھیں۔ ایمان بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔



”آج میں نے حرا کو بلوایا ہے۔ تم اپنی تیاری رکھو، ابھی تمہیں جانا ہے۔“  
انہوں نے تمہید باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”کہاں جانا ہے۔“

”جہاں تمہیں آج سے دو سال پہلے چلے جانا چاہیے تھا۔“ مہر بیگم نے رکھائی سے کہا۔ ایمان کو بات سمجھنے میں لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔

”دو سال گزر گئے ہیں، دس سال گزرتے کتنی دیر لگے گی۔“

”تم شادی نہیں کرنا چاہتی نہ کرو، مگر میں مزید تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتی۔“

”میرا وہاں رہنا عذاب بن جائے گا۔ حرا بھابی قطعاً نہیں مانیں گی۔“ ایمان نے التجائیہ لب و لہجے میں کہا۔

”مجھے یہیں رہنے دیں۔“

”ایسا ممکن نہیں۔“

”کیوں ممکن نہیں، میں پہلے بھی تو یہاں رہ رہی تھی۔“ ایمان کی آنکھیں بھگنے لگیں۔

”مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔ تم جاسکتی ہو۔“

”پلیز امی۔“

”کہا نا چلی جاؤ۔“

”آپی! آپ ہی امی کو سمجھائیں۔“

”جاؤ! ایمان چلی جاؤ۔ مت آزماؤ ہمارے ضبط کو۔“ آمنہ آپی نے تنک کر کہا تو وہ مرے مرے قدم اٹھاتی باہر آگئی۔

اسی شام جب وہ اس گھر سے ہمیشہ کیلئے جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک بابا چلے آئے۔ ان کی آمد کا سن کر ایمان کو کڑی دھوپ میں بادلوں کا گمان ہوا تھا۔ وہ جارہی تھی انہیں کیسے خبر ہوئی۔ مہر بیگم جزبز ہو کر رہ گئیں تاہم جتایا ضرور۔

”اس دفعہ جلدی آگئے۔“

”ہاں، دل گھبرا رہا تھا، سوچا گھر چلا جاؤں۔“ انہوں نے فوراً ایمان کو بلایا۔ اسی اثنا میں حرا بھابی اور بھیا بھی آگئے۔ بھیا بہت غصے میں تھے۔ آتے ہی برسنے لگے۔

”کہا تھا اسے چلو ہمارے ساتھ کیا رکھا ہے یہاں، مگر نہیں مانی اس ذلت سے بہتر تھا پہلے ہی مان جاتیں چلو ابھی اسی وقت۔“

”کیا بات ہے بیٹے!“ بابا نے حلاوت سے کہا۔

”ایمان کو لینے کے لئے آیا ہوں۔“

”کیوں؟“ وہ حیرانی سے بولے۔

”یہ آپ اپنے گھر والوں سے پوچھیں، ویسے بھی ایمان کا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔“

”یہ تمہیں دو سال پہلے سوچنا تھا۔“ آمنہ چمک کر بولیں۔

”دو وقت کی روٹی نہیں کھلا سکتے تھے۔“

”خاموش ہو جائیں پلیز۔“ بھیا چلا اٹھے۔ بابا نے آمنہ آپی کو جھڑکا اور پھر بھیا کو مزید بولنے بھی نہیں دیا بلکہ ان کا بازو تھام کر اسٹڈی روم میں چلے گئے۔ وہ گھنٹے بعد جب باہر آئے تو خاموش تھے۔ انہوں نے ایمان کو چلنے کے لئے نہیں کہا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد آمنہ آپی گرجتی برستی رہیں۔ بابا عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے تھے۔

بابا نماز پڑھ کر واپس آئے پھر انہوں نے اپنے سب بیٹوں کو لاؤنج میں طلب کیا۔ علی اور زین بچوں میں شمار ہوتے تھے مگر بابا نے ان دونوں کو بھی بلوالیا۔

پہلے انہوں نے عہد نبویؐ کے چند ایک واقعات بیان کیے۔ دو تین احادیث پڑھیں اور پھر بغیر تمہید کے بولے۔

”میں جو پردیس میں جا کر دین کی تبلیغ کا کام کرتا ہوں۔ لوگوں کو نصیحتیں، مشورے دیتا ہوں۔ حسن سلوک، حسن اخلاق اور محبت پیار کے اس سبق سے میرے اپنے گھر والے محروم ہیں۔ اس سے بڑی بد قسمتی بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ ہماری نمازیں، عبادتیں سب ضائع ہو جائیں گی جب ہم حقوق العباد سے نگاہ چرائیں گے۔ میں کس قدر انجان عاقبت نا اندیش تھا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے انجان بنتا رہا۔

کیوں تم لوگ جہنم خرید رہے ہو؟ کیوں تم لوگ اپنے گنہ چنے اعمال ضائع کرنے کے درپے ہو؟ وہ چند لمحے کے لئے رکے اور پھر عباد پر نگاہ جما کر بولے۔

”میں نے اللہ کی رضا کے لئے اور ایمان کی بہتری کے لئے ایک فیصلہ کیا ہے۔ امید ہے تم لوگ اس سے متفق ہو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ عباد تم ایمان سے عقد ثانی کرو۔ یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔“ انہوں نے گویا ان سب کے سروں پر دھماکہ کیا تھا۔

”بابا! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ سب سے پہلے عباد ہی بولنے کے قابل ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں انابیہ کے لٹھے کی مانند سفید چہرے پر جمی تھیں۔

”تم خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو، انابیہ کو یقیناً کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”بابا! میں ایسا ہر گز نہیں کر سکتا۔“ عباد چلا اٹھا تھا۔ ”آپ جانتے ہیں کیا کہہ رہے ہیں آپ، میری ازدواجی زندگی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے ایسی امید مت رکھیے۔ میرے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ کیا مجھے یہ سب زیب دیتا ہے۔“

”اسلام میں بہت گنجائش ہے۔“ وہ اپنے اسی نرم لب و لہجے میں بولے۔

”مگر میری زندگی میں کسی اور فرد کی کوئی گنجائش نہیں۔“ عباد نے پتھر یلے انداز میں کہا۔

”آپ ولید سے کہیں یہ کر لے اسے شاید ضرورت بھی ہے۔ تین سال ہو گئے اس کی شادی کو جبکہ زونیہ کی گود ہنوز خالی ہے۔ مجھے ہی کیوں برباد کرنا چاہتے ہیں آپ لوگ۔“ نابیہ پھٹی پھٹی آواز میں چلائی تھیں۔ مہر بیگم بھی گویا حواسوں میں لوٹ آئیں۔

”ولید کا نام بھی مت لینا۔ میں زونہ کو تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“  
مہر بیگم نے سرد آواز میں کہا۔

”زونہ بھانجی ہے۔ آپ اس کی فیور تو کریں گی ہی۔“ انابیہ کے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔

”اگر عباد نے ایسا کچھ کیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

”ولید کو میں ایمان سے نکاح نہیں کرنے دوں گی۔“ مہر بیگم نے حقارت سے کہا۔

”ٹھیک ہے جیسا تم لوگ چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔“ آمنہ کو امید نہیں تھی کہ باباں مان جائیں گے۔ ان لوگوں کی گویا جان میں جان آئی۔

بابا خاموشی سے اٹھے اور فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔ اب وہ نمبر ڈائل کر رہے تھے۔ سب نے الجھن آمیز نگاہوں سے بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بڑی رواں انگلیش میں کسی سے بات کی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اردو میں بات کرنے لگے۔

”اپنے باپ کا مان رکھنا ہے تو آجاؤ۔ صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر، اگر تم بھی اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہتے ہو تو میں بھلا کیا کر سکوں گا مگر ایک بات یاد رکھنا اس کے بعد تم سب میری شکل کو بھی ترس جاؤ گے۔“  
انہوں نے فون رکھ دیا تھا اور گویا سب کو ہی سانپ سونگھ گیا۔

”ایمان میری بیٹی ہے اور میں اس کے بارے میں بہترین فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔“



حاشر پاکستان آگیا تھا۔ جس جس نے بھی سنا گویا دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔  
حاشر کی ضدی طبیعت، اکھڑ مزاج سے بھلا کون ناواقف تھا۔ وہ جو شروع سے ہی اپنے فیصلے خود کرتا تھا۔ بغیر کچھ کہے خاموشی سے بابا کے کہے پر عمل کرتا رہا۔



اس نے امی کے آنسوؤں اور آمنہ آپی کی التجاؤں کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ سب نے ہی اسے سمجھانا چاہا تھا۔ روکنا چاہا تھا مگر وہ حاشر تھا جب ایک مرتبہ فیصلہ کر لیتا تو پھر پلٹنے کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔

بابا نے نکاح سے پہلے ایمان کو نہ جانے کیا کہا تھا۔ وہ سر جھکا کر بس آنسو بہاتی رہی۔ اسے بھی تو بابا کا مان رکھنا تھا۔

حاشر تیسرے دن واپس امریکہ چلا گیا تھا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ دو مہینے بعد واپس آئے گا ایمان کو ساتھ لے جانے کے لئے۔ بابا کی ایک واحد یہی شرط تھی جسے اس نے فوراً ہی مان لیا۔

حاشر چلا گیا تھا مگر گھر والے ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھے۔ انابیہ حیران تھیں جبکہ زونیہ پر تو صدمات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

”بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ حاشر ایمان کے ساتھ... نہیں میرا دل نہیں مانتا۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتی، خود سے سوال جواب کرتی انتہائی پریشان اور افسردہ تھی۔

”ایمان کیا اتنی بخت آور ہے کہ اسے بیٹھے بیٹھائے سب کچھ مل گیا اور میں تہی داماں رہ گئی۔“ وہ ایک دم ہی زور زور سے چلانے لگی تھی۔

گھر والوں کی ڈھکی چھپی نفرت کا اظہار اب با آواز بلند ہونے لگا تھا۔ مگر ایمان ان سب باتوں کی اب عادی ہو چکی تھی۔ اسے اب کسی کے بھی رویے سے دکھ نہیں پہنچتا تھا۔ امی کے کوسنے اور آمنہ آپی کی گالیاں بھی اسے تکلیف نہیں پہنچاتی تھیں۔ وہ واقعی بے حس ہو چکی تھی۔

اپنے وعدے کے عین مطابق حاشر اسے لینے کے لئے آگیا تھا۔ کچھ کاغذی کارروائی باقی تھی جو کہ اب مکمل ہو گئی تھی۔ اسے اسی ہفتے چلے جانا تھا نہ جانے کہا۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ بابا کی خواہش ہے وہ کچھ عرصے کے لئے اس گھر سے دور چلی جائے۔ اسے تو بس بابا کی ہر بات کا مان رکھنا تھا۔ وہ انہی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے یہاں سے جانے کے لئے تیار ہوئی تھی۔ ورنہ اس گھر سے دوری کا خیال ہی اس کی روح کو رگیدنے کے لئے کافی تھا۔

یہ گھر عمار کا تھا اور کون جانے کہ ایمان کو اس گھر کے در و دیوار سے کیسا جنونی عشق تھا۔ اسے عمار کے کمرے سے کیسا عشق تھا۔ اسے عمار کے بابا سے کتنی محبت تھی۔ اسے عمار کی ماں سے کس قدر والہانہ عقیدت تھی یہ جانتے بوجھتے کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہیں۔ وہ محض عمار کی خاطر انہیں چاہتی تھی۔ ان کا خیال رکھتی تھی۔ نہ جانے یہ محبت کی کون سی قسم تھی اور دیوانگی کی کون سی حد تھی۔ یہ عشق تھا یا جنون۔

نکاح سے ایک گھنٹہ پہلے زونہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ ایمان کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ حاشر سے نکاح نہ کرے۔ زونہ کا خیال تھا کہ ایمان اس سے وجہ پوچھے گی تو وہ حاشر سے اسے متنفر کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی مگر خلاف توقع اس نے سرے سے کسی بات کا جواب ہی نہ دیا۔ زونہ کو اک پل کے لئے یوں محسوس ہوا گویا وہ پتھر کا بے جان مجسمہ ہے یا پھر اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ ایمان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور آنکھیں

گویا سرد جھیلیں، بالکل پتھریلی اور بنجر۔ ان آنکھوں میں کوئی رنگ نہیں تھا۔ ان آنکھوں میں زندگی نہیں تھی۔ یہ ایک بے جان مورت کی آنکھیں تھیں۔ زونہ کو اک پل کے لئے اس سے بے پناہ خوف محسوس ہوا اور اسی خوف کے زیر اثر وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

زونہ جو چلا چلا کر اسے بتانا چاہتی تھی کہ حاشر تو اس کا محبوب تھا بلکہ ابھی تک اس کی محبت زونہ کے دل میں موجود ہے۔

وہ ایمان کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ ابھی تک حاشر کو چاہتی ہے۔ ولید کی محبت نے اس کے دل پر اپنا تسلط نہیں جمایا۔ اس جاگیر پر ابھی تک حاشر کا نام لکھا ہے دل کی اس سلطنت کو ولید ابھی تک اپنے نام نہیں کر سکا۔

اس کا دل راکھ بن گیا تھا مگر اس میں سے ابھی تک کچھ چنگاریاں لمحہ بہ لمحہ دل کو روح کو سلگاتی رہتی تھیں۔

جس رات اس نے چلے جانا تھا اس رات ایمان کی بنجر آنکھوں سے سیلاب جاری ہو گئے۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ شاید ان آنکھوں میں اب اک قطرہ آنسو

کا نہیں بچا مگر اس پل اسے یقین ہو گیا تھا کہ عمار کی یاد اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر تو ٹھہری ہے۔ اس نے دیوانگی کے عالم میں کمرے کی اک اک چیز کو اٹھا کر چوما تھا۔ عمار کی کتابیں، فائلیں، کمپیوٹر، موبائل اور ڈریسنگ پر رکھے پرفیومز ہر چیز کو جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔

اس نے ہر روز کی طرح بالکل معمول کے مطابق عمار کی وارڈ روب کھولی، پھر اس نے تمام استری شدہ کپڑے نکالے، الماری کی ترتیب الٹ پلٹ کی اور پھر تین گھنٹے بعد اس الماری کو دوبارہ اس کی اصلی حالت میں لے آئی۔ عمار کی ٹائیاں، شرٹس اور رومال، جرابیں ترتیب سے رکھے۔ پھر شوز ریک کھول کر اس نے تمام پالش شدہ جوتوں کو دوبارہ رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ یہ کام وہ ہمیشہ رات کو کیا کرتی تھی اچھی طرح دروازہ لاک کر کے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ایمان نے نماز پڑھی۔ پھر بابا چلے آئے، وہ بابا کے سینے سے لگ کر بے تحاشا روتی رہی۔

”آپ نے اچھا نہیں کیا بابا! آپ نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر کیوں ایمان کو مجبور کر دیا۔ آپ نے کیوں عمار کی قسم دے کر ایمان کے لبوں پر قفل لگا دیئے۔

ایمان اس کمرے سے باہر نکلے گی تو مر جائے گی۔ بابا! میں کیسے سانس لوں گی، میں کیسے جی پاؤں گی۔ آپ کو کیا پتا بابا! اس کمرے میں عمار کی خوشبو رچی بسی ہے۔ وہ مجھے یہاں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ وہ میرے قریب ہوتا ہے۔ وہ میرے ساتھ سوتا ہے۔ وہ مراکب ہے۔ وہ زندہ ہے، عمار زندہ ہے۔ میری آنکھوں میں دیکھیں، یہ درد بھری آنکھیں کسی کو نظر کیوں نہیں آتیں۔ ان آنکھوں میں عمار کیوں نہیں نظر آتا کسی کو۔ امی تو ماں ہیں انہیں بھی ان آنکھوں میں عمار نظر نہیں آتا۔“ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور بابا اس کا سر تھپکتے ہوئے صبر کی تلقین کر رہے تھے۔

”میں تم سے ملنے امریکہ آتا رہوں گا۔ حاشر نیویارک میں رہتا ہے۔ اٹلی میں اس نے کاروبار شروع کیا تھا مگر اس کے دوست نے کچھ فراڈ کے ساتھ

پارٹنر شپ کو ختم کر دیا ہے۔“ وہ اسے آہستہ آہستہ بہت سی باتیں سمجھا رہے تھے۔

”تمہاری زندگی کا نیا باب شروع ہو رہا ہے۔ میں اپنے رب سے تمہارے لئے ڈھیروں خوشیوں کی دعا کرتا ہوں۔ تم ہمیشہ میری دعا کے حصار میں رہو گی بیٹا کبھی خود کو تنہا مت سمجھنا اور نہ ہی میری طرف

سے کسی غلط فہمی کو دل میں جگہ دینا میں نے تمہارے لئے جو بہتر سمجھا اور جسے بہترین سمجھا اسے تمہارا ہم سفر بنا دیا۔ چلو آؤ فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے اور ہاں ان آنسوؤں کو ادھر ہی چھوڑ جاؤ۔ میں تمہیں آج کے بعد روتا کبھی نہ دیکھوں۔“

انابہ بھابی اس سے ملنے کمرے میں آئی تھیں۔ زونہ نہ جانے کہاں تھی۔ امی اور آپنی بھی نظر نہیں آئیں۔ وہ ان سے ملنا چاہتی تھی۔ جاتے سے عباد بھائی اور ولید نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ انہیں ایئر پورٹ چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔ علی، زین اور بچے بھی تھے۔

”تم لوگ راستے سے ہٹو تو میری باری آئے نا۔“

وہ قریب ہی تو گنگنایا تھا۔

”کاش کہ میں تم دونوں سے پہلے دنیا میں آجاتا۔“

”گھاڑ! امی کو زونہ کے متعلق بتاؤ۔“

ولید نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، وہ کہیں نہیں تھا بس اس کی آوازیں باقی رہ گئی تھیں۔ ولید نے نم آنکھوں سے ایمان کے چہرے پر پھیلے کرب کو دیکھا۔

”نہ جانے کس تکلیف سے گزر رہی ہے یہ، بھلا عمار تمہیں کوئی بھول سکتا ہے۔“ ولید نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ ولید کے کندھے سے سر ٹکائے بے آواز رونے لگی۔



”کچھ پلین میں بیٹھ کر رولینا۔ ادھر سب روکیں گے، وہاں تو کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔“ بابا اسے چپ کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حاشر اس سین کو دیکھ کر بولے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”خبردار! جو تم نے ایمان کو رلایا۔ اگر یہ روئے تو اسے چپ کرانا، یہ نہ ہو کہ تماشا دیکھتے رہو۔“ ولید نے اسے گھر کا تو وہ زیر لب مسکراتا رہا۔

”مجھے روتی ہوئی خواتین کو خاموش کروانے کا تجربہ تو نہیں مگر یہ بھی کر لیں گے۔“

”کچھ دن رہتے نا ہماری ٹریننگ میں، سب کچھ سکھا دینا تھا۔“ عباد بھائی بھی ماحول کی کثافت زائل کرنے کی غرض سے بولے۔

”اللہ حافظ بابا!“ حاشر نے بچوں کو پیار کرنے بعد روتی ہوئی ایمان کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

نئی جگہ، نئے لوگ، اجنبی ماحول، اجنبی گھر، اجنبی ہم سفر کچھ بھی تو اس کے مزاج پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ پاکستان سے وہ ایک چیز ہی تو اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ تھی بے حسی۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا اور اس پر پہلے جیسی خاموشی طاری تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ پہلے دن ہی حاشر پر واضح کر دے گی۔

”یہ صرف مجبوری کا بندھن ہے، یہ بابا کی خواہش ہے۔ میں اسے ساری زندگی نبھاؤں گی، میں اس بندھن کو قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی مگر میں تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔ تم اپنے لئے کوئی اچھا سا ہم سفر ڈھونڈ لینا۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں، نہ امنگ، نہ جذبے، نہ محبت بھرا دل... میرے پاس صرف آنسو ہیں، غم ہیں، درد ہیں... زخم زخم دل ہے۔“ وہ نہ جانے کب تک سوچوں میں گم رہتی حاشر کے تیز تیز بولنے کی آواز سن کر وہ باہر آگئی تھی۔ وہ کچن میں مصروف تھا اور شاید فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بولا۔

”یہ لو بابا سے بات کرو اور خبردار میری شکایت نہ کرنا۔“ یہ تنبیہ نہ جانے کیوں کی تھی۔ بھلا اس نے کیوں حاشر کی شکایت کرنا تھی جبکہ اسے فی الحال حاشر سے کوئی شکوہ بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ بابا سے بات کر رہی تھی کہ ولید کا فون آگیا۔ جب وہ فون رکھ کر پلٹی تو حاشر نے آواز دی۔

”میں نے سمجھا کہ تم گونگی ہو مگر تمہاری آواز سن کر میں مطمئن ہو گیا ہوں۔“

”مجھے بولنا آتا ہے مگر میرا بولنے کو دل نہیں کرتا۔“ اس نے آزر دگی سے سوچا۔

”تمہیں کھانا بنانا آتا ہے؟“

”ہوں...“ وہ اپنے ہی دھیان میں گم تھی۔

”تو پھر میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، چلو یہ چکن بنانے میں میری مدد کرو۔ اتنے دن کی مہمان نوازی کافی نہیں۔“ وہ انڈوں کو پھینٹتے ہوئے بولا تو وہ ناگواری چھپاتے ہوئے کوکنگ ریج کے قریب آگئی۔

”چکن کے سلائس پر نمک، مرچ پاؤڈر لگانے کے بعد پنیر کے سلائس بچھاؤ۔ اس پر مشروم رکھ کر اچھی طرح سے موڑ دو، میں آئل ڈال دیتا ہوں کڑا ہی میں، تم انہیں انڈوں میں ڈپ کرنے کے بعد فرائی کر لینا۔ میں اتنے میں شاوور لے آؤں۔“ اسے ہدایات دینے کے بعد وہ کچن سے نکل گیا تھا۔ ایمان گہرا سانس کھینچ کر اس کے لئے مختصر سالنچ تیار کرنے لگی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ نہا دھو کر آگیا تھا۔ اسے ہر کام جلدی جلدی کرنے کی عادت تھی۔ وہ بہت تیز بولتا تھا اکثر ایمان کو بات سمجھنے میں وقت لگتا۔ کچن مختصر سا تھا اور اتنے چھوٹے کچن میں دو فریج پڑے تھے۔ ایک فریج لاک تھا جبکہ دوسرے میں کھانے پینے کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ”تم نے کچھ منگوانا تو نہیں۔“ ایک ہاتھ میں رول پکڑے دوسرے میں پیپسی کاٹن لئے اس نے ایمان سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ نمبر ہے میرا“ اگر ضرورت پڑی تو رنگ کر دینا اور ہاں روڈ کے دوسری طرف مارکیٹ ہے۔ کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی تو لے آنا۔“ اب وہ جاگرز پہن رہا تھا۔ پھر اس نے جیکٹ اٹھائی اور اس کے قریب چلا آیا۔

”رات کو میں دیر سے آؤں گا تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا۔ اکثر خواتین رات کے اندھیرے سے ڈرتی ہیں۔“

”نہیں“ میری زندگی تو ہے ہی رات، بھلا خوف کیوں آئے گا مجھے۔“ ایمان نے محض نفی میں سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

”اوکے“ تم پھر دروازہ لاک کر لو۔“ وہ اک نرم مسکان اچھالتا تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ ایمان تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ دروازہ لاک کر کے وہ اپنے بیڈ روم میں جانے کے بجائے لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے تنہائی میں اپنے ماضی کو سوچنا بہت پسند تھا۔ جب بھی وہ تنہا ہوتی ماضی کی گنی چنی خوشگوار باتیں اس کے ذہن پر دستک دینے لگتیں۔

عمار کے ساتھ منگنی اور نکاح کا درمیانی عرصہ، اس کی بے تحاشا محبت، اس کی خوب صورت باتیں۔ اس کی جذبے لٹاتی آنکھیں، ہمہ وقت ٹھہری لبوں کی مسکان۔ وہ کس قدر بھرپور نوجوان تھا۔ کس قدر خوب صورت شخصیت تھی اس کی۔

پھر اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے پیٹوں سے جکڑا زخم زخم چہرہ آگیا۔ کتنا شدید ایکسیڈنٹ تھا۔ عمار نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ ذرا بھی اس کی پروانہ کی، پلٹ کر نہ دیکھا۔ بس خاموشی سے بغیر کچھ کہے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔

وہ سچ پر بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہ گئی تھی۔ سرخ لہنگا، مہندی سے سجے ہاتھ، آنکھوں میں خوب صورت خواب لئے، ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے، انگ انگ سے پھوٹی مہک میں نہ جانے خون کی بو کہاں سے آگئی تھی۔

دن ڈھل گیا تھا۔ رات غالب آرہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ گیارہ بجے کے قریب ڈور بیل گونج اٹھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ پیروں میں سلپیر اڑے، دوپٹہ درست کر کے دروازہ کھولا۔

”میں جلدی آگیا ہوں، محض تمہاری خاطر۔ ایک دم ہی خیال گزرا کہ کہیں تم خوفزدہ نہ ہو اور کہیں تم پاکستان فون نہ کھڑکا دو کہ میں تمہیں اکیلا، تنہا گھر میں چھوڑ کر خود مارا مارا پھر رہا ہوں۔ حالانکہ جیمز اور جارج آنے نہیں دے رہے تھے اور اینا نے بہت مزے کا اسپگٹھی سوپ بنایا تھا اور میری جیت کی خوشی میں وہ ڈنر دینے کے لئے بھی تیار تھی جبکہ میں گیم کو بالکل اختتام پر چھوڑ کر آگیا ہوں حالانکہ ”کرنلنگ“ کا ایک راؤنڈ اور فائنل راؤنڈ باقی تھا۔ اگلے سنڈے تمہیں بھی لے کر جاؤں گا۔ بڑا انٹر سٹنگ کھیل ہے۔ تم نے کچھ پکایا ہے تو دے دو مجھے بہت سخت بھوک لگی ہے۔“ تیز تیز بولتے ہوئے اس نے جیکٹ اتار کر صوفے پر پھینکی اور خود کارپٹ پر لیٹ گیا۔

ایمان کو پشیمانی نے گھیر لیا۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں پکایا تھا۔ شاید وہ بھی اسی لئے کچھ لے کر نہیں آیا تھا کہ ایمان نے کچھ پکالیا ہوگا۔

وہ تیزی سے کچن کی طرف آگئی تھی۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے فرائیڈ رائس بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ جلدی جلدی چاول نکال کر صاف کیے۔ چکن دھویا۔ پیاز کاٹی اور آلوؤں کے چھوٹے چھوٹے پیس کیے۔ اس دوران غیر ارادی طور پر اس کی نگار بار بار حاشر کی طرف اٹھ رہی تھی۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی کچن میں چلا آیا۔

”کیا بنا رہی ہو اور کب تک بنے گا؟“

”فرائیڈ رائس وڈ چکن، آپ پلزز جائیں، میں ابھی لا رہی ہوں۔“

”اتنے پیار اور نرمی سے کہہ رہی ہو، اسی لئے یہیں رک جاتا ہوں، کہو تو کچھ مدد کروا دوں۔“ اس کے التجائیہ لب و لہجے نے حاشر کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”نہیں، بس میں نے کھانا ریڈی کر لیا ہے۔“



”سوچ لو، ابھی کھانے کے بعد برتن بھی دھونے پڑیں گے۔ کچن بھی سمیٹنا ہوگا۔ تم تھک جاؤ گی، میں تمہاری مدد کروا دیتا ہوں۔“

”میں اتنے معمولی کاموں سے تھکن محسوس نہیں کرتی۔ پاکستان میں آپ کے گھر میں اس سے زیادہ کام کرتی تھی۔“ ایمان نے چکن کو کرسٹل کے باؤل میں نکالتے ہوئے کہا۔

”تم بہت کم گو ہو...“ اتنے دنوں بعد اس کی زبان سے چند لفظ ادا ہوئے تھے۔ اسے تو خود اپنے بولنے پر حیرت ہو رہی تھی۔ ایمان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”میں یہ برتن ٹیبل پر رکھتا ہوں۔“ حاشر نے گلاس چمچے اور پلیٹس اٹھائیں پھر فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی۔

”تم کھانا نہیں کھاؤ گی۔“ وہ کھانا لگا کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تھی جب حاشر کی آواز سنائی دی۔

”میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھاتی ہوں۔“

”آج پہلے کھالو۔“

”میری یہی روٹین ہے۔“

”کبھی کبھی روٹین بدل دینی چاہیے۔ مزاج پر اچھا اثر پڑتا ہے۔“

”میں اپنی عادت نہیں بدل سکتی۔“ اس نے سوچا کہا نہیں۔

”آجاؤ شاباش، پہلے کھانا کھالو۔ ویسے تم اچھا کھانا بناتی ہو۔“ حاشر نے فرائیڈ رائس کھاتے ہوئے بے ساختہ تعریف کی۔ ایمان بغیر کچھ کہے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ بحث کرنا اسے پسند تھا۔

”جب دو افراد بیٹھے ہوں تو انہیں کچھ نہ کچھ بولنا چاہیے۔“ حاشر نے اس کی پلیٹ میں مزید چکن ڈالی۔

”میں زیادہ نہیں بولتی۔“

”زیادہ نہیں، لیکن ضرورت کے مطابق بولنا چاہیے۔“ حاشر نے اپنا کولڈ ڈرنک والا گلاس اس کی طرف کھسکا دیا۔ وہ محض چاولوں میں چمچہ گھما رہی تھی۔

”عمار تو بہت باتونی تھا۔“ وہ اپنے ہی دھیان میں مگن کہہ رہا تھا۔ ایمان کا ہاتھ اک پل کے لئے ساکت رہ گیا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی پہلی مرتبہ حاشر کے منہ سے عمار کا ذکر سنا تھا۔

”اکثر عمار تمہارا ذکر کرتا تھا۔ اسی لئے میں جانتا ہوں کہ تم اتنی خاموش طبع نہیں ہو۔“ ایمان نے ٹھٹک کر حاشر کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”وہ تم سے بہت محبت کرتا تھا۔“ اس نے ایک دم ہی ایمان کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ بے ساختہ سر جھکا گئی۔

”تم بھی عمار سے بہت محبت کرتی تھیں۔“

”میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“ ایمان نے پہلی مرتبہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ کبھی حاشر، عمار کو ڈسکس کرے۔ وہ اپنے اور عمار کے متعلق کچھ بھی سننا گوارا نہیں کرتی تھی۔ حاشر کچھ پل نہ جانے کیا سوچتا رہا پھر اٹھتے ہوئے اچانک بولا۔

”محبت میں بہت وسعت ہے۔ یہ صرف ایک فرد تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔“

☆☆☆

منڈے کو حاشر کے چلے جانے کے بعد وہ معمول کے مطابق صفائی کر رہی تھی جب ڈور بیل بجی۔ ایمان نے دروازہ کھولا تو سامنے بہت ہی خوب صورت انگریز لڑکی کھڑی تھی۔

”کس سے ملنا ہے؟“

”تم سے۔“ بڑی نرم کھنکھاتی آواز میں کہا گیا۔

”کون ہو تم؟“

”اندر تو آنے دو بتاتی ہوں کہ کون ہوں میں۔“ وہ مسکان لبوں پر سجائے خود ہی اندر آکر صوفے پر بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔

”میرا نام اینا ہے۔ میں حاشر کی یونیورسٹی فیلو اور بہت پرانی دوست ہوں۔“

”حاشر نے کبھی بتایا نہیں۔“ ایمان نے کچھ تو کہنا تھا۔

”تم نے کبھی پوچھا نہیں ہوگا۔ ویسے بیویوں کو دلچسپی لینا چاہیے۔ شوہروں کے جاننے والوں میں کون کون ہے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر مسکرائی۔

”میں تمہارے لئے کچھ لاتی ہوں۔“

”ہاں، ضرور میں کافی پیوں گی۔“

”کافی بے تکلف دوست ہے۔“ ایمان نے کافی بناتے ہوئے سوچا۔ پھر ٹرائی

میں چند لوازمات سجا کر لے آئی۔

”ایمان! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“

”ہم لوگ مہمانوں کی خاطر مدارات اسی طرح کرتے ہیں۔“ ایمان کو بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا پڑا تھا۔

”کیا کرتی ہو تم؟“

”مجھے کرلنگ کی بہترین کھلاڑی سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اسپورٹس سے بہت دلچسپی ہے۔ لیکن میں جاب کی وجہ سے کھیل کو پروفیشن نہیں بنا سکتی۔ آج میں نے آفس سے چھٹی کی ہے۔ صرف تم سے ملنے کے لئے۔ سنڈے کو ہمارا فائنل ہے، تم حاشر کے ساتھ ضرور آنا۔“

”میں آؤں گی۔“ اس کا خلوص دیکھ کر ایمان نے ہامی بھر لی۔

”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ اینا نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر اجازت طلب کی۔

”کچھ دیر اور بیٹھو۔“

”نہیں اب میں چلوں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

رات کو جب وہ کھانا ٹیبل پر لگا کر اپنے کمرے میں نماز پڑھنے کی غرض سے گئی اسی پل حاشر کھٹاک سے دروازہ کھولے اندر چلا آیا۔ ایمان کو حاشر کا یوں ناک کیے بغیر اندر آنا سخت برا لگا تھا۔

”کسی کے کمرے میں بغیر اجازت کے نہیں آنا چاہیے۔“

”میں کسی کے کمرے میں نہیں، ایمان کے کمرے میں آیا ہوں۔“ حاشر نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

”میں آپ کی لگتی کیا ہوں۔“ ایمان کی بھنویں تن گئیں۔

”ویری انٹر سٹنگ کونسپن...“ حاشر نے دلچسپی سے ایمان کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یہ تم بابا سے پوچھنا کہ کیا لگتی ہو میری... ویسے ساڑھے تین مہینے سے کس حیثیت سے رہ رہی ہو میرے ساتھ۔“

”میں آپ کو اپنا شوہر تسلیم نہیں کرتی۔“ اس نے سوچ لیا تھا کہ ابھی اور اسی وقت حاشر پر واضح کر دے تاکہ کل کو وہ بحیثیت شوہر کے اس سے کسی بھی قسم کا تقاضا نہ کر سکے۔

”مگر میں تمہیں اپنی بیوی سمجھتا ہوں۔ عملی طور پر مظاہرہ اس لئے نہیں کیا کہ میں تمہیں وقت دینا چاہتا تھا تاکہ تم اس جذباتی دھچکے سے سنبھل سکو۔ تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے۔“

”میں آپ پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ مجھے اس رشتے سے نہ کوئی دلچسپی ہے نہ چاہ، آپ اپنا من پسند لائف پارٹنر چن لیں۔ کسی بھی لڑکی سے شادی کر لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر اس کے ساتھ ساتھ میں اس کاغذی رشتے کو بھی برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ تو پہلے سے ہی اس موقع کی تلاش میں تھی کہ کب یہ ذکر چھڑے اور وہ حاشر پر اپنا موقف واضح کر دے۔



”بہت خوب‘ آپ نے بالا ہی بالا تمام فیصلے کر لیے۔ حتیٰ کہ مجھے شادی کا اجازت نامہ بھی سنا دیا۔ زبردست‘ میں تمہاری عمدہ سوچ کی داد دیتا ہوں۔“ وہ مسلسل اسے سراہتے ہوئے اک پل کے لئے رکا اور پھر بولا۔

”ایمان! رشتے ناتے کچے دھاگے نہیں ہوتے جنہیں پل میں جوڑ لیا جائے یا توڑ دیا جائے۔ تم نہیں جانتیں اس نکاح کے بعد مجھے کس کس کی اور کیا کیا باتیں سننا پڑی ہیں اور مزید میں کسی کو خود پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہتا اسی...“

”ہاں تو اسی لئے میں آپ کو دوسری شادی کی بخوشی اجازت دیتی ہوں تاکہ آپ سے منسلک لوگ خوش ہو سکیں۔“ ایمان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی میں اپنے فیصلوں میں کسی کی رائے کی اہمیت رکھتا ہوں۔ تم سے نکاح اگرچہ بابا کی خواہش تھی مگر مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا۔“

”بہر حال میری زندگی میں مزید کسی رشتے کی جگہ نہیں‘ نہ ہی میں رشتوں کے بوجھ اٹھا سکتی ہوں۔“ ایمان کا انداز ہنوز ضدی تھا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو کھل کر کہو۔“ حاشر نے اطمینان سے کہا اگرچہ وہ جان چکا تھا کہ ایمان اس سے کیا چاہتی ہے۔

”میں... میں اس رشتے کو محض کاغذی حد تک محدود رکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی تو حاشر مسکرا اٹھا۔ نہ جانے یہ مسکراہٹ طنزیہ تھی ای اس کی بچکانہ سی بات پر وہ مسکرایا تھا تاہم ایمان سمجھ نہ سکی۔

”محض پیپر میرج‘ تو مجھے یہ معاہدہ منظور نہیں۔ تم خود کو ذہنی طور پر تیار کرلو‘ اور خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ زندگی بار بار مہربان نہیں ہوتی اور اگر مجھے تمہارے ساتھ پیپر میرج ہی کرنا تھی تو مجھ سا اُلہ کا پٹھا کوئی ہو نہیں سکتا۔“ وہ خود کو خوب خوب کوس رہا تھا۔ ایمان جھنجلا سی گئی۔

”آپ میری بات نہیں سمجھ رہے۔ میں آپ کو بھلا کیا دے سکتی ہوں۔ میرا دل بنجر ہو چکا ہے۔ میری آنکھیں ویران ہیں اب یہ کوئی بھی خواب بننے کے

قابل نہیں۔ نہ جذبے ہیں نہ امنگیں ہیں جو کہ نئی شادی کی ابتداء میں بہت اہم ہوتے ہیں۔ نئی زندگی کی شروعات کے لئے میرے پاس فقط دل کے زخموں اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔“

”بخیر زمینوں پر جب ابر رحمت برستا ہے تو وہ خود بخود نرم ہو جاتی ہیں اور رہی خواب سجانے کی بات تو خواب بننے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ بس کسی خوب صورت شخصیت کو سوچنے کی دیر ہے اور دل کے زخم بھی آہستہ آہستہ سل جائیں گے اور رہے آنسو تو کبھی کبھار رولینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔“ اس نے تو گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ ایمان غصے سے تنتناتی واش روم میں گھس گئی۔ جب وہ وضو کرنے کے بعد باہر نکلی تو حاشر کو ابھی تک کمرے میں موجود پا کر بھنا اٹھی۔

”آپ ابھی تک گئے نہیں۔“

”نہیں۔“ بہت اطمینان کے ساتھ کہا گیا تھا۔

”میں نماز پڑھنا چاہ رہی ہوں۔“

”تو پڑھو میں تمہیں روک تو نہیں رہا۔۔۔ بلکہ میرے لئے بھی نماز پڑھ کے دعا کرنا۔“ اس نے مزے سے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے ایک کتاب اٹھا کر پڑھنا شروع کر دی تھی۔ ایمان کچھ پل سوچتی رہی اور پھر نماز کی نیت کر لی۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ دعا مانگ کر جائے نماز سمیٹ رہی تھی تب اس نے حاشر کی آواز سنی۔

”میرے لئے تو دعا نہیں کی تم نے۔“

”میں نے سب کے لئے دعا کی ہے، یہی میرا معمول ہے۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”میں سب کی نہیں اپنی بات کر رہا ہوں۔“ حاشر اسے مزید بولنے پر اکسا رہا تھا۔ جس میں کسی حد تک کامیابی ہو رہی تھی۔

”آپ بھی سب میں شامل ہیں۔“

”کیا دعا مانگی ہے میرے لئے۔“

”آپ پلیز جائیں، مجھے نیند آرہی ہے۔“

”تو سو جاؤ...“ وہ مسکرایا۔

”میں باہر چلی جاتی ہوں۔“ ایمان زچ ہو اٹھی تھی۔ حاشر مسلسل مسکراتا رہا

اور پھر بولا۔

”کیا آج اپنا آئی تھی۔“

”ہاں“ ایمان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں یہی پوچھنے کے لئے تو آیا تھا۔“ وہ اسے چڑاتے ہوئے گڈ نائٹ بولتا

باہر نکل گیا جبکہ ایمان بند دروازے کو گھورتی رہ گئی۔

☆☆☆

مہر بیگم نے اسے فون کیا تھا۔ تھی نا حیرت کی بات وہ تو خود ابھی تک شاک

کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ مہر بیگم اور اس جیسی

منحوس، سبز قدم، بد بخت، لڑکی سے بات کریں جو کہ اتنی بدنصیب تھی جس

کا شوہر شادی کی پہلی رات ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

بھلا ان تین چار مہینوں میں یہ کیا پلٹ ہوئی کیسے۔ وہ حیران تھی، ششدر

تھی۔ ان کا لہجہ بے حد نرم تھا اور انداز بھی بالکل پہلے سے برعکس۔ اتنی

محبت، اس قدر حلاوت سے بات کر رہی تھیں کہ ایمان بے ہوش ہوتے

ہوتے پیچھے۔

ایمان کو آج سے چند ماہ پہلے والا ان کا رویہ یاد آیا تو وہ گوگو کی کیفیت میں

متلا ہو گئی۔

اسے اپنی عزت نفس اور روح پر لگے گھاؤ کیسے بھول سکتے تھے۔ وہ ان کی

نفرت کو کیسے بھلا سکتی تھی۔ وہ نفرت جو بغیر کسی وجہ کے اس کے حصے میں

آئی تھی۔ انہوں نے تو کبھی یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ان کے بہت پیارے

بیٹے کی پسند ہے جسے وہ بیاہ کر لانے کے محض چند گھنٹے بعد بے آسرا چھوڑ

گیا ہے۔

وہ اس کے ہاتھ کا پکا کھانا کھالیتی تھیں مگر اسے اپنے ساتھ بیٹھانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ سب نے اسے اچھوت سمجھ رکھا تھا گویا اسے کوئی موذی بیماری ہے۔ انابیہ بھابی، زونیہ اور آمنہ آپي اس کے قریب بیٹھنے سے گریز کرتی تھیں۔ وہ تو سہاگنیں تھیں کیونکر ایک ابھاگن کے قریب بیٹھتیں۔ گویا انہیں ایمان کے جراثیم لگ جانے کا خدشہ تھا۔ اس نے زندگی کے دو سال ان سب کی نفرت کے ساتھ گزار دیے۔ اس نازک وقت میں تو اسے ان سب کی ہمدردی اور دلا سوں کی ضرورت تھی مگر اس گھر میں سوائے ذلتوں، نفرتوں کے اسے کچھ نہیں ملا تھا۔

اب محض چند ماہ میں نہ جانے کون سا طلسم پھونکا گیا تھا کہ امی جان کا رویہ اس حد تک بدل گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ انہوں نے اس سے فون پر بات کی تھی۔ اس کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ بابا جدہ چلے گئے ہیں۔

وہ بہت رنجیدہ ہو گئی تھی بابا نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ اس دفعہ ایمان کو ساتھ لے کر جائیں گے مگر اس دفعہ بھی وہ تنہا ہی چلے گئے تھے۔

”میں آؤں گی تمہارے پاس کچھ دنوں کے لئے۔“ فون بند کرنے سے پہلے انہوں نے آخری بات یہی کی تھی۔ ایمان کو حیرتوں کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ کچھ پل وہ یوں ہی ریسبور ہاتھ میں پکڑے کھڑی رہی پھر اس کے ہاتھ ایک اور نمبر ڈائل کرنے لگے تھے۔ کچھ دیر بعد کسی ملازمہ ٹائپ لڑکی نے فون اٹھایا۔ ایمان کو ایک اور حیرت کا جھٹکا لگا۔

”تو کیا بھابی نے کام والی رکھ لی ہے۔“ ایمان کے دل میں اک تیر پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔ اب کیا بھیا ملازمہ افورڈ کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

”کب سے یہاں کام کر رہی ہو؟“

”جی تیسرا مہینہ ہے۔“

”کیا کام کرتی ہو؟“

”سارے کام کرتی ہوں، کپڑے دھوتی ہوں، استری کرتی ہوں، بہترین کھانا پکانے میں بھی ماہر ہوں۔ دیکھتیں تو ذرا میں نے گھر کو کیسے لشکا دیا ہے۔“



وہ کافی باتونی لڑکی تھی۔ ایمان نے گہرا سانس کھینچ کر بھابی اور بچوں کا پوچھا۔  
کچھ ہی دیر بعد ریسپور حمزہ کے ہاتھ میں تھا۔ پھر بسمہ نے فون چھین لیا۔ پیچھے  
سے حماد کی ریں ریں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ وہ بھی پھپھو سے بات  
کرنے کے لئے بے قرار تھا۔

”پھپھو! میرے لئے چاکلیٹس اور کینڈیز لانا۔“ حماد کی توتلی آواز سنائی دی۔  
پھر بسمہ نے گڑیا اور گڑیا گھر لانے کی فرمائش کر دی۔

”پھوپھو! میرے لئے ڈول لانا، بلیو آئز والی اور ساتھ ڈول ہاؤس بھی، جس  
میں ڈول کا بیڈ روم اور کچن بھی ہو۔“

”مجھے میوزیکل باکس چاہیے اور بڑے بڑے کارٹونز والے بیگ بھی۔“ حمزہ  
نے بھی اپنی پسند بتائی۔ اس نے سب کی فرمائشیں نوٹ کر لی تھیں۔ بچوں سے  
بات کر کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اسی اثنا میں بھابی آگئیں۔ کافی دیر اس سے  
باتیں کرتی رہیں۔ کرید کرید کر حاشر کے روئے کے بارے میں پوچھتی رہیں۔  
ایمان نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔

”تو کیا میں ان سب کی نگاہوں میں پھر سے معتبر ہو گئی ہوں۔“

اس نے بے دلی سے فون رکھ دیا تھا۔ کافی دیر وہ غائب دماغی کے عالم میں  
بیٹھی رہی پھر کچن کی طرف آگئی۔ ہمیشہ کی طرح اس کی نگاہ لاکڈ فریج پر  
پڑی تھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے لسٹ اور ہینڈ بیگ اٹھائے دروازہ لاک کر کے  
باہر نکل آئی۔ اس نے کچن کی ضروری اشیاء خریدنی تھیں۔ وہ پہلی مرتبہ گھر  
سے باہر نکلی تھی اسی لئے قدرے حیرانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی  
تھی۔ اسی پل اسے دائیں جانب سے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔  
وہ جو کوئی بھی تھا اشارے سے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ ایمان تھوڑی دیر  
سوچتی رہی اور پھر آواز کی سمت چل پڑی۔ وہ گلاس ونڈوں کھولے سر باہر  
نکالے اسے داخلی دروازے کا بتا رہا تھا۔ ایمان اس کی بات نظر انداز کر کے  
کھڑکی کی طرف آگئی۔

”تم مارکیٹ جا رہی ہو، میری بھی کچھ چیزیں لادینا۔ دیکھو، انکار مت کرنا۔ میرا  
دودھ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ بریڈ بھی نہیں، انڈے بھی ندارد ہیں۔ میں صبح سے

بھوکا بیٹھا ہوں۔ ابھی میں نے دوائی بھی کھانی ہے۔ پلیز یہ چیزیں لادو۔“ وہ بہت التجائیہ لب و لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ایمان کو ترس آگیا۔

”مسز ڈنگ... نے آج پھر چھٹی کر لی ہے اور میں صبح سے ادھر بیٹھا اسی کو کوس رہا ہوں۔“

”اللہ جھوٹ نہ بلوائے مجھے تو آپ پاکستانی لگتی ہیں۔“ اب کے اس نے بڑی رواں اردو میں پوچھا تھا۔ ایمان اثبات میں سر ہلا کر اس کے ہاتھ سے پیسے اور لسٹ پکڑ کر روڈ کر اس کرنے کے بعد مارکیٹ کی طرف آگئی۔ اپنی چند ضروری چیزیں خریدنے کے بعد جوں ہی ایمان نے اس اجنبی کی لسٹ کو بغور پڑھا تو وہ چکرا کر رہ گئی۔

اس بے چارے کا تو تقریباً کچن کا سارا راشن ہی ختم تھا۔ کچھ کوفت تو ہوئی اتنا سامان خریدنے کا سوچ کر مگر اس کی ازلی ہمدرد طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ وہ اس بے چارے کو مایوس کر دیتی۔ آدھ گھنٹہ تو اسے چیزیں خریدنے میں

لگا تھا اور پھر اس کے گھر تک پہنچتے پہنچتے ایمان کا ہمدردی کا بخار اتر گیا۔ اس شدید سردی میں بھی وہ پسینے پسینے ہو گئی تھی۔ وہ کھڑکی میں موجود نہیں تھا۔ مارے کوفت کے اس کا برا حال ہو گیا۔ مجبوراً اسے داخلی دروازے تک آنا پڑا۔ ماتھے پر بل ڈالے چہرے پر ناگواری اور غصہ سجائے اس نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔

ایمان غصے سے بھناتے ہوئے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی نگاہیں وہیل چیئر پر پڑیں اس کا تمام غصہ، کوفت اور جھنجلاہٹ پانی کے بلبے کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ ایمان کا بہت شکر گزار ہو رہا تھا۔ بہت مرتبہ اس نے ایمان کا شکریہ ادا کیا۔

”کوئی بات نہیں، میں نے کون سا پہاڑ سر کیا ہے۔ بس مارکیٹ تک تو گئی ہوں۔“

”یہ کام پہاڑ سر کرنے کے ہی برابر ہے۔ ہر کوئی آپ کی طرح نہیں سوچتا۔ میں صبح سات بجے سے اس کھڑکی میں بیٹھا ہوں اور تقریباً بیس لوگوں کی

گالیاں اور کوسنے سنے ہیں۔ ان میں تین چار لوگ تو میرے جاننے والے تھے ایک میرا پڑوسی تھا جبکہ ایک جمعدار تھا کہ ڈرم سے کوڑا اٹھانے آیا تھا میں نے اس سے بھی یہی التجا کی تھی جواباً اس نے مجھے خوب گھورا اور کہا کہ اپنی ٹانگیں ٹوٹی ہیں۔ خود جاکر لے آؤ، مجھے شدید غصے کے ساتھ بے حد ہنسی بھی آئی۔ اب میں اسے اپنی ٹوٹی ٹانگیں دکھاتا کیسے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بڑے مزاحیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”اوکے، اب میں چلتی ہوں، مجھے ابھی جاکر لنچ تیار کرنا ہے۔“

”نہیں، آپ چائے پی کر جائیں گی۔ دیکھیے میں ابھی دو منٹ میں بنا کر لاتا ہوں۔“

”پلیز، اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ ایمان نے التجائیہ انداز میں کہا تو اس نے وہیل چیئر کا رخ موڑ لیا۔

”آپ اس لئے چائے نہیں پی رہیں کہ مجھے اپنے لنچ میں سے کچھ حصہ نہ دینا پڑے۔“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ ایمان گڑ بڑاسی گئی۔

”ٹھیک ہے میں آپ سے لنچ نہیں مانگوں کا مگر آپ چائے تو پی لیں۔“ اس کے بے پناہ اصرار پر مجبوراً ایمان کو چائے پینی پڑی۔ جب تک وہ چائے بناتا رہا ایمان اس کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ بائیس تیس سال کا بھرپور نوجوان، وہیل چیئر پر بیٹھا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ گندمی رنگت اور کھڑے کھڑے نقوش تھے اس کے۔ بلاشبہ وہ کافی وجیہ تھا۔ ایمان کو فطری سادھ محسوس ہوا تھا اس کی معذوری کا سوچ کر۔

چائے پینے کے بعد وہ اٹھنے لگی تھی جب وہ بے ساختہ بولا۔

”اپنی ملازمہ کے ہاتھ میرے لئے لنچ میں سے بچا کھچا حصہ بھیج دیجئے گا۔ اللہ کی قسم وہیل چیئر پر بیٹھا دعائیں دوں گا۔“

”مگر میرے گھر تو ملازمہ نہیں ہے۔“ ایمان اس کی معصومیت بھری بے تکلفی پر مسکرا اٹھی تھی۔

”تو کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں۔“

”نہیں، اپنے ہزبینڈ کے ساتھ۔“

”اچھا، آپ کے ہزبینڈ کس مزاج کے ہیں؟“

”وہ کیسے بھی مزاج کے کیوں نہ ہوں، آپ کو لچ دینے تو نہیں آئیں گے۔“

ایمان نے مسکان دباتے ہوئے کہا۔

”اوکے، تھینکس اگین۔“

”میں تمہارے لئے بھی لچ میں حصہ رکھوں گی۔“

ایمان نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا تو اس کے لبوں پر ویسی ہی معصومیت  
بھری مسکان ابھر آئی۔

☆☆☆

”دو منٹ، میں ریڈی ہو جاؤں، اپنا تمہیں بہت اصرار سے بلا رہی ہے۔ میں

نے سوچا تم بھی گھوم پھر آؤ۔ ذرا مزاج پر اچھا اثر پڑے گا۔“

ایمان کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوراً جانا پڑا۔ دو جرسیاں ایک موٹا لانگ  
کوٹ اور شال کے باوجود تاحد نگاہ پھیلی برف کو دیکھ کر ہی اسے شدید سردی  
لگنے لگی تھی۔

اس بڑے سے برف سے ڈھکے میدان میں بہت رش تھا۔ بڑے تو بڑے بچے  
بھی اس دلچسپ کھیل کو دیکھنے کے لئے اس ٹھٹھرا دینے والی ٹھنڈ میں آئے  
ہوئے تھے۔ اپنا نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلا کر اپنی طرف بلایا۔ پھر تیزی سے  
برف پر پھسلتی ہوئی اس تک آگئی۔

”میں نے سوچا تم کہیں گرنہ جاؤ...“ وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک پر سکون  
گوشے کی طرف گئی۔ اسی پل جارج اور جیمز بھی ہاتھ میں بڑے بڑے کافی  
کے مگ پکڑے آگئے۔

وہ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ آوازیں تھیں، شور تھا قہقہے اور  
مسکراہٹیں تھیں۔



”کاش کہ ہمارے درمیان عامر بھی ہوتا۔“ اپنا کہنے پر ایک دم ہی ماحول پر افسردگی سی چھا گئی۔ جارج اور جیمز دونوں ہی رنجیدہ ہو گئے تھے۔ جیمز، جارج سے کہہ رہا تھا۔

”عامر نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا، لڑائی تو حاشر کے ساتھ تھی جبکہ اس نے ہمارے ساتھ بھی تمام تعلق توڑ لئے ہیں۔“

”عامر کو کرو کوئٹ کا کھیل کس قدر پسند تھا۔ ہم آخری مرتبہ فرانس میں اکٹھے ہوئے تھے ”کرو کوئٹ“ کا فائنل میچ دیکھنے کے لئے۔“ اپنا کی آنکھیں نہ جانے کیوں نم ہو رہی تھیں۔

”اسے مختلف ممالک کی کرنسی جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے فرینچ

فرانک، کونا، کولون، ریڈ جسٹڈ، خوانجا، اسپٹ کریبشین ڈالر، اسکیوڈو، لیرا اور مالاگاسی فرانک کے علاوہ نہ جانے کتنے ممالک کی کرنسی جمع کر رکھی تھی جو کہ اس بے غیرت ناصر اور اس کی بہن نے چوری کر لی۔“ جیمز تنفّر سے کہہ رہا تھا۔

”یاد ہے تمہیں اسی برف سے ڈھکے میدان میں حاشر اور عامر نے ”برج“ کھیلا تھا اور ہمیشہ کی طرح حاشر جیت گیا تھا اور عامر آکشن برج اور کنٹریکٹ برج دونوں میں بری طرح ہارنے کے بعد برف پر لیٹ گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے کیسے زبردستی اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا۔ نہ جانے اتنا اچھا وقت جلدی کیوں بیت گیا ہے۔“ اپنا کی سبز آنکھوں کے کونے بھگتے جا رہے تھے۔ ایمان نے بغور اس کے خوب صورت چہرے پر پھیلے حزن و کرب کو دیکھا ایک دم ہی اس پر انکشاف ہوا تھا۔

”تو کیا اپنا بھی محبت کے مرض میں مبتلا ہے۔“

کچھ ہی دیر بعد کرلنگ کا کھیل شروع ہو گیا۔ سب لوگوں کی توجہ کھیل کی طرف مبذول ہو گئی۔ اپنا اسے کرلنگ کے رولز کے بارے میں بتانے لگی تھی۔

”ایکپوٹلی یہ اسکاٹ لینڈ کا قومی کھیل ہے اور برف پر پتھروں سے کھیلا جاتا ہے۔ اس میں صرف دو مخالف ٹیمیں حصہ لیتی ہیں اور ٹیم کے کھلاڑیوں کی

تعداد صرف چار ہوتی ہے۔ حاشر لوگ فائنل میں حصہ نہیں لیں گے۔ ان کا چوتھا ساتھی طبیعت کی خرابی کے باعث آ نہیں سکا۔ اسی لیے تو جارج اور جیمز کے منہ لٹکے ہوئے ہیں۔“

”تم کیا میری بیوی کو غلط سلط پٹیاں پڑھا رہی ہو۔“ حاشر، ایمان کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا تو اینا نے منہ بنا لیا۔

”تمہاری برائیاں کر رہی ہوں۔ یہ بتا رہی ہوں اسے کہ تم کتنے خراب ہو۔“

”اسے پتا ہے کہ میں کتنا اچھا، نیک اور شریف ہوں۔“ حاشر نے بہت معنی خیزی سے کہا تھا۔ ایمان نے نگاہیں چرائیں۔

”بہت بورنگ کھیل ہے چلو، جیمز کی جیب ہلکی کرواتے ہیں۔ حاشر کی شادی کی خوشی میں۔“ جارج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد جیمز اور جارج کھانے کی ٹرے اٹھائے چلے آئے۔ یہ ایک خوب صورت شام تھی جس کا اختتام بھی بہت خوشگوار تھا۔ واپسی پر ایمان کا موڈ خود بخود تبدیل ہو گیا۔

گھر آکر اس نے خود کو ان بھاری کپڑوں سے آزاد کیا اور پھر گرما گرم چائے بنا لائی۔ حاشر ٹی وی آن کیے کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ چائے ہاتھ میں لے کر بولا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے چائے کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔“

”میں نے اپنے لئے بنائی تھی، سوچا آپ کو بھی دے دوں۔“ ایمان نے اس کی غلط فہمی رفع کرنا چاہی۔

”کبھی تو چند منٹوں کے لئے خوش ہو جانے دیا کرو۔“

”میں آپ کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ ہرگز نہیں ہوں۔“ وہ بات کو کسی اور رخ کی طرف لے گئی تھی۔ حاشر نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور بولا۔

”تم میری خوشیوں اور سکون کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ رکاوٹ کا عظیم پہاڑ ہو۔ جسے سر کرنا اتنا بھی ممکن نہیں۔ میں تو بس تمہیں تمہاری اور دلی رضا مندی سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ ایمان اس کی اس درجہ بے باکی پر کٹ کر رہ گئی تھی۔ اسے بھول گیا تھا کہ وہ انہیں آزاد فضاؤں کا باسی ہے۔

”تم مجھے کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتے، سنا تم نے“ ایمان کا لہجہ ایک دم ہی کرخت اور آواز بلند ہو گئی تھی۔

”میں ایک منٹ میں تمہیں بے بس کر سکتا ہوں، چڑیا جتنی تو ہو تم اور اکڑتی ایسے ہو گویا پوری ویٹ لفٹر کر سٹینا ہو۔“ حاشر نے انتہائی سختی سے اس کا ہاتھ دبایا تو وہ چلا اُٹھی۔

”مجھے ہاتھ مت لگانا۔“

”کیا کر لو گی تم؟“ حاشر نے چیلنجنگ انداز میں ایمان کی طرف دیکھا تو وہ تنفر سے بولی۔

”یا تمہیں مار دوں گی یا خود مر جاؤں گی۔“

”مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھ پر مر مٹو، تمہاری قبر کے کتبے پر ”محبت کی دیوی“ سنہری حرفوں میں لکھواؤں گا۔“ اس نے واضح ایمان کا مذاق اڑایا تھا۔ وہ چائے ٹیبل پر رکھ کر اس سے دور ہٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ حاشر نے محض شرارت میں اس کے اور اپنے درمیان فاصلے کو پاٹ کر اس کے گرد

بازو دراز کر کے سختی سے دباؤ ڈالا تو وہ غصے کے عالم میں محض پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

”مجھے چھوڑو۔“

”اگر نہ چھوڑوں تو۔“

”میں تمہیں کاٹ لوں گی۔“ وہ نفرت سے چلائی۔

”تم کیا کٹ کھنی بلی ہو جو کاٹ لوں گی۔ یا پھر میرے ولیم میک جتنا زہر ہے تم میں پھر تو مجھے پیٹ میں اکیس ٹیکے لگوانے پڑیں گے۔“ وہ اسے مزید چڑا رہا تھا جبکہ ایمان اس وقت ذہنی اور جذباتی توڑ پھو

کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو رہی تھیں۔ بس غصے کا اک غبار تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

”اگر اپنے نفس کی پیاس بجھانی ہے تو تمہارے لئے عورتوں کی بھلا کیا کمی،  
اینا اور اینا جیسی کئی تمہارے قدموں میں رہتی ہیں صبح شام۔“

”بکو اس بند کرو...“ حاشر نے پہلی مرتبہ چلا کر کہا تھا۔ وہ اس پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا تھا حالانکہ اس لمحے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ مار مار کر اسے لہولہان کر دے مگر اس نے ضبط کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ اسے زور دار دھکا دے کر وہ غصے سے بھناتا اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا جبکہ ایمان پھٹی پھٹی نگاہوں سے بند دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

”تم نے اینا کے متعلق بہت غلط انداز لگایا ہے۔ تم نے اینا کو عورتوں کی کس کیٹگری میں شمار کر رکھا ہے جارج اور جیمز میرے یونیورسٹی کے زمانے کے دوست ہیں جبکہ اینا اور عامر کو تو میں ان دونوں کے بچپن سے جانتا ہوں۔ عامر کے والد میرے تایا کے بہترین دوست تھے۔ ابو ظہبی میں ہم نے ایک طویل عرصہ اکٹھے گزارا ہے جبکہ اینا بھی ابو ظہبی میں ہمارے ساتھ طویل

عرصہ رہی عامر اور اینا مجھ سے دس سال چھوٹے ہیں۔ اینا کے والد فارن منسٹر میں تھے، میں اینا کو ٹیوشن پڑھاتا تھا اور ابو ظہبی میں میری چھوٹی سی اکیڈمی تھی جس میں بیرون ملک سے آئے لوگوں کو عربی، فارسی اور دوسری زبانیں سکھاتا تھا۔ وہ اس وقت گیارہ سال کی تھی۔ میرے توسط سے ہی تو اینا کی عامر سے دوستی ہوئی تھی۔ اور پھر“ وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ پچھلے دو دن سے اس نے ایمان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ ایمان کے نہ بولنے کے باوجود وہ خود بخود اس سے باتیں کرتا رہتا تھا مگر دو دن سے وہ بالکل خاموش تھا اور آج وہ خود بخود اس سے پہلے کی طرح باتیں کرنے لگا تھا۔

”تمہاری سوچ بہت گھٹیا ہے اور مجھے کوئی نازیبا لفظ نہیں سوجھ رہا جو میں تمہارے بارے میں کہوں، تمہاری عمدہ سوچ اور اعلیٰ ذہنیت کی تعریف کروں۔ بہر حال میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پچھلے دو دن سے کیوں تم نے تربوز جتنا منہ بنایا ہے۔ خفا میں نے ہونا تھا الٹا ناراض تم ہو رہی



ہو۔ ایکسیوز تمہیں کرنا چاہیے تھا وہ بھی میں ہی کر دیتا ہوں۔ کیونکہ اس میں فائدہ بھی میرا ہے۔ تم جو دو دن سے نہ میرا ناشتا بنا رہی ہو نہ کھانا دے رہی ہو، اس سے بڑا ظلم اور ناانصافی بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ پلیز اب یہ خود ساختہ ناراضگی ختم کر دو اور مہربانی فرما کر میرے کپڑے بھی پریس کر دینا۔“ وہ بن ٹھن کر کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ شوز پہن کر اس نے موبائل اٹھایا اور پھر دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹا۔

”اور ہاں آج میرے لئے لنچ میں کافی اہتمام کرنا۔ دو دن سے سوکھی ڈبل روٹی تین تین ٹائم کھا کھا کر میں بور ہو گیا ہوں۔“

”او نہہ... کچھ نہیں نہیں بناؤں گی میں، اتنی باتیں سنا گیا ہے۔“ وہ جلتی کلستی دروازہ بند کر کے اندر چلی آئی۔ کپڑے پریس کیے، پھر کچن میں آکر لنچ کی تیاری شروع کر دی۔ چار گھنٹے بعد کچن سے فارغ ہو کر اس نے اپنا کی طرف جانے کا پروگرام بنا لیا۔ غصے کے عالم میں نہ جانے اس نے کیا کچھ کہہ ڈالا تھا اب اپنی کہی گئی باتوں پر پشیمان ہو رہی تھی۔

اینا گھر میں ہی تھی اور فلو سے بے حال چھینک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئی۔

”تم نے بہت اچھا کیا کہ آگئی ہو۔ میں بھی سخت بوریت محسوس کر رہی تھی۔“

”میں تمہاری بوریت دور کرنے کے لئے ہی آئی ہوں۔“ ایمان نے بھی خوش دلی سے کہا۔

”اپنے سڑے ہوئے ہزبینڈ کو بھی لے آنا تھا۔“

”وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں مجھ ناچیز کو کچن میں گھسے رہنے کا آرڈر دے کر چلے گئے ہیں۔“

”ہاں... ایمان! مجھے تم ایشین لیڈیز کی یہی بات بہت پسند ہے۔ پتا ہے وہاں ابو ظہبی میں حاشر کی تائی امی بہت اچھی کوکنگ کرتی تھیں اور مزے مزے کے کھانے بنا کر اکیڈمی بھیجتی تھیں۔ وہ بہت کیئرنگ لیڈی تھیں بہت سوفٹ اور لونگ بالکل تمہارے جیسی حاشر کی اصل ماما مجھے اچھی نہیں لگتیں بہت

روڈ ہیں وہ جبکہ بابا بہت نائس ہیں۔ حاشر کو اپنے بابا سے بہت محبت ہے۔ وہ ان کی ہر بات مانتا ہے۔“ ایسا مزے سے بول رہی تھی اور اسی کوشش میں اس کے گلے میں سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

”تم نے کچھ کھایا ہے؟“ اچانک خیال آنے پر ایمان نے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”نہیں یار بخار کی وجہ سے دل نہیں چاہ رہا۔“

”تو میڈسن تو لینی تھی نا، اچھا میں تمہارے لئے کچھ بنا لاتی ہوں۔“ ایمان نے خلوص سے کہا تو وہ خوشدلی سے سر ہلانے لگی۔

”سوپ بنا لاؤں۔“ جاتے جاتے ایمان نے پلٹ کر پوچھا۔

”ہاں نو ڈلز والا۔“ وہ ایسا کے لئے سوپ بنا کر لائی تو ایسا کو میگزین پڑھتے پایا۔ اسے دیکھ کر اس نے میگزین رکھ دیا تھا۔

”تم اپنے لئے نہیں لائیں۔“

”بس ایسے ہی موڈ نہیں ہے۔“

”ایک بات پوچھوں، براتو نہیں لگے گا تمہیں، کیونکہ سوال کافی پرسنل سا ہے۔“ ایسا نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا تو ایمان نے خفگی سے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا تمہاری اور حاشر کی لو میرج ہے؟“

”نہیں تو...“ ایمان قدرے چونکی۔

”تم نے کیسے اندازہ لگایا۔“

”بس ایسے ہی خیال گزرا تو میں نے سوچا تم سے پوچھ لوں۔“

”تم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ رکھا تھا؟“ ایسا کے اگلے سوال نے اسے سوچ میں مبتلا کر دیا تھا کہ اسے تفصیل بتائے یا نہیں۔

”نہیں...“ وہ مختصر بولی۔

”ایمان! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟“

”محبت...“ وہ زیر لب بڑ بڑائی اور پھر دھیرے سے گویا ہوئی۔

”میں نے محبت نہیں عشق کیا تھا۔“

”کیا تم نے بھی کسی نے محبت کی تھی۔“

”ہاں...“

”یقیناً“ حاشر ہوگا، تم دونوں کی شادی کے بعد وہ ہر وقت تمہاری باتیں کرتا

تھا۔ اس کے بابا نے حاشر کو تمہارے بارے میں سب بتایا تھا۔ ہم حاشر کو

بہت لکی سمجھتے ہیں۔“ وہ خود ہی مزید بتانے لگی تھی۔ ایمان کچھ پل اینا کی

طرف دیکھتی رہی اور پھر سنجیدگی سے بولی۔

”مجھے لگتا ہے کہ اینا بھی کسی کے عشق میں گرفتار ہے۔“

”ہاں...“ وہ بغیر جھجکے بولی۔

”میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ خوش قسمت کون ہے۔“

”عامر...“ وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔

”کون عامر؟ وہ ہی جو تمہارا اور حاشر کا مشترکہ فرینڈ تھا پھر کسی وجہ سے تم

لوگوں کی ناراضگی ہو گئی تھی۔“

”ہاں... وہ ہی عامر ہے جسے میں میں چاہتی ہوں۔ لڑائی تو ہماری بعد میں ہوئی

تھی۔ دراصل وہ پہلے ہی ہم سے خفا خفا رہنے لگا تھا۔ اس حادثے نے اسے

ساری دنیا سے ناراض کر ڈالا تھا۔“ وہ بھرائی آواز میں بول رہی تھی۔

”کیا تم نے اسے نہیں بتایا کہ تم اس سے پیار کرتی ہو۔“

”اسے سب پتا تھا۔“ اینا نے آنسو رگڑ رگڑ کر صاف کیے اور پھر بولی۔

”اس نے کہا اینا تم مسلم نہیں ہو، حاشر نے کہا اینا اسلام قبول کر لے گی

مگر وہ پھر بھی نہیں مانا۔ دراصل وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے یاسیت

کے دورے پڑنے لگے تھے۔ وہ تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ اسے محفلوں سے نفرت

ہو گئی تھی۔ کچھ حاشر کے رویے نے اسے مزید تنہا کر دیا تھا۔ حالانکہ میں جانتی

ہوں مجھے یقین ہے کہ حاشر کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ عامر ایسا ہرگز نہیں ہے

مگر میں نے پھر بھی حاشر کا ساتھ دیا تھا۔ حاشر نے مجھے بھائیوں والا مان دیا۔

مجھے بہت عزت اور محبت دی۔ پھر میں حاشر کا ساتھ کیسے نہ دیتی۔“ اس کی الجھی الجھی باتیں ایمان کے سر پر سے گزر گئی تھیں۔ ایمان کافی دیر مزید بیٹھی رہی اور پھر اپنا کے روکنے کے باوجود چلی آئی اس نے مارکیٹ سے کچھ ضروری چیزیں خریدنا تھیں۔

مختصر سی شاپنگ کرنے کے بعد وہ جوں ہی روڈ کراس کر کے ترتیب سے بنے ولاز کے قریب سے گزری تو وہ ہی مانوس سی آواز سنائی دی۔ ایمان نے مڑ کر دیکھا، اس دن کی طرح آج بھی وہ اسے اشارے سے بلا رہا تھا۔ ایمان نہ چاہتے ہوئے بھی آگئی۔

”میں اتنے دنوں سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا مگر آپ یہاں سے گزری نہیں۔“ اس نے بڑے اپنائیت بھرے انداز میں شکوہ کیا تھا۔

”کیوں کیا مسز ڈنگ آج بھی چھٹی پر ہیں؟“

”ارے نہیں تو... اب وہ باقاعدگی کے ساتھ آتی ہیں۔“

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”بس گزر رہی ہے۔“ وہ رنجیدگی سے بولا۔

”اتنی مایوسی اچھی نہیں، ینگ بوائے۔“

”آپ اندر آئیں نا۔“ وہ اتنے اصرار سے بلا رہا تھا۔ ایمان کچھ سوچتے ہوئے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اسے یہ مایوس، روٹھا روٹھا سا اداس لڑکا بہت اچھا لگا تھا۔ اس لئے وہ اکثر اس کی تنہائی کے خیال سے اس کے گھر چلی جاتی تھی۔ اس کی عادتیں بہت اچھی تھیں اور مزاج بھی بہت نرم تھا۔

ایمان آج بھی اس سے ملنے کے بعد گھر آئی اور آتے ہی ٹی وی آن کر لیا۔ حالانکہ اسے ٹی وی سے دلچسپی نہیں تھی۔

اچانک ہی ٹی وی پر پٹی چلنے لگی۔



”نامور دانشور، مفکر اور ادیب محمد سجاد حسین مدینہ میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پاگئے۔ انہیں مدینہ میں ہی سپرد خاک کیا جائے گا۔“ ایمان پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی بے ساختہ چیخیں لبوں سے آزاد ہوئیں اور پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ وہ اسے تسلیاں اور دلا سے دے رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا۔ صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ جبکہ خود حاشر کی آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔

”مجھے ابھی پہنچنا ہے سعودی عرب، تم یہاں رہو گی۔ اپنا تمہارے پاس آجائے گی۔“ حاشر اسے بتا رہا تھا۔

”میں بھی جاؤں گی۔“ اس نے مچل کر کہا۔

”تمہارا پاسپورٹ بننے میں ٹائم لگ جائے گا۔ تم یہیں رہو اور ان کی مغفرت کے لئے دعا کرو۔“ وہ اسے مزید ہدایات دے کر چلا گیا تھا۔ ایمان نے پاکستان فون کیا تو وہاں بھی کہرام مچا تھا۔ کسی سے بھی فون پر بات نہ ہو سکی۔ وہ سب رنجیدہ تھے افسردہ تھے۔ غمزدہ تھے۔

تین دن بعد حاشر کی واپسی ہوئی تھی۔ ایمان اسے دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ حاشر کے آنسو بھی بے آواز بہہ رہے تھے۔

”میں عمار کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا، میں بابا کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا پاکستان سے سب پہنچ گئے تھے ایک میں ہی دیر سے پہنچا ہوں۔ میں نے اپنے بھائی کا بھی چہرہ نہیں دیکھا اس وقت میں عمرہ ادا کر رہا تھا۔ میں کس قدر بد نصیب ہوں۔“

”مجھے یقین نہیں آتا، بابا ہم ہم سے ملے بغیر چلے گئے۔“ وہ تھک کر نڈھال ہی صوفے پر ڈھے گئی تھی۔

بابا کی اچانک وفات نے امی کو بھی توڑ پھوڑ دیا تھا۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگی تھیں۔ حاشر نے انہیں کچھ دنوں کے لئے اپنے پاس بلا لیا تھا تاکہ ان کے ذہن اور مزاج پر اچھا اثر پڑے۔

وہ بہت کم گو ہو گئی تھیں۔ انہوں نے لوگوں سے ملنا ملانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ایمان بھی امی کو لینے حاشر کے ساتھ ایئرپورٹ گئی تھی۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی پہلی بات یہی کی۔

”ایمان! تم تو بہت خوبصورت ہو گئی ہو۔“

ایمان کو ہنسی آگئی تھی۔ فطرت انسانی کبھی بدل نہیں سکتی۔

گھر آنے کے بعد ایمان نے فٹافٹ کھانا لگایا۔ امی حاشر سے کہہ رہی تھیں کہ ایمان بہت اچھا کھانا بناتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ امی نے کھانا کھا لیا تو وہ ان کے لئے چائے بنالائی۔

”ایمان کا بستر کہاں لگاؤں گی۔“ برتن سمیٹتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہی

تھی۔ یہ فلیٹ صرف دو بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ حاشر کے زیر استعمال تھا اور دوسرے میں وہ سوتی تھی۔ اب اسے امی کے لئے اپنا کمرہ چھوڑنا تھا۔ وہ ان کا بیڈ درست کر کے نئی بیڈ شیٹ بچھانے کے بعد باہر آئی تو امی بھی تھکن کی وجہ سے سونے کے لئے اٹھ گئی تھیں۔ جاتے جاتے پلٹیں۔

”ایمان! ایک جگہ پانی کا اور گلاس لے آؤ۔“

”جی اچھا امی۔“ وہ تابعداری سے سرہلاتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ حاشر شاید باہر نکلا ہوا تھا۔ اس نے یہی موقع غنیمت جانا اور بہت اطمینان کے ساتھ حاشر کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ امی پر کچھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بہت مشکل سے اس کا یہ مقام بحال ہوا تھا اب وہ ایک مرتبہ پھر اپنی عزت نفس کو مجروح ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

وہ مہر بیگم پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ بہت خوشگوار ازواجی زندگی گزار رہی ہے۔

رات کو حاشر کافی دیر بعد واپس آیا تھا۔ وہ اپنے ہی دھیان میں مگن دروازہ کھول کر اندر آیا تو ایمان کو اپنے بیڈ پر لیٹے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کچھ پل بعد اسے حقیقت کچھ سمجھ آگئی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر لائٹ آن کی اور پھر اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

”یہاں کیوں سو رہی ہو؟“

”تو پھر اس ٹھٹھرا دینے والی سردی میں کہاں جاؤں۔“

”یہ تمہارے مسئلہ ہے، اٹھو میرے بیڈ سے۔“ ایمان نے بے چارگی کے عالم میں حاشر کی طرف دیکھا اور پھر نو سیٹر صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

”تم میرے کمرے میں رہو گی تو مجھے نیند نہیں آئے گی۔“ حاشر نے مزید اسے بتایا۔

”تو کہا جاؤں میں۔“ وہ تنک کر بولی۔

”جہاں پہلے سوتی تھی۔“

”مجھے یہیں سونا ہے۔“

”اچھی زبردستی ہے۔ چلو، لائٹ آف کر دو۔“

”خود کر لیں، میں نے تو نہیں آن کی۔“ وہ غصے سے بھناتے ہوئے بولی تھی

اور پھر سمٹ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد حاشر نے اسے آواز دی۔

”مجھے ترس آرہا ہے تم پر، ادھر آ جاؤ۔“

”مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا کروں رحمدل بندہ ہوں، تمہیں بے آرام دیکھ کر مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ چلو ضد نہ کرو اور ادھر آ جاؤ۔“

”نہیں آتی پھر...“ وہ تنک اٹھی۔

”سردی میں مرنا ہے کیا؟“

”مر جاؤں تو بہتر ہے۔“

”اتنی مایوسی...“ اس نے مزید ایمان کو چڑایا۔

”آپ چپ نہیں رہ سکتے۔“

”پاس آ کر کہو۔“ ایمان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ حاشر اٹھ کر اس کے

قریب آ گیا۔

”ایمان ڈیر! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ بیڈ پر آجائیں۔“ ایمان نے بے بسی کے عالم میں حاشر کی طرف دیکھا اور پھر تکیہ اٹھا کر بیڈ پر آگئی۔

”مجھے امی کو بہت پہلے بلا لینا چاہیے تھا۔“ حاشر اس کے کان کے قریب گنگنایا تھا۔ ایمان بے بسی کے احساس سے لب بھینچ کر رہ گئی۔

”کچھ دنیا داری کے تقاضے ہوتے ہیں جنہیں نباہنا پڑتا ہے۔“

”اور کچھ دل کے تقاضے بھی ہوتے ہیں، جنہیں آپ نباہنا نہیں چاہتیں۔“ وہ بلا کا حاضر جواب تھا۔ ایمان کو عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ قدرے سمٹ کر بیڈ کے کنارے سے لگ گئی۔

”کھسکتے ہوئے کہاں جا رہی ہو کیا نیچے گرنا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ گھبرا کر بھینچی آواز میں بولی تھی۔

”کہا ٹھیک ہوں... ذرا قریب ہو کر لیٹو، مجھے چھوت کی بیماری نہیں۔“ حاشر نے سہولت سے اس کے بازو کو دبوچ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

”پلیز حاشر! کیا کر رہے ہیں۔“ وہ کپکپاتی آواز میں بولی تھی۔ حاشر نے اس کے سیاہ ریشمی بالوں میں انگلیاں پھنسا کر جھٹکا دیا۔ وہ اس کے بہت قریب آگئی تھی یوں کہ حاشر کی گرم سانسیں اس نے اپنی گردن پر محسوس کیں۔ اس کا دل پہلو میں دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے بہت سہولت سے ایمان کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر تمام الفاظ نہ جانے کہاں کھو گئے تھے اور زبان میں گویا لکنت آگئی تھی۔

”اس بنجر دل کو پھر سے آباد کرلو، ان خوفزدہ ہرنی جیسی آنکھوں میں کچھ نئے خواب سجالو۔ میرے اپنے اور اپنے ہونے والے بچوں کے لئے زندگی ایک شخص پر ختم نہیں ہو جاتی۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ کچھ زندہ لوگوں کی بھی خواہشات ہوتی ہیں۔ بھول جاؤ ماضی کو اپنے حال کی طرف توجہ



”دو“ زندگی اسی کا نام ہے۔ دکھ، غم اور خوشیوں کا سنگم ہی اصل زندگی کی خوبصورتی ہے۔

میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا کہ تم مجھ سے محبت کرو، مگر میں یہ ضرور چاہوں گا کہ تم نارمل زندگی جیو۔ اک خوشگوار ازواجی زندگی گزارو، تم نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی بے سکون کر رکھا ہے۔ اس بستر پر تنہا لیٹے میں نے کتنی ہی مرتبہ تمہاری موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ میری خواہش تھی تم خود چل کر اپنی دلی رضا مندی کے ساتھ اس کمرے تک آؤ۔ اگرچہ جس طرح سے بھی سہی تم آئی تو ہو اور میں تمہیں بہت محبت دوں گا، بہت چاہوں گا تمہیں میری محبت سے کہاں تک بھاگو گی۔ آخر آنا تو میری پناہوں میں ہے نا۔ تم عمار کو بھول جاؤ گی۔“ حاشر نے اس کی گرم پتی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے تھے۔ وہ اسے چاہ رہا تھا، سراہ رہا تھا، معتبر کر رہا تھا۔

”عمار...“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں رو رہی تھی۔

...☆☆☆...

”نہ جانے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔ تین سال ہو گئے ہیں۔ ابھی تک زونہ کی گود خالی ہے۔ کم از کم تم ہی خوشخبری سنا دو۔“ ایمان نے شرم کے مارے سر جھکا لیا تھا۔ جبکہ حاشر کا گویا پسندیدہ ٹاپک چھڑ چکا تھا۔ وہ مسلسل ماں کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

”کسی ڈاکٹر کو چیک کروالینا تھا ایمان۔“

”جی امی...“ وہ دبی آواز میں بولی تھی۔

”ابھی فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ ایمان کی لٹکی صورت دیکھ کر حاشر نے ماں سے کہا تو وہ خفا ہو گئیں۔

”کیوں ضرورت نہیں، بچے تو گھر کی رونق ہوتے ہیں۔“

”بچوں کی بات نہیں، ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کی بات کر رہا ہوں۔“

وہ فریج کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کچھ ہے تو نہیں، بہت کچھ ہے۔ کیا کھائیں گی۔“ وہ فروٹ باسکٹ اٹھالایا

تھا۔ ایمان کے ساتھ ساتھ مہر بیگم بھی مسکرا دیں۔

”امی! اینا نے آپ کو انوائٹ کیا ہے۔“

”نہ میں نہیں جاتی، نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے ہو۔ میرے تو پلے کچھ نہیں پڑتا۔“

”اچھا، آج ڈاکٹر کے پاس تو چلیں گی نا۔“

”مجھ سے نہیں دوائیاں کھائی جاتیں۔“ انہوں نے بے زاری سے کہا اور پھر

اریبہ اور کاظم کو یاد کرنے لگیں۔ پندرہ دنوں میں نہ جانے کتنی مرتبہ وہ

اپنے پوتے اور پوتی کو یاد کر چکی تھیں۔

”میرا تو بچوں کے لئے بہت دل اداس ہو رہا ہے۔“

”اب آپ کے لئے اگلے سال تک کوئی نہ کوئی انتظام کر رکھیں گے۔“ حاشر

نے انہیں تسلی دی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ انہوں نے صدق دل سے دعا کی۔

امی محض پچیس دن رہ کر ہی بور ہو گئی تھیں۔ وہ بہت بے چین تھیں گھر

جانے کے لئے۔ ایمان کے بے حد اصرار پر بھی وہ مزید نہیں رک رہی

تھیں۔ ایمان نے امی کے ہاتھ سب کے لئے بہت سے گفٹس بھجوائے تھے

حمزہ، حماد اور بسمہ کے لئے بھی تحفے بھیجے۔ وہ آئی تین ماہ رہنے کے لئے تھیں

مگر ایک مہینہ بھی نہیں رہ سکیں۔

انابیہ بھابی نے شکریہ کا فون بھی کیا تھا البتہ زونیہ اور آمنہ آپی نے ایسی کوئی

زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ امی کے جانے کے تیسرے دن ولید آگیا تھا۔ وہ

اپنے آفیشل کام کے سلسلے میں آیا تھا۔

ایمان کے پوچھنے پر اس نے صاف صاف بتادیا تھا کہ زونیہ بانجھ ہے۔ اس

فطری سادکھ تھا جس نے ایمان کو اپنے لپیٹ میں لے لیا۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیسے افسوس کا اظہار کرے۔

ولید نے حاشر کو بھی بتایا تھا اسی لئے وہ رات کو کافی چپ چپ تھا۔ یہ ایسی کمی تھی جو کسی بھی صورت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

ولید کے جانے کے بعد ایمان ایک مرتبہ پھر سامان سمیت اپنے کمرے میں شفٹ ہو چکی تھی۔ حاشر اس کی چالاکی پر سخت ناراض تھا۔ اسی لئے تو دن میں بیس بیس مرتبہ فون کر کے اسے دھمکاتا تھا۔

”ابھی فون کر کے بتاتا ہوں امی کو کہ آپ کی موجودگی میں محض ڈرامہ کر رہی تھی یہ۔“ ایمان اس کی باتیں اور دھمکیاں سن کر نظر انداز کر دیتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ حاشر کبھی بھی ایسا نہیں کرے گا۔

”تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔“ رات کو وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی جب حاشر کی آواز سنائی دی۔

”کس بات کا غرور ہے، کیوں اتنی اکڑ ہے تم میں۔“

”غلط فہمی ہے آپ کی، مجھ ناچیز میں کیسی اکڑ، کیسا غرور۔“ وہ تلخی سے بولی تھی۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہارے عشق میں مرا جا رہا ہوں۔ نہیں رہ سکتا میں تمہارے بغیر، تم مجھے لفٹ نہیں کرواؤ گی تو میں گیسن، سینڈی، وکٹوریہ، فارس اور کیزل کم کے صحراؤں کی خاک چھاننے نکل جاؤں گا یا پھر مس سپی، وانگ زے کیانگ، وولگا ہانگ ہو، ارل، اور نیل کے دریاؤں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں گا۔ تو میڈم یہ آپ کی بھول ہے۔ آپ جتنا میری عزت نفس کو مجروح کرنا چاہتی تھیں کر چکی ہیں۔ میں مزید خود کو جھکانا نہیں چاہتا۔“ اس نے بے حد طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ ایمان نے آنسو بھری آنکھوں سے حاشر کی طرف دیکھا اور اس کا دل موم کی طرح پگھل گیا۔

”کم از کم مجھے اس طرح نہ دیکھا کرو، گھائل کر کے رکھ دیتی ہو، اتنی کوششوں سے تو میں نے خود پر غصہ طاری کیا تھا۔ سارے موڈ کا ستیاناس کر دیا ہے۔“ ایمان کے آنسو روانی کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ حاشر کو پشیمانی نے گھیر لیا۔

”پلیز ایکی!“ وہ سرعت سے اس کے قریب آیا۔

”کیوں رو رہی ہو“ میں نے کون سا آتش فشاں پہاڑ تمہارے سر پر پھوڑا ہے۔ پلیز خاموش ہو جاؤ۔“

”میری طبیعت خراب ہے مگر آپ کو کیوں احساس ہوگا۔“

”کیا ہوا ہے طبیعت کو“ بیمار ہوں تمہارے دشمن چلو آؤ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ حاشر نے سرعت سے اس کا ہاتھ تھاما، نبض ٹٹولی اور پھر گاڑی کی چابیاں اٹھالیں۔

”آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”اس بیڈ روم میں کیا شفا کا تعویذ رکھا ہوا ہے؟“

بہت حیرانی کے عالم میں دریافت کیا گیا تھا۔ ایمان نے جھنجھلا کر حاشر کی طرف دیکھا اور پھر لاؤنج میں صوفے پر لیٹ گئی۔ اسے پچھلے دو دن سے بخار تھا۔ ابھی بھی سر بری طرح سے چکرار رہا تھا۔

”کیا تیمارداری کروانے کا ارادہ ہے۔“ وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”سر دباؤں؟“

”نہیں...“ وہ بھرائی آواز میں بولی تھی۔

”تو پھر گلا دباؤں؟“

”دبا دیں...“ حاشر نے مسکراتے ہوئے اس کی گداز گردن پر ہاتھوں کا دباؤ ڈالا۔

”پلیز حاشر! مجھے کچھ دیر آرام کرنے دیں۔“ اس نے التجائیہ لب و لہجے میں کہا۔

”اوکے“ پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں پھر آرام کر لینا۔“ ایمان گہری سانس کھینچ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

☆☆☆



”اتنے دنوں بعد میری یاد آئی ہے۔ اب بھی نہ آتیں۔“ ایمان نے جوں ہی لاؤنج میں قدم رکھا اس کی ناراض ناراض آواز سنائی دی۔

”اصل میں پہلے مہمان آگئے تھے پاکستان سے پھر میری طبیعت خراب ہوگئی تھی، ابھی بھی ٹھیک نہیں ہوں مگر پھر بھی آگئی ہوں۔“

”بہت احسان کیا ہے آپ نے میری ذات پر“

”عامر! ایک تو تم ناراض بہت جلدی ہو جاتے ہو۔“

”اتنے دن ہو گئے ہیں کھڑکی کے ساتھ روز چپک کر بیٹھتا ہوں... اب آئی

ہیں آپ۔“ وہ خفا خفا سا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”میں آپ کو آپنی کہتا ہی نہیں سمجھتا بھی ہوں۔ مگر آپ اچھی بہن ہر گز نہیں ہیں۔“

”تنہا رہ رہ کر اتنے چڑ چڑے ہو گئے، اسی لئے تو کہتی ہوں کہ شادی کرلو۔“

”بھلا میرے ساتھ کون کرے گا شادی۔“

کیوں تم میں کیا کمی ہے۔“ ایمان نے خفگی سے کہا۔

”اس سے بڑی کیا کمی ہو سکتی ہے۔“ عامر نے اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا۔

”لوگوں کو اس سے بڑے بڑے صدمات بھی پہنچتے ہیں مگر جینا تو پڑتا ہے۔ تم اللہ کا شکر ادا کیا کرو جس نے تمہیں دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔“ ایمان اسے نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

”خون کا رشتہ تو کوئی تھا نہیں، جنہیں اپنا سمجھا تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔“

”جو روٹھ جائے اسے منا لینا چاہیے۔“

”میں کیوں مناتا اسے، کیوں صفائیاں پیش کرتا اپنی۔ وہ مجھے جانتا تھا میری

رگ رگ سے واقف تھا پھر بھی اس نے میرا یقین نہیں کیا۔ ان جھوٹے

لوگوں کو اہمیت دی اور اس کی وہ لومڑی سی بہن، مجھ پر الزام لگاتی رہی

تھی۔“ وہ غصے سے بھنا اٹھا تھا۔

”چلو تم حاشر سمیت سب سے ناراض ہو جاتے مگر اپنا کیا قصور تھا۔“

”وہ بھی مجھے جھوٹا اور بے ایمان سمجھتی تھی۔“

”نہیں وہ تمہیں ایسا نہیں سمجھتی۔“ ایمان نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ نہیں جانتیں آپ! یہاں کے لوگ بہت منافق ہیں۔“

”مگر حاشر اور اپنا ایسے نہیں ہیں۔“

”اپنا سے آپ مل چکی ہیں، لیکن حاشر کی اتنی فیور کیوں کر رہی ہیں۔“ عامر نے الجھ کر سوال کیا تو ایمان مسکرا اٹھی۔

”میں حاشر کی بیوی ہوں۔“

”کیا...“ عامر چلا اٹھا تھا۔ اس کی حیرت کسی طور کم نہیں ہو پارہی تھی۔ ”آپ

نے مجھے کبھی بتایا نہیں کہ آپ اس کمینے اور ذلیل شخص کی بیوی ہیں۔ آپ

اتنی اچھی ہیں بھلا اس کی بیوی کیسے ہو سکتی ہیں۔“ وہ بے یقینی کے عالم میں

کہہ رہا تھا۔

”اب بات کھل چکی ہے تو مجھے بتا دیں کہ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں وہ ہی

عامر ہوں جس کی داستان اپنا نے آپ کو سنائی تھی۔“

”بہت ہی گھامڑ ہو تم عامر! ڈرائنگ روم میں اتنی بڑی بڑی تصویریں لگا

رکھی ہیں تم نے حاشر اور اپنا کی، اور میں الحمد للہ دیکھ سکتی ہوں اور میری

آئی سائیڈ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”او... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ وہ ہونق پن سے بولا۔

”تم سوچتے کم ہو اور جلتے زیادہ ہو۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ اس نے فوراً ہی اتفاق کر لیا تھا۔ ایمان کافی دیر بعد گھر

آئی تو اپنا کو موجود پایا۔

”تم کہاں سے راستہ بھول آئی ہو۔“ اپنا نے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ اضطراب

کے عالم میں انگلیاں چٹختی رہی۔

”کیا بات ہے اپنا! تم پریشان دکھائی دے رہی ہو۔“

”اصل میں مجھے حاشر نے آج ہی بتایا ہے میں نے سوچا خود جا کر مبارک باد دوں۔“ ایسا جس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی ایمان سمجھتے ہوئے شرمیلی سی مسکان لبوں پر سجا کر بولی۔

”ایک تو حاشر بھی نہ۔“ جب سے حاشر کو اس کے پریگنٹ ہونے کی خبر ملی تھی اس نے فرداً فرداً پاکستان میں سب کو فون کر کے بتایا تھا۔ بس اعلان کروانے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

”اینا! تم کیوں پریشان ہو؟“ ایمان کے پوچھنے پر وہ سنجیدگی سے بتانے لگی تھی۔

”جارج نے مجھے پرپوز کیا ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“

”مگر میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”تم عامر کی وجہ سے انکار کر رہی ہو۔“

”ایک بات یہ بھی ہے مگر جارج کو انکار کرنے کی وجہ کچھ اور ہے۔“ وہ اسی طرح اضطراب انداز میں بولی تھی۔

”کیا وجہ ہے۔“

”مم... میں نے آج سے تین سال پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔“

”کیا یہ سچ ہے۔“ ایمان نے فرط مسرت سے اس کے ہاتھ چوم لئے۔

”ہاں...“ وہ مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

”تمہیں اسلام کیسا مذہب لگا۔“

”بہت ٹھنڈا میٹھا روح کو سرشار کر دینے والا۔“

”تم کیا پہلے کر سچنیں تھی؟“

”ہاں... مجھے رسالت محمدیؐ کی جو خصوصیات ہیں مثلاً عمومیت، جامعیت، کامیات، ہمہ گیریت نے بے حد متاثر کیا ہے۔ میں جان گئی ہوں کہ اسلام ہی سچا دین ہے اور القرآن ہی ایسی کتاب ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں،

قرآن مجید جس زبان میں نازل ہوا وہ ایک زندہ زبان ہے، قرآن مجید ایک عالمگیر کتاب ہے اس کا پیغام آفاقی ہے اس سے زیادہ جامع کتاب نہ آج تک نازل ہوئی ہے اور نہ کسی پر نازل ہوگی۔ تم نہیں جانتیں ایمان میں نے قرآن پاک کے تراجم بے شمار زبانوں میں پڑھے ہیں۔ البانوی، اطالوی، فارسی، لاطینی، ڈینش سربین، اور پوش مگر عربی زبان میں قرآن پاک پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ میں بہت مطمئن ہوگئی ہوں۔ مجھے میری زندگی کا مقصد مل چکا ہے۔“

”اینا! تم نے مجھے بے پناہ خوشی سے نوازا ہے، مگر مجھے افسوس ہے کہ حاشر نے اتنی بڑی خوشخبری مجھ سے چھپائی۔“

”حاشر کو میں نے ہی منع کر رکھا ہے۔ میری کچھ مجبوریاں تھیں۔“ وہ اب اتنی کنپٹیاں دبا رہی تھی۔ ایمان کو اس چھوٹی سی لڑکی پر بہت ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔

”تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”تم دونوں کے خیالات کتنے ملتے جلتے ہیں۔“ ایمان نے طنزیہ کہا۔

”اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ اس نے دل ہی دل میں مضبوط عہد کیا تھا۔

”اینا! مسلمان ہے۔ مگر آپ نے مجھے بتایا نہیں۔“

رات کو ایمان نے بہت خوشی کے عالم حاشر سے پوچھا تھا۔

”اتنا تو تم مجھے دیکھ کر کبھی خوش نہیں ہوئیں۔“ حاشر کے اپنے ہی شکوے شکایات تھے۔

”اینا آج آئی تھی۔ وہ بہت پریشان تھی، یقیناً آپ اس کی پریشانی کی وجہ جانتے ہوں گے، آپ اپنا کی خاطر کوئی اسٹینڈ کیوں نہیں لیتے۔ اگر آپ چاہیں تو وہ ایک اچھی اور من پسند زندگی گزار سکتی ہے۔“ وہ آج حاشر کو بھرپور قائل کرنے کے موڈ میں تھی۔



”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”جان بوجھ کر انجان مت بنیں، اگر آپ عامر سے صلح کر لیں تو تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔“

”آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے زوجہ محترمہ! کہ عامر نے میری لڑائی سے پہلے ہی اپنا سے منگنی کو ختم کر دیا تھا محض اپنی معذوری کی وجہ سے، جبکہ اپنا کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا مگر اس کے احساس کمتری نے اسے بالکل تنہا کر ڈالا ہے۔“ حاشر نے اطمینان سے تفصیلاً اسے بتایا جبکہ وہ مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔

”آپ عامر کو قائل کر سکتے تھے۔“ اس نے جرح کی۔

”وکیل صاحبہ! عامر کو آپ سے زیادہ بہتر کوئی قائل نہیں کر سکتا۔ آج کل آپ کے نام کی مالا جپ رہا ہے وہ مجھ سے بہتر آپ اسے سمجھا سکتی ہیں۔“

”آپ کو کیسے پتا کہ میں عامر کو جانتی ہوں؟“ ایمان کی حیرت کی شدت سے آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”میں اللہ کے فضل سے دو خوبصورت آنکھیں اور ایک ذہین دماغ رکھتا ہوں اور میں بخوبی جانتا ہوں کہ میری نرم دل بیگم اس گھامڑ کا سودا کیسے اتنی دور سے اٹھا کر لاتی ہے اور یہ بھی کہ اکثر ادھر سے لنچ تیار ہو کر اس احمق کے گھر جاتا ہے۔“ حاشر نے بڑے سکون کے عالم میں اپنی بات مکمل کی تھی۔

”تو پھر آپ عامر سے ناراض نہیں ہیں اور اسے ہماری نہیں صرف اپنا کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ مجھے کسی اور کی نہیں صرف تمہاری ضرورت ہے اور ہاں عامر کو تم ہم سب سے بہتر سمجھا سکتی ہو۔ وہ تمہاری بات مان لے گا۔“ حاشر نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے کھڑا ہو گیا تھا جبکہ ایمان نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔ وہ اس کے پیچھے ہی بیڈ روم میں آگئی۔

”آپ بھی تو ایک مرتبہ اس سے بات کر کے دیکھ لیں۔“

”تم اپنی اور میری کوئی بات نہیں کر سکتیں۔“ حاشر نے سنجیدگی سے کہا۔

”فی الحال آپ کو اپنا مسئلہ حل کرنا ہوگا۔“ ایمان نے اسے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔

”تمہیں میرے علاوہ ساری دنیا کی پروا ہے۔“

”آپ کے تو شکوے ختم نہیں ہوتے۔“ اس نے جھنجلا کر کہا۔

”تم نے کبھی شکوے دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔“ حاشر نے چہرے پر مظلومیت طاری کر رکھی تھی۔ وہ بیڈ روم میں بکھری چیزیں سمیٹتے ہوئے زیر لب بڑ بڑاتی رہی۔

”کبھی دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ یہ بے جان چیز مجھ سے زیادہ توجہ کی حق دار ہیں۔“ ایمان نے بیڈ شیٹ بدلی اور پھر دھونے والے کپڑے اکٹھے کر کے باسکٹ میں رکھے۔ حاشر اس دوران مسلسل بول رہا تھا۔

”مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں ہوگا اسی لئے تو تمہاری جیسی بیویاں خوا مخواہ کے رعب ڈالنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔“

”آپ نے خود کو احمق تسلیم کر لیا ہے۔“ ایمان نے حیرت سے کہا۔

”ظاہر ہے کوئی عقل سے پیدل شخص ہی تم سے شادی کر سکتا تھا۔“ اس نے ایمان کو چڑانا چاہا۔

”تو آپ کو کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ خود مختار تھے انکار دیتے۔“ اب وہ بیڈ پر لیٹنے کے بعد آنکھوں پر بازو رکھ چکی تھی شاید کمرے میں پھیلی روشنی کی وجہ سے۔

”کہا نا کہ میں بہت رحمدل انسان ہوں، تمہاری ویران زندگی کو دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔“ حاشر لائٹ آف کرنے کے بعد اس کے برابر آکر لیٹ گیا تھا۔

”جو میرے حصے کے غم تھے وہ مجھے مل کر رہنے تھے۔“

”اپنے حصے کی خوشیوں کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔“ حاشر نے اس کی آنکھوں پر رکھے بازو کو ہٹایا۔

”خوشیاں کبھی راس نہیں آئیں۔“ نہ جانے کیوں آنکھوں کے گوشے کسی گرم چیز سے بھگنے لگنے تھے۔ بائیں جانب سے اک میٹھا سا درد اٹھا تھا جو کہ پورے وجود میں سرایت کر گیا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ حاشر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے بولا۔

”ویسے ایسی! تم نے کبھی سوچا نہیں ہوگا اس قدر سپر لکٹری لائف گزارنے کے بارے میں۔“

”مجھے کبھی دولت اور نمود و نمائش متاثر نہیں کر سکی۔“ اس کے اندازے کے عین مطابق ایمان نے غصے سے کہا اور پھر کروت بدل لی۔

”لیکن پیسہ زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔“ حاشر نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر رخ بدلا۔

”میرے نزدیک رشتے اور محبت اہم ہے۔“

”اگر رشتے اور محبت اتنی ہی اہم ہے تو کبھی میرے منہ پر بھی محبت کے دو بول مار دیا کرو۔“ حاشر نے میٹھی سی نگاہ اس کی سیاہ بھگی بھگی آنکھوں پر ڈالی اور پھر اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

”محبت صرف ایک دفعہ ہوتی ہے۔“ ایمان نے تھک کر سوچا۔

”محبت میں بہت وسعت ہے یہ بار بار بھی ہو جاتی ہے۔“ وہ گویا اس کی سوچوں تک رسائی پا چکا تھا۔ ایمان کا سر حاشر کے کندھے سے ٹکرایا۔ وہ ہنوز مسکرا رہا تھا، یہ سپردگی کا انداز، اسے بہت بھارہا تھا۔ حاشر نے اس کے چہرے پر کھڑے بالوں کو سمیٹ کر آنکھوں میں جھانکا وہ ان آنکھوں کے درد کو نوچ کر ان میں خوشیاں بھر دینا چاہتا تھا۔ ایمان آنکھیں بند کر چکی تھی۔ حاشر نے اس کے کندھے کو ہلایا تو وہ دبی آواز میں بولی۔

”پلیز حاشر! سونے دیں۔“

”اب کس کافر کو نیند آئے گی۔“ وہ اس کے کان کے قریب گنگنایا تھا۔



”ایمان آپ! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ عامر انتہائی سنجیدگی سے بولا تھا۔

”کون سا فیصلہ؟“

”یہی جھک جانے کا فیصلہ“ میں جانتا ہوں۔ وہ کس قدر خود پسند اور اناپرست ہے۔ روزانہ مسز ڈنگ کو فون کر کے میری خیریت پوچھے گا ادھر سے گزرتے ہوئے اک لمحے کے لئے ہی سہی اپنی گاڑی میرے دروازے کے سامنے روکے گا مگر خود چل کر یہاں نہیں آئے گا۔ خوب جانتا ہے وہ کہ کس نے کاروبار میں فراڈ کیا ہے، کون جھوٹا اور دھوکے باز ہے مگر اب انا آڑے آتی ہے اعتراف کرنے میں، اسی لئے میں نے سوچ لیا کہ خود ہی اس کے پاس چلا جاتا ہوں آخر میں چھوٹا ہوں وہ بڑا ہے، پھر اس کا رتبہ بھی بڑا ہے منصب بھی بڑا ہے وہ میرا استاد بھی تھا بھائی بھی اور دوست بھی“

”ساڑھے تین سال بعد تمہیں خیال آیا ہے کہ میں تم سے بڑا ہوں۔“ حاشر کی آواز سن کر وہ دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ عامر کا منہ کھلا رہ گیا۔

”حاشر! تم...“

”الو، بے وقوف، اور انتہائی مکار شخص اب ٹسوے بہا کر خود کو مظلوم ثابت کرنا چاہتے ہو۔“ حاشر نے اسے سینے میں خوب بھینچا کہ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ پھر کچھ ہی دیر بعد اپنا، جیمز اور جارج بھی آگئے۔

عامر اور حاشر کی صلح کی خوشی میں جیمز اور جارج نے بھنگڑا ڈالا۔ ایک دفعہ پھر جارج نے ان کی صلح کی خوشی میں ٹریٹ دی۔

اور ٹھیک ایک ہفتے بعد اپنا اور عامر کا نکاح ہو گیا تھا۔ ان دونوں کو خوش اور مسرور دیکھ کر ایمان نے صدق دل سے ان کی خوشیوں کے قائم دائم رہنے کی دعا کی۔

حاشر ان دنوں اپنے اسٹور کی تیسری برانچ کو اسٹیبلس کرنے میں مصروف تھا۔ وہ آج کل امریکہ کی ریاست ”کولورڈو“ کے ایک بڑے سرمایہ کار سے رابطے میں مصروف تھا۔ آج مسٹر جوزنات نے نیویارک آنا تھا اور حاشر، مسٹر جوزنات سے ملاقات کی غرض سے مقامی ہوٹل پہنچ گیا تھا جہاں مسٹر جوزنات ٹھہرے ہوئے تھے۔



وہ ایمان کو بتا کر گیا تھا کہ واپسی پر اسے کافی دیر ہو جائے گی لہذا وہ پریشان نہ ہو۔ ایمان گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اپنا کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی واپسی چھ بجے کے قریب ہوئی۔

وہ اپنے ہی دھیان میں مگن جوں ہی لاک کھول کر اندر آئی تو صوفے پر ایک حسین تیس انیتس سال کی عورت کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”یہ اندر کیسے آئی جبکہ دروازہ باہر سے لاکھ تھا۔“ وہ گم سم اور بے حد خوفزدہ سی دروازے میں ہی کھڑی رہ گئی۔

”رک کیوں گئیں آؤنا۔“ وہ اس اطمینان سے اسے اندر بلا رہی تھی گویا یہ فلیٹ اسی کا تھا۔

”کون ہوں تم؟“ ایمان نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”مجھے میرہ کہتے ہیں۔“ وہ دلکشی سے مسکرائی۔

”کون میرہ؟“

”تمہارے شوہر کی بیوی...“ میرہ نے قہقہہ لگایا۔  
”کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”یہی سچ ہے۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں میں پھنسی ہیرے کی انگوٹھیوں کو گھماتے ہوئے بولی۔

”کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟“ ایمان کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔

”میری یہاں موجودگی۔“ وہ کھلکھلائی۔

”کیا یہ ثبوت کافی نہیں؟ کہ میرے پاس اس فلیٹ کی چابیاں ہیں۔ اس فلیٹ

میں میرا سامان پڑا ہے۔ یہ سامنے والا کیمبنٹ کھول کر دیکھو اور یہ لاکڈ وار

ڈروب بھی۔“ وہ دیوار میں نصب بڑی سی الماری کی طرف اشارہ کر کے بولی

اور پھر اس نے اٹھ کر الماری کے تینوں پٹ کھول دیے، وہاں لیڈیز ویسٹرن

ڈریس لٹکے ہوئے تھے ساتھ کچھ جینٹس ڈریسز بھی تھے۔ نچلے کیمبنٹ میں

میک اپ کا سامان پڑا تھا۔ جیو لری اور کچھ دیگر اشیاء بھی تھیں۔ ایمان نے

شدت کی ایک تیز لہر من میں اٹھتی محسوس کی۔

”کچھ اور ثبوت بھی ہیں میرے پاس۔“ وہ بڑے تفاخر کے عالم میں اٹھی اور بہت استحقاق سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پھر اس نے ایمان کو آواز دی۔ ایمان کا وجود گویا پتھر کا مجسمہ بن چکا تھا۔ اس سے ایک قدم بھی چلا نہیں گیا۔ میرہ نے کچن میں سے جھانکا اور پھر اسے منجمد کھڑا دیکھ کر واپس آئی۔ اس کا ہاتھ سختی سے پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے کچن میں لائی۔ پھر اس نے فریج کے لاکڈ دروازے کو کھولا۔ ایمان کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹ گئی تھیں۔ وہ چھوٹا سا فریج ولایتی شراب کی بوتلوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرہ نے آرام سے ایک بوتل اٹھائی اور اس کو کھول کر اپنے منہ سے لگالیا۔

”یہ ہے میرا اور تمہارے شوہر کا فیورٹ مشروب۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ثبوت ہیں اگر دیکھنے کی تاب ہے تو دکھاتی ہوں تمہیں۔“ میرہ نے بوتل سلیب پر پٹنی اور پھر ہینڈ بیگ سے چند فحش تصویریں نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائیں۔ ایمان سفید لٹھے کی مانند چہرہ لئے نگاہ چراگئی تھی۔ اس کے آنسو بے آواز گر رہے تھے۔

”نہیں حاشر ایسا ہرگز نہیں ہے۔“ وہ دھیرے دھیرے بڑا بڑا رہی تھی۔ ”ایک اور چیز بھی ہے میرے پاس“ میرہ نے ایک خاکی لفافہ پرس میں سے نکالا۔

”دیکھو“ یہ میرا آخری ثبوت ہے۔ میرا اور حاشر کا نکاح نامہ۔“ ایمان کے سر پر گویا یہ پوری کی پوری بلڈنگ آگری تھی۔ وہ رو رہی تھی، چیخ رہی تھی اور میرہ برابر قہقہے لگا رہی تھی۔

”میں پھر آؤں گی، تمہاری بربادی کا تماشا دیکھنے۔“ اس نے حقارت سے کہا اور نہ جانے کون سا انگلش گانا بے ڈھنگے انداز میں گاتی دفغان ہو گئی۔

ایمان کو تو کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ رو رو کر نڈھال ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ رو رو کر حلق میں کانٹے اگ آئے تھے، سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

”بابا! آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، آپ نے مجھے دوزخ میں پھینک دیا ہے۔ میں برباد ہو گئی ہوں۔ میری نمازیں ضائع ہو گئیں، میرے اعمال فنا

ہو گئے۔ مجھے ایک شرابی اور زانی کے حوالے کر دیا آپ نے، مجھے ذلتوں کے اندھے گڑھے میں پھینک دیا ہے۔ میں مر رہی ہوں، میرا سانس گھٹ رہا ہے۔ میں کیسے نکلوں اس کھائی سے آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ نہ جانے وہ کب تک چلائی رہتی، روتی رہتی، اپنے نصیبوں پر ماتم کرتی رہتی۔ حاشر کی آمد نے اسے گم سم کر دیا تھا۔ وہ اسے پاگلوں کی طرح دیکھ رہی تھی اور پھر چیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑی۔ حاشر اس کی جنونی حالت کو دیکھ کر پریشان ہو اٹھا تھا۔

”ایمی! ہوش کرو کیا ہوا ہے، پاکستان میں تو خیریت ہے نا۔“ حاشر نے بمشکل اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر قابو کر کے جھنجھوڑا تھا۔

”تم دھوکے باز ہو، جھوٹے ہو، شرابی ہو۔ بابا نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا ایک بد کردار شخص سے میری شادی کر دی۔ نہیں اچھا کیا بابا نے۔“ وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔

”ایمان! ہوا کیا ہے، کچھ بتاؤ تو سہی۔“ حاشر نے بے قراری سے کہا۔

”چھوڑو مجھے، نہیں رہنا میں نے یہاں۔“ وہ اسی طرح مسلسل چلا رہی تھی۔

”نفرت ہے مجھے تم جیسے مردوں سے، گھٹیا، غلیظ گندی نالی کے کیڑے۔“

”ایمان! کیا پاگل پن ہے، کچھ بتاؤ تو سہی۔“ حاشر نے نرمی سے التجا کی۔ پھر اس کی نگاہ کھلی الماریوں اور شراب کی بوتل پر پڑی۔ وہ ایک دم چونکا، ٹھٹکا اور پھر سختی سے پوچھنے لگا۔

”کون آیا تھا یہاں... بتاؤ ایمی!“

”آئی تھی تمہاری ہوتی سوتی، جس کے ساتھ گلچھرے اڑاتے رہے ہو۔“

ایمان نے چلا چلا کر کہا۔

”میرہ، بے غیرت، تجھے تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ میرہ کو گالیوں سے نوازتا ایمان کے لئے پانی لے آیا۔ ایمان نے گلاس اٹھا کر سامنے والی دیوار سے دے مارا۔

”دیکھو ایمان! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، پلیز خاموش ہو جاؤ۔ میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا، بس مجھے واپس بھجوادو، نہیں رہوں گی میں یہاں۔“ اس نے اپنے بال نوچنے شروع کر دیے تھے۔

”مجھے کچھ کہنے تو دو۔۔۔ میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں۔“ حاشر نے بے بسی سے کہا۔

”میں خود کو ختم کر لوں گی ورنہ مجھے واپس بھجوا دو۔“ اس کی بس ایک ہی رٹ تھی۔ لاکھ التجاؤں اور منتوں کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے کوس کوس کر تھک گئی تھی۔ حاشر کو یہ خدشہ تھا کہیں اس کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔

وہ اس کی منتیں کر کر کے تھک چکا تھا مگر وہ کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ پھر ایمان نے خود کو کمرے میں بند کر لیا، اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ حاشر دروازہ پیٹ پیٹ کر تھک جاتا۔ تین دن اس نے مسلسل خود کو کمرے میں

بند رکھا اس دوران نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا۔ آخر تھک ہار کر محض اس کی اس کیفیت کو مد نظر رکھتے ہوئے حاشر نے اسے پاکستان بھجوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس کی سیٹ کنفرم کروا کر حاشر نے آخری کوشش کے طور پر اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو وہ ایک مرتبہ پھر کمرے میں بند ہو گئی۔

جانے سے پہلے اس نے اپنا اور عامر سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ پھر وہ چلی گئی تھی شاید ہمیشہ کے لئے۔

☆☆☆

اس کا استقبال بہت اچھا نہ سہی اتنا برا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ خصوصاً انابیہ بھابی بہت اچھے طریقے سے ملی تھیں۔ امی کا رویہ بھی بہت اچھا تھا۔ البتہ گزرے وقت نے زونہ کے مزاج پر کچھ بہتر اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ پہلے جیسی ہی تھی روڈ اور روکھی پھیکی۔



اس کی اچانک آمد کا سن کر بھیا اور حرا بھابی بھی ملنے کے لئے آئی تھیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتی تھیں مگر ایمان نے انکار کر دیا۔

وہ عمار کے کمرے میں ہی ٹھہری تھی۔ اس نے ہمیشہ اب اسی کمرے میں ہی رہنا تھا۔ وہ ان سب پر کچھ بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اسی لئے اس نے اپنے رویے کو نارمل رکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ حاشر انہیں کچھ نہیں بتائے گا اور وہ خود بھی اپنے بھرم کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ مگر حاشر کے فون نے سب کو ہی تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ایمان سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ایمان نے انکار کر دیا اسی لئے گھر والوں کو کچھ ان کی آپس میں ناچاقی کی بھنک پڑ گئی تھی۔

ان تینوں مہینوں میں حاشر نے ایک سوچو بیس مرتبہ فون کیا تھا مگر ایمان ہر دفعہ ہی بہانہ بنا کر ادھر ادھر جاتی۔ مہر بیگم نے ایک دن اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔

”کیا بات ہے ایمان! تم حاشر سے بات کیوں نہیں کرتیں۔“

”امی! اصل میں موبائل پر بات ہو جاتی ہے۔“ اسے فوراً ہی بہانہ سوچھ گیا۔

”کہیں لڑائی جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گڑ بڑا سی گئی تھی۔

پہلے پہل سب گھر والوں نے اسے بہت اہمیت دی تھی حتیٰ کہ آمنہ آپنی بھی بہت تپاک سے ملی تھیں۔ مگر آہستہ آہستہ انہیں بھی اندازہ ہو گیا کہ اصل میں کوئی گڑ بڑ ہے۔ سب اس کے طویل قیام پر حیران تھے۔ ادھر حاشر بھی کوئی بات نہیں بتا رہا تھا اور نہ ہی وہ پاکستان آرہا تھا۔

ایمان اب پہلے والی ایمان تو نہیں تھی جو دب کر رہ جاتی۔ اس نے گھر کے کشیدہ ماحول سے بے زار ہو کر ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی۔ اب تو گویا سب کو ہی یقین آ گیا تھا کہ حاشر اور ایمان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس کے سامنے نہ سہی پیٹھ پیچھے سب کو ہی باتیں بنانے کا موقع مل جاتا تھا۔ اب بھی آمنہ آپنی زور شور سے امی کے کمرے میں بول رہی تھیں۔

”آپ حاشر سے پوچھتی کیوں نہیں آخر کیا وجہ ہے، کیوں ایمان یہاں آئی ہے۔“

”اس نے کبھی کوئی بات بتائی ہے جواب بتائے گا۔“ امی نے لاپرواہی سے کہا تھا۔

”یقیناً کوئی بات ضرور ہوگی جو یہ محترمہ یہاں آکر بیٹھ گئی ہیں۔“ آمنہ آپی نے آنکھیں مٹکائیں۔

”بھلا اس حالت میں حاشر نے اسے کیوں بھیجا ہے۔“

ایسی بہت سی باتیں ایمان کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ پھر حاشر نے ایک دن تصدیق بھی کر ڈالی۔ گھر والوں کے رویہ میں ایک مرتبہ پھر واضح فرق آگیا۔ آمنہ آپی باتوں ہی باتوں میں اسے بہت کچھ جتا دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر ان سب کو ایمان کی ذات میں بہت سے کیڑے نظر آنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ سب کی نگاہوں میں اپنا مقام کھو چکی تھی۔

ایسا بھلا کیوں تھا۔ صرف اور صرف حاشر کی وجہ سے حاشر کے نام نے اسے معتبر کر دیا تھا۔ اس کا نام اس کے ساتھ کیا لگا وہ پھر سے معتبر ہو گئی۔ اس کا مقام بحال ہو گیا۔ اور اب ایک مرتبہ پھر اس کا نام سب کی زبان پر تھا۔ اس کی جیٹھانی اور دیورانی کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کی بھابی کو بھی اب اس میں ایک مرتبہ پھر کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے بھتیجے اور بھتیجی نے بھی فون کرنا چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

وہ سکول سے گھر آئی تو گرمی اور بھوک سے برا حال تھا۔ اس نے سوچا شربت بنا کر پی لے مگر جب کچن میں آئی تو آمنہ آپی پہلے سے ہی موجود تھیں۔ اسے چینی نکالتے دیکھ کر بولیں۔

”پچاس روپے کلو چینی ہے۔“

”میں نے آپ سے چینی کا ریٹ تو نہیں پوچھا۔“

ایمان نے ناگواری سے کہا تو آمنہ آپ کی تیوریاں چڑھ گئیں جبکہ زونہ نے اک زور دار قہقہہ لگایا تھا۔ ایمان نے خفت کے مارے جگ وہیں رکھا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

پھر اکثر ایسا ہی ہونے لگا تھا۔ جب وہ کھانا کھانے کے لئے آتی سالن ختم ہوتا کبھی روٹی نہ ملتی۔ کپڑے دھونے لگتی تو صابن اور سرف غائب ہوتا۔ فریج کو لاک لگا دیا گیا۔ دودھ کو فریج میں چھپا دیا جاتا تھا جبکہ فروٹ کی ٹوکریاں آپنی اور زونہ کے کمرے میں چلی جاتیں۔

وہ جس کنڈیشن میں تھی اسے اس حالت میں فروٹ اور دودھ کی ضرورت تھی مگر زونہ اور آپنی کا ازلی جلاپا اور حسد عود آیا تھا۔ وہ اسے زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔

ایک مرتبہ پھر وہ عمار کے حوالے سے اس پر طنز کے تیر برسانے لگی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر انہوں نے اس پر زندگی کے دروازے بند کرنے چاہے تھے۔

اور اس دفعہ تو اس کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں بچا تھا۔ بھابی نے بھی آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

کل جتنی ذلت اس نے محسوس کی تھی۔ جتنی بے عزتی بھابی نے اس کی کی تھی وہ ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکی تھی۔ اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔

”کیا اب تیسرا شوہر ڈھونڈنا ہے یا پھر یہ کام پہلے سے کر چکی ہو۔“

بھابی! اللہ کے لئے خاموش ہو جائیں۔“ ایمان نے گویا گڑگڑا کر کہا تھا۔

”میں خاموش ہو جاتی ہوں، لوگوں کی زبانیں بھی روک لو۔“ انہوں نے تنفر سے کہا۔

”میں کس کس کو جواب دوں... آج کل سب کی زبان پر میری نند کے قصے ہیں۔“

”اپنے گھر سے بات نکلتی ہے تبھی دوسروں کی زبانیں زہر اگلتی ہیں۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے کہ میں سب کو گھر گھر جا کر تمہاری کہانیاں سناتی ہوں۔“ بھابی نے چیخ کر کہا تھا۔

”تمہیں خود ہی گھر بسانا نہیں آتا۔“

”میں آئندہ اس گھر میں نہیں آؤں گی۔“ ایمان نے روتے ہوئے کہا۔

”اگر خالہ امی نے بھی تمہیں گھر سے نکال دیا تو پھر کہاں جاؤ گی؟“ بھابی کا لفظ لفظ زہر میں بجھا تھا۔

”کم از کم اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گی، آپ بے فکر ہو جائیں۔“

”سڑکوں پر دھکے کھاتی پھروں گی۔“ انہوں نے نفرت سے کہا۔

”میاں بیوی میں جھگڑا ہو ہی جاتا ہے گھر اجاڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اتنی اکڑ اور غرور کم از کم عورت میں نہیں ہونا چاہیے۔ اگر حاشر کی غلطی ہے پھر

بھی تم معافی مانگ لو اس سے... اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

”مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”آخر وجہ کیا ہے؟“

”زبردستی کے رشتے ناپائیدار ہوتے ہیں آپا! زونیہ بھی اس کا رخیر میں شرکت کی غرض سے آپہنچی تھی۔“

”حاشر کو خالو جان نے مجبور کیا تھا کہ ان کے عمار کی بیوہ سے وہ شادی کر لے۔ ظاہر ہے اس کی پسند تو کوئی اور تھی۔ وہ اپنے دوست کی بہن میرہ کو شروع سے ہی پسند کرتا تھا۔“ زونیہ نے تمسخر اڑایا۔ ایمان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

”حاشر نے اسے خود ہی یہاں بھیج دیا ہوگا۔ بھلا ایمان میں ہے ہی کیا۔“

”کیا پتا اس نے وہاں شادی کر رکھی ہو۔“

”ہاں، تمہاری بات میں وزن ہے۔ اسی لئے یہ واپس آگئی مگر کتنی گھنی اور

میسنی کچھ بتاتی نہیں۔“ حرا بھابی نے ناک چڑھائی۔



”چاند نکلے گا تو سب کو ہی نظر آئے گا۔ کہاں تک چھپائے گی۔“ زونہ نے تمسخرانہ کہا۔

”شکر ہے ولید ایسا نہیں... ساڑھے تین چار سال ہونے والے ہیں مگر آج تک اس نے کبھی تمہیں بتایا نہیں۔ تمہارے ساتھ ولید جیسا بندہ ہی گزارہ کر سکتا تھا۔“ حرا نے تشکر بھرے انداز میں کہا تو زونہ نے بھی فوراً ہی تائید کی۔

کبھی کبھی اسے اپنی حماقت پر بہت ہنسی آتی تھی۔ یہ تو ولید جیسا نرم طبیعت اور محبت کرنے والا بندہ تھا جس نے آج تک اسے کبھی بانجھ کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ وہ اول روز کی طرح ہی اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ حاشر جیسے شخص کے ساتھ ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ جو کہ پہلے سے ہی کسی اور کی زلف کا اسیر تھا۔ اسی لئے وہ مطمئن تھی، بے حد خوش تھی۔ سرشار تھی اور ایمان کی بد نصیبی پر بھرپور انداز میں اظہار افسوس کرتی تھی۔

”تم ٹکے ٹکے کی نوکری کر کے ہم پر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو کہ دو وقت کی روٹی نہیں دے سکتے ہم تمہیں۔“ آمنہ آپنی غصے سے آگ بگولا ہو رہی تھیں۔

”میری جاب سے آپ کو بھلا کیا پرابلم ہے۔“ ایمان کہاں تک برداشت کرتی ایک دم پھٹ پڑی۔

”لوگ تھو تھو کر رہے ہیں۔ باتیں بناتے ہیں۔ بے غیرتی کی بھی کوئی حد ہے۔ اگر اتنا ہی شوق ہے تو اپنے بھائی کے گھر دفع ہو جاؤ۔“ نہ جانے اس میں اتنی کہاں سے ہمت آگئی تھی کہ وہ انتہائی بے خوفی سے بولی۔

”جس کے حوالے سے ہے اسی نے تمہیں منہ نہیں لگایا۔ چار دن برداشت نہیں کیا۔ مجھے تو لگتا ہے عنقریب وہ تمہیں طلاق بھی دے دے گا۔ ایسا کرے تو اسی کے حق میں بہتر ہے۔ اتنی منحوس ہو تم پہلے عمار کو کھا گئی ہو اب حاشر کی زندگی تباہ کرو گی۔“

”میں اپنی مرضی سے یہاں آئی ہوں۔“ ایمان نے مری مری آواز میں کہا۔

”اونہہ... اسی نے تم سے جان چھڑوائی ہے۔ بہت اچھا کیا ہے میرے بھائی نے جو تم جیسی بد بخت عورت سے جان چھڑوالی ہے۔“ وہ مسلسل بولے جا رہی تھیں۔ ایمان تھکے تھکے قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کیا کرتی کہاں جاتی۔ آگے کنواں پیچھے کھائی تھی۔ آمنہ آپنی کا رویہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کچھ دن بھیا کی طرف رہ آئے گی مگر وہاں بھی حالات کچھ مختلف نہیں تھے۔

اسے صبح صبح آتے دیکھ بھابی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

”لو آگئی مصیبت۔“ وہ منہ ہی منہ میں بد بدائیں۔

”پھوپھو! رہنے کے لئے آئی ہیں۔“ بسمہ اس کی گود میں چڑھ گئی تھی۔

”ہوں...“

”کتنے دن رہیں گی۔“

”جتنے تم کہو گی۔“

”تو پھر ابھی چلی جائیں۔“ بسمہ کی جگہ حمزہ نے کہا وہ ششدر رہ گئی۔

”دیکھو ایمان! تو سمجھدار ہو، اتنی عقل تو ہے تم میں کہ اپنا اچھا برا سوچ لو، کچھ عرصے تک تمہاری ڈلیوری ہوگی۔ تمہیں ہمارے حالات کا تو پتا ہے۔ کہاں اتنا خرچہ افورڈ کر سکیں گے۔ تمہیں کم از کم ان دنوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ بھابی نے لگی لپٹی بغیر کہہ دیا تھا۔

”میں شام تک چلی جاؤں گی۔“

”اچھا، پھر یہ برتن وغیرہ سمیٹ دو، لنچ بھی بنا دینا۔ آج میں افشاں کی

طرف جاؤں گی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

ایمان گہری سانس خارج کر کے کچن میں گھس گئی تھی۔ برتن دھوئے، کچن

صاف کیا اور پھر کھانا بنانے لگی۔

رات کو زین کا فون آگیا تھا۔ وہ اسے واپس بلا رہا تھا۔ ایمان نے فوراً تیاری

کر لی تھی۔ آمنہ آپنی جاچکی تھیں۔

”امریکہ سے کسی ایسا نامی خاتون کا فون آیا تھا۔“ زین نے اسے بتایا تو وہ قدرے حیران ہوئی۔

”کیا کہہ رہی تھی۔“

”آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ شاید دوبارہ کر لیں۔ اگر آپ بیک رنگ کرنا چاہتی ہیں تو کر لیں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ ایمان نے لاپرواہی سے کہا۔

”آپ کی فرینڈ ہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ ایمان نے مسکرا کر کہا۔

”کیا حاشر کے ساتھ آپ کا جھگڑا چل رہا ہے۔“

”نہیں تو“ س نے نگاہ چرائی تھی۔

”پھر آپ یہاں“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

”میں عنقریب چلی جاؤں گی۔“ اس نے اک پل میں ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

”کہاں؟“

”جہاں قسمت لے گئی۔“

”بھابی! میری بات کا برا مت مانے گا۔ گھر اپنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“ زین نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ ایمان کچھ نہیں بولی تھی بس خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اس نے خود کو آزمانے کا سوچ لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا واپس جانے کا۔ وہ اس ذلت سے تنگ آئی تھی۔ وہ مزید خود کو گرانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ عورت بغیر مرد کے سہارے کے اس معاشرے میں نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر رشتے کو آزما چکی تھی۔

اس نے عمار کی سچی اور خالص محبت بھی دیکھی تھی اس نے حاشر کی منافقانہ محبت بھی دیکھی تھی۔ عمار چلا گیا تھا، حاشر موجود تھا جس کے نام کے بغیر ساتھ کے بغیر وہ ادھوری تھی اپاہج تھی، نامکمل تھی۔

وہ جیسا بھی تھا اس نے حاشر کو قبول کرنے کا سوچ لیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رہنے کے لئے خود کو تیار کر رہی تھی۔ وہ اللہ سے شکوہ نہیں کر سکتی تھی۔ اللہ نے حاشر حسین کو ہی اس کا مقدر کا ستارہ بنایا تھا اور جو شخص اللہ نے اس کے لئے پسند کیا تھا وہ کیسے اسے ناپسند کرتی۔ وہ شرابی اور بدکردار شخص ہی اس کے نصیب میں لکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی لکیروں میں حاشر کا نام تھا۔ پھر کیسے عمار زندہ رہتا۔

وہ ان سب کی نفرتیں سہ سہ کر تنگ آچکی تھی۔ وہ جھک گئی تھی، ٹوٹ گئی تھی آمنہ آپی نے رات کو فون کر کے پھر اسے بے عزت کیا تھا۔ ایمان خاموشی سے سنتی رہی۔ پھر اس نے فون رکھ دیا تھا۔

یہ صرف بیس دن بعد کی بات ہے جب اچانک اپنا چلی آئی۔ وہ اکیلی آئی تھی اور صرف دو دن کے لئے آئی تھی۔ اپنا کا استقبال ان سب نے بہت پر تپاک کیا تھا وہ صرف ایمان سے ملنے کے لئے آئی تھی۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا جبکہ شکوے شکایات بے حساب۔

وہ اس سے ناراض تھی۔ اور ایمان اسے بھلا بتاتی بھی کیا۔

”ایمان! میں تو تمہیں بہت عقلمند سمجھتی تھی مگر تم تو“ اپنا نے ناراضگی سے کہا۔

”تم نہیں جانتیں اپنا! میرے ساتھ کیا کچھ بیت چکا ہے۔“ ایمان نے تھکی تھکی آواز میں کہا تو اپنا رنجیدگی سے بولی۔

”میں جانتی ہوں، مگر مجھے افسوس ہے کہ تم نے حاشر سمیت ہمارا بھی اعتبار نہیں کیا۔ اگر تم میرے ساتھ شیمز کرتیں تو میں تمہاری تمام غلط فہمی دور کر دیتی۔“ اپنا نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے کہا تھا۔

”اگر تم حاشر کی وکالت کے لئے آئی ہو تو پلیز کچھ مت کہو۔“

”میں حاشر کو بغیر بتائے آئی ہوں، مجھے عامر نے بھیجا ہے۔ اگر تم میری بات آرام سے سن لو تو مجھے یقین ہے کہ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔“



”کیا کہنا چاہتی ہو؟“ ایمان نے آہستگی سے کہا تھا اور اپنا تمام رام کہانی سنانے لگی تھی۔ اس نے ایک ایک بات واضح کر دی تھی۔ اس نے ہر سچائی پر سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ ایمان حیران پریشان، ششدر سی سن رہی تھی۔

اپنا مزید ایک دن رہی تھی اور پھر ایمان کے بے حد اصرار کے باوجود واپس چلی گئی۔ اسے عامر کی بہت فکر تھی۔ وہ بہت پریشان تھی کہ عامر کو کھانے پینے میں پر اہلم ہوگی۔

اپنا کے جانے کے ٹھیک تین دن بعد اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انابیہ بھابی بمعہ بچوں کے میکے گئی ہوئی تھیں۔ ولید کراچی جبکہ علی اور زیب ٹرپ کے ساتھ جرمنی گئے تھے۔ صرف زونہ اور امی گھر میں موجود تھیں۔

امی دوا کھا کر سوچکی تھیں۔ تقریباً ایک بجے کے قریب اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ پہلے تو وہ درد برداشت کرتی رہی پھر جب تکلیف مزید بڑھ گئی تو وہ اٹھ کر زونہ کے بیڈ روم کی طرف آگئی۔

دروازہ پیٹ پیٹ کر اور آوازیں دے دے کر وہ تھک چکی تھی مگر زونہ نے دروازہ نہیں کھولا۔ درد کی شدت سے اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی، چلا رہی تھی مگر اس بے حس عورت پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ وہ زونہ کے دروازے کے پاس بیٹھی کراہتی رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیسے ہمتیں جمع کر کے اٹھی۔ مگر کمر کے شدید درد نے اسے اٹھنے نہیں دیا تھا۔ وہ دیوار سے سر ٹکراتے مسلسل رو رہی تھی۔ چلا رہی تھی، کراہ رہی تھی۔ اس کے آنسو گالوں پر پھسل رہے تھے۔ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔

”حاشر! آجاؤ، اللہ کے واسطے آجاؤ۔ میں بہت اکیلی ہوں، میں بہت تنہا ہوں۔ مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ میری خاطر نہ سہی اپنے بچے کی خاطر آجاؤ۔ دیکھو، میں تمہیں بلا رہی ہوں، ایمان تمہیں بلا رہی ہے۔ میرا دل تمہیں آواز دے رہا ہے، پکار رہا ہے۔ فریاد کر رہا ہے۔ دیکھو، حاشر میں تڑپ رہی ہوں۔ مجھے بہت تکلیف ہے، میری سانسیں رک رہی ہیں۔ پلیز آجاؤ۔ حاشر آجاؤ نا۔ میرا

کوئی نہیں، میرا تمہارے سوا کوئی بھی نہیں۔“ وہ روتے روتے نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کی رنگت سفید لٹھے کی مانند ہو گئی تھی۔ اس کا حلق خشک تھا گویا اس میں کانٹے اگ آئے ہیں۔

اسی پل فون کی بیل گونج اٹھی تھی۔ ایمان نے بے بسی کے عالم میں فون اسٹینڈ کی طرف دیکھا۔ بیل مسلسل بج رہی تھی، ایمان زمین پر گھسٹتے ہوئے بمشکل دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی تھی۔ فون تک پہنچتے پہنچتے اسے دانتوں پسینہ آگیا تھا۔

اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف حاشر کی آواز سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ حاشر نے اسے تسلی دی اور پھر عمیر بھیا کو فون کیا۔ جب تک عمیر بھیا آئے امی بھی اٹھ گئی تھیں اور زونہ بھی کمرے سے نکل آئی۔ امی اسے غصہ ہو رہی تھیں کہ اس نے انہیں بتایا کیوں نہیں۔ کچھ ہی دیر بعد اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ فجر کی اذان کے ساتھ اس نے ایک صحت مند بیٹھے کو جنم دیا تھا۔

حاشر بھی بیٹے کی خبر سن کر تمام غصہ اور ناراضگی بھلائے تیسرے دن ہی آگیا تھا۔ سارا دن اپنے چھوٹے سے بیٹے کو گود میں اٹھائے رکھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی ایمان سے بات نہیں کی تھی۔ ایمان اس کے کٹھور روئے پر دل ہی دل میں افسردہ تھی۔

رات کو جب حاشر ننھے عمان کو اٹھا کر اندر آیا تو ایمان بے ساختہ بولی۔  
”اب بھی نہ آتے، ہم کسی کے ہاتھ بھیج دیتے عمان کو۔“

”یہ میرا گھر ہے اور یہ کمرہ بھی میرا ہے“ میں جب چاہے آسکتا ہوں۔“  
حاشر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا۔

”آپ خفا ہیں حاشر!“ وہ جو بیڈ پر عمان کو لٹا کر اس سے کھیل رہا تھا۔ ایمان کی بات سن کر چونک اٹھا۔

”تمہیں میری ناراضگی کی پروا ہے۔؟“

”آپ کو ہمیشہ مجھ سے شکایتیں ہی رہی ہیں۔“

اس نے آزدگی سے کہا۔

”تم نے میری شکایتیں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”اب کر لیتی ہوں۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”پلیز حاشر! مجھے معاف کر دیں۔“ ایمان نے التجائیہ کہا اور پھر اس کے

قدموں کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے اور غلط فہمی پر شرمندگی بھی۔ میں نے ان

جانے میں آپ کو جو کچھ بھی کہا تھا۔ میں اس پر پشیمان ہوں اور آپ سے

معافی بھی مانگ رہی ہوں۔ میں نے آپ کو بہت برا بھلا کہا تھا، مجھے بغیر

تصدیق کیے کچھ کہنے کا حق نہیں تھا مگر میں میرہ کو دیکھ کر اور اپنے کچن

کے فریج میں ام الخبائث کی بوتلیں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکی تھی اور پھر

جو اس نے مجھے جعلی نکاح نامہ دکھایا تھا اور وہ گندی، فحش تصویریں، آپ

سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کس ذہنی کرب سے گزری ہوں۔ میرا جی چاہ رہا

تھا کہ میں خود کو ختم کر لوں۔“

”تم نے اس بے غیرت اور جھوٹی عورت کی باتوں پر یقین کیوں کیا اور پھر

میری کوئی بات بھی تم سننا نہیں گوارا کر رہی تھیں۔ مگر اچھا ہی ہوا اگر میں

اس وقت تمہیں اپنی صفائیاں دیتا تو تم ہر گز یقین نہ کرتیں۔“ حاشر نے غصے

سے کہا تو ایمان نے اس کے پیروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

”مجھے یقین آگیا ہے کہ میرہ جھوٹی تھی اور وہ سارا سامان ان دونوں بہن

بھائی کا تھا جو کہ امانتاً آپ نے رکھا ہوا تھا۔ پلیز اب آپ مجھے معاف

کر دیں۔“

”تم میرا اعتبار بے شک نہ کرو مگر میں تمہاری غلط فہمی ضرور ختم کرنا

چاہوں گا۔ ناصر اور میرہ انڈین مسلم تھے۔ نیویارک میں ہماری ملاقات ہوئی

تھی۔ ان دنوں وہ دونوں ہی نیویارک کی سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے

تھے۔ میں نے ترس کھا کر انہیں اپنے فلیٹ میں رہنے کی جگہ دی۔ کچھ عرصہ

تک ان دونوں نے قدم جمالیے۔ ایک دوست کے توسط میں اٹلی گیا تو وہاں کاروبار کے لئے حالات قدرے بہتر لگے۔ یوں میں نے ناصر، میرہ اور عامر سے مشورہ کرنے کے بعد کاروبار شروع کر لیا۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد میرا اور عامر کا جھگڑا ہو گیا۔ ان دونوں نے موقع پا کر ہمارا بہت سا نقصان کر دیا تھا۔ پہلے پہل میرہ مجھے اچھی لگی تھی مگر یورپ میں رہ کر اس نے بھی پرزے نکال لئے تھے میں نے اس کی حرکتیں دیکھ کر اس پر لعنت بھیجی مگر وہ لومڑی کہاں جان چھوڑنے والی تھی موقع پا کر پھر سے اوقات دکھا گئی اور تم بدھو

اس کی باتوں میں آکر اسے خوش کرنے کے مواقع فراہم کرتی رہی ہو۔“

”میں بہت بے عقل اور احمق ہوں۔“

”ہاں، وہ تو تم ہو ہی۔“ حاشر نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے؟“ اس کا موڈ قدرے بہتر دیکھ کر ایمان مسرور سی بولی۔

”نہیں۔“

”اچھا“ اس کا منہ ایک دفعہ پھر اتر گیا تھا۔

”تمہیں تو شوہر کو ڈھنگ سے منانا بھی نہیں آتا۔“

حاشر نے تاسف سے کہا۔ وہ ہونق سی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”بھئی کوئی منتیں کر لیا کرو اور کچھ نہیں تو کوئی گانا وانا ہی سنا دو۔ کوئی پیار

محبت کے ڈائلاگ ہی بول دو۔ تم پاکستانی فلمیں تو دیکھتی ہو گی۔“

”جی نہیں، مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

اس نے ناک چڑھائی۔

”اوکے، تم میرے کمرے سے جاسکتی ہو۔“

”کک... کیوں؟“ ایمان نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نن، نہیں، حاشر! میں باہر نہیں جاؤں گی۔“ اسے تو آمنہ آپی اور بھابی کی

طنزیہ، معنی خیز نگاہوں کا سوچ کر ہی وحشت ہونے لگی تھی۔ انہیں تو ایک

اور چٹ پٹا موضوع مل جانا تھا کہ حاشر نے ایمان کو کمرے سے نکال دیا ہے۔

”کیوں؟“ حاشر نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

”وہ میں آمنہ آپ کی باتیں نہیں سن سکتی۔ وہ تو خوش ہوں گی کہ آپ نے مجھے بیڈ روم سے نکال دیا ہے۔“ ایمان نے پریشانی کی اصل وجہ بتائی تو حاشر نے بھی مزید اسے تنگ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کیونکہ ایمان کی اب بھاں بھاں کر کے رونے کی کسر باقی رہ گئی تھی اور ایمان کے آنسو وہ کہا برداشت کر سکتا تھا۔

”کہاں جارہی ہو؟“ اسے اٹھتا دیکھ کر حاشر نے دوائی دی۔ ایمان نے قدرے پلٹ کر جواب دیا۔

”آپ کے لئے دودھ لینے جارہی ہوں۔“

”اتنی خدمت گزار بیوی نہ بنو کہ مجھے خوا مخواہ خوش فہمی لاحق ہو جائے۔“ حاشر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کبھی کبھی خوش فہمیاں بھی پال لینی چاہئیں، وقت اچھا گزر جاتا ہے۔“ ایمان بھی مطلع صاف دیکھ کر مطمئن اور سرشار ہو گئی تھی اور اسے خوش دیکھ کر حاشر بھی اندر تک مسرور ہو گیا تھا۔ ایمان کا رویہ چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ وہ بھی زندگی سے قدم ملا کر چلنا سیکھ گئی ہے۔ بہت دیر بعد سہی اس نے زندگی میں موجود تبدیلیوں کو سمجھ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ زندگی خوشی، غم، دکھ اور مسکراہٹوں کا حسین سنگم ہے۔

ایمان شاید کچن میں گئی تھی۔ حاشر بیڈ سے اٹھ کر سامنے ٹیبل پر سچی عمار کی تصویر تک آیا۔ اسے یوں لگا کہ عمار بہت خوش ہے۔ وہ مسکرا بھی رہا تھا۔ حاشر نے عمار کی تصویر اٹھائی۔ اس کے کانوں میں آج سے پانچ سال پہلے گونجنے والی آوازوں نے وہ گھڑی، وہ پل، وہ لمحہ یاد کروادیا تھا جب حاشر حسین پہلی مرتبہ ایمان کا اسیر ہو گیا تھا اس نے ایمان سے محبت نہیں عشق کیا تھا۔



کیا کوئی شخص کسی عورت کی تصویر دیکھ کر اس کے عشق میں گرفتار ہو سکتا ہے جبکہ وہ عورت اس قدر حسین بھی نہ ہو مگر حاشر حسین، ایمان علی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا محض اس کی تصویر دیکھ کر۔

اسے وہ وقت کیسے بھول سکتا تھا جب پہلی مرتبہ اس نے ایمان کی تصویر دیکھی اور پھر دیکھتا رہ گیا۔ اسے اس تصویر نے گویا جکڑ لیا تھا۔ وہ گویا کسی طلسم کے زیر اثر پاگلوں کی طرح اس تصویر کو دیکھتا رہا تھا۔ اس پل حاشر بھول گیا تھا کہ ایمان اس کے عزیز جان بھائی کی منگیتر ہے۔ اس کا بھائی ایمان نامی اس لڑکی سے بہت محبت کرتا ہے۔

آج بھی عمار کی کھنکھاتی آواز اس روز کی طرح اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

”اوہو گھامڑ، اڑیل ضدی گھوڑے“ میں نے یہ تصویر تجھے اس لئے بھیجی ہے تاکہ تو بھی صنف نازک کے بارے میں کچھ سوچنے کے قابل ہو سکے۔ تیرے

دل کے تار بھی گنگنا اٹھیں۔ تمہاری غیرت بھی جاگے کہ تم سے چھوٹا ہو کر میں منگنی شدہ ہو گیا ہوں۔

ولید کو تو میں نے نبٹا دیا ہے مگر تو میرے ہتھے نہیں چڑھ رہا۔ امی کی شرط بھی کتنی خطرناک ہے کہ میں یعنی عمار حسین اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا جب تک مجھ سے بڑے دو کٹھور بھائی نہ بیاہے جائیں۔ بھلا اس منحوس شرط کی ضرورت ہی کیا تھی مگر اب امی کی بات ماننا پڑے گی۔ اللہ کے لئے میرے شریف اور معصوم بھائی کسی میم کو ہی اپنے چنگل میں پھنسا لے کہ وہ بھی تجھے دیکھ کر بدکتی ہیں۔ اف میں کیا کروں میرے کتنے مسائل ہیں۔ کتنی ذمہ داریاں ہیں میری، بس تو جلدی سے جھوٹی سچی لڑکی ڈھونڈ کر غائبانہ منگنی کی خبر امی کو سنا دے تاکہ میرا معاملہ بھی قدرے بہتر ہو۔ میرے سر پر بھی سہرا سجے اور تیرا بھائی بھی شادی شدہ کی فہرست میں شامل ہو جائے۔ امی سے کہہ دے کہ تو ناصر کی بہن میرہ کو پسند کرتا ہے۔“

اور پھر حاشر نے امی کو قائل کرنے کے لئے عمار کی بات مان لی۔ اس نے اپنی محبت کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا لیا وہ تو خود پر بھی یہ راز ظاہر نہیں کرتا تھا۔

اس نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ عمار اپنی محبت کو پانہ سکے۔ وہ تو ہمیشہ اپنے بھائی کی دائمی خوشیوں کے لئے دعا کرتا تھا مگر نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ وہ عمار کی شادی پر نہیں پہنچ سکا تھا اور نہ ہی اس کے جنازے پر پہنچ سکا تھا۔ مگر اس کا دل اس صدمے سے لہو لہو ہو گیا تھا۔ وہ کتنا ہی عرصہ دنیا سے کٹ کر اپنے فلیٹ میں پڑا رہتا۔ باہر ناصر اور میرہ اور ان کے فرینڈز نے اودھم مچایا ہوتا تھا مگر اس نے کبھی ان دونوں کو نہیں روکا تھا۔ وقت بیتتا رہا، موسم گزرتے رہے۔

پھر ایک دن بابا نے اسے پاکستان بلوایا۔ وہ چاہتے تھے کہ حاشر، عمار کی بیوی ایمان سے شادی کر لے۔ حاشر نے بابا کی بات کا مان رکھ لیا مگر دل میں چھپی وہ خواہش، ایمان کی چاہ انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھی تھی۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایمان اس کی ہو چکی ہے۔ اس نے ایسا کبھی چاہا بھی نہیں تھا نہ ایمان کی اس نے طلب کی تھی مگر اللہ نے ایمان کو اس کے نصیب کا ستارہ بنا دیا تھا۔ اس نے ایمان کو خوش رکھنے کا خود سے عہد کیا تھا۔

عمار سے عہد کیا تھا اور وہ اس عہد کو تا حیات نباہنا چاہتا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ یوں ہی سوچوں میں گم رہتا۔ باہر کھٹکے کی آواز سن کر اس نے عمار کی تصویر واپس رکھ لی اور پھر دھیمے سے بڑ بڑایا۔

”یہ حقیقت میں کبھی بھی ایمان کو نہیں بتاؤں گا۔“

ایک ہفتے بعد انہوں نے واپس چلے جانا تھا اور حاشر کی خواہش تھی کہ نیویارک جانے سے پہلے وہ لوگ عمرہ ادا کریں گے۔ ایمان نے تو جب سے سنا تھا خوشی کے مارے زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے اس کے۔

اس کی بہت دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ وہ اللہ کا گھر دیکھے گی۔ خانہ کعبہ کی چھاؤں میں بیٹھے گی، بہت سے نوافل ادا کرے گی۔ عمار کے لئے دعائے مغفرت کرے گی مگر اللہ سے شکوہ ہر گز نہیں کرے گی۔ کیونکہ اللہ

تعالیٰ مصلحتیں صرف وہ ہی جانتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اس پروردگار عالم نے اسے اتنا نوازا تھا کہ وہ جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔

ایک بہترین ہم سفر، پیارا سا بیٹا اور پر سکون زندگی۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ بہت سی خوشیاں اس کی منتظر تھیں مگر کبھی کبھی دل میں اک میٹھا سا درد عمار کی یاد بن کر ابھرتا تھا اور ایمان زندگی کی بہت سی رنگینیوں میں خود کو مصروف کر لیتی۔

وہ بہت خوش تھی اور اس نے صرف اللہ کی رضا کی خاطر کسی اور کے دل کو بھی مطمئن اور سرشار کر دیا تھا۔ اس نے اپنے جگر کا ٹکڑا، اپنا پیارا تین ماہ کا بیٹا زونہ کی گود میں ہمیشہ کے لئے ڈال دیا تھا۔ تمام نفرتیں، اذیتیں، تکلیفیں بھلا کے اس نے محبت اور وسیع القلبی کی ایک عظیم مثال قائم کر دی تھی۔ کبھی کبھی حاشر بڑے موڈ میں اسے چھیڑتا تھا۔

کم از کم دوسرا بے بی آنے تک تو عمان کو میرے پاس رہنے دیتیں۔“ اور ایمان کھکھلا کر ہنس دیتی تھی۔ ایمان کی مسکان حاشر کے ارد گرد پھول ہی پھول کھلا دیتی۔ یوں محسوس ہوتا گویا صحرا میں ابر رحمت برسے لگا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## کچھ دن لگیں گے

”کومی پتر! دیکھ تو برساتی میں کوئی لکڑی بچی ہے۔“ عصر کے وقت سے لے کر اب تک خالہ نے کم و بیش سولہویں دفعہ ٹھٹھرتے، کانپتے ہوئے پوچھا تھا۔

خالہ کا بار بار لکڑیوں کے بارے میں سوال کرنا کومی کو بری طرح سے تپا گیا۔

”کب سے ٹیپ بجائے جا رہی ہو خالہ! ایک ہزار ایک مرتبہ تو بتا چکی ہوں۔ صبح کا چولہا جلانے کے لئے لکڑی رکھی ہے۔ کل دہشت خان سے کہوں گی، بالن کاٹ کر دے جائے، یہ کمینہ بھی نہ جانے بغیر بتائے کہا دفغان ہو گیا ہے۔“

”دہشت خان، کہا گیا ہے؟“ خالہ نے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے خود کو لحاف میں دبا لیا تھا، مگر ٹھنڈ تھی کہ ہڈیوں، پسلیوں میں گھس رہی تھی۔ باہر برف باری کی شدت میں جیسے ہی اضافہ ہونے لگتا تھا۔ کمرے کی چھت اور دیواریں تک برف کا بلاک بن جاتی تھیں۔ ایسے موسم میں لکڑی ان جیسے سفید پوشوں کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ پہلے تو دہشت خان خاصی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالن روزانہ ہی تقریباً یل آتا تھا۔ مگر پچھلے ایک دو روز سے وہ بھی نہ جانے کہاں تھا۔

”کومی!“ خالہ نے ایک مرتبہ پھر نحیف سی آواز میں پکارا۔ کومی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”پتر! سو گئی ہو کیا؟“

”بولو خالہ! کانوں سے سنتی ہوں۔ ناس ماری نیند اس ٹھنڈ میں بھلا آئے گی۔“ لحاف سے ایک سلگتی آواز برآمد ہوئی۔

”دہشت خان اتنے روز سے کہاں ہے؟“ خالہ کی سوئی اب دہشت خان میں اٹک چکی تھی، اور اب کومی جانتی تھی کہ نہ جانے کتنے ہی گھنٹے دہشت خان کی گردان ہوگی۔

”مجھے بتا کر نہیں گیا۔“ وہ جل بھن کر بولی۔

”کہیں بیمار نہ پڑ گیا ہو، بغیر بتائے تو کہیں نہیں جاتا۔“ خالہ کے لہجے میں واضح پریشانی تھی اور اس پریشانی کی اصل وجہ یہ تھی کہ دہشت خان اگر سویرے بھی نہ آیا تو لکڑیاں کہاں سے آئیں گی۔ انگلیٹھی کیسے تپے گی؟ چولہا کیسے چلے گا؟

”ارے، یہ تو میں نے بھی نہیں خیال کیا۔ وہ بیمار نہ ہو۔“ کومی سوچ میں پڑ گئی۔

”نمونہ ہوا ہوگا۔ پچھلے سال بھی ہوا تھا۔“ خالہ بے حد و ثوق سے بول رہی تھیں۔

”اللہ نہ کرے“ وہ دہل کر رہ گئی۔ ”دہشت خان بیمار ہوا تو سچ مچ ہماری قلفی جم جائے گی خالہ! اب میں کم از کم کلہاڑی لے کر درخت کاٹنے تو نہیں جاؤں گی۔“ اس نے گویا وارننگ دے ڈالی تھی۔

”رب خیر کرے۔“ خالہ نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”تو صبح اس کے گھر پتا کر کے آنا۔“

”جاؤں گی، ضرور جاؤں گی، اب سو جاؤ خالہ۔“ کومی نے شاید کروٹ بدل لی تھی۔ چار پائی کے چر چرانے کی آواز آئی تھی۔



”نہیں نہیں آرہی پتر!“ خالہ نے گویا بے بس سی آہ بھری۔ ”ٹھنڈ تو لگتا ہے میری رضائی میں گھس گئی ہے، تو اطمینان سے پڑی ہے، واہ کیسی موج ہے۔“

”تو میں کیا کروں؟“ کومی کو بھی غصہ آگیا۔ ویسے بھی اس کا غصہ تو ناک پر دھرا رہتا تھا۔

”مجھے چائے بنا کر دے۔“

”چینی نہیں ہے۔“ کومی نے سلگ کر کہا۔

”بغیر چینی کے پی لوں گی، پہلے بھی تو پی ہے۔ یہاں کون سا چینی کی بوریاں دھری رہتی ہیں۔“ خالہ نے تیکھے انداز میں بتایا۔

”میرے باپ کی شوگر مل چلتی ہے نا۔ بوریاں میں نے اسٹور کر رکھی ہیں۔

روکھے سوکھے ویلے وقت کیلئے۔“ وہ بھی کومی تھی۔ ادھار رکھنے کی قائل ہر گز نہیں تھی۔

”وہ نشئی تو اپنے جوگا نہیں تھا۔ کوئی ایک گن بھی نہیں تھا تیرے باپ میں، اسی لئے رب نے اسے رزق بھی تر سا تر سا کر دیا تھا۔ کمبخت، ناشکرا، بے قدر۔“ ہمیشہ والا راگ اپنے کے لئے خالہ فل موڈ میں آچکی تھیں۔

”بس کرو خالہ! بخش دو میرے باپ کو، اس کی روح تلملا رہی ہوگی۔“ کومی کو ہنسی آگئی۔

”مویا جہنمی، دوزخ میں سڑ رہا ہوگا۔“

”تم تو گویا ابا سے ملاقات کر کے آئی ہو خالہ!“ کومی سے سکھ کا سانس لیا تھا کہ خالہ کا دھیان بٹ گیا ہے۔

”کومی! آج بہت ٹھنڈ ہے نا۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھیں۔ بجتے دانت اور کپکپاتا وجود کسی اور بات کو سوچنے ہی کہاں دے رہے تھے۔

”صبح، شام برف پڑتی ہے، ٹھنڈ تو ہوگی۔“ کچھ سوچ کر کومی لحاف ہٹا کر اٹھ

بیٹھی۔ کمرے کے ایک کونے میں بہت پرانی دادی کے وقت کی پیٹی رکھی

تھی۔ وہ شٹر پڑ کرتی پیٹی تک آئی۔ پیٹی کے اوپر سے سامان اتارا۔ لکڑی کی

صندوق، پلاسٹک کی ٹوکری، جس میں تہہ کیے کپڑے رکھے تھے۔ پانی کا کولر، شہر سے نئی نکور منگوائی گئی استری۔ اور خالہ کی دوائیاں وغیرہ۔ پھر پیٹی کھول کر ایک اور رضائی نکال کر خالہ کے اوپر پھیلا دی۔

”کومی پتر! یہ تو نے کیوں نکالی، اگر کوئی پروہنا آگیا تو کیا پڑوسیوں سے مانگیں گے۔ نئی نکور ویلوٹ کی رضائی ہے۔ لے کے میرے اوپر ڈال دی۔“ خالہ نے گرم اور بھاری سی چیز خود پر محسوس کر کے لحاف سے باہر منہ نکال کر دیکھا تھا۔ ”اسے تہہ کر کے رکھ دے۔ گھر میں نیا بستر تو لازمی ہونا چاہیے۔“

”ہماری کٹیا میں کس نے آکر رہنا ہے خالہ! اگر کوئی آ بھی گیا، بھولے بھٹکے سے تو ایک بستر تو رکھا ہی ہے۔“ وہ اطمینان سے دوبارہ لحاف میں گھس گئی۔

”اگر ایک سے زیادہ مہمان ہوئے تو۔“

”تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب آرام سے سو جاؤ خالہ! کومی نے بے زاری سے کہا۔

”نیند آئے تو سوؤں گی۔“ خالہ اس سے بھی زیادہ بے زار تھیں۔

”کیوں؟ اب کیا مصیبت ہے۔ ٹھنڈ کا انتظام تو کر دیا ہے۔“ کومی نے ناگواری سے کہا۔

”دل گھبرا رہا ہے۔“ خالہ نے ایک اور شگوفہ چھوڑا۔

”تو میں کیا کروں؟ ٹھنڈ کا علاج تو کر دیا ہے۔ اس گھبراتے، اڑی کرتے دل کا کیا کروں؟“ کومی کو غصہ آگیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ خالہ جان بوجھ کر گفتگو کو طول دے رہی ہیں، تاکہ نیند کی رسیا کومی سو ہی نہ جائے۔

”کومی! او کومی۔“ خالہ نے دو، تین مرتبہ آواز لگائی تھی، مگر کومی بھی شاید جان بوجھ کر سوتی بن گئی تھی۔

”ایک تو آنکھ بند کرتے ہی دھت ہو جاتی ہے، سن تو“ خالہ نے گویا التجا کی۔

”کیا ہے خالہ! خود تو دن کو لحاف میں دبک کر سوئی رہتی ہو۔ مجھے مرغ کی بانگ کے ساتھ اٹھنا ہوتا ہے، پتا تو ہے تمہیں پھر بھی۔“ وہ لمبی لمبی جمائیاں روکتے ناگواری سے بولی۔

”میرا دل پھڑک رہا ہے، ذرا اٹھ کر دیکھ تو۔“ خالہ نے لجاجت سے کہا۔

”نہ میں حکیم ہوں، نہ ڈاکٹر، تو پھر کیسے سینے کے اندر پھڑکتے دل کو دیکھ کر بتاؤں کہ رات کے اس پہر یہ کیوں پھڑک رہا ہے۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”مجھے کچھ کھانے کودے، شاید بھوک کی وجہ سے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

خالہ نے گھبراہٹ کا اصل متن بیان کر ہی دیا۔

”تمہارا معدہ رات دن نہیں دیکھتا۔ بس مچل جاتا ہے کچھ نہ کچھ کھانے کو۔“

کومی کی بے زاری عروج پر پہنچ گئی۔

”چل رہے دے، خالی پیٹ پہاڑ جتنی رات گزار لوں گی۔“ خالہ نے خود پر

مظلومیت طاری کر لی۔

”کیاں دوں؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”اندھ تو عصر کے وقت کھا لیا تھا آپ نے، پاپے بھی چائے کے ساتھ نوش فرمائے تھے۔“ ”ٹین میں دیکھ نا، میٹھے بسکٹ رکھے ہوں گے۔“ خالہ کی یادداشت کھانے پینے کے معاملے میں غضب کی تھی۔

”دیتی ہوں۔“ گرم لحاف سے نکلنا کسی عذاب سے کیا کم تھا۔ مگر خالہ بھی بغیر پروا کیے رات دن اس کی پریڈ کرواتی رہتی تھیں۔ کومی نے ٹین کھول کر اندر جھانکا۔ نمکو اور تھوڑی سی مونگ پھلی بھی رکھی تھی۔ دو عدد دیسی انڈے بھی تھے۔ خالہ کو تھمائے تھے اور پھر خود چار پانی کی طرف بڑھنے لگی تھی، تب خالہ نے مری مری آواز میں کہا۔

”سوکھے بسکٹ حلق میں پھنس جائیں گے کومی۔“

”پانی دوں۔“ اس نے جان بوجھ کر جگ اٹھا کر گلاس میں پانی بھرا۔

”ٹھنڈا ٹھار پانی پی کر میں نے مرنا ہے۔“ خالہ نے شاید منہ پھلا لیا تھا۔

”تو پھر؟“ وہ کلس کر رہ گئی تھی۔ جانتی تھی کہ خالہ کو چائے کی طلب ستا رہی ہے۔

”مجھے چائے بنا کر دے۔“ انہوں نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔

”بغیر چینی کے۔“ اس نے گہرا طویل سانس خارج کیا۔ ”آپ کے حلق سے میٹھے کے بغیر چائے اتر جائے گی؟“

”تو کیا ہوا۔“ خالہ نے اس کے سارے بودے بہانے چٹکی میں اڑا دیے۔

”میٹھے بسکٹ جو ہیں۔“

”بنا دیتی ہوں۔“ وہ جلتی بھنتی رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔ رسوئی کا دروازہ

برآمدے میں کھلتا تھا۔ وہ باہر نکلی تو شدید تیز کٹیلی ہوا نے اس کے بدن کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔ برف روئی کے گالوں کی طرح آسمان سے گر رہی تھی۔ چھوٹا

ساحن جس کی چھوٹی چھوٹی چار دیواری کے پار کا منظر بھی خاموش اور

اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے رسوئی میں گھس گئی۔ دروازہ

بھی بند کر لیا۔ مگر آگ جلانے میں اسے ہمیشہ کی طرح دقت کا سامنا کرنا پڑا

تھا۔ لکڑیاں اگرچہ سوکھی ہوئی تھیں۔ تاہم سردی کی شدت کے باعث ان میں موجود نمی کی وجہ سے آگ جلانا مشکل تھا۔ تھوڑا سا تیل ڈالا، تب جاکر آگ روشن ہوئی تھی اور کچھ دیر بعد سکون دینے والی حرارت نے ٹھنڈ کی شدت میں کمی کر دی۔

خالہ کے بڑے سے پسندیدہ پیالے میں چائے ڈال کر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو خالہ کو اپنا منتظر پایا۔

”اتنی دیر لگادی؟“ خالہ نے طنزیہ کہا۔ ”میں نے سمجھا پائے چڑھانے لگی ہو۔“

”گیس کے چولہے پر بنا کر لارہی ہوں۔ اسی لئے دیر ہوگئی۔“ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ گئی۔

”اپنے لئے بھی بنا لاتی۔“ خالہ چائے کی طرف متوجہ تھیں۔

”مجھے رات بھر جاگ کر پہرہ نہیں دینا۔“ وہ رضائی میں دبک گئی تھی۔

”ایک بسکٹ ہی کھالے۔“

”مجھے کچھ بھی نہیں کھانا۔“

”سونے لگی ہو؟“

”نہیں۔“ وہ طنزیہ بولی۔

”اچھا..“ خالہ بے طرح سے خوش ہو گئیں۔ ”ٹھیک ہے، دیر تک باتیں کریں گے۔ یہ موا بڑھاپا آتا بعد میں ہے، نیند پہلے چرا لیتا ہے۔“

”کس قسم کی باتیں۔“ کومی پر نیند طاری ہونے لگی تھی۔

”ہر قسم کی۔“ خالہ سوچ میں گم ہو گئیں۔ ”کومی! دہشت خان کی ماں کو پھر سے ساتواں مہینہ ہے۔“ موضوع گفتگو کوشش کے بعد انہوں نے ڈھونڈ ہی لیا تھا۔

”تو میں کیا کروں؟“ وہ غنودگی میں چلی گئی۔

”یہاں کی عورتوں کی تو مت ہی ماری گئی ہے۔ دو ماہ بعد بیٹی بھی بچہ جنے گی

اور ماں بھی۔ دونوں کا چھلہ آگے پیچھے ہوگا، فٹے منہ۔“ خالہ نے آخری

بسکٹ چائے میں ڈبویا تھا، مگر بد قسمتی سے وہ چائے میں ہی رہ گیا۔

”ہائے یہ کیا ہوا؟ کیسے نکالوں؟“ وہ سخت بد حواس ہو گئیں۔ ”کومی! او

کومی!“ خالہ نے یکے بعد دیگرے کئی آوازیں دیں۔

”کومی! مر گئی ہے کیا، سنتی کیوں نہیں۔“ خالہ کو سخت تاؤ آگیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”دیکھ تو بسکٹ چائے میں ڈوب گیا ہے، اب کیا کروں۔“ وہ بے حد غم زدہ تھیں۔ جواب ندارد۔ وہ سچ مچ سوچکی تھی۔

”مجھے اور دے نا۔“ خالہ کہنے لگیں۔ کومی! اے کومی، اٹھتی ہے کہ لگاؤں دو

ہاتھ۔“ انہیں شدید غصہ آگیا۔ ذرا سا جھک کے نیچے سے جوتا اٹھایا تھا۔ پھر کچھ

سوچ کر دوبارہ رکھ دیا۔ وہ تو لحاف میں دبکی ہوئی تھی۔ انہوں نے دائیں بائیں

دیکھا چار پائی کے پاس ان کی لاٹھی پڑی تھی۔ جو ہمیشہ ان کے قریب ہی



پڑی رہتی تھی۔ لاٹھی اٹھا کر لحاف کے اوپر دے ماری۔ کومی دہل کر اٹھ بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا خالہ؟ ہائے ربا! میرے اوپر کیا گرا۔“ وہ بد حواس سی ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ پھر خالہ کے ہاتھ تک نظر گئی تو گویا سب کچھ سمجھ میں آگیا۔

”اب کیا ہے؟“ کچی نیند کی سرخی لئے آنکھیں غضب ناک ہو گئیں۔

”یہ پیالے میں بسکٹ گر گیا ہے، کیسے نکالوں؟“ انہوں نے معصومیت سے کہتے ہوئے پیالہ آگے کر دیا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ تکیے پر سر رکھے دوبارہ لیٹ گئی۔ دماغ ایک دم چکرا کر رہ گیا تھا۔

”اسے کہتے ہیں، جس سے تو حلوہ کھلاتی ہے مجھے اور دلیہ بھی۔“ انہوں نے بہت زور ڈالا تھا ذہن پر، مگر کمبخت کا نام یاد ہی نہیں آیا۔

”چمچہ چاہیے؟“ کومی چار پائی سے اٹھ گئی۔ جانتی تھی جب تک انہیں مطلوبہ چیز نہ ملی اسی طرح وقفے وقفے سے آواز لگاتی رہیں گی۔ رسوئی کے بجائے اس نے بڑے سے خاکی ڈبے کو کھول کر پلاسٹک کے ڈنر سیٹ کا نیا چمچ نکال کر دیا۔

”یہ کیوں دیا ہے؟ یہ برتن تو مہمانوں کے لئے ہیں۔“ خالہ نے ہمیشہ کی طرح جرح کرنا شروع کر دی۔

”ابھی اپنا کام چلاؤ اس چمچے سے۔“ وہ غصے سے پھنکاری۔

”غصہ کیوں کھاتی ہے، سو جانا۔“ خالہ نے نرم اور پلپلے سے بسکٹ کو چائے میں نکال کر رکھا لیا تھا۔ پیالہ بھی خالی کر کے رکھ دیا۔ اب وہ اطمینان سے لیٹ چکی تھیں۔ ان پر اونگھ طاری ہونے لگی تھی۔ تبھی کومی پر بھی احسان عظیم کیا گیا تھا۔ کومی نے جلتے بجھتے کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

نہ جانے رات کے تیسرے پہر کا کون سا وقت تھا۔ جب دروازے پر شدید قسم کی دستک ہوئی۔ یوں لگتا تھا دروازہ کھٹکھٹانے والا اسے توڑنے کے ارادے سے آیا ہے۔

”یہ کون آگیا؟“ وہ دونوں ہی ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ کومی نے پاس رکھا چھوٹا سا ٹائم پیس اٹھا کر وقت دیکھا۔

”کوئی ضرورت نہیں دروازہ کھولنے کی۔“ خالہ پر شدید خوف طاری تھا۔ ”کوئی چور اچکانہ ہو۔“

”چور، اچکا دیوار پھلانگ کر آتا، یوں دستک تو نہ دیتا، نہ جانے کون ہے۔“ کومی خود فکر مند تھی۔

”ڈاکو ہوں گے۔“ خالہ کو گویا پکا یقین تھا۔

”ہمارے گھر سے کیا لوٹنا ہے۔“ وہ استہزائیہ ہنسی۔

”کیوں؟ یہ قیمتی استری، یہ نیا نکور ڈنر سیٹ، تمہارا ٹیم پیس، ساجدہ (کومی کی ماں) کی سلائی مشین، یہ پتیلیاں، دیگچے، ہائے یہ نیا نکور بستر۔“ خالہ نے گھر کی قیمتی چیدہ چیدہ اشیاء انگلیوں پر گنوا دیں۔

”ڈاکوؤں کے معیار بدل گئے ہیں خالہ! اب وہ کیش مانگتے ہیں، زیور اور نقدی لیتے ہیں۔“ کومی کا دھیان ابھی تک بجتے دروازے کی طرف تھا۔

”باہر اس قدر برف پڑ رہی ہے، کون احمق ہے آخر؟ یہ کوئی وقت ہے گرم بستروں سے نکلنے کا۔“ وہ مسلسل بول رہی تھی، تاکہ خالہ کا خوف کچھ کم ہو۔

”کوئی مسافر یا پردیسی نہ ہو۔“ کومی کی سوئی ایک جگہ اٹک گئی۔ ”میں دیکھتی ہوں۔“

”رک جا کومی! خالہ پکارتی رہ گئیں، کومی نے چٹخنی گرا دی تھی۔“

”اری، یہ میری لاٹھی ساتھ لے جا۔“

”میں کسی کو قتل نہیں کر سکتی خالہ!“ وہ بجتے دانتوں کو سختی سے ایک دوسرے پہ جمائے کہہ رہی تھی۔

”اور کوئی بے شک تیری گردن مروڑ کر دروازے پر ہی پھینک جائے۔ مجھے تو خبر بھی نہیں ہوگی، بستر پر پڑی چلائی رہوں گی، لولی، لنگڑی ہوں، اٹھ تو سکوں گی نہیں، صبح تک تو ویسے بھی برف میں دفن ہو چکی ہوگی۔ آخری رسومات پر جو پیسے خرچ ہونے ہیں، ان کی تو بچت ہوگی۔“ خالہ بڑ بڑا رہی تھیں۔ کومی باہر نکل آئی۔ ایک دفعہ پھر کڑا امتحان، آج کی رات تو اس کی اچھی خاصی پریڈ ہو گئی تھی۔ سفید برف نے زمین کا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ آنگن میں لگے پودے تک برف کی چادر میں چھپے ہوئے تھے۔ کونے میں ایک طرف نل لگا تھا، جس کا پانی بھی یقیناً اس وقت برف ہو رہا تھا۔

وہ ان پہاڑوں کے درمیان زندگی کے بہت سال گزار چکی تھی۔ برف سے اور ان سنگلاخ پہاڑوں سے آج تک کومی کو خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ خود کو ان پہاڑوں کی بیٹی سمجھتی تھی۔ اس کے مزاج میں

بھی پتھروں کی سی سختی تھی۔ وادی کے لوگ اس کے منہ لگنے سے کتراتے تھے۔ بچے اسے دیکھ کر گھبرا جاتے۔ سرد علاقے کی باسی کوئل بخت یار کا مزاج بھی اس برق کی طرح تھا، ٹھٹھرا دینے والا، لہو تک کو منجمد کر دینے والا، نرم اور گرم جذبات اس پر اثر نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس کا دل ایک وسیع سرد خانہ تھا۔ جس کے عین وسط میں کسی کی قبر بنائی گئی تھی۔ اس قبر کی نرم مٹی پر اس کے وہ آنسو گرتے تھے جنہیں زمانے کی نظر سے چھپا کر وہ چپکے چپکے بہاتی تھی۔

دروازے پر دستک کی رفتار میں کمی آتی چلی گئی تھی۔ کومی عین دروازے کے سامنے رک چکی تھی۔ اس نے کندھی پر ہاتھ رکھا تھا اور اپنے مخصوص سرد لہجے اور پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

”کون؟“

”یا اللہ! تیرا شکر، کسی انسان کی آواز تو سنائی دی ہے۔“ دوسری طرف سے آتی مردانہ آواز میں تشکر کی نمی تھی۔

”کون ہے؟“ کومی نے اپنا سوال دہرایا۔

”مسافر“ بڑی عاجزی کے ساتھ کہا گیا تھا۔

”پناہ چاہیے؟“

”مہربانی ہوگی۔“ آواز میں شدید قسم کی سکیپاہٹ تھی۔ ”مجھے دہشت خان نے ادھر بھیجا ہے۔“ ساتھ وضاحت بھی کی گئی تھی۔ اب کہ کومی سچ مچ چونکی۔

”اچھا... اچھا“ کومی کو گویا بے ساختہ خوشی کے احساس نے چھوا۔ ”گیسٹ روم میں ٹھہرو گے؟“

”جی...“

”نام کیا ہے تمہارا؟“

”خیل خان... سرخیل خان“ سبھی خیال خان کے نام سے پکارتے ہیں۔“

انکساری کے ساتھ ٹھٹھرتے ہوئے وضاحت کی گئی۔

”ہاں، تو خیل خان! کرایہ کتنا دو گے؟“ گیٹ پر کھڑے کھڑے وہ حساب کتاب کرنے لگی تھی۔

”ایک کمرے کا پندرہ سو۔“ خیل نے قدرے جھنجلا کر کہا۔ ”دروازہ تو کھولے محترمہ۔“

”پندرہ سو کم ہیں، تم روٹی بھی تو ادھر سے کھاؤ گے، اس کے پندرہ سو الگ۔“ وہ بھی پکی منیجر تھی۔

”ٹھیک ہے جناب! اندر تو آنے دیں۔“ بڑی شائستگی سے درخواست کی گئی تھی۔

”کہاں سے آئے ہو؟“ ایک اور سوال۔

”کوہاٹ سے۔“

”کب تک رہو گے؟“ انٹرویو کا آغاز ہو چکا تھا۔

”کام پر ڈپینڈ کرتا ہے۔“

”کیسا کام؟ کیا شہر میں لنڈا لگاؤ گے؟“ اس سے پہلے دو لوگ ایسے رہائش پذیر تھے، جو لنڈے کے کاروبار سے منسلک تھے۔ وہ اپنا سیزن چمکا کر کسی اور شہر روانہ ہو گئے تھے۔ اور کومی کی آمدن کا ذریعہ ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔

”نہیں... میں نے شہر سے کچھ فاصلے پر زمین خریدی ہے، گیس اسٹیشن بناؤں گا، کام شروع ہو چکا ہے۔“ وہ شاید رو دینے کو تھا، مگر اسے اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ انٹرویو دیے بغیر دروازہ نہیں کھلے گا، چاہے وہ سردی کی شدت سے قلفی بنے یا برف کا گولا۔

”گیس اسٹیشن۔“ چند لمحے غور و فکر میں ضائع کیے گئے۔ “گاڑیوں میں گیس بھرو گے؟“

”یہ ہی سمجھ لیں۔“

’پہلے کہاں رہتے رہے ہو؟‘ ایک اور سوال۔

”شہر میں، ہوٹل میں کمرہ بک کروایا تھا۔“ خیل خان کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا سر اس لوہے کے پھاٹک سے دے مارے۔

”کرایہ زیادہ ہو گا۔ اسی لئے ادھر کو دوڑے ہو؟“ کومی نے طنزیہ کہا۔

”پندرہ سو میں اتنا اچھا ٹھکانا مل جائے تو اور کیا چاہیے۔“

”جی نہیں، یہ جگہ میرے گیس اسٹیشن سے قریب ہے، آنے جانے میں بہت وقت لگتا تھا، اسی لئے یہاں آیا ہوں، آپ کو زحمت دینے کے لئے۔“ وہ تلملا کر بولا۔

”نہیں... زحمت کیسی۔“ کومی شان بے نیازی سے کہا گیا۔ ”یہ بتاؤ، چھڑے چھانٹ ہو؟“

”اللہ نہ کرے پورا خاندان رکھتا ہوں۔“ وہ برا مان گیا۔

”کتنے بچے ہیں؟“ کومی نے شاید آخری سوال پچھا تھا۔ اس کی تسلی ہو چکی تھی۔

”بچے؟“ وہ سوچ میں گم ہو گیا۔



”بہت زیادہ ہیں کیا؟ گننے لگے ہو؟“ کومی نے اپنے ازلی منہ پھٹ انداز میں جتایا۔

”ایک بھی نہیں۔“ خیل خان کو بھی غصہ آگیا۔

”شادی ہوگی تو بچے ہوں گے نا۔“ وہ گویا پھٹ پڑا۔

تمہاری شادی نہیں ہوئی؟“ صدمے کے مارے کومی کے منہ سے پھٹی پھٹی آواز نکلی۔

”نہیں“ وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا۔

”اچھا“ کومی سوچ کر بولی۔ ”تم یہاں رہنے کے اہل نہیں ہو سکتے“ میں چھڑوں کو کمرہ کرائے پر نہیں دے سکتی۔“ اس نے گویا اپنا فیصلہ سنایا۔

”محترمہ! یہ ظلم مت کیجئے، پلیز“ مجھ پر ترس کھائیے، ٹھنڈ میری ہڈیوں کے گودے میں گھس گئی ہے، مجھے یہاں کھڑے کھڑے ایک سو چار بخار ہو گیا ہے۔ شادی نہ ہونا میرا جرم ٹھہرا۔ یہ سراسر میرے والدین کا قصور ہے۔ میں

کیسے بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دوں کہ پہلے سر پر سہرا سجائیں، جبکہ میرے بڑے دو مسیر (دو کزن) دو چاچے، دو مامے ابھی کنوارے بیٹھے ہیں۔“ وہ چٹختے ہوئے بولا تھا۔ دوسری طرف دبیز خاموشی چھا گئی تھی۔ سرخیل خان کی سن انگلیوں میں دستک دینے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ برف کے ڈھیر پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ کومی سچ مچ واپس آگئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ خود ہی واپس چلا جائے گا۔ مایوس ہو کر۔ وہ گرم کمرے میں داخل ہوئی تو خالہ اسے دیکھتے ساتھ ہی پھٹ پڑیں۔

”میں تجھ پر فاتحہ پڑھ کے بیٹھ گئی۔ خوف کے مارے جان نکلی جا رہی تھی میری۔“

”کہ بھانجی کے بعد خالہ کی باری نہ آجائے۔“

”بک بک نہ کر، یہ بتا، باہر کون تھا؟“ خالہ کو یہ ہی جاننے کی بے چینی تھی۔

”دہشت خان نے کرائے دار بھیجا تھا۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”تو وہ کہاں ہے۔“ خالہ کی بانچھیں کھل گئیں۔

”میں نے بھیج دیا۔“

”ہیں، تیرا دماغ تو ٹھیک ہے“ خالہ اچھل پڑیں۔ ”واپس کیوں بھیجا؟“

”چھڑا چھانٹ تھا، نہ بال، نہ بچہ۔“ اس نے ہاتھ جھاڑے۔

”ہائے یہ کیا غضب کیا کومی! جا اٹھ بلا کر لا اسے، ہمارا تو چولہا ہی کرائے

داروں کے دم سے جلتا ہے۔ دیکھ وہ ابھی کھڑا ہے، دستک کی آواز آرہی

ہے۔“ خالہ کے کان خوا مخواہ بجنے لگے۔ ”اٹھ بھی پتر!“ اب وہ التجائیں

کرنے لگی تھیں۔

”وہ کنوارا ہو رنڈو! بیابا ہو، ہمیں اس سے کیا غرض، ہمارا تو چولہا ٹھنڈا پڑا

ہے۔ میری دوائی مہینے کا راشن، ہائے کومی! یہ تو نے کیا غضب ڈھایا۔ مہینوں

بعد تو کوئی ادھر کا رخ کرتا ہے۔“ خالہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ ان تلخ

حقیقتوں سے نظر بھی تو نہیں چرائی جاسکتی تھی۔ آمدن کا یہ واحد ذریعہ تھا۔

جس کی ابتداء ماں نے کی تھی۔ اماں کے کچھ زیورات تھے، جنہیں بیچ کر ایک

ہی قطار میں تین کمرے بنوائے گئے تھے۔ ساتھ ہی ایک غسل خانہ تھا۔ نہ

جانے اماں کے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا تھا۔ اپنی بساط کے مطابق یہ چھوٹا

ساگیسٹ ہاؤس ان متوسط اور مڈل کلاس مزدورہ پیشہ لوگوں کے لئے تھا، جو

شہر میں نہ تو کسی ہوٹل میں کمرہ بک کروا سکتے تھے اور نہ ہی کسی فرنشڈ

گیسٹ ہاؤس میں قیام کرنا افورڈ کر سکتے تھے۔

اس کا گھر شہری حدود کے قریب قریب تھا۔ پہاڑی کے اوپر چھوٹا سا یہ مکان

پلس گیسٹ ہاؤس بہت سے غریب، سفید پوش چھوٹے پیمانے پر کاروبار کرنے

والوں کے لئے کسی محل سرا سے کم نہیں تھا۔ اور ابا، اماں کے جانے کے بعد

کومی اور اس کی سگی خالہ کی روزی روٹی کا وسیلہ بھی تھا۔

”کومی! اٹھو بھی، کہیں وہ چلانہ جائے۔“ خالہ کی آواز اسے سوچوں کے بھنور

سے کھینچ لائی تھی۔

”اگر وہ ضرورت کے تحت آیا ہے تو پتر! مجبور تو ہم بھی ہیں۔“

”اب تک تو وہ جا چکا ہوگا۔“ کومی کو اپنی بے عقلی پر جی بھر کے تاؤ آیا۔

”ایک دفعہ دیکھ تو سہی۔“ خالہ پر امید تھیں۔ ڈاکوؤں کا خوف ہوا ہو گیا تھا۔ کچھ سوچ کر کومی پھر سے پھاٹک تک چلی آئی۔ بغیر کسی خوف کے اس نے تالا کھول کر باہر جھانکا تھا۔ پھر خود بھی باہر آگئی۔ وہ سامنے ہی تو برف کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔

”اوئے خیل خان! اٹھو“ وہ اس سے قدرے فاصلے پر کھڑی تنک کر بولی۔

”یہاں بیٹھنے پر بھی پابندی ہے۔“ پندرہ منٹ کے ٹھٹھرا دینے والے انتظار کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔ سرخیل خان کو تپ چڑھ گئی۔

”چلو...“ کومی نے اس کا بیگ اٹھا لیا تھا۔ وہ دوسرا بیگ اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔ ”ادھر لائیے۔“

”اٹھا لیتی ہوں۔ پہلے سے ٹھٹھر رہے ہو، گرم مت جانا۔“ وہ بیگ اٹھائے پھاٹک کھولے اس کے اندر آنے کی منتظر تھی۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، نسلی پٹھان ہوں۔“ وہ اکڑ کر بولا۔ ”اپنا بوجھ میں خود اٹھاتا ہوں، لائیے ادھر۔“ سرخیل خان نے اس کے ہاتھ سے بیگ

پکڑ لیا۔ کومی شانے اچکا کر چل دی تھی۔ وہ بھی اس کی پیروی میں ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے میں کم از کم اس کے رہنے کی تو کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا کمرہ، دو چارپائیاں، جس میں سے ایک پر، آنکھوں میں اشتیاق لئے ایک عمر رسیدہ خاتون لیٹی تھیں۔

”یہاں رہنا ہے؟“ وہ دہل کر پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“

”تو پھر؟“ سرخیل خان حیران تھا۔

”خالہ سے ملوانے، جب تک یہ تمہیں دیکھ نہ لیں گی، بچی کھچی رات میں مجھے چین سے نہیں لیٹنے دینا تھا، انہوں نے۔“ وہ وضاحت کر رہی تھی۔

سرخیل خان نے سر ہلا دیا تھا۔ خالہ کو شائستگی سے سلام کیا۔ خالہ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ وہ ان کے خلوص اور اپنائیت بھرے انداز سے خوب

متاثر ہو رہا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس خلوص کا خراج لیا جائے گا یعنی باقی

ماندہ رات خالہ کو انٹرویو دینا تھا۔ بھانجی کو نہ جانے کیا اشارہ کیا تھا۔ وہ پیر پٹختی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

”کتنے بہن، بھائی ہو؟“ انٹرویو کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔

”تین بھائی ہیں۔“ اس نے سادگی سے بتایا۔

”ماں، باپ؟“

”الحمد للہ حیات ہیں۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“

”ہمارا لکڑی کا کاروبار ہے، اس کے علاوہ گیس اسٹیشن ہیں۔ ادھر بھی اسی

سلسلے میں آیا ہوں۔“

”ماشاء اللہ“ خالہ بے ساختہ خوش ہوئیں۔ گیسٹ ہاؤس کی تاریخ میں پہلی

مرتبہ کوئی باحیثیت مہمان آیا تھا، بات تو خوشی کی تھی۔

☆☆☆

”خالہ جی! میں سونا چاہتا ہوں“ وہ سچ مچ رو دینے کو تھا خالہ جی نے سوالوں کے سلسلے کو لمحہ بھر کے لئے منقطع کیا تھا۔ سرخیل خان بار بار چھوٹے سے ٹائم پیس پر وقت دیکھ رہا تھا۔ رات آخری پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک تو شدید سردی، اوپر سے سخت تھکاوٹ، وہ بستر پر گر کے نیند میں گم ہو جانا چاہتا تھا، مگر...

اور وہ اس چھوٹے سے گیسٹ ہاؤس کی مینجر، اونر، ایڈمنسٹریٹر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کم از کم اسے کمرہ تو دکھا دیتی۔ کمرے کی چابی پکڑا دیتی۔ خالہ جی اس کی پریشانی سے قطعاً بے نیاز اپنی کہنے میں مصروف تھیں۔

”خالہ جی! وہ خاتون کہاں ہیں؟“ جب رہانہ گیا تو سرخیل خان نے پوچھ ہی لیا۔

”کومی کا پوچھ رہے ہو؟“

”جی۔“

”میں نے اسے تمہارے لئے چائے بنانے کے لئے کہا ہے۔“

”چائے“ سرخیل خان اس مہمان نوازی پر قربان ہو گیا۔ چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اسے تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ چائے کی خاطر وہ خالہ جی کے تمام سوالوں کے جواب بغیر برا مانے دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

”ہاں، تو میں پوچھ رہی تھی، شادی ہوئی تمہاری؟“

”نہیں جی۔“

”بڑی اچھی بات ہے“ خالہ جی بے ساختہ خوش ہوئیں۔

”کیا اچھی بات ہے؟“

”یہ ہی کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی۔“ خالہ جی نے سادگی سے کہا۔

”جی“ سرخیل خان حیران ہوا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا، اس میں اتنا خوش ہونے کی کیا بات ہے، مگر لحاظ آڑے آ گیا۔

”لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟“ ایک اور معصومانہ سا سوال۔

”جی!“ سرخیل خان نے مسکراہٹ چھپانے کے لئے سر جھکا لیا۔ ”جمع تفریق آتی ہے۔“

”وہ تو سوئم اور دوئم جماعت کے بچوں کو بھی آتی ہے۔“ خالہ نے برا مان کر کہا اور سرخیل خان نے ہونق پن سے خالہ جان کو دیکھا تھا۔

”اسکول کتنا پڑھے ہو؟“

”بی بی اے کیا ہے، پھر کاروبار میں لگ گیا تھا۔ مزید پڑھنے کو دل راضی نہیں تھا۔“

”دو دفعہ بی اے کیا ہے؟ چودہ ایک دفعہ پھر چودہ ایک دفعہ۔“ خالہ جان نے معصومیت سے پوچھا۔

”یہ ہی سمجھ لیں۔“ اس کا انداز جان چھڑوانے والا تھا۔

”کیوں سمجھوں؟ سیدھی طرح کہو بزنس کی کتابیں پڑھی ہیں، مشکل والی۔“



”جی... ای، وہ ہی، جو آپ کہہ رہی ہیں۔“ وہ آج برا ہی پھنسا تھا۔ اور یہ

چائے کا لارا ابھی خالہ جان نے جھوٹا لگا رکھا تھا شاید اتنی دیر میں تو پر

تکلف ڈنر کی ابتدائی تیاری کی جاسکتی تھی۔

”میں سو جاؤں؟“ اس نے پھر سے اجازت چاہی۔

”کیوں؟ چائے کون پیے گا میں تو اتنا بڑا پیالہ پی چکی ہوں“ خالہ نے ناراضگی

سے جتایا۔

”کیا وہ محترمہ سری لنکا سے پتی لینے چلی گئی ہیں؟“ وہ عاجزی سے پوچھ رہا

تھا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بخار تھکاوٹ کی وجہ سے تھا۔

اتنے دن ہو گئے تھے۔ وہ ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا۔ آرام نہیں کر سکا تھا۔ گیس

اسٹیشن کا کام برف باری کے آغاز سے پہلے ہی مکمل کر لیا گیا تھا۔ تاہم اس کی

رہائش کے لئے کابینے تعمیر کیا جا رہا تھا۔ جو خرابی موسم کی وجہ سے روکا جا چکا

تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی گیسٹ ہاؤس میں قیام کی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ

سہولتوں سے مبرا یہ گیسٹ ہاؤس اس کے دفتر سے قریب تھا، اور تیسری

وجہ۔

”پتی بھی ٹین کے ڈبے میں رکھی ہے اور دودھ بھی موجود ہے۔ اسے سری

لنکا جانے کی اس وقت کیا ضرورت پڑی ہے۔ سری لنکا تو اس وقت بند

ہوتی ہے۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھیں۔

”پپو سری لنکا کو صبح دس بجے سے پہلے نہیں کھولتا۔

موا، ہڈ حرام رضائی میں گھسا رہتا ہے۔“ ان کے خیال میں سرخیل خان نے

دکان کو انگریزی میں سری لنکا کہا تھا۔ سرخیل خان سمجھ کر بے ساختہ مسکرا

اٹھا۔

”تو کیوں ہنس رہا ہے۔“ خالہ کی نظر بھی بلا کی تیز تھی، ”چپکے چپکے تو تب

ہی ہنسا جاتا ہے، جب بندے کو وہ ہو جاتی ہے۔“ وہ عینک درست کرتی

ناراضگی سے بولیں۔

”کیا ہوتی ہے؟“ سرخیل خان نے گویا خوب ہی لطف لیا۔

”وہ ہی جو کومی کو حماد خان سے تھی۔ بلکہ ہے، میری مانتی نہیں۔ ورنہ میں تو چاہتی تھی کومی اپنی زندگی کی اس ڈولتی نیا کو پار لگالے۔“ خالہ کے چہرے پر آن کی آن میں زردیاں چھا گئیں۔ ”اسے کیا کہتے ہیں، جو سب کو ہوجاتی ہے۔ نوجوانوں کو، بوڑھوں کو، حتیٰ کہ بڑھیوں کو بھی، ابھی پچھلے مہینے گل بدن کو بھی ہوئی تھی۔ بے شرم پچپن سال کی مسٹنڈی۔ ہک ہا، چونڈے میں مہندی لگوا بیٹھی۔ بات پکی کے بتاشے جو بٹ چکے ہیں اور ایک میری کومی۔“

”خالہ جان! ٹی بی۔“ سرخیل خان نے ذہن پر زور ڈال کر ان کی مشکل آسان کی تھی۔

”ٹی بی بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کو بھی ہوجاتی ہے، مگر یہ کوئی ناقابل علاج مرض نہیں، گل بدن صاحبہ کو مہندی لگانے اور بتاشے بانٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈاکٹر سے رجوع کرتیں۔“

”ارے نسیں... ٹی بی کہاں؟ تجھے نہیں پتا کیا؟ وہ جو فلموں میں بھی لڑکے لڑکی کو ہوجاتی ہے۔“ خالہ جان نے گویا اپنا ماتھا پیٹا۔

”کون سی فلم میں؟“ وہ مسکراہٹ روکے پوچھ رہا تھا۔

”وہ ہی جو اکشے کمار اور وہ کالی سی لڑکی برف پر لوٹیں لگاتے ہوئے زمانے کو بتا رہے تھے، ہمیں وہ ہوگئی“ خالہ جان نے یادداشت کے سارے خانے کھنگال ڈالے۔

”سردی لگ گئی ہوگی۔ برف پر لوٹیں لگانے سے تو یہ ہی لگ سکتی ہے یا پھر نمونیہ، جو مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ مسکراہٹ ضبط کرنے کے چکر میں لال بھبھو کا چہرہ لئے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مگر پھر بھی ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

”خالہ کی معصومیت، سادگی اور محبت کا مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں۔“ نہ جانے وہ کب دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”جی!“ وہ سر اٹھا کر سامنے کھڑی اکھڑا کھڑی سی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

”محبت... ہاں پتر! تجھے محبت تو نہیں ہوگئی۔“ خالہ بستر سے اس انداز میں اچھلی تھیں یا پھر انہوں نے پہلو ہی اتنے زور سے بدلا تھا کہ بے چاری چارپائی نے چوں چاں کر کے شدید احتجاج کیا۔

”کس سے؟ کیا اس برف سے؟“ اس کا سارا دھیان بھاپ اڑاتے مگ کی طرف تھا۔ ابلے ہوئے دو انڈے اور ایک پلیٹ میں بسکٹ بھی تھے۔ سرخیل خان نے کفران نعمت کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”یہ دوسرا انڈہ بھی کھالو۔“ خالہ جی بڑی اپنائیت سے کہہ رہی تھیں۔

”شکریہ“ میں بس چائے لوں گا۔“ وہ ایک انڈہ اور تین بسکٹ کھا چکا تھا۔  
معدے میں گرمائش پہنچی تو کچھ سکون آیا تھا۔

”مجھے کمرہ دکھا دیجئے۔“ یہ کہنے کی سرخیل خان کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے چائے کا کپ ابھی رکھا تھا جب منیجر صاحبہ نے اسے باہر آنے کا سگنل دیا تھا۔ وہ اس کی پیروی میں ایک کشادہ صاف ستھرے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ یہ کمرہ شاید خاص قسم کے سیاحوں یا مہمانوں کے لئے تھا۔ دو پلنگ، فرش پر سرخ قالین، ریک میں سچی کتابیں، سنگھار میز، تھری سیٹر صوفہ اور ایک کارنر ٹیبل جس کے اوپر

کسی خوش شکل نوجوان کی زندگی سے بھرپور تصویر مسکرا رہی تھی۔

”یہ تمہارا کمرہ ہوا“ جب تک رہنا چاہو، آرام سے رہو، البتہ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے پرہیز کرنا۔“ ہدایت نامہ کھل چکا تھا۔ سرخیل خان چھیڑ چھاڑ کی وضاحت چاہتا تھا، تبھی سادگی سے پوچھنے لگا۔

”میں کسے چھیڑوں گا؟“ نہ تو یہاں نازک اندام باندیاں ہیں، نہ ہی مغلیہ دور کی شہزادیاں، ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا ہوں کہ میں چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کے قبیلے سے نہیں ہوں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں۔“ منیجر صاحبہ کو غصہ آگیا۔ ”اس کمرے میں یہ الماری ہے، اس میں تم کپڑے نہیں رکھ سکتے، اس کے اندر گھسنے کی کوشش نہ کرنا، کتابوں والے اس ریک کو بھی ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔“

”کتابیں ڈیکوریشن کے لئے سجائی ہیں؟“ اس نے پھر سے سادگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”یہ ہی سمجھ لو۔“ تیکھے انداز میں جواب دیا گیا۔

”اور اس ٹی وی کو بھی ہاتھ لگانا منع ہے؟“

”ٹی وی کو ہاتھ لگانے سے بھلا کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ یہ تو خالی ڈبا ہی سمجھ لو، انٹینا گرما کا طوفان لے اڑا تھا۔ پھر لگوانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ویسے بھی ٹی وی سے شغل فرمانے والے گیسٹ ہاؤس میں قیام نہیں کرتے، غریب مسکین لوگ یہاں ٹھہرنے کے لئے آتے ہیں اور ایسی سہولیات وہ افورڈ نہیں کر سکتے۔ تم پہلے مہمان ہو جس نے اس کمرے کا تالا کھلوا دیا ہے۔“ نہ جانے کیوں سرخیل خان کو لگا تھا منیجر صاحبہ کے چہرے پر سائے سے لہرائے ہیں۔

”اور یہ صوفہ؟“ اس نے پھر سے معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں“ وہ ناگواری سے بولی۔ ”اور ایک بات اور بھی سن لو، آج کے علاوہ کل سے جو بھی کھانا پینا یہاں سے ہوگا، اس کا الگ سے بل ادا کرو گے۔“

”جی، جانتا ہوں، اور کچھ۔“ وہ پلنگ پر بیٹھ چکا تھا۔

”ایڈوانس میں ہم ہمیشہ ساری رقم وصول کرتے ہیں۔“ وہ دھونس بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”میں آپ کو ساری نہیں، آدھی رقم ادا کروں گا، کیا ابھی کروں؟“

”نہیں، صبح دیجئے گا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”مہربانی جناب کی۔“ اس نے شاید طنز کیا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی تھی اور وہ ٹھٹھرتے ہوئے رضائی میں گھس گیا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر پھر سے دستک ہوئی۔ اس نے کون سا کنڈی لگانے کی زحمت گوارا کی تھی۔ منیجر صاحبہ کی پھر سے تشریف آوری ہوئی۔ ہاتھ میں کونلوں سے دکھتی انگلی تھی۔ جو یقیناً ہیٹر کی جگہ استعمال کی جاتی تھی، سرخیل خان نے تشکر سے اسے دیکھا۔

”اس عنایت کا شکریہ۔“

”شکریہ قبول کر لیتی ہوں۔“ وہ اپنے سدا کے بے نیاز لہجے میں بولی۔ ”مناہم ایک بات اور واضح کردوں، لکڑی سرما میں اور برف باری کے دنوں میں بہت مہنگی ہو جاتی ہے اسی لئے۔“

”آپ فکر مند نہ ہوں، میرے یہاں قیام کے دوران آپ کو لکڑی خریدنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اس بستی کے اس سب سے بڑے پرابلم سے اچھی طرح سے آگاہ تھا۔ ان دنوں تو لکڑی سونے کے بھاؤ گویا بیچی جاتی تھی۔

”کوہاٹ سے منگوا کر دو گے؟ اس نے شاید طنز کیا تھا۔

”نہیں، لکڑی کی قیمت ادا کروں گا۔“

”ہم کو یہ گوارا نہیں۔“

”مگر کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔

”تمہاری خیرات کے کچھ اور لوگ مستحق ہو سکتے ہیں، مگر ہم نہیں۔“ وہ

ناراضگی سے گویا ہوئی۔ ”جو لکڑی اس انگلیٹھی میں تمہارے لئے استعمال کی

جائے گی، تم صرف اسی کے پیسے دو گے۔“ اس نے گویا وارننگ دی تھی۔

”ٹھیک ہے جناب۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ مزید کچھ کہے بغیر وہ پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

کوئل کے ابا بختیار خان کا کسی زمانے میں بادام کا بڑا چلتا کاروبار تھا۔ گھر میں خوش حالی تھی، کنبہ مختصر تھا، اماں اور ابا کی محبت بھی مثالی تھی، ابا نے کبھی اماں کی کسی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ اماں کی ہر خواہش کو اولیت دی۔ اماں کا کہا کبھی نہیں ٹالا۔ یہ ہی وجہ تھی جب اماں کی چھوٹی بہن بیوگی کے بعد بے آسرا ہو گئیں تو اماں انہیں اپنے گھر لے آئیں اور یہیں سے گویا برے دنوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ ابا کو کسی دشمن نے نشے کی بری لت لگا دی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ نشہ ابا کو دیمک کی طرح چاٹ گیا۔ کاروبار تباہ ہوا تو نوبت فاقوں تک آگئی۔ اماں کی دور اندیشی کے تحت گھر کا چولہا جل پڑا تھا۔ خالہ کو بس ہمیشہ ایک قلق رہا

کہ اس گھر میں انہوں نے بھوک ہی دیکھی۔

ابا کو غلط صحبت نے خاندان بھر سے اور بستی والوں سے دور کر دیا تھا۔ بھوک

اور افلاس نے مت مار کے رکھ دی تھی۔ سننے میں آیا تھا ابا کا سارا کاروبار

قرضوں میں ڈوب گیا۔ ابا رنگین مزاج تھے۔ خالہ بتاتی تھیں کہ کاروبار بھی



اسی لئے ڈوبا کہ ابا کسی عورت کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ اس عورت کی بے وفائی نے ابا کو نشے کی چاٹ لگا دی اور ادھر اماں سوت کے غم کو سہار نہ سکیں اور چل بسیں۔ کومی اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ خالہ نے اپنی آغوش میں اسے ہمیشہ کے لئے چھپا لیا تھا۔ ان دنوں حماد خان پنڈی کے ایک سکول میں زیر تعلیم تھا۔ خالہ نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کے حماد خان کو پڑھایا لکھایا تھا۔ دن رات اجرت پر کپڑے سیے، اماں نے بھی خالہ کا بہت ساتھ دیا تھا۔ حماد خان ان دو عورتوں کا خواب تھا جو اس تیسری عورت کی آنکھ میں آن بسا۔

گھر کے حالات دن بہ دن بگڑتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ ضرورت کی بے شمار چیزیں پیٹ کے دوزخ کو بجھانے کے لئے اماں نے چپکے چپکے بیچ دی تھیں۔ ابا کو گھر تو کیا اپنا بھی ہوش نہیں تھا اور خالہ اکثر کہتی تھیں۔ ”بدبختی پھیرا مارے تو اسی طرح ہوش مند انسان عقل کھو دیتا ہے۔ زندگی بھر میری بہن کو ترسایا، جب وقت نے کروٹ بدلی، خوش حالی کے دن آئے تو خود ہی اپنے ہاتھوں سے لٹا کر بیٹھ گیا۔“

کوئل کو بدلتے حالات نے بہت مضبوط کر دیا تھا۔ اماں اور ابا کے بعد معذور خالہ کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ سارا معاشی بوجھ اس کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔ وہ وادی کے واحد پرائمری سکول میں جماعت پنجم کو پڑھاتی تھی۔ تنخواہ اگرچہ مختصر تھی۔ تاہم ان دو خواتین کا گزارہ مشکل ضرور تھا۔ مگر ناممکن نہیں۔ خالہ کی بیماری اور علاج پر کافی رقم اٹھ گئی تھی۔ اب تو خیر سے خالہ صحت مند تھیں۔ لاٹھی سے چلتی پھرتی بھی تھیں۔ چھوٹی موٹی تکلیفیں تو زندگی کی ساتھی ہوتی ہیں۔ وقت سبک خرامی سے گزر رہا تھا۔ بہتے وقت کے سمندر میں تلاطم آیا تو کب؟

سرما کی اس رات جب آسمان برف برسا رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کے شاید آٹھ بجے تھے، جب دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ اسے بستر کو چھوڑنا نہیں پڑا تھا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ وہ ٹرے میں ناشتے کے لوازمات رکھے اندر داخل ہوئی۔

”صبح بخیر۔“

”بخیر“ وہ بھاری آوازی میں بمشکل بولا۔

”ابھی تک بستر میں پڑے ہو، خیریت؟“ خیریت پوچھنے کا بھی اپنا ہی اسٹائل تھا محترمہ کا شاید۔

”بخار ہے“

”اچھا“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”طبیعت ٹھیک نہیں؟ دوائی چاہیے؟“ وہ ہی لٹھ مارا انداز۔

”نہیں“ سر خیل خان آنکھیں دبا رہا تھا۔

”کیوں؟“

”میرے پاس ٹیبلٹس ہیں“

”ٹھیک ہے پر تمہیں تو ہلکی غذا چاہیے ہوگی۔“ کومی پھر سے سوچ میں پڑ گئی۔

”آپ کیا لائی ہیں؟“

”پراٹھے، انڈے اور چائے“ اس نے ٹرے پھر سے اٹھالی۔ ”میں کچھ اور لے آتی ہوں۔“

”کیا لائیں گی؟“

”رسک ٹھیک رہیں گے“ وہ پھر سے سوچنے لگی۔

”نہیں میں نے کبھی رسک نہیں کھائے۔“

”تو پھر دلیہ“

”ناجی نا، دلیہ، دلیہ بھی نہیں“ خان نے منہ بنا کر کہا۔ گویا کسی کڑوی دوا کو

چبا لیا ہو۔

”کھچڑی بنا دوں؟“ وہ اپنے کچن میں رکھی چیزوں کے حساب سے کہہ رہی تھی۔

”کھچڑی؟ مونگ کی دال کی، میں نے کبھی نہیں کھائی۔ ہمارے گھر مونگ کی دال نہیں پکتی۔ ہم تینوں بھائیوں کو پسند نہیں“ وہ سخت بے زار ہو گیا تھا۔

”پردیس میں نخرے نہیں کرتے“ کومی کو غصہ آگیا۔ جو کھانا ہے، بتادو، اور جو آئندہ کھانا پسند کرو گے، اس کی لسٹ بھی بنا دو۔ ایڈوانس بھی دینا، دہشت خان شہر سے لادے گا سامان۔“

”میں اس وقت سوپ پینا چاہتا ہوں، نگین بہت اچھا بناتی ہے، اور بخار میں ہمیشہ میں سوپ پینا پسند کرتا ہوں۔“

”نگین کو ساتھ لے آتے۔“ کومی غصہ پیتے ہوئے بولی تھی۔

”کیا تمہیں سوپ بنانا نہیں آتا؟“ وہ روانی میں آپ سے تم پر آگیا تھا۔ ”مجھے چکن کارن سوپ بنا دو، پلیز!“ وہ لجاجت سے بولا۔

”میرے باپ کا پولٹری فارم ہے نا۔ چکن کارن سوپ بنا دو ہونہ۔“ لحاظ اور مروّت تو کومی کو چھو کے نہیں گزری تھی۔

”چکن نہیں، سبزیاں تو ہوں گی۔ ویجی ٹیبل سوپ بھی چلے گا۔“ اس نے پھر سے گویا التجا کی۔

”سبزیوں کے کھیت نہیں ہیں میرے۔ ناہی رنگ رنگ کی سبزیاں گھر میں موجود ہیں۔ دلیہ لے آتی ہوں، کھانا چاہوں تو شوق سے، ورنہ میری بلا سے بھوکے رہو۔“ کومی جل بھن کر رہ گئی۔

”آلو تو موجود ہوں گے۔“ اس نے بھی ہار کبھی نہیں مانی تھی۔

”ہاں دو پڑے ہیں، ٹوکری میں“ وہ تاؤ کھا کر بولی۔ ”مگر مجھے سوپ ووپ نہیں بنانا آتا۔“

”ترکیب میں بتاتا ہوں۔“ سرخیل خان بے ساختہ خوش ہو گیا۔

”تمہیں بنانا آتا ہے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”اس میں مشکل کیا ہے۔“ سرخیل خان نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ محترمہ مانی تو ہیں۔

پھر اس نے رسان سے سوپ بنانے کی ترکیب بتائی۔

”یہ بڑا آسان طریقہ ہے۔“ کومی پلٹتے ہوئے بڑ بڑا رہی تھی۔ ”ہونہہ“ یہ بڑے لوگ نہ جانے کیا کیا کھاتے ہیں۔“

”منیجر صاحبہ! اپنا نام بتانا پسند کریں گی؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھنے کی جسارت کی تھی کہ محترمہ کا مزاج بدلتے لمحہ بھر کی دیر نہیں لگتی تھی۔

”کومی“

”جی یہ کیا نام ہوا؟ کورمہ یا کومہ نہیں کہہ سکتے؟“ وہ معصومیت سے بولا۔  
”فل اسٹاپ بھی ہو سکتا ہے۔“

”کومل بختیار نام ہے میرا، مگر اس نام سے بستی والے واقف نہیں۔ سب کومی کہتے ہیں“ وہ ہی لٹھ مار انداز۔

”نک نیم ہوگا، لاڈ کا نام“ سخیل خان خوا مخواہ مسکرایا۔

”یہ ہی سمجھ لیں۔ لاڈ کا نام ہے، یہاں اصل نام کو بگاڑ کر بلانا ہی لاڈ کے زمرے میں آتا ہے۔“ وہ ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

سرخیل خان کا بخار تو اتر چکا تھا۔ مگر اس نے دوسرے دن اور تیسرے دن بھی اپنے کام سے چھٹی کر لی تھی۔ اس دن کومی کپڑے دھو رہی تھی۔ جھٹ پٹ کپڑے دھونے اور سکھانے والی مشین بھی اس نے کمیٹی ڈال کر ابھی دو سال پہلے ہی خریدی تھی۔

برف باری کے موسم میں یہ مشین بڑی فائدہ مند تھی۔

آج سے پہلے اس گیسٹ ہاؤس میں قیام کرنے والے جتنے لوگ بھی آئے تھے وہ صرف ہفتہ دو ہفتہ کے لئے ٹھہرتے تھے۔ اس دوران انہوں نے کبھی کپڑے دھلوانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کچھ تو خود ہی دھولیتے تھے اور زیادہ ایک ہی سوٹ میں گزارہ کر لیتے کہ کپڑے دھلوانے کے الگ سے پیسے افورڈ

کرنا ممکن ہی کہاں تھا۔ نچلے طبقے کے چھوٹے کاروبار سے منسلک لوگ ایسی عیاشیاں پردیس میں اپنا معمول بنالیں تو کمائیں اور کھائیں کیا؟

یہ گیسٹ ہاؤس کی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا۔ جب پہلے، دوسرے اور پھر تیسرے دن بھی سرخیل خان اپنے کپڑے اٹھا کر لے آیا۔

”یہ کیا ہے؟“ کومی نے بغیر دیکھے پوچھا۔

”میرے کپڑے ہیں“

”انہیں کیا کرنا ہے؟“ وہ چادروں پر برش رگڑ رہی تھی۔

”دھونا ہے“ معصومیت سے کہا گیا۔

”یہاں رکھ دو۔“ اس نے ایک خالی ٹب اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”گھر

میں تمہارے کپڑے کون دھوتا ہے؟“

”گل بدن“ وہ اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ کومی نے ایسے ہی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے پوچھ لیا۔

”ملازمہ“ اسے ایک قمیض کی جیب میں سے آئی ڈی کارڈ مل ہی گیا تھا۔

”تمہارے گھر میں نوکر ہیں؟“

”جی، تین چار ہیں۔“

”پھر بھی اپنی بہن سے کام کرواتے ہو؟“ کومی لمحہ بھر کے لئے کہیں کھو سی گئی تھی۔

”نگین میری بہن نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟“ کومی نے سادگی سے پوچھا۔

”کزن ہے اور“ سرخیل خان سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔

”اور کیا؟“ وہ اپنا کام روک کر پوچھ رہی تھی۔

”منگیترا بھی تھی اور اب“



”اچھا... اچھا“ کو می کو بہت خوشی محسوس ہوئی۔

”مبارک ہو“

”کس بات کی؟“

”منگنی کی“ وہ پھر سے لب جھپ کپڑے کھنگالنے لگی۔

”منگنی بہت پرانی ہے، بچپن کی، یا اس سے بھی پہلے کی۔“ سرخیل خان نے وضاحت کی۔

”ہمارے ہاں بھی بچپن میں رشتے پکے کر دیے جاتے ہیں“ وہ اسے بتا رہی تھی۔ ”خود میرا بھی رشتہ بچپن میں طے کر دیا گیا تھا۔“

”جانتا ہوں“ ایک معمول کی طرح اس کے لبوں سے برآمد ہوا۔

”کیا جانتے ہو؟“ وہ تکیے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”یہ ہی کہ ہمارے ہاں بچپن کی منگنیوں کا رواج ہے“ سرخیل خان نے گڑ بڑا کر وضاحت کی۔

”کچھ غلط رواج نہیں؟“ اب وہ جان بوجھ کر بات کو طول دینے کی غرض سے پوچھ رہا تھا۔

”اس میں کیا برائی ہے“ کو می لاپرواہی سے بولی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ یکدم کو می نے سر اٹھا کر پوچھا۔

”اور یہ آپ مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھے کیوں جارہے ہیں؟“

”میں کب دیکھ رہا ہوں“ وہ سٹپٹایا۔ ”ایسا الزام یعنی آنکھیں پھاڑ کے“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”جاؤ، اپنا کام کرو“

”کون سا کام؟“ معصومیت سے پوچھا گیا۔

”اب یہ بھی میں بتاؤں۔“ اسے پھر سے تپ چڑھی۔

”تو اور کون بتائے گا، گھر تو آپ کا ہے“ اس نے سادگی سے جتایا۔

”تم اپنا کوئی کام کرو“ وہ جوڈبہ (لیپ ٹاپ) ساتھ لائے ہو۔ اسی کے ساتھ لگے رہو۔ جاؤ یہاں سے۔“

”میں تو آپ سے لنچ کا پوچھنے آیا تھا“ بہت سوچ و بچار کے بعد اسے یاد آگیا تھا کہ وہ کس کام کے سلسلے میں آیا ہے۔

”لنچ، ونچ سب ملے گا۔ مگر اپنے وقت پر“ زیادہ بھوک کا شور مچایا تو شہر کا راستہ دکھاؤں گی۔“ اس نے گویا وارننگ دی۔

”شہر کے راستے سے میں انجان نہیں ہوں۔ روز آتا جاتا ہوں“ اب بھی شہر ہی جا رہا ہوں، تم نے کچھ منگوانا ہے؟“ وہ اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

”ہم نے کچھ نہیں منگوانا۔ اگر کچھ چاہیے ہوگا تو دہشت خان سے کہیں گے۔“ کومی نے ناک چڑھا کر جتایا۔

”بہت بولتے ہو تم۔“

”مگر تم سے کم“ وہ مزے سے بالٹی اٹھا کر برآمدے میں لگی الگنی پر کپڑے پھیلانے لگا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ وہ چٹخی۔

”نظر نہیں آرہا کیا؟“

”چھوڑو میں کرلوں گی، ہٹو پیچھے“ کومی چلاتی رہ گئی۔

”میں تمہاری ہیلپ کرنا چاہتا ہوں“

”یہاں میری ہیلپ کرنے کے لئے آئے ہو“ اور کوئی کام نہیں تمہیں؟“ وہ کام ختم کر چکی تھی۔ اب پھیلاوا سمیٹ رہی تھی۔ ”یہ جو تمہارا کاروبار ہے نا“ بس ڈوباہی سمجھو“

”بھلا کیسے؟“ سرخیل خان نے مسکرا کر پوچھا۔

”اب یہ بھی میں بتاؤں۔ اگر نگرانی نہیں کرو گے تو مینجر فراڈ کر کے بھاگ جائے گا۔“ کومی اسے وارن کر رہی تھی۔

”منیجر ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔“ وہ اپنے گیلے ہاتھ تولیے سے صاف کر رہا تھا۔

”اب جا بھی چکو“ کومی زچ ہو اٹھی۔

”جارہاں ہوں۔ میری آفر بھی برقرار ہے ابھی تک۔“

”کیسی آفر؟“ کومی بھول بھی چکی تھی۔

”کچن کے لئے کچھ منگوانا ہے؟“

”نہیں“ وہ رکھائی سے بولتے ہوئے خالہ کے کمرے کی طرف چل دی تھی۔

”خود ہی لے آؤں گا“ اندازے سے“ سرخیل خان زیر لب بڑ بڑایا اور کچن

کے سامان کی لسٹ ذہن میں ترتیب دینے لگا تھا۔

☆☆☆

نہ جانے کون سی بوٹی خالہ کو اس نے سنگھا دی تھی۔ وہ تو سرخیل خان کے

گیت گاتے نہیں تھکتی تھیں۔ کومی کے منع کرنے کے باوجود و خالہ کے لئے

طاقت کی دوائیں، پھل اور نہ جانے کیا کچھ اٹھالاتا تھا۔ ایک دن خالہ کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر لے گیا۔ ان کا چیک اپ کروایا۔ کپڑے لے کر دیے، گرم جرسی، شال، اونی سوٹ، خالہ کو سیر بھی کروائی، نہ جانے کدھر کدھر گھماتا رہا تھا۔ کومی کی سمجھ سے یہ عنایات تو بالاتر تھیں۔ خالہ گھر آئیں تو کومی پھٹ ہی پڑی۔

”مجھ سے پوچھے بغیر کیوں اس نواب زادے کے ساتھ گئی تھیں۔“

”وہ مجھے خود ساتھ لے کر گیا تھا۔“ خالہ لاپرواہی سے بولیں۔ ”کومی! کسی دن

تم بھی شہر کو دیکھ آنا... ہائے“ یہ اونچی اونچی عمارتیں اور دکانیں۔“

”وہ ہمیں ان احسانات کے بوجھ میں دبا لینا چاہتا ہے اور ابھی تک اس کے

مقاصد واضح نہیں ہو رہے۔“ کومی تو اس کی آمد کے کچھ دن بعد ہی مشکوک

ہو گئی تھی۔

”خوا مخواہ شک میں پڑ رہی ہو۔ خیال خان بڑے دل والا، نیک طبیعت بچہ

ہے۔“ خالہ کی نظر میں بھی کم کم ہی کوئی جچتا تھا۔

”خالہ! وہ ہمارے لئے ایک مہمان ہے۔ اسے مہمان ہی سمجھو، چند دن بعد چلا جائے گا۔ اس سے دل کے رشتے گانٹھنے مت بیٹھ جاؤ۔“ وہ کافی دیر سے خالہ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”وہ میرے لئے اپنے پتر جیسا ہے۔“

”پتر جیسا ہے، مگر پتر نہیں۔ یہ بات تمہیں کون سمجھائے خالہ“ وہ کنستری میں آٹا ڈال رہی تھی، جو خالہ کالا ڈالے کر آیا تھا۔

”اس مہمان خانے میں سینکڑوں آئے اور چلے گئے۔ کسی نے کب احساس اور انسانیت کا رشتہ جوڑا تھا۔ سب اپنے غموں، فکروں اور تلاش معاش کے چکروں میں خود کو بھی بھولے ہوئے تھے۔ سو میں سے کوئی ایک سرخیل خان جیسا ہوتا ہے۔“ خالہ کے لبوں سے گویا شہد ٹپک رہا تھا۔ ”رب سوہنا اسے لمبی حیات دے۔“ خالہ کی آنکھیں بھینگنے لگیں۔

”ہر ایک کے لئے جذباتی ہو جایا کرو خالہ“ وہ بے زاری سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ گئی۔

”آج سرشام ہی سرخیل خان گھر آگیا تھا، ہاتھ میں شاپر پکڑ رکھے تھے۔ سیدھا کچن میں چلا آیا۔“

”محترمہ! آج کیا پکانے کا ارادہ ہے؟“

”گو بھی گوشت پکایا ہے“ وہ روٹیاں بنا رہی تھی، مصروف سے انداز میں بولی۔

”میرے لئے روٹی مت بنانا۔“ شاپر لکڑی کے میز پر رکھے خود وہ پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”کیوں؟ آج فاقہ کرو گے؟“

”نہیں، پاسٹا کھاؤں گا اور تمہیں بھی کھلاؤں گا۔“ وہ شاپر میں سے مختلف چیزیں نکال کر میز پر سجانے لگا۔

”میں خالہ کو روٹی دے آؤں۔ اس کو بنانے کا کام خود کر لینا، نہ جانے کیا کیا اٹھا کے لے آتے ہو۔“ کومی نے یہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

”خالہ کو روٹی کھلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی پاسٹا کھائیں گی۔“ سرخیل خان نے اس کے ہاتھ سے رومال میں لپیٹی روٹیاں پکڑ لیں۔

”خالہ کو الم غلم کھلانے کے بعد پھر ہسپتال لے کر چل پڑنا ہے“

”یہ قطعاً بے ضرر ڈش ہے“ وہ مسکرایا۔ آپ بھی چکھ سکتی ہیں۔“

اس نے پاسٹا ابال لئے۔

”شکریہ“ کومی ابلے ہوئے پاسٹا کو دیگچی میں ڈال کر مکس کرنے کے بعد ڈونگے میں نکالنے لگی۔

”اب کچھ دیر بعد چائے بھی بنا لانا۔ میں خالہ جی کے کمرے میں ہوں۔“ وہ ڈونگہ اٹھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”گو بھی گوشت کھاتے ہوئے ہمیں کوسنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ آفر برقرار ہے، آپ بھی پاسٹا کھا سکتی ہیں۔“

”مجھے کوئی شوق نہیں۔“ کومی انگلیٹھی میں دہکتے کونلے رکھ رہی تھی۔ ”جی چاہ رہا ہے ایک کونلہ تمہاری زبان پر بھی رکھ دوں۔ کچھ اور ذائقہ بھی چکھنا چاہیے تمہیں۔“

”ہماری زبان ہر قسم کے ذائقے سے آشنا ہے اور دل بھی... آج کل کچھ نئے نئے انکشافات بھی رونما ہو رہے ہیں۔“ وہ پھر سے مسکرایا۔

”کہا؟“ کومی نے ہونق پن سے پوچھا۔

”یہاں“ وہ دل پر ہاتھ رکھے بڑی نرم نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ ان نگاہوں کے مفہوم سے اچھی طرح آگاہ تھی۔

”سرخیل خان! اپنی حد میں رہا کرو، لحاظ کرتی ہوں تمہارا، مہمان سمجھ کر، تم یہاں رہتے ہو، اور معاوضہ دیتے ہو، ہمارے گھر کا چولہا اسی طرح جلتا ہے، اللہ نے روزی روٹی کے وسیلے بنا رکھے ہیں۔ غریبوں اور مجبور لوگوں کی بے بسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔“ کومی یک دم مشتعل ہو گئی۔



”بہ خدا آپ کو ہرٹ کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف اپنے احساسات شیر کرنا چاہ رہا تھا آپ سے“ وہ بھی پریشان سا ہو گیا۔

”کیا لگتی ہوں میں تمہاری، خوا مخواہ میرے ساتھ بے تکلف ہونا چاہتے ہو، تم مجھے جانتے نہیں، میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں، ظاہری چمک دمک سے متاثر ہونے والی،“ کومی چیخ کر رہ گئی۔

”تم بہت اچھی لڑکی ہو کومل! اور میں تمہارے ساتھ دوستی، انسانیت اور ہمدردی کا تعلق نہیں بنانا چاہتا، کیونکہ میرے دل میں تمہارا الگ مقام ہے، الگ حیثیت ہے،“ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، سچ کہہ رہا تھا، مگر اس سچائی کو کومل بختیار سمجھنے کی حدود سے بہت آگے نکل چکی تھی۔

”اپنی حد میں رہو سر خیل خان“ وہ لال بھبھو کا چہرہ لئے کھڑی ہو گئی۔

”اور میری حد کیا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں تپش تھی۔

”وہ مہمان خانہ اور اس کا سب سے بہترین کمرہ، یہ نہ ہو کہ میں تمہیں اس گھر سے نکال دوں، سامان سمیت، شہر میں سینکڑوں گیسٹ ہاؤس ہیں، کہیں بھی قیام کر لینا۔“ کومی آگ بگولا ہو گئی۔

”اور میں سینکڑوں ہوٹلز اور ریسٹ ہاؤس، فرنشڈ بیڈ رومز چھوڑے یہاں کیوں آیا ہوں، کبھی سوچا ہے تم نے کومل بختیار، سر خیل خان کی آنکھوں میں لالی گہری ہوتی چلی گئی۔

”کیوں آئے ہو؟“ وہ سر سے پیر تک برف ہو گئی تھی۔

”تمہارے لئے۔“ سر خیل خان اطمینان سے بولا۔

”تم جانتے ہو، میں کون ہوں۔“ برف میں شگاف ہوا۔ وہ تڑختے ہوئے کہہ رہی تھی۔ چٹختے ہوئے بول رہی تھی۔ ”میں کون ہوں، سر خیل خان!“ وہ چلائی۔

”حماد خان کی بیوہ“ سر خیل خان بدرنگ دیوار پر بنے عکس دیکھ رہا تھا۔  
”ٹپالے، ادھورے اور اپاہج عکس۔

”اور تم کون ہو؟“ کومی دھاڑی۔

”حماد خان کا اکلوتا دوست، ہم پنڈی میں آٹھ سال اکٹھے رہے ہیں، حماد خان نے تمہیں نہیں بتایا ہوگا، تمہارا اور اس کا ساتھ بہت مختصر رہا ہے، صرف تین دن اور تین راتوں پر مشتمل۔“

”تم میرے زخم کیوں ادھیڑ رہے ہوں۔“ وہ دم بخود تھی، ششدر تھی۔ ”تم کیوں آئے ہو؟“

”میں تمہارے دل پر لگے ان زخموں کی مسیحائی کرنے آیا ہوں، مجھے غلط مت سمجھو۔“

”مجھے کسی مسیحا کی مسیحائی کی ضرورت نہیں۔“ وہ چلائی۔

”میری بات تحمل سے سننا، یہ کچھ سال پہلے کی بات ہے، تب میں امریکہ میں اپنے بھائی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں نے حماد خان کو خواب میں دیکھا، بار بار دیکھا، اور نہ جانے کتنے ہزار بار دیکھا، یہ خواب اور اس کا تسلسل پاکستان آنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ خواب میں مجھے ہمیشہ وہ پریشان نظر آتا تھا۔“

بے چین، کھویا کھویا، وہ بار بار مجھے پکارتا تھا اور نہ جانے پورب کی طرف دیکھ کر کیا اشارہ کرتا۔ پھر مجھے برف پر بیٹھی ایک لڑکی دکھائی دینے لگی۔ حماد خان پھر سے میرے قریب آجاتا تھا اور وہ برف پر بیٹھی اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتا اور مجھے اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ کہتا تھا اس لڑکی کا خیال رکھنا خیل خان! یہ میرا دل ہے اور میرا دل اس وقت زخم زخم ہے، میری ہی یاد سے میں نے اس خواب کا ذکر اپنے بھائی سے کیا، گل شیر نے بڑی سنجیدگی سے میرے خواب کو سنا تھا۔ پھر اسی نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے حماد خان کی بیوہ اور اس کی ماں سے ملنا چاہیے۔ انہیں شاید میری ضرورت ہو اور میں یہاں آگیا۔“

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے لفظ لفظ سے سچائی پھوٹ رہی تھی، جبکہ سامنے کھڑی کوئل بختیار گویا پتھر ہو گئی۔

☆☆☆

”خیل خان! او خاناں اور جانا، اٹھونا، اٹھ بھی جا، تمہارا مہمان آیا پنڈی سے“  
 نگین اسے پکارتی بلکہ دھاڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ ملازمہ اسے  
 جگانے کی ناکام کوشش کے بعد منہ بناتی لوٹ گئی تھی۔

”خیل خان! کیا بھنگ پی کر سوئے ہو۔“ اس نے بھنا کر کمبل کھینچا۔ ”اٹھو،  
 ورنہ یہ پانی کا جگ تمہارے اوپر انڈیل دوں گی۔“

”کیا ہے؟“ وہ نیند میں دھت تھا۔

”پنڈی سے مہمان آیا ہے۔“ نگین اسے لحاف میں منہ گھسیڑتے دیکھ کر  
 دونوں ہاتھوں میں اس کے بال دبوچے زور سے بولی۔

”بیٹھک میں بٹھاؤ اسے، کہاں ہے سورج خان؟“ وہ بھاری آواز میں بمشکل  
 بولا۔

”سورج خان غروب ہو چکا ہے، ابا جان کے ساتھ، مہمان کو بیٹھک میں بٹھا  
 دیا ہے۔“ نگین ابھی تک اس کے بال دبوچے کھڑی تھی۔

”کون منہ اٹھا کر آگیا ہے سویرے سویرے۔“ وہ غصے سے بھنایا۔ نیند پوری  
 نہیں ہو سکی تھی، اسی لئے طبیعت سخت بے زار تھی، ”نام نہیں پوچھا۔“  
 ”حماد خان۔“ نگین نے اطمینان سے بتایا۔

”حماد آیا ہے، تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ اسپرنگ کی طرح پلنگ سے  
 اچھل پڑا۔

”قمیض کہاں ہے میری؟“

”رات کو اتار کر کہاں رکھی تھی؟“ نگین نے کمبل تہہ کرتے ہوئے طنزیہ  
 کیا۔ وہ پلنگ کے نیچے، صوفوں کے نیچے اور الماری تک دیکھ آیا تھا۔

”واش روم میں لٹکی ہوگی۔“

”وہاں بھی نہیں۔“ وہ سوچ میں گم تھا۔

”کوئی اور پہن لو۔“ نگین نے مشورہ دیا۔ ”بلکہ نہالو، ڈھنگ کا حلیہ بنا کر ملنا  
 مہمان سے، پوستی نہ ہو تو۔“

”تم بھی کبھی کبھی کام کا مشورہ دیتی ہو، ذرا اس شلوار قمیض پر استری پھیرو، میں دو منٹ میں آیا۔“ وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ نگین سر ہلا کر کپڑے پریس کرنے لگی۔ ابھی صرف قمیض پریس ہوئی تھی جب وہ باہر نکل بھی آیا۔

”نگی! تو نا صرف اناج کی دشمن ہے، ایک سوٹ استری نہیں ہو سکا۔“

”دس منٹ کا کہہ کر گئے تھے۔ سات منٹ بھی نہیں ہوئے اور باہر نکل آئے ہو۔“

”صرف باتیں بنانے میں ماہر ہو، ادھر لاؤ۔“ وہ قمیض جھپٹ کر پہننے لگا تھا۔

”حماد خان تمہارا وہ ہی دوست ہے نا، جس کی منگیتر بہت خوب صورت

ہے۔“ نگین کئی مرتبہ حماد خان سے مل چکی تھی اور ظاہریوں کر رہی تھی کہ

حماد خان واقعی اس کی یادداشت کے خانے سے نکل چکا ہو۔

”مجھے خبر نہیں، میں اس کی منگیتر سے کبھی ملا نہیں ہوں۔ ویسے وہ خوبصورت

نہیں، بہت خوبصورت ہے۔“ وہ اسے تپانا چاہ رہا تھا۔

”تمہیں تو گل بدن بھی بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔“ نگین واقعی تپ گئی۔

”جلنا کڑھنا فی الحال ملتوی کرو اور فٹافٹ چائے بنا کر بھیجو، بلکہ خود بھی

آجانا، حماد سے اس کی منگیتر کے بارے میں پوچھنا۔ وہ اچھی طرح سے کومل

کے بارے میں بتائے گا۔ تمہاری تسلی بھی ہو جائے گی۔“ وہ بولتا ہوا باہر نکل

گیا تھا۔ نگین استری کا پلگ نکال کر خود کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ گل

بدن کے ہمراہ ٹرائی گھسیٹتے بیٹھک میں پہنچی تو ان دونوں کو ایک دوسرے

سے جھگڑتا پایا۔ صرف گتھم گتھا ہونے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ نگین خوف زدہ ہو گئی۔

”کیا کر رہے ہیں۔“ وہ دونوں ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”لالہ! یہ جھگڑ رہا تھا تم سے؟“

”نہیں تو، ہم باتیں کر رہے تھے۔“ حماد خان مصنوعی بشاشت سے مسکرایا۔

”کتنے جھوٹے ہو، تم دونوں۔“ نگین بھنائی۔

”کس بات پر جھگڑ رہے تھے؟“

”تمہارے کان خوا مخواہ بج رہے ہیں۔“

”لالہ! تم بھی جھوٹ بولنے لگے ہو؟“ نگین ناراضگی سے گویا ہوئی۔

”صحبت کا اثر ہے بہنا۔“ حماد لاچاری سے بولا۔

”یہ بھانج ہے تیری۔“ وہ اس کے کان میں گھسا۔

”لالہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ نگین ان مسخروں کو دیکھ کر ہمیشہ حیران

ہوتی تھی۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔

”تمہارے ہاتھ کی بدمزہ چائے پی کر میرا خودکشی کر لینے کو جی کرتا ہے۔“ سر

خیل خان اپنی حرکتوں پر آگیا تھا۔

”تو نہ پیو، میں تمہارے لئے لائی بھی نہیں۔“ نگین کو غصہ آگیا۔ ”لالہ یہ

کباب، حلوہ، پزا آپ کے لئے ہے۔ خبردار جو اس کو کچھ بھی سنگھایا۔“

”جا کر اپنا کام کرو، اماں کا ہاتھ بٹاؤ۔“ سرخیل نے پزا کا پیس اٹھا کر اپنی

پلیٹ میں رکھ لیا۔

”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے، اماں شہر چلی گئی ہیں، گل بدن کو بخار

ہے، کھانا میں نے اور تم نے بنانا ہے۔“

”اچھا...“ سرخیل خان سوچ میں گم ہوا۔ ”یہ زنانہ کام میرے نصیب میں

لکھے گئے ہیں شاید۔“

”لالہ! تم کیا کھاؤ گے؟“ نگین اٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تم جو بھی بناؤ گی۔“ حماد خان نے مسکرا کر کہا۔

”ساگ اور مکئی کی روٹی کھالو گے لالہ!“ وہ پوچھ حماد خان سے رہی تھی اور

دیکھ سرخیل خان کو رہی تھی۔ مینیوسن کر اس کے منہ کے زاویے بگڑ گئے

تھے۔



”حماد ساگ اور مکئی کی روٹی کھانے پنڈی سے یہاں نہیں آیا، اتنا لمبا سفر کر کے۔“

”تو پھر؟“ نگین ہونق پن سے بولی۔

”اسے چائیز فوڈ پسند ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”لالہ کو نہیں، تمہیں سی فوڈ پسند ہے، اور آج کے مینیو میں کلٹر کڑا ہی، کٹاکٹ، بکرے کا بھیجہ اور اس کی ٹانگیں شامل ہیں۔“ نگین نے مزے سے ہاتھ جھاڑے۔

”اور یہ سب تم اکیلے بناؤ گی۔ میں تمہاری ہیلپ ہر گز نہیں کروں گا۔“ اس نے بھی صاف جھنڈی دکھا دی۔

”کتنے بے مروت ہو تم۔“

”اور کتنی بامروت ہو تم۔ سب جانتا ہوں میں۔“ وہ بھی دو بدد بولا۔

”پلاؤ کے بجائے چائیز رائس کر لیں گے۔“ نگین نے فوراً مینیو میں تبدیلی کی۔

”اس کے علاوہ۔“ وہ بھنویں اچکاتے پوچھ رہا تھا۔

”سلاد تو ہوگا ہی۔“ نگین نے دانت پیسے۔

”تم لوگ کس کے لئے دعوت شیراز کا اہتمام کر رہے ہو۔“ حماد خان کو مداخلت کرنا ہی پڑی۔

”تمہارے علاوہ اس وقت مہمان خانے میں کوئی دوسرا موجود نہیں ہے۔“ سرخیل خان نے جتا کر کہا۔

”میرے لئے اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ پریشانی کے عالم میں ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

”مہمان کھانے پینے کے معاملے میں بک بک نہیں کرتے۔“ سرخیل نے

اسے لتاڑا۔ جو کچھ ہم تمہیں ٹھنسائیں گے، تمہیں ٹھونسنا ہی پڑے گا۔“

”اور ابھی یہ حلوہ ختم کریں پلیز! نگین اس کے سر پر کھڑی ہوگئی۔

”شاباش! یہ کباب بھی کھاؤ۔“ اسے بھی آداب میزبانی کا خیال آہی گیا۔ ”پڑا تو چکھا ہی نہیں۔“

”پہلے آپ حلوہ کھائیں گے۔ اماں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔“ نگین نے پلیٹ زبردستی حماد خان کے ہاتھ میں تھمائی۔

”اور ہاں لالہ! آپ کی منگیتر کیسی ہے؟“ وہ اسے گھورتے ہوئے حماد خان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے، تم دیکھ کر بتانا۔“ حماد خان نے سادگی سے بتایا۔

”لالہ! اس سے کہیں نا، مجھے آپ کا گاؤں دکھا کر لائے، میں نے سنا ہے‘ آپ کا گاؤں، آپ کی منگیتر کومل کی طرح بہت خوبصورت ہے۔“

”تم سرما میں خیل خان کے ساتھ آنا۔ برف بارش کی طرح برستی اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔“

”جا کر کلڑ کا قیمہ بناؤ، ورنہ میں تمہارا بنادوں گا، چکنا گھڑا، کچھ بھی کہہ لو، اثر نہیں ہوتا۔“

”میں تم سے منگنی کر کے پچھتائی۔“ نگین جل کر رہ گئی۔

”اور میں نے تو بڑے شکرانے پڑھے تھے گویا۔“ وہ استہزائیہ بولا۔ ”نہ جانے کون سی گھڑی تھی جب ابا جان نے تمہیں مجھ سے منسوب کر کے ایک عظیم زیادتی کر ڈالی۔“

”تو نہ کرتے، کس نے ہاتھ جوڑ کے ترلے کیے تھے۔“ نگین تلملائی۔

”تم تو بچپن سے ہی میرے متھے لگ گئی تھیں۔ پالنے میں لیٹی انگوٹھا چوس رہی تھی، اور میری بھولی اماں اس کی اسی چیپ ادا پر قربان ہو کر اپنے گلے کی مالا سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یہ جو اس نے مالا پہن رکھی ہے نا، میری اماں نے جذبات میں آکر پہنا دی تھی اسے، اب تک پچھتاتی ہیں میری طرح۔“ اسے ہمیشہ نگي کو جلا کر لطف آتا تھا۔

”میری اماں کی مجھ سے محبت تمہاری طرح ملاوٹ شدہ نہیں ہے، خبردار جو پھاہا کٹنی بن کر اماں اور میرے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی۔“

نگین نے وارننگ دی۔

”ایسی کوششیں تو میں اکثر کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔“ اس نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

”ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ اماں کا جوتا سلامت رہے اور سرخیل خان کا سر سلامت رہے۔“ نگین نے صاف مذاق اڑایا۔ ”لالہ کبھی اسے اماں سے جوتے کھاتے ہوئے دیکھا ہے تو نے؟“

”نہیں۔“ حماد خان گہری سانس کھینچتا مسکرانے لگا تھا۔ یہ لڑائیاں ان کے معمول کا حصہ تھیں۔ جو دن ان دونوں میں جھگڑے کے بغیر گزر جاتا تھا۔ اس دن گھر والے سخت پریشان اٹھتے تھے۔ ان دونوں کی باقاعدہ احوال پر سی

کی جاتی تھی کہ شاید ناسازی طبع کے پیش نظر دونوں طرف امن اور خاموشی ہے۔

☆☆☆

سرخیل خان، دلاور خان کا تیسرا بیٹا تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے کچھ لاڈلا اور بہت ہی شوخ و شنگ طبیعت میں چونچالی تھی۔ ابا جان اور اماں کی شفقتوں اور محبتوں اور ذمہ داری سے ہمیشہ کوسوں دور رکھا۔ اپنے شوق سے جتنا دل چاہا تھا پڑھ لیا، جی پڑھائی سے اچاٹ ہوا تو کتابیں اطمینان سے اسٹور روم کے صندوق میں بند کر دیں۔

نگین چچا زاد تھی۔ کزن بھی اور بچپن کی منگیتر بھی۔ سرخیل خان کی پسند اور محبت بھی۔ پوری برادری اور خاندان بھر میں اس کی محبت کے چرچے تھے۔

اماں نے ہی نگین کو پالا پوسا تھا۔ بیچ میں ظالم سماج کیسا۔ ابا جان نے ان دونوں کی باہمی رضا مندی معلوم کر کے پچھلے سال دھوم دھام سے منگنی کر دی تھی۔

خیل خان چونکہ فارغ تھا، تو اب گھر اور زمینوں کی دیکھ بھال کے علاوہ تیسرا کام صرف یہ تھا کہ جب بھی حماد خان سے ملنے کو طبیعت مچنے لگتی، وہ گاڑی بھگاتا اور پنڈی ہاسٹل پہنچ جاتا تھا۔ جہاں حماد خان کافی الحال قیام تھا اور آج شام بھی نگین سے مزے دار سی جھڑپ کے بعد اس نے رخت سفر باندھ لیا۔

”کہاں منہ اٹھا کر بھاگے جارہے ہو۔“ نگین اس کی تیاریوں سے اندازہ تو لگا چکی تھی، مگر عادتاً تفتیش کرنا ضروری سمجھا۔

”منہ تمہارے پاس رکھ جاتا ہوں۔ پھر خوش ہو جاؤ گی۔“ وہ بیگ میں کپڑے ٹھونس رہا تھا۔

”اس سڑی ہوئی مسکراہٹ والے منہ کو میں نے کیا کرنا ہے۔ اپنا دل دے جاؤ۔ سنبھال کر رکھوں گی اپنے پاس، خوا مخواہ شہر کی ماڈرن لڑکیوں کو دیکھ کر پھسل پھسل جاتا ہے۔“ نگین نے ہاتھ میں پکڑا بھٹہ پوری رفتار سے کھانا اور چبانا شروع کیا۔

”میری آنکھوں پر تو پورے کالج کی لڑکیاں فدا تھیں۔“ اس نے خوا مخواہ کالر کھڑے کیے۔

”شکر کرو کوئی نوچ کر نہیں لے گئی۔“

”حماد خان جیسے یار ہوں تو کس کی جرأت ہے، کوئی ایسی جسارت کرے۔“ وہ اترایا۔

”لالہ سے ملنے جارہے ہو؟“

”ہاں... تم کیا سمجھی تھیں کہ ڈیٹ پر جا رہا ہوں۔“

لالہ کو میرا سلام دینا۔“ نگین نے سنجیدگی سے یاد دہانی کروائی۔ ”ویسے ابھی پچھلے ہفتے تو تم پنڈی گئے تھے خاناں! تم دونوں کی محبت بھی نرالی ہے۔“

”بہت ہی نرالی ہے، عجیب و غریب قسم کی۔ کبھی حماد خان مجھے خواب میں پریشان دیکھتا ہے اور بھاگا چلا آتا ہے میرا دیدار کرنے، کبھی میں اسے خواب

میں فکر مند دیکھتا ہوں اور پنڈی کی دوڑ لگا دیتا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ نگین سے ہر بات شیر کیے بغیر گزارہ بھی کہاں ہوتا تھا اس کا۔

”تم نے پھر کوئی خواب دیکھا ہے؟“

”ہاں...“ اس نے بیگ کی زپ بند کی۔ ”مجھے لگتا ہے‘ وہ کچھ پریشان ہے۔“

”لالہ نے تم سے اپنی پریشانی شیر نہیں کی؟“

”ملاقات ہوگی تو بتائے گا۔“ اب وہ جاگرز پہن رہا تھا۔

”اور تم آؤ گے کب؟“ نگین بے چین سی ہو گئی۔

”دو ماہ بعد۔“

”چل جھوٹے! دو ماہ بعد بھی نہ آنا۔“ وہ چٹخی۔

”تم شکرانے پڑھنا‘ بلا ٹل گئی۔“

”خیل خان! سفر پر جاتے ہوئے اچھی بات منہ سے نکالا کرو۔“ نگی ناراضگی سے سمجھانے لگی۔

”اچھا سیانی بی! آئندہ احتیاط کروں گا۔“ اس نے نگی کے سر پر چپت لگائی۔

”ویسے تیری دعا کے حصار میں رہتا ہوں‘ پھر ڈر کیسا؟“

”جاؤ، اللہ کی امان میں دیا۔“ نگی نے آنکھ کی نمی سر جھکا کر چھپالی۔ اے نگی!

تو رو رہی ہے۔“ وہ چیخا۔ ”اوپر دیکھ“ اس نے زبردستی اس کا منہ دونوں

ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر اونچا کیا۔

”وجہ تو نہیں پوچھوں گا‘ جانتا جو ہوں‘ میری دوڑیں پنڈی تک لگتی رہیں گی،

نگی ہمیشہ جی ہی جی میں تمللاتی رہے گی، آنسو بھی بہائے گی، مجھے منع نہیں

کرے گی۔“

”ہاں، تو منع کروں بھی کیسے، کون سا کسی سو کن سے ملنے جاتے ہو، ایک

ہی تو تمہارا یار ہے، اس کے اور تمہارے بیچ ظالم سماج کیوں بنوں، اچھے اور

سمجھ دار دوست قسمت سے ملتے ہیں۔“ نگی نے تو نہ جانے کس رو میں کہا

تھا۔ مگر وقت نے اس دوستی، محبت اور وفاداری کو کیسے ثابت کیا تھا کہ وقت



تک ششدر رہ گیا تھا۔ محبت اور دوستی کی مدتوں یاد رہنے والی داستان کے انجام کو دیکھ کر۔

”عقل مند ہوتی جا رہی ہو نگین یاور خان۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

”عقل کل رکھنے والے ایک شاطر آدمی سے پالا جو پڑا ہے۔“ نگین مسکرا دی۔

...☆☆☆...

”حمادے! او حماد خان، کس کے خیالوں میں گم ہو؟“ وہ تیسری مرتبہ رسوائی میں سے باہر نکلی تھی، اور وہ ابھی تک سابقہ پوزیشن میں بیٹھا نہ جانے کس گہری سوچ میں مبتلا تھا۔

”تیرے علاوہ کسی اور کو سوچنا بھی گناہ ہے، پھر بھی مشکوک رہتی ہو۔“ وہ بے دلی سے مسکرایا۔

”باتوں سے مجھے نہیں بہلا سکتے تم، بتاؤ، کیا پریشانی ہے۔“ کومی کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ بے حد سنجیدہ، خاموش طبع اس کی خالہ کا اکلوتا بیٹا چھوٹی عمر میں ہی ذمہ داریوں کے بوجھ میں دب کر رہ گیا تھا۔

”تمہیں نہیں بتاؤں گا اور کون ہے میرا، دکھ سکھ سننے والا۔“ وہ اداس آنکھوں سے مسکرا دیا۔

”تو پھر بتاؤ،“ کومی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”ایسے تھوڑی بتاؤں گا، پہلے گرم گرما چائے۔“

”پورے نشئی بن چکے ہو، میری طرح۔“ کومی مسکرا کر اٹھ گئی تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے رسوائی میں چلا آیا۔

”وہ خان ہے نا، میرا یا! بس اسی نے عادی بنا دیا ہے، پکا نشئی ہے۔“

”تم کچھ بتانا چاہ رہے تھے؟“ وہ چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اماں کو دوا دے دی؟“

”ہاں... خالہ سوچکی ہیں۔ تم کم از کم مل تو لیتے اس سے، اب وہ اٹھیں گی جب تو تم سوچکے ہو گے۔“ کومی پتی کا ڈبہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

”میں اماں سے مل کر سوؤں گا۔“

”واپسی کب تک ہے؟“ وہ لکڑی کے پرانے ڈیزائن کے شوکیس سے کپ نکال رہی تھی۔

”فجر کی پہلی اذان کے ساتھ ہی نکلوں گا۔“

”کل سویرے۔“ کومی ٹھٹک گئی۔

”نہیں... پرسوں سویرے۔“

”تم نے مجھے ڈرا دیا، ہوا کے گھوڑے پر سوار آتے ہو۔ شکل دکھائی اور بھاگ گئے، دو گھڑی بات کرنے کا بھی وقت نہیں تمہارے پاس۔“

”تھوڑا سا اور انتظار کرلو، پھر فرصت ہی فرصت ہوگی، اچھے دن آئیں گے،

زندگی سے تھکن اور مشقت ختم ہو جائے گی ایک روز، میں، اماں اور تم۔“ وہ روشن آنکھوں سے مسکرا دیا۔ ”اتنی باتیں جمع ہیں یہاں بھی اور اس دل میں تیرے لئے پیار کے طوفان کے جھکڑ چل رہے ہیں، بس کوئل! تھوڑا سا اور انتظار کرلو۔“

”کتنا انتظار؟“ کومی دھیمے سروں سے مسکرائی۔

”تین، چار سال۔“

”خالہ سے مار کھانی ہے کیا، وہ تمہارے پکے پرچوں (فائل ایگزامز) تک کے دن گن گن کر گزار رہی ہیں۔“ اس نے چائے چھان کر کپ میں ڈالی۔

”خالہ سے زیادہ بھانجی بے چین لگتی ہے۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

”یہ ہی سمجھ لو۔“ اس کے ہونٹوں پر گلاب کھلنے لگے۔

”اتنی محبت کرتی ہو۔“

”جو میرے دل میں تمہارے لئے جذبہ ہے نا، اس کے لئے لفظ محبت بہت چھوٹا ہے۔“

”ہمیشہ ایسی محبت تمہارا دل میرے لئے محسوس کرتا رہے گا؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں“ یقین کی خوشبو لہجے سے عیاں تھی۔

”اگر میں نہ رہا تو؟“ وہ سراسر مذاق کر رہا تھا۔

”حماد خان!“ کومی یک دم چیخی۔ ”فضول بکواس کرنی ہے تو اٹھ کر باہر نکل جاؤ۔“

”سوری یار!“ اس نے فوراً معذرت کی۔ ”مان گیا آج تو، کوئل بختیار کے دل میں میرے لئے کیا کچھ موجود ہے۔“

”کیا کچھ موجود ہے۔“ اس نے ناراضگی سے پوچھا۔

”وہ سب جو میں سننا چاہتا تھا۔“

”چائے کا کپ اٹھاؤ، اور بھاگو یہاں سے۔“ وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

”تم سے کچھ شیئر کرنا تھا۔“ اسے اچانک خیال آیا تو مسکراہٹ پھر سے مٹ گئی۔

”بتا بھی دو“ کومی آلو چھیلنے لگی تھی۔ ”نہ جانے کس سوچ میں ڈوب جاتے ہو گھڑی گھڑی۔“

”مجھے اسکالر شپ کے لئے اپلائی کرنا ہے، مجھے امید ہے، میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا، کیا تم چند سالوں کے لئے باہر جانے دو گی؟“

”باہر کہا؟“ اس کے ہاتھ سے چھری اور آلو گر گیا۔

”لندن۔“

”حماد خان!“ کومی ٹھٹک گئی۔ ”یہ تو کمٹ منٹ کا حصہ نہیں۔“ وہ رو دینے

کو تھی۔ اتنی لمبی جدائی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”باہر سے ڈگری لاؤں گا تو اور اچھی نوکری ملے گی۔ ہمارے حالات بدل جائیں گے۔“ اس نے کومل کے لرزیدہ ہاتھوں کو اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ ”میں تمہیں زندگی کی ہر سہولت مہیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ سب کچھ جس کی تمنا ہر لڑکی کو ہوتی ہے۔“

”مگر میری تمناؤں کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے حماد خان! میری تمنا صرف تم ہو۔“ کومی کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گر پڑا۔ ”ہمیں بہت زیادہ کی چاہ تو کبھی نہیں رہی، نہ مجھے، نہ تمہاری بوڑھی بیمار ماں کو۔“

”ہم کب تک معمولی معمولی چیزوں کے لئے ترسیں گے۔ تم دیکھ لینا کومل! میں یہاں اس گیسٹ ہاؤس کو ایک نیا روپ دوں گا، یہاں ایک بہت اچھی عمارت تعمیر کرواؤں گا۔“

”میں تمہیں پردیس جانے نہیں دوں گی، جو کچھ کرنا ہے، یہیں رہ کر کرو، ہماری آنکھوں کے سامنے۔“ کومی کا انداز دو ٹوک تھا۔

”یہاں رہ کر بھلا میں کیا کر سکوں گا۔ بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت ہے، مجھے اپنا کاروبار کرنا ہے۔“

”ہم تھوڑے میں گزارہ کر لیں گے۔“ وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

”صرف کہنے کی باتیں ہیں، جب شادی ہوگی، خاندان بڑھے گا، پھر ضروریات کا پتا چلے گا۔“

”میں خالہ کو بتا رہی ہوں۔“ وہ غصے سے دھپ دھپ کرتی اٹھ گئی۔

”کومل! او کومی! یار، ابھی نہ بتانا۔“ حماد خان بھی اس کے پیچھے دوڑا چلا آیا۔

”خالہ! سمجھالو، اپنے اس بیٹے کو ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔“ وہ دھاڑ سے

دروازہ کھولے اندر داخل ہوئی، خالہ نیند پوری کر چکی تھیں۔ عینک تلاش

کر رہی تھیں، اسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

”کہاں جا رہا ہے؟ اس وقت کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ باہر نکلے تو ٹانگیں

توڑ دوں گی۔“ خالہ نہ جانے کیا سمجھی تھیں۔

”خالہ! یہ انگریزوں کے ملک جا رہا ہے“

”اس وقت“ خالہ نے دل تھام لیا۔ ”حمادے! یہ میں کیا سن رہی ہوں“

”اماں! پڑھنے کے لئے جانا چاہتا ہوں، اگر آپ دونوں معزز خواتین اجازت دیں گی تب۔“ وہ روہانسا ہو گیا تھا کہ دونوں طرف سے توپوں کے منہ کھل گئے تھے۔

”میری طرف سے صاف انکار ہے۔“ خالہ آگ بگولہ ہو گئیں۔

”اور میری طرف سے بھی۔“ اس نے بھی اعلان کیا۔

”تو وہاں میموں سے دل لگالے، اتنا پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے۔“ خالہ کی دور اندیشی کی کومی دل سے قائل ہو گئی۔

”اور کیا، آپ نے ٹھیک کہا خالہ!“

”اماں! ایسا ہر گز نہیں ہوگا۔“

”تیرے پاس کیا ضمانت ہے، بڑے دیکھے ہیں، دعوے کرنے والے۔“ خالہ ناراض ہو گئیں۔ ”یہ تو نے سوچا بھی کیوں؟“

”اماں! آپ دونوں کو بہتر زندگی دینے کے لئے۔“

”ہم دونوں اب بھی بہتر زندگی جی رہے ہیں اور بہتری ہمیں نہیں چاہیے، اپنے چن جیسے پتر کو پردیس بھیج دوں، کومی میم متھے لگ گئی تو پھر کیا ہوگا۔“ خالہ کی پریشانی بجا تھی۔

”اماں! میمیں اب پاکستانیوں کی باتوں میں نہیں آتیں۔“ وہ زچ ہو اٹھا۔

”میں صرف پڑھنے کے لئے جانا چاہتا ہوں۔“

”ادھر کالج، سکول ختم ہو گئے ہیں۔ سولہ جماعتیں پاس کر لی ہیں اور کتنی جماعتیں پڑھنی ہے، کیا ستارہویں اور اٹھارہویں جماعت کا سکول نہیں ہے یہاں۔“ خالہ نے سادگی سے پوچھا۔

”نہیں اماں۔“ اس نے مختصر کہا۔ اب اٹھارہویں اور ستارہویں جماعت کی بھلا کیا تشریح کرتا۔ اماں تو بال کی کھال اتارنے بیٹھ جاتی تھیں۔



”پتر! سولہ جماعتیں کافی ہیں۔ کیوں کومی پتر! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔“  
خالہ نے کومی سے بھی تائید چاہی تھی۔ اس نے شد و مد سے اثبات میں

سر ہلایا۔

”جی خالہ“

”دیکھ حمادے! ان بوڑھی آنکھوں کو اور نہ ترسا۔ مجھ میں انتظار کا دم نہیں  
میرے بچے!“ خالہ آبدیدہ ہو گئیں۔

”اماں! میں تو قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو میری  
خواہش پوری ہو جائے گی۔“ وہ بے دلی سے بولا۔ وہ ان دونوں کو بھلا کیا  
بتاتا۔ جدائیاں تو اسے بھی گوارا نہیں تھیں۔ مگر مجبوریاں اور رزق نہ جانے  
کہاں کہاں باندھے لے جاتا ہے۔

”بس میں نے کہہ دیا ہے کہ تو کہیں بھی نہیں جا رہا۔“ خالہ ضدی لہجے میں  
گویا ہوئیں۔

”اگر شادی کر کے جاؤں تو پھر؟“ اس نے اچانک اک انوکھی بات کہہ دی  
تھی، لمحہ بھر کو دونوں ہی خاموش ہو گئیں۔

”ایسا ممکن ہے؟“ خالہ نے خوشی سے لرزیدہ آواز میں کہا تھا۔ کومی خاموش  
تھی، بھلا وہ اس موضوع پر کیا بولتی۔ شرم سے زبان تالو سے چپک گئی تھی۔  
”نا ممکن بھلا کیا ہے؟“ وہ مسکرا دیا۔

”تو نے میرے من کی بات چرائی ہے پتر!“ خالہ کو بیٹے پر ٹوٹ کے پیار  
آگیا۔

”اور آپ کے من میں کیا کچھڑی پک رہی ہے، کچھ بولیے نا، خاموش کیوں  
ہو گئیں اب، ابھی تو تڑ تڑ جواب دیے جا رہی تھیں۔“ حماد خان کو اسے ستانے  
میں خوب مزہ آنے لگا تھا۔ ”اپنی رائے کا اظہار کیجئے، آپ کی مرضی بھی  
بہت اہمیت رکھتی ہے۔“

”خالہ کے سامنے کیا بولوں؟“ کومی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”یہ ہی کہ میں شادی کروانا چاہتی ہوں۔“ وہ آنکھوں میں شرارت لئے مسکرا رہا تھا۔

”دیکو نہیں۔“

”اماں! یہ کومل نہیں مان رہی۔ مجھے آنکھیں دکھا رہی ہے کہ آپ کو سمجھاؤں، دو، چار سال ٹھہر جائیں۔“ وہ اسے تپا رہا تھا۔

”کومی پتر! بدشگونی کی بات مت کرو۔ خیر سے اتنے طویل عرصے بعد اس آنگن میں خوشی اترے گی۔ پھر حماد باہر چلا جائے گا۔ میرے پاس تم ہوگی۔ تم دونوں کے بچے ہوں گے۔ وقت گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا۔“ خالہ مستقبل کی پلاننگ میں مصروف ہو گئی تھیں۔ حماد خان اسے میٹھی نظروں سے دیکھتا اماں کی طرف متوجہ ہوا۔

”پیاری اماں! بچوں کی آمد تک تو میں نہیں رکوں گا۔“

”کیا مطلب ہے تیرا۔“ خالہ کو غصہ آگیا۔

”مطلب مجھے تو جلد ہی جانا ہوگا۔“

”پھر بھی کب؟“ دونوں کی آنکھوں میں سوال اتر آئے۔

”یہ ہی تین، چار ماہ بعد۔“

”پتر! شادی کی تیاری نہیں کرنی کیا؟“ خالہ تو پریشان ہو اٹھیں۔ ”برادری کو روٹی کھلاؤں گی، دھوم دھڑکا کروں گی۔“

”اماں! دو، چار مہینے کم تو نہیں۔“

”سب کچھ تم نے اور کومی نے ہی کرنا ہے۔ میرے تو ہاتھ ابھی سے پھولنے لگے ہیں۔“ وہ سچ مچ بوکھلا گئی تھیں۔

”سب کچھ ہوگا اماں! آپ فکر نہ کریں۔ کیوں کومل صاحبہ!“ حماد خان بڑی دلکشی سے مسکرایا۔

”مجھے کیا پتا؟“ کومی جز بڑ سی بولی۔

”پتر! شادی کا سرخ جوڑا خریدنا، شہر سے لے کر آنا، آج کل کے فیشن کے مطابق۔“ خالہ کی آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے۔

”اماں! آپ ساتھ چلنا، اپنی پسند سے خریدنا۔“ خود بخود گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔

”نہ پتر! کومی کو ساتھ لے جانا، جس نے پہننا ہے، وہ خود ہی خریدے گی، گورا رنگ ہو تو لال رنگ بڑا ہی اٹھتا ہے۔“ خالہ تصور کی آنکھ سے شاید کومی کو دلہن بنا دیکھ رہی تھیں۔

”بس سرخ جوڑا ڈن ہوا، کیوں کوئل!“ وہ اسے ٹھوکے دیے جا رہا تھا۔

”انسان بن جاؤ حمادے! اس نے دانت پیسے۔“

”زیادہ چھپھورے مت بنو۔“

”اماں! یہ کوئل کچھ کہہ رہی ہے۔“ وہ اسے جی بھر کے آج ستانا چاہتا تھا۔  
”کیا؟“

”خود پوچھیں۔“ اپنا دامن اس نے صاف بچالیا۔

”کومی! کیا بات ہے، لال جوڑا نہ سہی، جو مرضی خرید لینا۔“ خالہ نے پچکار

کر کہا۔ ان کا خیال تھا کومی کو لال رنگ بھا نہیں رہا۔

”خالہ! سرخ رنگ ہی اچھا ہے۔“ اس نے پھر سے دانت پیسے۔

”تو پھر؟“ خالہ حیران ہوئیں۔

”اماں! آپ کی ہونے والی بہو، اور حالیہ بھانجی کہہ رہی ہے کہ زیور گہنے نہیں دیں گی کیا؟“

”میں نے کب کہا۔“ کومی چیخ پڑی۔

”ابھی میرے کان میں کہا ہے۔“

”خالہ! جھوٹ بول رہا ہے یہ۔“ وہ چلائی۔

”یہ چلنا، دھاڑنا، ذرا کم کردو، گلے میں خراشیں پڑ جائیں گی۔“ حماد خان نے

ایک مخلصانہ مشورہ دینا چاہا۔

”اور تم نے جھوٹ بولنا اور غلط بیان کب سے جاری کرنا شروع کر دیئے ہیں۔“

”سیاست دانوں کے پتر! میرے سے بات کر، بچی کے کان میں کیوں گھس رہا ہے۔“ خالہ نے تمللا کر کہا۔ اس کی کھسر پھسر ان کے کانوں تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔

”کان کا پردہ چیک کر رہا تھا۔“ وہ گڑ بڑایا۔

”تو نے حکمت کا علم کب سے سیکھا؟“

”ابھی میں دس منٹ پہلے۔“ وہ ہنسا۔

”مخول نہ کر میرے ساتھ۔“ انہوں نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

”تو پھر کس کے ساتھ مخول کروں؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”کل سے مایوں بٹھادوں گی اسے۔“ خالہ نے پٹاخہ چھوڑا۔

”تین ماہ پہلے ہی۔“ کومی چیخ اٹھی۔ ”خالہ! گھر میں بند کر کے مجھے زنگ لگانا ہے، کائی جم جائے گی مجھ پر اور میرے سکول کے بچے۔“

”بھاڑ میں گئے بچے، مفت خورے، دو وقت دماغ چاٹتے ہیں تیرا۔ آجاتے ہیں سہ پہر کے وقت بھی بستے بغل میں دبا کر۔“ خالہ بھنا کر بولیں۔

”اماں! آپ کی بھانجی علم بانٹی ہے، یہ بھی صدقہ جاریہ ہے۔“

”ارے بھوسہ بھرا ہے، ان کے دماغوں میں، یہ خوا مخواہ کھوپڑی کھپاتی ہے۔“

خالہ سہ پہر میں آنے والے بچوں سے سخت بے زار تھیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کو کمپنی دینے کے بجائے کومی بچوں کو پڑھانے بیٹھ جاتی تھی۔

”اماں! زیور اور گہنوں کا کیا کرنا ہے؟“ وہ انہیں پھر سے موضوع کی طرف لے آیا۔

”دو کنگن اور ایک سونے کا سیٹ چڑھاؤں گی۔“ خالہ خوشی خوشی بتانے لگیں۔

”یہ کنگن اور ایک سونے کا سیٹ کہاں چھپا رکھا تھا؟“ اس نے راز داری سے اماں سے پوچھنا چاہا۔

”بھلے وقتوں میں بنوا کر رکھے تھے۔ برے وقت میں بھی بیچنے کو دل نہیں چاہا تھا۔ سوچا کومی کے کام آئیں گے۔“ اماں ماضی کے کسی لمحے میں کھو گئیں۔

”بچپن سے ہی آپ کومی کو بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں اماں!“ وہ کومی کو اٹھتا دیکھ کر اس کا بازو پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“

”چائے بنانے۔“

”کام تو نیکی کا ہے۔ مگر ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔“ وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ ”جا کہاں رہی ہو، ابھی تو ولیمے کے ڈریس کو ڈسکس کرنا ہے۔“ اس نے پھر سے کومی کو چھیڑا۔

”کیا کرنا ہے پتر!“ خالہ نے نا سمجھی کے عالم میں بیٹے کی طرف دیکھا۔

”اماں! ولیمہ کے جوڑے کی بات کر رہا ہوں، کیسا ہونا چاہیے؟“

”یہ تم دونوں آپس میں صلاح کرلو۔“ انہوں نے کھلے دل سے اجازت دی۔

”دیکھ لو، میری اماں کتنی براڈ مائنڈڈ ہیں۔“ وہ فخریہ مسکرایا۔ ”اب بتاؤ، ولیمہ والے روز کیا پہنو گی۔“

”جا حمادے! دیکھ نہیں رہے، وہ شرما رہی ہے۔“ خالہ کو بھانجی کی پتلی حالت پر ترس آگیا۔ ”کومی! تین پیالے کڑک سی چائے کے ساتھ گڑ کی مٹھائی لے کر آ۔“ انہوں نے بیٹے کی شوخ نظروں سے کومی کو بچانا چاہا۔

”آج میری اماں اس خوشی کے موقع پر جی بھر کے بد پرہیزی کرنا چاہتی ہیں۔“ حماد خان ناراضگی سے جتاتے ہوئے بولا تھا۔

”تمہاری شادی کے بعد سے پرہیز شروع کروں گی۔“ وہ بیٹے اور بھانجی دونوں کو بیک وقت تسلی دے رہی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔



دھرتی کے پیٹ سے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ پھوٹتا تھا۔ جس کا شفاف پانی ندی میں جاگرتا۔ بستی کے اکثر لوگ یہ ہی پانی پینے کے لئے استعمال کرتے تھے۔

وہ سکول سے واپسی پر دہشت خان کے گھر چلی گئی تھی۔ اس کی ماں بیمار تھی۔ حکیم کی دوائی سے افاقہ نہیں ہوا تھا۔ شہر لے جانے کی طاقت دہشت خان کے باپ میں کہاں تھی۔ اپنی استطاعت کے مطابق علاج معالجہ کروا رہا تھا۔ اس کا دل بہت برا ہو رہا تھا، نہ جانے کیوں اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس بستی میں ایک معالج کا ہونا کس قدر ناگزیر تھا۔ نہ معالج تھا، نہ اچھی دوا تھی اور زندگی کو سسک سسک کر دم ہی تو توڑنا تھا۔

وہ گھر جانے کے بجائے ندی کے کنارے اپنے مخصوص پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کنکر پانی میں پھینکتے ہوئے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب دبے قدموں سے حماد خان چلا آیا ہے۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم اسی جگہ پر بیٹھی کسی سوچ میں گم ہوگی۔ کیا سوچا جا رہا ہے؟“ وہ اس کے قریب دھم سے بیٹھ گیا۔

”تم کب آئے ہو؟“ غیر متوقع حماد خان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکنے لگیں۔

”ابھی کچھ دیر پہلے۔“ وہ اپنے ہاتھ میں دبا سیب کومی کو تھماتے ہوئے بولا۔  
”گھر نہیں چلنا کیا؟“

”یہاں کچھ دیر بیٹھنا چاہتی ہوں“ اس کا انداز پر سوچ تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ نرمی سے پوچھنے لگا۔

”اس بستی میں کوئی ڈاکٹر نہیں آسکتا۔“

”کتنے ڈاکٹر آئے اور گئے، کمبخت ٹکنتے نہیں۔“ وہ کومی کی سنجیدگی کی وجہ سمجھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

”مستقل انتظام نہیں ہو سکتا۔ زکام اور بخار کی دوا لینے کے لئے اتنی دور جانا پڑتا ہے۔ زچہ بچہ کے علاج کی کوئی سہولت نہیں۔ زچگی کے دوران کئی عورتیں جاں بحق ہو جاتی ہیں۔ بچے پیدائشی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور مرض کی تشخیص کرنے والا کوئی نہیں۔“ کومی کے لہجے میں بے پناہ تھکن تھی۔

”میں خان سے بات کروں گا، اس کے پاس یقیناً کوئی حل ضرور ہوگا۔“ حماد خان نے اپنے دوست کا نام لیا تھا شاید وہ سن نہیں سکی تھی، اس کا دھیان دہشت خان کی بیمار ماں میں اٹکا ہوا تھا۔

”تم نے بتایا نہیں، کیسے اچانک آنا ہوا؟“

”گھر چلو گی تو خود بخو پتا چل جائے گا۔“ وہ مسکرایا۔ ”ایک سر پرائز ہے تمہارے لیے۔“

”کیا لائے ہو؟“

”خود دیکھ لینا۔“ وہ اس کے تجسس کو ہوا دینا چاہتا تھا۔

”بتا دو۔“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا ہو سکتا ہے؟“ وہ سوچنے لگی۔ ”نکاح کا جوڑا لائے ہو؟“ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ہاں... کچھ اور بھی ہے۔“ اس نے ”بھی“ پر خاصا زور دیا تھا۔

”کیا؟“ وہ متجسس سی کھڑی ہو گئی۔ دونوں دس منٹ کا فاصلہ پچیس منٹ میں طے کر کے آئے تھے۔ باتوں اور چٹکوں کے دوران، حالانکہ حماد خان بہت کم گو تھا اور کوئل ذرا سخت مزاج رکھتی تھی، مگر حماد خان کے لئے اس کے دل میں اور لفظوں میں نرمی ہی نرمی تھی۔ بڑی عجیب سی محبت دونوں کے درمیان پروان چڑھی تھی۔ کبھی اظہار کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ خوشبو کی طرح، کچھ کہتی، بولتی، سنتی اور احساس دلاتی محبت۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ خالہ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی، جب حماد

خان اس کا ہاتھ پکڑے ایک دوسرے کمرے کی طرف لے آیا۔

”یہ کیا ہے؟“ کومی حیران سی دیکھتی رہ گئی۔ چمکتا دمکتا فرنیچر، کلر ٹی وی، شیشے کا نفیس ریک، لکڑی کی دیدہ زیب الماری، منقش پلنگ، صوفہ۔

”حماد خان! اس کی بھلا کیا ضرورت تھی۔“ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ ”اتنا خرچہ کر دیا۔ یہ پیسے بچا کر رکھتے۔“

”تمہیں میرا سر پرائز پسند نہیں آیا؟“ وہ بد دل سا ہو کر پوچھنے لگا۔

”بہت اچھا ہے“ نیا نیا اور انوکھا... میں صرف یہ کہنا چاہ رہی ہوں“ یہ پیسے پردیس میں تمہارے کام آجاتے۔“

”پردیس جانے کی اجازت دے دو گی؟“ حماد خان نے جگمگاتی آنکھوں سے کومی کے چہرے پر بکھرتے رنگ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”دل نہیں مانتا“ مگر میں تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔“

”میں جلد لوٹ آؤں گا۔“

”اور ہم انتظار ہی کر سکتے ہیں، مجھے تو پہلے سے ہی خبر تھی، مجھے اور خالہ کو تنہا ہی رہنا ہے۔“ کیسی قبولیت کی گھڑی تھی جب یہ منحوس الفاظ انجانے میں اس کے منہ سے پھسلے تھے۔

”میرے دل کا کچھ تو خیال کرو، خوا مخواہ برا ہو رہا ہے، مجھے خوشی خوشی رخصت کرنا ہے، پردیس جا رہا ہوں، دنیا سے نہیں۔“ وہ ناراضگی سے گویا ہوا۔

”اللہ نہ کرے۔“ کومی دہل گئی۔ ”فضول ہانکتے رہا کرو۔“

”چائے پانی کا موڈ ہے تو پلاؤ، ورنہ مسافر تو چلا۔“

”ایک شرط پہ، کل کا دن یہیں گزارو گے۔“

”توبہ، تم نے تو ڈرا دیا تھا۔ میں نے سمجھا نہ جانے کیا ارشاد جاری کر دو گی۔“

وہ دہل سا گیا۔

”ڈرامہ کرو۔“ کومی ہنس پڑی۔ ”پتا نہیں کیسے کیسے دوست بنا لیے ہیں، پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔“

”ایک ہی دوست ہے میرا، جنید جان، بہت پیار کرتا ہے مجھ سے،‘ جانتی ہو‘ پچھلے سال میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا نا تو اسی نے مجھے خون دیا تھا۔ اس کا خون میری رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔“

”ہمارے دل سے تمہارے اس دوست کے لئے ہمیشہ دعا نکلتی ہے،‘ خالہ تو اٹھتے بیٹھتے اسے دعائیں دیتی ہیں۔ بڑا احسان ہے تمہارے دوست کا،‘ تم پر بھی اور ہم پر بھی۔“ کومی نے سادگی سے کہا۔ وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ سے چھو کر دیکھ رہی تھی۔

”حماد خان! یوں لگتا ہے،‘ میں خواب کے سفر میں ہوں۔ دعا کیا کرو،‘ یہ حسین سپنا کبھی نہ ٹوٹے۔“

”خواب کے اس سفر میں،‘ حماد خان ہمراہ ہے یا نہیں۔“ وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

”بکواس نہ کیا کرو۔“ کومی ناراض سی دھپ دھپ کرتی باہر نکل گئی۔

”میرے بغیر زندگی کے رنگ پھیکے ہیں کیا؟“ وہ بھی اس کے پیچھے ہی آدھمکا تھا۔ گھر میں ہوتا تو کومل کے پیچھے پیچھے رہتا، باہر نکلتا تو تب بھی دھیان ادھر ہی اٹکا رہتا۔

”تو اور کیا۔“

”اتنی محبت کرتی ہو،‘ مجھ سے۔“

”یہ سوال نہ پوچھا کرو۔“ سنجیدگی اس کے چہرے پر گہری ہوتی چلی گئی۔ شعور نے جب سے دامن پکڑا ہے،‘ تمہارے چہرے کو ہی دیکھا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کی تمنا اس دل نے کبھی نہیں کی۔ تمہارے شوق کے پیش نظر تمہیں باہر جانے کی اجازت دے رہی ہوں،‘ ورنہ...“ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے ضبط کے مراحل سے گزر رہی تھی۔

”تمہیں کون سا خوف لاحق ہے؟ کیا یہ ہے کہ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا؟“ حماد خان اس کے قریب کھڑا پوچھ رہا تھا۔ فاصلہ صرف دو قدم کا تھا اور ابدی جدائی بھی پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”نہیں مجھے خوف ہے تو تم سے بچھڑنے کا“ پتا نہیں، دل اس قدر بجھا بجھا کیوں ہے۔“ کوئل اپنے احساسات بتانے سے قاصر تھی۔

”دل کو وہموں سے پاک کرلو۔“ وہ روشن آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

”یہ دل اور اس کی صدائیں مجھے پاگل کر دیں گی۔ پوری خوشی تو جانے میرے نصیب میں لکھی ہے یا نہیں۔“ کوئل لب کچلتی کہہ رہی تھی اور جو وہ کہہ رہی تھی۔ وقت اسے سرخ روشنائی کے ساتھ رقم کر رہا تھا۔

☆☆☆

”اماں! میری شادی کا ارادہ ہے بھی یا نہیں، منگنی پر ہی ٹر خا دیا ہے مجھے۔“ جب سے سرخیل خان کو حماد خان کی بات پکی ہو جانے کی اطلاع ملی تھی، وہ تو سخت اتاؤلا ہو رہا تھا۔

”ارے دم تو لو بچے! تم سے بڑے ابھی دو منگنی شدہ بھی نہیں ہوئے۔“ اماں اس کی مسخریوں سے اچھی طرح واقف تھیں۔ مگر اس وقت تو وہ اچھا خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔

”حمادے کی شادی ہو رہی ہے۔“ وہ جل بھن کر بولا۔

”یہ تو خوشی کی خبر ہے۔“

”کوئی خوشی کی خبر آپ بھی سنا دیں۔ آپ کے ارمان کہاں جا کر سوچکے ہیں اماں! نہیں جگائیں، اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجائیں۔ میں شادی کے لئے مرا جارہا ہوں۔“ وہ تلملایا۔

”خیل خان! تجھے کیا ہو گیا ہے۔“ اماں تو بے چاری حق دق رہ گئیں۔

”شادی فوبیا ہو گیا ہے، میرے یار کے سر پر سہرا سجے، ڈھول ڈھمکا بجے اور میں بغیر سہرے کے پھروں امپا سبل۔“ وہ تو باقاعدہ تقریر کرنے کھڑا ہو گیا تھا۔



”خیبر اور گل شیر امریکہ سے آئیں تو پھر یہ موضوع چھیڑنا۔“ اماں کا انداز صاف ٹالنے والا تھا اور وہ ٹلنے والا ہرگز نہیں تھا۔

”اور وہ آئیں گے چار سال بعد، میں اتنا صبر نہیں کر سکتا۔“

”بے شرما! ماں کے سامنے تو حیا کر لے۔“ اماں ناراض ہونے کے بجائے مسکرا رہی تھیں۔

”میں لطیفہ نہیں سنا رہا، آپ مسکرائے جارہی ہیں۔“ سرخیل خان برا مان گیا۔

”تو خود پورا لطیفہ ہے میرے بچے! فکر نہ کر، تیرے ابا جان سے بات کروں گی۔“ اماں نے پیار سے اسے پچکارا۔

”بچہ نہیں ہوں میں، جسے لولی پاپ پکڑا کر بہلا رہی ہیں، آج ہی فائنل بات کریں۔“

”ابھی نا، تیرا نکاح پڑھا دوں نگین سے۔“ اماں بولیں۔

”میں تو تیار ہوں، بلاؤں مولوی قیوم الدین کو۔“ وہ سچ مچ کھڑا ہو گیا۔

”خیل بچے! تھوڑا ذمہ دار ہو جا، کچھ ہاتھ بٹا اپنے ابا جان کا کاروبار میں۔“

اماں نے پھر سے پچکارا۔

”پلیز اماں! فی الحال نصیحتوں کی پوٹلی بند ہی رکھیے۔“ وہ بے زار سا ہو گیا۔

”اماں! کہاں ہیں؟ گل شیر سے بات کریں۔“ نگین نے غلط موقع پر انٹری دی تھی۔

اماں کے ہاتھ میں ریسیور تھمایا تھا اور خود اس کے برابر بیٹھ گئی۔

”تم نے کونین کی گولی کھائی ہے؟“

”نہیں تو۔“ وہ لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”بو تھی پر تو یہ ہی کچھ لکھا ہے۔“

”شکل اچھی نہ ہو تو بات اچھی کر لینی چاہیے۔ بندہ پھر بھی خوبصورت ہی لگتا

ہے۔“ وہ بھی گویا ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

”میرے گلے کیوں پڑ رہے ہو؟“ نگین نے ناک چڑھائی۔

”میں تو تین فٹ دور بیٹھا ہوں۔“

”محاورہ بولا ہے میں نے۔“ نگین نے گویا ماتھا پیٹا۔

”اچھا۔“ وہ سمجھ کر مسکرایا۔ ”بتا دینا تھا نا یہ محاورہ ہے۔“

”کتنے جاہل ہو تم، محاورہ تک سمجھ نہیں سکتے۔“ نگین کو بھی اسے چڑانے کا موقع مل گیا۔

”اور کتنی قابل ہو تم، میٹرک میں بار بار فیل۔“ وہ بھی چبا چبا کر بولا۔

”لو فر انسان! تمہاری یادداشت سے یہ بات نکل کیوں نہیں جاتی۔“ نگین تلملائی۔

”یہ لو فر انسان، تمہارا شوہر بننے والا ہے۔“ اس نے کالر کھڑے کیے۔

”کب؟“ نگین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”عنقریب، وہ دن دور نہیں جب تم میری کنیز بن جاؤ گی۔“ وہ شاہانہ انداز میں بولا تھا۔

”منہ دھو رکھو اپنا، میں اس نام نہاد منگنی کو توڑ بھی سکتی ہوں۔“ نگین نے اسے دھمکانا چاہا۔

”کیسے؟“ وہ حیران ہوا۔

”ایسے۔“ نگین نے انگوٹھی اتار کر اس کی طرف اچھالی تھی، جسے سرخیل خان نے مہارت سے کیچ کر لیا۔

”اور میں پتا ہے کیا کروں گا؟“

”کیا کرو گے؟“ نگین نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

”یہ انگوٹھی کسی خوبصورت لڑکی کی حسین انگلی میں پہنا دوں گا۔ کم از کم انگوٹھی کی قیمت تو وصول ہو جائے گی۔“ اس نے نگین کو بری طرح سے چڑایا۔

”میری انگوٹھی واپس کرو۔“ نگین چیخی۔

”ہرگز نہیں، یہ انگوٹھی اب تمہیں نہیں ملے گی۔“ وہ انگوٹھی کو ہتھیلی پر رکھے باریک بینی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کسے دو گے؟“ وہ دھاڑی۔

”وہ ہی جو اس کی اصل حق دار ہوگی۔“

”زندہ نہیں چھوڑوں گی میں اس لومڑی کو۔“ نگین نے دانت پیسے۔

”کون لومڑی؟“

”وہ ہی جو...“ نگین گڑ بڑا کر رہ گئی تھی، کیونکہ انگوٹھی پھر سے اس کی گود میں گر چکی تھی۔

”تم نے خود کو ٹھیک پہچانا۔“ سرخیل خان نے قہقہہ لگایا تھا۔

”خیل خان! بہت برے ہو تم۔“ وہ تنتنائی۔

”ارے، پھر سے جھگڑنے لگے۔“ اماں فون سن چکی تھیں۔ انہیں ایک دوسرے کے بچنے ادھیڑتے دیکھ کر سر تھامے بیٹھ گئیں۔

”چھوڑیے اماں! میری تعریفوں پر خوا مخواہ وقت ضائع کریں گی۔ یہ بتائیے، گل شیر کیا کہہ رہا تھا؟“ وہ بھی کمال کا اداکار تھا، فوراً موضوع بدل گیا۔

”خیر سے خیبر خان اور گل شیر واپس آرہے ہیں۔“ اماں سرشار سی بتانے لگیں۔

”کب؟“ وہ دونوں چلا اٹھے۔

”اگلے ہفتے۔“ اماں خوشی خوشی بتانے لگیں۔

”یاہو...“ ان دونوں نے جوش کے عالم میں نعرہ لگایا۔

☆☆☆

خیبر خان اور گل شیر کے واپس آتے ہی گھر میں خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔ بیٹوں کی وطن واپسی اور وہ بھی اعلیٰ ڈگریوں کی ہمراہی کے ساتھ ابا

جان کا سینہ فخر سے پھلا گئی تھی۔ وہ اکثر کہتے تھے۔ ”خیل خان ہمارا لاڈلا بیٹا ہے، مگر اس نے ہمیں تعلیم کے معاملے میں خاصا مایوس کیا ہے۔“

اماں کے سوئے ہوئے سارے ارمان جاگ گئے تھے۔ بیٹوں کو دیکھتے ہی ان کی شادیوں کے لئے سرگرم عمل ہو گئیں۔

گل شیر خان کے لئے اپنی بھانجی مروت کو سلیکٹ کر لیا گیا تھا۔ اور خیبر خان جیسے چاکلیٹی ہیرو کے لئے کوئی لڑکی نظر میں نہ آ رہی تھی۔ ابھی لڑکیاں دیکھنے کا سلسلہ جاری تھا۔ جب خیبر خان نے نرم نرم الفاظ میں دھماکہ کر دیا تھا اور حیرانی کی بات یہ تھی ابا جان نے سوچ سمجھ کر اس کی خواہش پر سر تسلیم خم کر دیا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔

خیبر خان نے ابا جان سے نگین کے ساتھ کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس کے خیال میں نگین جیسی سادہ مزاج، سیدھی سادی گھریلو لڑکی بہت مناسب تھی۔ وہ خود بہت سادہ مزاج رکھنے والا اعلیٰ سوچ کا حامل نوجوان تھا۔ تمام عمر

امریکہ میں گزارنے کے باوجود یورپ کے ماحول نے اس کے کردار پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ مضبوط، شاندار اور ہر لحاظ سے مکمل۔

ابا جان نے سوچا، غور کیا اور خیبر خان کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ جس نے سنا گویا دھک سے رہ گیا، حتیٰ کہ اماں بھی گھبرا اٹھیں۔

”خان جی! یہ آپ نے کیسا فیصلہ سنا دیا۔ نگی تو خیل خان کی منگ ہے۔ بچپن کی منگ۔“

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ نگی اور خیل خان کے حق میں یہی بہت ہے۔ مجھے نگی بھی عزیز ہے اور خیل خان بھی۔ نگی کی یہی مناسب عمر ہے اور اس کے لئے خیبر خان جیسا سمجھ دار، ذمہ دار شخص ہی بہتر رہے گا جبکہ خیل خان میں بہت بچپنا ہے۔ ابھی شادی کے لائق نہیں۔ کھیلنے کودنے کی عمر ہے اس کی۔ ذمہ داریوں کا بوجھ ابھی سے لادنے کو دل نہیں مانتا۔“

”وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ آپ اچھی طرح سے واقف ہیں۔“ وہ حد درجہ متوحش ہو گئیں۔

”بچپن سے ساتھ ہیں۔ انسیت تو ہو ہی جاتی ہے۔“ ان کا انداز سر سری تھا۔

”اور وہ جو باقاعدہ منگنی کی تھی۔“ وہ روہانسی ہو گئیں۔

”آپ پریشان مت ہوں۔ خیل خان کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ اپنے بھائی کی پسند کو اہمیت دے گا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ہمارے بیٹے نے کچھ مانگا ہے اپنی کسی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کی خواہش کو رد نہیں کر سکا۔ خیل خان کو میں سمجھا دوں گا۔ اسے بھی خیر خان کی خوشی کا خیال کرنا چاہیے۔ ہمارے بیٹے ہماری تربیت پر حرف نہیں آنے دیں گے۔“

اور دروازے کے دوسری طرف کھڑے خیل خان کے قدموں کے نیچے سے زمین دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ”یہ ابا جان نے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔“ اس کے جسم میں گردش کرتا لہو تھم تھم گیا۔

☆☆☆

”خیل خان! اونچیلے! اٹھ بھی جا۔ بھنگ پی کر سوئے ہو۔ ادھر مجھ پر قیامت بیت رہی ہے اور تم کیسے نیند میں دھت پڑے ہو۔“ نگین نے چیخ چیخ کر کمرہ

سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ سو تو نہیں رہا تھا بس تکیے میں منہ دیے لیٹا رہا۔

”خیل خان! اٹھو نا،“ نگین رو دینے کو تھی۔

”کیا ہے؟“ وہ بھاری آواز میں بولا۔

”تم نے کچھ سنا ہے۔“ نگین سچ مچ رو پڑی تھی اور وہ تو پچھلے تین دن سے چپکے چپکے رو رہی تھی۔

”ہا سنا ہے۔“

”سب کچھ جان کر بھی ایسے پڑے ہو۔“

”تو کیا کروں۔“ وہ الٹا نگین سے پوچھنے لگا۔

”ابا جان کے فیصلے پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟“

نگین رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی تھی جو تکیہ ہٹا کر اٹھ بیٹھا تھا۔



”نہیں“

”مک کیوں؟“ چھت گویا اس کے سر پر آن پڑی تھی۔

”اعتراض کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ خیبر خان میں کیا کمی ہے؟“

”یہ تم کہہ رہے ہو۔“ نگین ششدر رہ گئی۔

”کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا۔ ایک دنیا خیبر خان کے عشق میں گرفتار ہے۔“ وہ

لاپرواہی سے کہہ رہا تھا۔

”میں اس دنیا میں شامل نہیں ہوں۔“ نگین چبا چبا کر بولی۔

”اب شمولیت اختیار کرلو۔“ اس نے اطمینان سے کہہ دیا تھا۔ گویا جو کچھ ہو رہا

تھا اس کی بلا سے۔ ابا جان کا ہر قول ان کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ

کیسے ممکن تھا کہ خیل خان بغاوت کا علم اٹھا لیتا۔ یہ منگنی بھی ان کی باہمی

رضا مندی سے ہوئی تھی اور باہمی رضا مندی کے ساتھ توڑی بھی گئی۔ ابھی

کل رات خیبر خان اس سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم دونوں یعنی نگین اور تم۔ ایک

دوسرے سے کافی اٹیچ رہے ہو۔ میں نے سنا ہے۔ بچپن میں رشتہ بھی رہا ہے۔

اگر تم نگین کے لئے سوفٹ ایموشنز رکھتے ہو تو میں تم دونوں کے درمیان

نہیں آؤں گا اگر یہ صرف کزنز ہونے کے ناتے دوستی رہی ہے تو نگین کو

اپنی زندگی میں شامل کرنا میری اولین آرزو بن چکی ہے۔ وہ مجھے صرف اچھی

نہیں لگی تھی۔ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بہر حال تمہاری خوشی مجھے

ہمیشہ عزیز رہے گی۔“ وہ شائستگی سے نرمی سے اپنا نقطہ نظر واضح کر رہا تھا۔

”اور لالہ! تمہاری خوشی مجھے بھی ہمیشہ عزیز رہے گی۔“ خیل خان کو

مسکراتے میں کس قدر وقت پیش آیا تھا۔

”ہم دونوں میں صرف دوستی کا رشتہ ہے جو سدا قائم رہے گا۔“ اس نے

خیبر خان کے دل میں چھپی پھانس نکال دی تھی۔

”خیل خان! کہاں کھو گئے۔“ نگین نے اس کا کندھا ہلایا۔ ”تم ٹھیک تو ہونا؟“

”مجھے کیا ہونا ہے۔ میں پہلے کی طرح ہشاش بشاش ہوں۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”تمہیں قطعاً افسوس نہیں۔ تمہیں ذرا دکھ نہیں۔ ہماری منگنی ٹوٹ رہی ہے۔  
رشتہ ختم ہو رہا ہے اور تم اتنے مطمئن ہو۔“ نگین گویا پھٹ پڑی۔

”میرا اور تمہارا مزاج نہیں ملتا۔ تم بھی آگ کی طرح بھڑکتی رہتی ہو اور میں  
بھی شعلہ ہوں۔ بعد میں مسائل کھڑے ہوں۔ اس سے بہتر ہے ہم کوئی اچھا  
سا فیصلہ کر لیں۔“

”اور وہ سب کیا تھا۔ تمہاری توجہ، وہ احساس، خیال، محبت“ وہ چیخی۔

”دھوکا، فریب، جھوٹ، کچھ بھی سمجھ لو۔“ سرخیل خان ہنس رہا تھا۔ ”نگی!  
کیوں اتنی جذباتی ہو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ خیبر خان کی نظر تم پر  
ٹھہری ہے۔“

”بھاڑ میں جاؤ۔ کمینے انسان، میرے جذبات، میری محبت کا مذاق اڑایا ہے تم  
نے۔ میں خود ہی تم جیسے بے غیرت پر لعنت بھیجتی ہوں۔ کسی اور کو کیا دوش  
دوں۔ نظریں تو تم ہی نے بدلی ہیں۔ ورنہ میں تو ابا جان کے سامنے بھی ٹھہر  
ہی جاتی۔ تم سے بہتر تو خیبر لالہ ہیں۔ میری عزت کرتے ہیں۔ مجھ سے محبت

کرتے ہیں تمہارا اور ان کا بھلا کیا مقابلہ ہو نہ! لفظ، لوفر، کمینہ، پنڈی میں  
کسی کے ساتھ آنکھیں لڑا آیا ہوگا۔“ وہ تن فن کرتی باہر نکل رہی تھی۔ ”تم  
تو میرے قابل ہی نہیں۔ ابا جان نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ میں کیوں نافرمان  
بنوں۔ بغاوت کروں۔ جب تم ہی کو پروا نہیں۔“

”شادی کی تیاری کرو۔ کچھ کام ہو تو مجھے بلوا لینا۔ خادم ہمیشہ حاضر رہے گا۔“  
وہ جو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی تھم کر رہ گیا۔

”جو بھی سمجھ لو گی! مگر میں بھی ابا جان کے فیصلے سے اختلاف نہیں کر سکتا  
اور محبت کا کیا ہے۔ یہ تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی جو دل کو اتنا اچھا  
لگے کہ اس کے بغیر جینا محال ہو۔ تم آباد اور شاد رہو۔ میری صرف یہی دعا  
ہے۔ لالہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی فراہم کرے گا۔ اتنا تو مجھے یقین ہے۔“ وہ  
زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

☆☆☆

نگی اور خیبر خان کی شادی یادگار شادیوں میں شمار ہوتی تھی۔ اتنی دھوم دھام سے ہوئی کہ مدتوں تک ذہنوں میں محفوظ رہ سکتی تھی۔

ان کا ہنی مون ٹور بھی یادگار رہا تھا۔ نگی کو دیکھ کر پہچاننا مشکل تھا۔ صرف ڈیڑھ مہینہ اس کی زندگی میں انقلاب لے آیا تھا۔ اول جلول لاہروا سی نگی ایک شائستہ سے لبادے میں لپٹ گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح چٹکے چھوڑتی ہنستی مسکراتی نگی کے گالوں پر کھلتے شگوفے خیل خان کے سارے خدشات مٹاتے چلے گئے۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح لڑتے جھگڑتے تھے۔ ایک دوسرے کے بچے ادھیڑتے اور خیبر خان ان کی نوک جھوک سے محفوظ ہوتا تھا۔ گل شیر واپس چلا گیا تھا اور خیل خان بھی اس کے پاس جانے کی چپکے چپکے تیاری کر رہا تھا۔

حماد خان کو بھی اسکالر شپ مل گیا تھا۔ وہ اپنی شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ باہر جانے کے انتظامات میں بھی مصروف تھا۔ خیل خان نے جس شب کو پنڈی کے لئے روانہ ہونا تھا اس سے اگلے دن حماد خان کی شادی تھی مگر

اسی رات ابا جان کو شدید گردے میں درد اٹھا تھا۔ دل کے مریض تو وہ پہلے سے ہی تھے۔ گھر بھر میں پریشانی کی لہر جاگ اٹھی تھی۔ اس نے فی الفور اپنا پروگرام بدل لیا تھا۔ ابا جان کو ہاسپٹلائز کر دیا گیا۔ حماد خان کی شادی اسی پریشانی کی نذر ہو گئی تھی۔

شادی کے تیسرے روز ابا جان کو ڈسچارج کیا گیا تو اس نے بھی پنڈی کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔ حماد خان سے رابطہ ہو چکا تھا اور وہ اسے لینے کی غرض سے پنڈی پہنچ چکا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ حماد خان کے گاؤں جا رہا تھا سو متجسس تو تھا ہی سرخیل خان اپنی گاڑی میں تھا اور ابھی وہ دونوں شہر کی حدود میں تھے جب اچانک دو موٹر سائیکل سوار نجانے کہاں سے نکل آئے۔ ان کے چہرے نقاب میں چھپے تھے اور وہ شاید انہیں لوٹنے کے لئے آئے تھے۔

”جو کچھ ہے نکالو باہر۔“

”کچھ بھی نہیں ہمارے پاس۔ پھر کیا نکالیں۔“ سرخیل خان کا جوشیلا خون جوش کھانے لگا۔

”کیش، موبائل اور گاڑی کی چابی ادھر کرو۔“ دوسرے آدمی نے پستول کے ٹریگر پر ہاتھ رکھے رکھے چنگھاڑ کر کہا تھا۔

”او بھائی! ہم جلدی میں ہیں۔ جانے دو ہمیں، کسی اور کا راستہ روکو۔ ہم فقیروں کے پاس تمہارے لئے کچھ نہیں۔ مانگے تانگے کی گاڑی ہے۔“ حماد خان نے اس کے پیر پر ٹھوکا دے کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

”یہ ایسے نہیں مانیں گے استاد!“

”موٹر سائیکل بھگاؤ۔“ سرخیل خان بھی چنگھاڑا۔

”بڑا جوش ہے تم میں۔“ پہلے والا آگے بڑھا۔ ”استاد! ذرا ٹھنڈا کرو، اس کے ابلتے خون کو۔“ بس لمحوں کا کھیل تھا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا تھا اور حماد خان جو اپنا جمع جتھا نکال رہا تھا فائر کی آواز سن کر دم بخود رہ گیا۔ وہ دوسرا فائر کھولنے لگا تھا جب حماد خان نے بغیر سوچے سمجھے نقاب پوش آدمی سے پستول

جھپٹنا چاہا تھا۔ سرخیل خان کے سینے میں اترنے والی گولی رخ بدل کر حماد خان کے دل میں اتر گئی تھی۔ لمحوں کا کھیل تمام ہوا تھا۔

وہ کون لوگ تھے؟ دہشت گرد؟ ڈاکو؟ لٹیرے؟ جو بھی تھے بس لمحوں میں کوئل بختیار کا دل اجاڑ کر بھاگ نکلے اور اسی سہ پہر پنڈی میں بم دھماکہ ہوا اور نہ جانے کتنے ہی بے قصور لوگ موت کی آغوش میں جاسوئے۔ سہاگنیں ابھاگنیں ہو گئیں، بچے یتیم ہوئے۔

حماد خان نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ زندگی جسے دیکھ کر مسکراتی تھی۔ وہ بہت ہی ذہین اور حد درجہ خوددار شخص دوستی اور دوست پر قربان ہو گیا تھا۔ کیا تھا اگر وہ سرخیل خان کے سامنے نہ آتا؟ وہ بے رحم گولی حماد خان کا سینہ تو نہ چیرتی؟ ہسپتال کے بستر پر پڑے ان سوچوں کے علاوہ اس کے پاس آخر بچا ہی کیا تھا۔ وہ تو اتنا بدنصیب تھا کہ حماد خان کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔ ابا جان اس کی حالت دیکھ کر اور بھی بیمار رہنے لگے تھے اور انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کچھ عرصہ کے لئے سرخیل خان کو اس کے

بھائیوں کے پاس بھجوا دیں۔ سرخیل خان باہر جانا تو نہیں چاہتا تھا، مگر گل شیر اور خیبر لالہ کے اصرار نے اسے مجبور کر دیا تھا اور وہ اپنے یار کی دائمی جدائی اور ناگہانی موت کا نہ بھولنے والا غم لیے پردیس چلا گیا۔

وہ مقدر کی ستم ظریفی پر ششدر تھا۔ پہلے نگین نہیں رہی تھی، پھر حماد خان چلا گیا۔ اپنے ہی غموں میں گم سرخیل خان کو لمحہ بھر کے لئے بھی حماد خان کی بیمار یوڑھی ماں اور تین روز کی بیوہ کا خیال نہیں آیا تھا۔ یورپ کی رنگینیوں اور تیز رفتار زندگی میں کھو کر اب بھی یقیناً وہ کبھی نہ چونکتا، مگر اس خواب نے سرخیل خان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور اس خواب کا تسلسل پاکستان آنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ یہ پہلا عجیب و غریب خواب تھا جس نے حماد خان کو ٹھٹکا دیا۔ یہاں تک کہ اسے گل شیر سے بہت سی باتیں شیئر کرنا پڑی تھیں اور گل شیر نے اسے وادی میں جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ خواب کا وہ سفر اس حسین برف سے ڈھکی وادی میں اختتام پذیر ہوا تھا، جب اس نے یعنی سرخیل خان نے کومل بختیار کو دیکھا۔

☆☆☆

”آج بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو۔ نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے بھی اتنے خوش نہیں تھے۔“ وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑ رہی تھی۔ بڑے اہتمام سے تیار ہوتا حماد خان اسے دیکھنے لگا تھا اور پھر مسکرا دیا۔

”کہاں جانے کی تیاری ہے؟“

”پنڈی جا رہا ہوں۔“ وہ پرفیوم اسپرے کرتا ہوں مصروف سے انداز میں بولا۔

”یہ پنڈی تو میری سوکن بنتا جا رہا ہے۔“ کومی جل بھن کر رہ گئی۔

”کوہاٹ سے میرا یار آرہا ہے۔ اسے ساتھ لے کر آؤں گا۔ وہ یہاں کے راستوں سے انجان ہے۔“ حماد خان نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی تھی۔

”تمہارا یار میری پہلی سوکن ہے اور یہ پنڈی کا شہر دوسری، ان دونوں نے تمہارے پیروں میں پہیے باندھ رکھے ہیں،“ کومل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔



”ایک ہی تو میرا دوست ہے اس سے مت جلا کرو۔“ حماد خان نے قہقہہ لگایا تھا۔

”تمہارا دوست میرا رقیب ہے۔“ وہ کبیل تہہ کر رہی تھی۔ ”واپسی کب تک ہوگی؟“

”ابھی گھنٹہ ڈیڑھ میں تمہارے پاس آجاؤں گا“ فکر مت کرو۔“ حماد خان نے اسے تسلی دی۔

”ویسے تمہارا اکلوتا یار شادی میں تو آیا نہیں۔“

”اسی لئے تو اب آرہا ہے، تمہیں رونمائی کا تحفہ دینے، اس کے والد اچانک بیمار ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے آ نہیں سکا تھا۔“ وہ جاگرز کے تسمے کستا کھڑا ہو گیا۔

”کھانے میں کیا بناؤں؟“ کومی کو ایک دم خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

”جو کچھ وہ شوق سے کھاتا ہے، تم نہیں بنا سکو گی۔ اپنی مرضی سے کچھ بھی بنا لینا۔“ حماد نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ شوق سے کیا کھاتا ہے، میں مہمان کی پسند کا کھانا بناؤں گی۔“ وہ ضدی لہجے میں گویا ہوئی۔

”تمہیں بنانا ہی نہیں آئے گا یار! اپنی روایتی ڈشز بنا لینا۔ جو بھی آسانی کے ساتھ پکا سکو۔“ وہ نرمی سے سمجھانے لگا تھا، مگر کومی کو غصہ آگیا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، میں پھوہڑ ہوں، کچھ پکا نہیں سکتی۔“

”میرا یہ مطلب نہیں، خان کو الم غلم پسند ہے، میں تو...“ حماد خان کی بات درمیان میں رہ گئی تھی۔

”کچھوے اور خرگوش کھاتا ہے تمہارا یار! پھر تو معذرت کرتی ہوں، یہ میں نہیں بنا سکتی۔“ وہ بھنائی۔

”اسے بدیسی کھانے پسند ہیں، چائیز فوڈ، اٹالین، فرانسیسی۔“ حماد خان نے ہنستے ہوئے وضاحت کی۔

”بڑا آیا انگریز کا پتر۔“ کومی نے جل کر کہا۔ ”ادھر مت لانا اسے“ مینڈک اور مچھر کھانے والے کو، چھی، چھی۔“ کومی کا جی بری طرح متلایا۔

”وہ مینڈک اور مچھر نہیں کھاتا، اف کومل! تم بھی نا۔“ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہوا۔ زندگی میں شاید پہلی مرتبہ وہ اس قدر دل سے ہنسا تھا اور کومی کو بھلا کیا خبر تھی، وہ آخری مرتبہ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کی ہنسی کو آخری مرتبہ سن رہی ہے۔ اگر جان جاتی تو جی بھر کے دیدار یار سے سیراب ہو جاتی ہے۔

”خیر سے جلدی آجانا۔ وہیں ڈیرہ لگا کے بیٹھ نہ جانا۔“ وہ باہر نکلنے سے پہلے بار بار اسے یاد دہانی کروا رہی تھی۔ ”پنڈی ہمیشہ تمہیں روک لیتا ہے۔“ اور پنڈی نے سچ مچ اسے ہمیشہ کے لئے روک لیا تھا۔

وہ اپنے قول کے مطابق ڈیڑھ گھنٹے سے بھی پہلے آگیا تھا۔ مگر تنہا، خاموش، ساکت، اکیلا، خون میں ترتر، نہ جانے اس کا یار کہاں تھا۔ جسے لینے کے لئے وہ گیا تھا اور کومل دستر خوان پر رنگ رنگ کے کھانے سجائے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی اور یہ انتظار، انتظار ہی رہا تھا۔ آناً فاناً ہر منظر کو لال رنگ نے ڈھانپ لیا تھا۔ خالہ پچھاڑیں کھا کر گر پڑی تھیں اور کومل، اس کے وجود کو وقت کے اس بے رحم وار نے پتھر کر دیا تھا۔ سنگ مرمر سے تراشے اس پتھر میں جان کب پڑی تھی۔ اس وقت جب وہ اجنبی سر جھکائے، بھرائی آواز میں اور نم آنکھوں سے سفید برف کو دیکھتا انکشاف کر رہا تھا اور اس کے انکشاف نے کومل کو دنگ کر دیا۔

”میں حماد خان کا یار ہوں، اکلوتا یار، میری زندگی کو بچاتے ہوئے وہ اپنی زندگی ہار گیا تھا۔ میرا دوست مجھ پر قربان ہو گیا۔ میں بدنصیب ہوں، جو اسے کاندھا بھی نہ دے سکا۔ میں بے غیرت ہوں جو اس کی بوڑھی ماں اور تین دن کی بیابھی بیوہ کو بے آسرا کر گیا۔ مڑ کر خبر بھی نہ لی۔ پلٹ کر پوچھا تک

نہیں۔ میں مجرم ہوں تمہارا، میری وجہ سے تم ابھاگن ہو گئی اور میں سرخیل  
دلاور خان طلب گار ہوں تمہارا۔ اگر مجھے اپنے قابل سمجھو، میں پھر سے  
تمہیں آباد کروں گا، شاد کروں گا، تمہیں پھر سے خوشی کے رنگ سے  
روشناس کرواؤں گا، تمہاری آنسوؤں سے گم ہنسی کو لوٹاؤں گا، میری جان پر  
ایک قرض دھرا ہے، یہ قرض مجھے چکانا ہے، تم چاہو تو ایک نئی زندگی  
تمہاری منتظر ہے۔“

سرخیل خان کارنر ٹیبل پر سچی حماد خان کی زندگی سے بھرپور تصویر کو اٹھا  
کر دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اگر تم چاہو تو، ستارے پھر سے چمکنے لگیں گے، اگر تم چاہو تو، بہاریں لوٹ  
آئیں گی، اگر تم چاہو تو، سرخیل خان جرم کے اس احساس سے بری ہو جائے  
گا، اگر تم چاہو تو سرخیل خان تمہیں پھر سے محبت کرنے کا سلیقہ اور طریقہ  
سکھا دے گا اور اگر تم اجازت دو گی تو میں تمہارے دل کی سرزمین پر اپنی

محبت کا بیج بو دوں گا۔“ وہ اسے ساکت، بے دم اور گم صم کھڑا دیکھ کر  
رکا نہیں تھا، پلٹ گیا تھا، دھیمے اور مضبوط قدموں سے۔

☆☆☆

”میں کوئل بختیار ہوں، حماد خان کی بیوہ، بدمزاج، غصیلی، جھگڑالو، بستی کے  
لوگ مجھے ان ہی القابات سے نوازتے ہیں، حماد خان کے جانے کے بعد میں  
نے خود پر ایسا ہی خول چڑھالیا تھا۔ میں نے زندگی سے خوشی اور ہنسی کی  
طلب کرنا چھوڑ دی تھی۔ میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا، پیسہ جمع  
کرنا، رقم جوڑنا اور میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے بہت مشقت کر رہی  
تھی۔“

مجھے بستی والوں کے لئے بہت بڑا نہ سہی ایک چھوٹا سا ہسپتال بنوانا تھا اور  
اس کے لئے بہت وقت اور پیسے کے ساتھ ساتھ طویل انتظار کی ضرورت  
تھی اور مجھے لگا تھا یہ انتظار اختتام پذیر ہو گیا۔

سرخیل خان، ایک نرم دل اور نیک طبیعت نوجوان، درد دل رکھنے والا ہمدرد انسان، مجھے امید تھی سرخیل میری مدد ضرور کرے گا اور اسی وجہ سے میں نے اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ میں اس سے نرمی سے بات کرنے لگی تھی۔ حالانکہ میری حسیات خاصی تیز ہیں اور میں اس کی نظروں کے بدلتے مفہوم سے انجان نہیں اور صرف مصلحت کے تحت خاموش رہنا میری مجبوری تھا۔ اور آج میں سرخیل خان سے اسی موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی، جب اس کے انکشاف نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔

”تو تم تھے حماد خان کے دوست، جس پر میرا حماد خان قربان ہو گیا۔“ میں ششدر تھی، حیران تھی اور وہ کہے جا رہا تھا۔ ”اگر تم چاہو تو۔“

میرے ارد گرد بس ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ خوشیاں دستک دے رہی تھیں تو کیا دروازہ کھول دوں؟

اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”لوٹ جاؤ سرخیل خان! کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔“ وہ خود کو مضبوط ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

”پلیز کومل! جذباتیت سے باہر نکل کر فیصلہ کرو، کچھ دیر کے لئے بھول جاؤ کہ میں حماد خان کا دوست ہوں۔“ سرخیل خان نے گویا التجا کی تھی۔

”کیسے بھول جاؤں، تمہاری خود غرضی کو، کس طرح حماد خان کے زخم زخم وجود کو اجنبی اور غیر لوگ لے کر آئے تھے، تم کہاں تھے اس وقت بزدل آدمی، کون کون سا قرض اتارو گے، ایک دوستی کا حق تو ادا نہ کر سکے۔“ وہ چلا اٹھی تھی۔

”میں کہاں تھا؟“ سرخیل خان تھم سا گیا۔ پھر جب بولا تو اس کے لہجے میں واضح ٹھہراؤ تھا۔ ”میں سرکاری ہسپتال کے ایک بستر پر بے ہوش پڑا تھا۔ مجھے بھی اجنبی اور غیر لوگ ہسپتال لے کر گئے تھے۔ آٹھ دن بعد میرے گھر والوں کو میرے ساتھ ہونے والے حادثے کا پتا چلا تھا اور اس کے بعد۔“ وہ دھیرے دھیرے اول سے آخر تک کے سارے واقعات دہراتا چلا گیا۔

”میں تمہاری بدگمانی دور کرنے کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتا۔“ وہ تھک سا گیا تھا۔

”مجھے کسی ثبوت کی ضرورت بھی نہیں۔“ کومل ٹھہر سی گئی تھی۔ ”جو ہوا اللہ کی طرف سے تھا۔ میں نے، خالہ نے، ہم نے تسلیم کر لیا اور اللہ کی رضا میں راضی ہو گئے۔“ اس کی آنکھیں موتی برسانے لگی تھیں۔

”پھر تم نے کیا سوچا ہے؟“ وہ بھی بہت دیر بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”ایسا ممکن نہیں سرخیل خان!“ کومل لرزیدہ آواز میں بولی۔

”کیوں ممکن نہیں۔“ وہ بے چین ہوا۔ ”میں نہ جھوٹا ہوں، نہ فریبی ہوں، نہ دھوکے باز ہوں، ہاں، میں نے تم تک آنے میں ضرور کچھ دیر کردی ہے۔“

”تم چلے جاؤ سرخیل! یہاں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں۔ اس دل میں ایک قبر ہے، جس کی میں پجارتن ہوں۔“ وہ رو رہی تھی، بے آواز، خاموشی سے،

زندگی میں پہلی مرتبہ وہ کسی اجنبی کے سامنے رو رہی تھی اور وہ اجنبی تھا کہاں۔

”قبروں کی پرستش کرنے والے جانتی ہو کیا ہوتے ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”میں اس موضوع پر تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ روکھے پن سے بولی۔ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ حماد خان نے تمہاری زندگی بچا کر کوئی احسان کیا تھا

یا پھر خود پر کچھ قرض سمجھتے ہو تو۔“ وہ لمحہ بھر کو رکی تھی۔ ”تم سرخیل خان! یوں کرو، ایک ایسی نیکی کرو، جو امر ہو جائے، جو مرنے کے بعد بھی تمہیں ثواب پہنچاتی رہے۔ تم اس بستی میں ایک ہسپتال بنو دو، جس میں الٹرا ساؤنڈ سے لے کر ایکسرے مشین تک کی سہولیات موجود ہوں، تم کچھ ایسا کیوں نہیں کرتے، جو مرنے کے بعد بھی ہمیشہ یاد گار رہے گا۔ دلوں میں تم ہمیشہ کے لئے زندہ رہو گے، کبھی مرو گے نہیں۔“



”کسی بیوہ عورت کا سہارا بننا بھی ثواب کا کام ہے، میں یہ نیکی بھی اپنے نامہ اعمال میں لکھوانا چاہتا ہوں۔“ وہ کھل کر مسکرا دیا تھا، ایک بوجھ تھا جو دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔

”تم ایسی بات کیوں کر رہے ہو، جو ناممکن ہے۔“ وہ گویا زچ ہو اٹھی۔

”ناممکن کیا ہے؟ خالہ جی دل سے رضا مند ہیں۔ ان کا بس چلے تو ہاتھ پکڑ کر تمہیں میرے ساتھ چلتا کر دیں۔“ بد گمانی کے بادل چھٹ رہے تھے۔ مطلع صاف ہو رہا تھا۔ ”کومل! مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاسکتا۔ زندگی رکنے کا نام نہیں، آگے بڑھنے کا نام ہے۔“

”بات صرف خالہ جی کی رضا مندی تک تو محدود نہیں، تم سمجھتے کیوں نہیں؟ یہ معاشرہ تمہیں چین لینے نہیں دے گا، تمہارا خاندان، برادری۔“ وہ ہونٹ کچلتے خاموش ہو گئی۔ ”مجھ میں کیا کمی ہے، بیوہ یا مطلقہ عورت سے شادی کرنا بھی یہ معاشرہ ایک جرم ہی بنا دیتا ہے، لفظوں کے کوڑے پہلے سے تیار کر لیے جاتے ہیں۔“

”مجھے کسی کی پروا نہیں اور رہی میرے خاندان کی بات تو میرے ابا جان اور اماں جانتے ہیں، میں کیوں پچھلے تین مہینے سے گھر بدر پھر رہا ہوں، یہاں کیوں آیا ہوں۔“

”کیوں آئے ہو؟ کیا جانتے ہیں وہ۔“ کومی حیران رہ گئی۔

”تمہارے لئے اور وہ بھی یہاں آنے کے انتظار میں سوکھ رہے ہیں، تم گرین سگنل دو گی تب ہی اماں اور ابا جان آئیں گے اور نگین بھی۔“ وہ اسے مزید حیران کر رہا تھا۔ ”وہ تمہیں پورے اعزاز کے ساتھ لے کر جائیں گے۔ اب تو دو من کے سر کو ہلا دو۔“

”نگین؟“ کومی، نگین میں ہی اٹک گئی تھی۔

”نگین بس آنا ہی چاہتی ہے۔“

”نگین آچکی ہے عالی جاہ۔“ ایک پر جوش اور جوشیلی آواز سنائی دی تھی۔

”شہزادی عالیہ، کہاں ہے عالی جاہ۔“ وہ مسکراتے ہوئے کومل سے لپٹ رہی تھی اور کومل پھر سے دنگ۔

”آنکھیں لالہ کے پاس چھوڑ آئی ہو، تین من کی دوشیزہ۔“ نگین کو دیکھنے کے ساتھ ہی اس کی زبان پھسلنے لگی تھی۔

”ان کی نگرانی بھی ضروری ہے۔“ وہ کھلکھلائی۔ ”مجھے نگین خیر خان کہتے ہیں۔ میں مستقبل میں تمہاری جیٹھانی بنوں گی، گن گن کر بدلے لوں گی، اس مکار آدمی سے، ہماری ناک تلے ڈرامے کا ڈراپ سین بھی کر دیا۔“

”یہ نگین خیر خان ہیں، میری سابقہ منگیتر۔“ سرخیل خان نے اسے چھیڑا، ساتھ تعارف کا مرحلہ بھی نمٹا دیا تھا۔

”شکر ہے، میری اس سے شادی نہیں ہوئی۔“ نگین بھی اسے تپا رہی تھی۔

”اپنا یہ پیارا سا کزن چھٹکا دیور اور سابقہ منگیتر تمہارے نام کرنے آئی ہوں۔ بقیہ لوگ ابھی پہنچنے ہی والے ہیں۔ باقاعدہ بارات بعد میں آئے گی، ابھی جلدی سے منظوری دو، میں تمہاری مرضی معلوم کرنے تو آئی ہوں۔“ وہ کومل کے کان میں گھس رہی تھی۔

”اپنے دیور کو میرے متھے کیوں مار رہی ہو۔“ کومل گڑ بڑا کر رہ گئی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی اور پھر اسے خالہ کی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ کومل نے مڑ کر دیکھا۔ وہ لاٹھی کے سہارے کھڑی تھیں اور ان کا چہرہ جگمگ کر رہا تھا۔ ان خوشیوں کی آمد کی وجہ سے جو کومی کو انعام کے طور پر دی گئی تھیں۔

”بول نا کومی!“ خالہ نے گویا التجا کی۔ ایسی التجائیں تو وہ کئی روز سے کر رہی تھیں۔ سرخیل خان، خالہ اور نگین، پتھر میں شگاف تو ہونا ہی تھا۔

”کیا بولوں؟“ کومی نروس ہو رہی تھی۔

”اس لوفر کا ساتھ منظور ہے۔“ نگین اسے ٹھوکے دے رہی تھی۔ اس نے خالہ کی پھر سے التجا سنی تھی اور لبوں سے ایک پھڑ پھڑاتی ہاں نے چھوٹے سے کمرے کو زعفران زار کر دیا تھا۔ کومل نے دیکھا، سب کے چہرے روشن تھے۔ خالہ مسکرا رہی تھی۔ سرخیل خان وکٹری کا نشان دکھا رہا تھا۔ نگین پر

ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ شاید وہ ایسی ہی تھی بے حد چلبلی اور کومل بختیار خان نے کھڑکی سے باہر جھانکا تھا۔ آسمان سے گرتی سفید برف بھی مسکرائی تھی۔ کومل کی آنکھ سے ایک ستارہ ٹوٹا اور برف پر گرتے ہی کھو گیا۔ یہ ستارہ حماد خان کی یاد میں گرا تھا، شاید آخری مرتبہ اور وہ رب کی رضا میں راضی تھی۔ اس نے صبر اور شکر کو اپنا شعار بنائے رکھا تھا۔ تب ہی وہ پھر سے نواز دی گئی تھی۔

وہ گزشتہ رات کو سوچ رہی تھی، جب خالہ نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر کہا۔

”پتر! دل کے بند کواڑوں کو کھول دو، قسمت بار بار مہربان نہیں ہوتی۔ جو چلا گیا، اس پر صبر کرلو، جو تمہارے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے اس پر شکر ادا کرو، جینے کا سلیقہ اسی میں ہے اور بہت کم لوگ سرخیل خان جیسے ہوتے ہیں، رفاقت اور یاری کو نبھانے والے، اپنے گھر سے چراغ روشن کر کے راہگیر، مسافروں کو راہ دکھانے والے، سچے اور خالص لوگ، سرخیل خان نے

مجھے بتایا تھا۔ وہ تمہارا طلب گار بن کر یہاں نہیں آیا تھا۔ وہ تو حماد خان کی ماں اور بیوہ کا کفیل بننا چاہتا تھا۔ خبر گیری کرنے آیا تھا اور پھر دل پر پہرہ بٹھانا ممکن کہاں ہے۔ تم اسے مایوس کرو گی، تو وہ لوٹ جائے گا۔ زندگی کے سفر میں کوئی بھی ہم سفر مل جائے گا اسے، مگر تم، کومی پتر! تمہیں زندگی کے طویل سفر میں ایسا ساتھی ہرگز نہیں ملے گا، جو تمہارے ساتھ بیٹھ کر حماد خان کو باتوں اور یادوں میں زندہ رکھے۔“

”میں حماد خان کو بھولنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں۔“ وہ سسک رہی تھی۔

”اور میں تمہیں کب مجبور کر رہا ہوں کہ اسے بھول جاؤ۔“ سرخیل خان نہ جانے کب درپچے میں آکھڑا ہوا تھا۔ ”تم اسے یاد کر کے رونا چاہو تو رو سکتی ہو۔ جب بھی دل بہت مجبور کرے تو مجھے بتانا۔ میں تمہیں اس کی قبر پر لے آیا کروں گا۔ ہم فاتحہ پڑھیں گے۔ اس کے ایصالِ ثواب کے لئے اس بستی میں ہسپتال بنوائیں گے۔ اس گیسٹ ہاؤس کی تعمیر نو ہوگی۔ ہر سہولت سے مزین کیا جائے گا اور اس گیسٹ ہاؤس میں پہلے کی طرح مزدور پیشہ لوگ

آکر قیام کریں گے۔ حماد خان کے ہر خواب کو سچا کروں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔ وہ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا، ایک بہترین زندگی دینا چاہتا تھا، زندگی نے اسے مہلت نہیں دی، تم حماد خان کی خاطر خوش رہا کرو اور آخری بات تم میرے جذبات کی قدر کرو، محبت کرو یا نہ کرو، مگر میرے اس فیصلے، لگن اور جذبہ کو کبھی بے مول مت کرنا کہ میں سرخیل خان ایک خواب کے توسط سے تم تک پہنچا ہوں۔ ہے نا عجیب بات، بہت سے لوگ میرے خواب کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان میں ایک خیبر لالہ تھے۔ بہت سے لوگ میرے خواب کو ایک وہم اور خیال سمجھ کر جھٹلا دیتے تھے اور ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اسے ایک اشارہ سمجھا اللہ کی طرف سے دیا گیا اشارہ اور مجھے پورے دل کے ساتھ جینے کی اجازت دی۔ ان میں میری اماں، گل شیر اور نگین شامل ہیں۔ اماں نے کہا تھا جب اللہ دو لوگوں کو ملانا چاہتا ہے تو وسیلے خود بخود بنا دیتا ہے۔ میں نے حماد خان کی بیوہ سے نکاح کسی احسان کے بدلے نہیں کیا ہے۔ میرے دل نے تمہارے لئے محبت محسوس کی تھی اور اگر تم چاہو تو، اپنے دل کے بند کواڑ سرخیل خان کے لئے کھول

سکتی ہو۔“ وہ روشن آنکھوں سے دیکھتا ہوا اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

”بولونا۔“ سرخیل کا نقش نقش درخواست کر رہا تھا۔

”کچھ وقت اور دن تو لگیں گے۔“ وہ آنسو پونچھتی ہوئے سے مسکرائی تھی۔ اس مسکراہٹ میں اقرار چھپا تھا۔ سرخیل خان بھی کھل کر مسکرا دیا کہ وہ بند کواڑوں کے کھلنے تک کا انتظار کر سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## اجالے دو نپیں

منگنی کی ڈیٹ فکس تھی۔ دونوں طرف زور و شور سے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ پرسوں مومنہ کی ساس بذات خود اسے اپنے ساتھ شاپنگ کروانے لے کر گئی تھی۔ کپڑے، جوتے اور زیورات سب میں اس کی مرضی اور پسند کا خیال رکھا گیا۔

مامی جی تو اتنا بہترین رشتہ مل جانے پر خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ ان لوگوں کی سلیجھی سوچ، شرافت و نجابت نے ماموں کو بھی بے حد متاثر کیا تھا اسی لئے انہوں نے تھوڑی بہت جانچ پڑتال کے بعد ہاں کر دی۔

لیکن صبح صبح آنے والا فون گویا قیامت کی خبر لایا تھا۔ مامی جی تو سنتے ہی غش کھا کر گر پڑیں۔ عائشہ دوڑ کر پانی لے آئی۔ مومنہ نے بھاگم بھاگ ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس ”فسادی“ فون کا خیال آیا۔ سامعہ بھابی، مامی جی کو تسلیاں، دلا سے دے رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مامی جی کو سننے میں مغالطہ ہوا ہے۔ انہوں نے تصدیق کرنے کے لئے دوبارہ فون ملایا تو بڑی کی ٹون سنائی دی۔

چنانچہ وہ میاں کے ہمراہ مومنہ کے سسرال اصل بات معلوم کرنے کے لئے چلی گئیں۔ واپسی پر ان کی اتری صورتیں دیکھ کر بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ مامی جی نے دل تھام کر رحم کو کوسنے دینے شروع کر دیے۔ اس کی خباثت رنگ لے آئی تھی۔ ماموں بھی آگئے تھے اور اب سر تھامے اپنے



لخت جگر کا انتظار کر رہے تھے جس نے انہیں رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ماموں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے شدید غصے میں تھے وقتاً فوقتاً اپنی نصف بہتر پر ایک سلگتی نگاہ ڈال کر کوئی ایسا کٹھن جملہ بول دیتے تھے سن کر نبیلہ مامی کے رونے میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ فرمان کا خیال تھا کہ ارحم کو نبیلہ کے بے جالاڑ پیار نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور اب انہیں سارا قصور اپنی بیوی کا ہی نظر آ رہا تھا۔

”میں نے اس عورت سے کہا تھا کہ یہ سرکش اس قابل نہیں ہے۔ مت اس کے اتنے نازنخرے اور لاڈ اٹھایا کرو مگر...“ لب بھینچ کر انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا جو کہ دس بج رہی تھی۔ انہوں نے تھک ہار کر نشست سنبھالی اور بڑے بیٹے رحیم سے مخاطب ہوئے۔

”ایک دفعہ پھر ٹرائی کرو۔ شاید آن کیا ہو اس نے موبائل۔“ جوں جوں گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں مامی کے غصے پر ممتا غالب آنے لگی۔ دیر سویر تو اکثر ہی ہو جاتی تھی۔ وہ جب بھی دیر سے گھر آتا۔ نبیلہ اسی

طرح اس کے آنے تک بے قرار رہتیں۔ اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہوئے انہوں نے شوہر کے پتھریلے چہرے کی طرف دیکھا۔ فرمان کے چہرے پر نرمی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

سامعہ بھابی، نومی کو سلانے چلی گئیں تو فرمان کے کہنے پر رحیم کو بھی اٹھنا پڑا۔ نبیلہ نے کرن کو بھی سونے کے لئے بھیج دیا اور پھر کچھ سوچ کر آہستگی سے بولیں۔

”آپ بچے کی بات مان کیوں نہیں جاتے۔ پتا بھی ہے کہ وہ کتنا ضدی اور خود سر ہے۔ کل کو اگر اس نے کوئی انتہائی قدم اٹھالیا تو پھر...“ نبیلہ نے کانپتی آواز میں اپنی بات مکمل کی تھی۔ فرمان نے سرخ آنکھوں سے نبیلہ کی طرف دیکھا۔

”اگر مومنہ کی جگہ کرن ہوتی تب بھی آپ یہی کہتیں۔ میں اس عیاش، آوارہ کے حوالے اپنی بھانجی کردوں۔ اور قیامت کے روز اپنی بہن کو کیا جواب دوں

گا۔“ ان کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ نبیلہ ہونٹ کاٹتے لب بھیج کر رہ گئیں۔

ارحم کیلئے ایسے سخت الفاظ سن کر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ نہ جانے کہاں تربیت میں کوتاہی رہ گئی تھی کہ ارحم اس حد تک سرکشی پر اتر آیا تھا۔ نہ ماں کا لحاظ کرتا تھا اور نہ ہی باپ سے کلام کرتے ہوئے اس کی نگاہیں جھکتیں۔ بس ایک ضد سر پر سوار تھی جس نے تمام ادب و لحاظ اور احترام تک بھلا کر رکھ دیا تھا۔

مومنہ کے رشتے کے لئے جو بھی آتا تو اس کی موہنی سی صورت دیکھ کر فدا ہی ہو جاتا لیکن اس کے بعد دوسری طرف گہری خاموشی چھا جاتی تھی۔ پہلے پہل نبیلہ نے اسے اپنا وہم سمجھا تھا مگر اس دفعہ تو تصدیق ہو گئی تھی کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے ارحم کا ہاتھ ہے۔ کس قدر سسکی ہوئی تھی ان کی تمام خاندان والوں کے سامنے لیکن یہی بات ارحم کے مغز میں سماتی نہیں تھی۔ اب تو پورے خاندان میں دبی دبی سی باتیں ہونے لگی تھیں۔ لوگ منگنی

ٹوٹنے کی ”وجہ“ جاننے کو بے تاب ہوتے۔ چھوٹی سی بات کو مریج مصالحہ لگا کر اچھالا جاتا۔ لوگ طرح طرح کے فقرے کستے، الزام لگاتے۔ اس کے کردار تک کو داغ دار کیا جاتا تھا۔ اس تمام صورت حال نے مومنہ کو بھی بے حد تکلیف و پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس روز روز کے ڈرامے نے اسے ذہنی افیت کا شکار کر دیا۔

سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ ارحم کا نام سنتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو جاتا۔ وہ اس شخص سے شدید ترین نفرت کرتی تھی۔ وجہ اس کی مشکوک سرگرمیاں اور واہیات قسم کی حرکتیں تھیں جو اس جیسی سنجیدہ مزاج لڑکی کو انتہائی کوفت زدہ کر دیتیں۔ وہ اس گھر میں بہت چھوٹی سی تھی جب آئی تھی۔ نہ جانے کب ارحم کی نظروں کے انداز بدلے تھے۔ کب اس نے مومنہ کی تصویر دل میں سجالی تھی۔

کب ارحم کے دل نے اس کی طلب کی تھی۔

وہ ارحم کی طبیعت سے اگرچہ واقف ضرور تھی۔ مگر اس سے اس حد تک کمینگی کی توقع ہرگز نہیں تھی اسے نہ جانے کیا کہہ کر اس نے ان لوگوں کو بدظن کیا تھا۔ مومنہ کو منگنی ٹوٹنے یا رشتہ نہ ہونے کا افسوس نہیں تھا۔ اس کے پاکیزہ وجود پر کیچڑ اچھالا جاتا۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند کی دیوی مہربان ہوگئی تھی۔ جب وہ اٹھی تو اجالا ہر سو پھیل چکا تھا۔

اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پھر خود کو لعن طعن کرتی واش روم میں گھس گئی۔ نماز تو قضاء ہوچکی تھی لہذا وہ معمول کی سورتیں تلاوت کر کے نیچے چلی آئی۔

کچن میں جھانکا تو ناشتے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ لاؤنج سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس آرکی۔ جھری میں سے جھانکا تو ارحم سمیت سب گھر کے افراد بالترتیب صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے تفاخر سے بیٹھا نہ جانے کس زعم

میں تھا۔ ماموں شاید گرج برس کے خاموش ہوچکے تھے۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ نہایت دیدہ دلیری سے گویا ہوا۔

”آئیں ملکہ عالیہ! آپ کا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ آج دیر سے اٹھی ہیں۔ کیا منگنی نہ ہونے کا غم مناتی رہی ہیں رات بھر...“ اس کے طنز میں ڈوبے الفاظ نے مومنہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ رحیم بھائی نے ملامتی نظروں سے اسے گھورا جبکہ اس ڈھیٹ پر کیا اثر ہونا تھا۔ وہ اسی طرح دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر مومنہ کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ ارحم کی اس بے باکی پر کھول کر رہ گئی۔

”اب تو آپ لوگوں کو یقین آگیا ہوگا۔ آئندہ کسی بھی اسٹوپڈ شخص کے ساتھ اس کی منگنی کرنے کا سوچئے گا بھی مت اور نہ ہی طرح طرح کے لوگوں کو گھر میں بلانے کی ضرورت ہے۔“ اس کے دو ٹوک، حکمیہ انداز پر ماموں ایک دفعہ پھر بلبلا اٹھے۔ ”بے شرم“ بے غیرت دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں آپ کی نظروں کے سامنے سے چلا جاتا ہو لیکن میری ”بات“ پر غور ضرور کیجئے گا۔“ وہ نہایت ہی اطمینان سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ماموں کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اسے گولی سے ہی اڑا دیتے۔

”تم جو چاہتے ہو وہ ہر گز نہیں ہوگا۔ چاہے تم ناک تک رگڑ ڈالو۔“

”میں جو چاہتا ہوں اور جسے ”چاہتا“ ہو اسے حاصل کر لوں گا۔“ مومنہ کے پاس اک لمحے کے لئے رکتے ہوئے اس نے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا تھا کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ ارحم کو تو اب ماموں کا بھی لحاظ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے اڈتے ہوئے اشتعال پر قابو پاتے ہوئے اسے پہلے ہی کمرے سے نکل گئی۔ وہ بھی گنگناتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

مومنہ کی بی۔ اے میں سبیلی آئی تھی۔ لہذا وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دلجمعی سے پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ اگرچہ پڑھائی میں وہ پہلے ہی بہت اچھی تھی

لیکن پے درپے حادثات کی وجہ سے اس کا دھیان پڑھائی سے تھوڑا ہٹ گیا تھا۔ کچھ گھریلو ماحول میں کشیدگی کے باعث کتابوں میں دل نہیں لگتا تھا۔ ماموں اسے ایک دفعہ پھر کتابوں میں گم دیکھ کر خوش ہو گئے۔ دراصل وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ مومنہ پھر سے اپنے تعلیمی سلسلے کو جوڑے تاکہ مختلف سوچوں کی طرف دھیان نہ رہے اس کا۔ اب بھی وہ لان میں بیٹھی اکناکس کی کتاب کھولے رٹا مارنے میں مصروف تھی جب ارحم کی بانیک ایک جھٹکے کے ساتھ گیراج میں آن رکی۔

وہ مومنہ کو لان میں بیٹھا دیکھ کر بڑے بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ مومنہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے کتابیں اور نوٹس وغیرہ سمیٹنے لگی۔

”آج اکیلی نظر آرہی ہو۔ تمہارے باڈی گارڈ کدھر ہیں۔“ گھر پر چھائی خاموشی کو محسوس کر کے ارحم نے اپنے ہی انداز میں اس سے دریافت کیا۔ وہ لب بھیج کر اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ارحم نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔



”چپ شاہ کا روزہ رکھا ہے یا پھر ریٹائرڈ بریگیڈیئر فرمان احمد صاحب نے کرفیو لگا دیا ہے تمہارے بولنے پر۔“ فرتج میں سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے ادھر ادھر دیکھ کر گلاس تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ناکامی کی صورت میں اس نے ڈھکن کھول کر بوتل منہ سے لگالی۔

مومنہ اس کی بدتمیزی کو دیکھ کر ٹوٹ کر رہ سکی تھی۔ ارحم نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو دیکھا۔

”خو! مخواہ کتابوں میں دماغ کھپاتی ہو۔ اپنی قاتل نظروں کے تیر مجھ پر چلاؤ تو کچھ بات بھی بنے۔“ مومنہ کو کتاب کھولتے دیکھ کر اس کی زبان پر ایک مرتبہ پھر کھجلی ہوئی تھی۔ مومنہ نے یہاں سے ہٹ جانا چاہا تھا۔ حالانکہ چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

”ایک کپ چائے مل جائے گی“ مومنہ کو باہر نکلتا دیکھ کر اس نے فوراً ہی فرمائش کر دی۔ مومنہ نے اک نظر اسکی طرف دیکھا۔

”زہر نہ پلاؤں تمہیں...“ ارحم کے ماتھے پر اک سلوٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی تھی تاہم لبوں کی مسکان اسی طرح قائم دائم تھی۔

”زہر کو بھی شہد کا گھونٹ سمجھ کر پی جائیں گے آپ پلائیں تو سہی۔“ وہ کچن کے دروازے میں جم کر کھڑا ہو گیا تھا یوں کہ باہر نکلنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ مومنہ نے کتاب سلیب پر پیچ کر پتیلی چولہے پر رکھی۔ برنر آن کر کے اس نے دودھ فرتج میں سے نکالا۔ وہ بہت کم پتی کی چائے پیتا تھا۔ مومنہ نے جان بوجھ کر دو تین چمچے بھر کر پتی کے ڈالے، پھر میٹھا بھی اسی حساب سے ڈال کر اس نے پتیلی کو ڈھانک دیا۔

وہ خاموشی سے تمام کارروائی دیکھ رہا تھا۔ چائے چھان کر اس نے کپ ارحم کی طرف بڑھایا۔ اس کالی سیاہ چائے کو دیکھ کر ارحم نے خوب ناک بھوں چڑھایا اور پھر پہلا گھونٹ بھرا تو سچ مچ شہد اور زہر کی تفریق سمجھ میں آگئی۔ مومنہ نے کتاب اٹھائی اور باہر نکلنے ہی لگی تھی جب ارحم نے تیزی سے بازو آگے کر کے اس کا راستہ روک لیا۔



”دیکھ لو سارا غصہ مجھ پر ہی نکال دیا ہے تم نے منگنی نہ ہونے کا۔“ وہ اسے چڑاتے ہوئے بولا تھا۔ مومنہ غصے سے دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

وہ جو اس نے سوچا تھا کہ ماحول اب سازگار ہو گیا ہے۔ ارحم اپنی ضد پوری کر کے خاموش ہو جائے گا تو یہ اس کی بھول تھی۔ دو چار دن بعد اس نے دوبارہ شادی کی بات چھیڑ دی تھی۔ ماموں نے سنتے ہی

اسے جھڑک دیا۔ جبکہ مامی کی فطری محبت غالب آگئی۔ انہوں نے شوہر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”کتنے دن بعد تو ارحم گھر میں ناشتا کر رہا ہے۔“

”تمہاری انہی حرکتوں نے اسے خود سر بنا دیا ہے۔“ وہ اخبار پھینک کر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔ ارحم بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ وہ بنا ٹھٹھا باہر جانے کے لئے تیار تھا۔

”تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے۔“ فرمان کے مقابل کھڑے ہو کر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا مدعا بیان کیا۔ نبیلہ بھی اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی تھیں۔ متوقع جھگڑے نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ خود پر کنٹرول کرتے ہوئے انہوں نے بے حد نافرمان اور بدتمیز بیٹے کی طرف دیکھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن مروڑ دیتے۔

”میں آپ کی پیاری، دلاری بھانجی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔“ وہ زور سے چلا لیا۔

”اس لئے کہ مومنہ کسی عیاش، آوارہ اور بدکردار شخص کی بیوی بننا پسند نہیں کرے گی سنا تم نے۔ آئندہ اپنی زبان سے مومنہ کا نام بھی مت لینا۔“ ارحم، باپ کے منہ سے نکلتے تیزابی الفاظ کو سن کر دنگ رہ گیا۔ غصے اور اہانت کے

احساس نے اسے آگ بگولا کر دیا تھا۔ نبیلہ بیٹے کی خوفناک حد تک سرخ آنکھوں کو دیکھ کر لرز اٹھیں۔

”بابا! آپ کی بھانجی کو اسی عیاش، بدچلن اور آوارہ شخص کی ہی بیوی بننا ہے۔ چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔ اسے گھر میں قید کریں، کسی دوسرے برا عظموں میں بھجوا دیں۔ اگر یہ قبر میں بھی اتر گئی تو میں اسے نکال لوں گا۔“ چبا چبا کر بولتے ہوئے وہ رکا نہیں تھا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکلتا چلا گیا۔ نبیلہ گیٹ تک اس کے پیچھے گئی تھیں۔ سامعہ بھابی اور کرن نے خوف زدہ نظروں سے مومنہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ماموں کے سینے پر سر رکھ کے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”میں تجھ پر اس ناہنجار کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔“ فرمان نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ وہ اس قدر روئی تھی کہ فرمان کا گریبان گیلا ہو گیا۔ مومنہ کو اس جنون سے اب خوف آنے لگا تھا۔ پچھلے تین چار دن سے وہ گھر سے غائب تھا۔ پھر اکثر ہی ایسا ہونے لگا۔ وہ ہفتوں گھر کی خبر نہ لیتا۔ نبیلہ ہر وقت

جائے نماز بچھائے اس کے لئے لمبی لمبی دعائیں مانگتیں۔ اس کی یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ مومنہ نے گھر سے نکلنا بالکل ختم کر دیا تھا۔ بے حد ضروری کام بھی ہوتا تو وہ پھر بھی نہ جاتی۔ خود کو اس نے گھر کی چار دیواری تک محدود کر لیا تھا۔



اس دن موسم بے حد خراب تھا۔ وقفے وقفے سے بارش جاری تھی۔ سامعہ بھابی میکے گئی تھیں جبکہ کرن کالج، مامی جی اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ مومنہ نے بور ہو کر کھڑکی میں سے جھانکا تو سرد کیٹیلی ہوا جسم سے ٹکرائی۔ اس نے جھر جھری لے کر کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے تھے۔ آج پڑھنے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ لہذا وہ کمبل لے کر صوفے میں دھنس گئی۔ ٹی وی پر کوئی انڈین پروگرام چل رہا تھا۔ محویت سے ٹی وی تکتے ہوئے اسے ارحم کی آمد کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ وہ کھنکارا تو مومنہ کو خبر ہوئی۔

وہ آج پورے ستائیس دن بعد گھر آیا تھا۔ مومنہ اسے دیکھ کر سہم سی گئی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ شاور لے کر جب وہ آیا تو مومنہ مامی جی کے لحاف میں جاگھسی تھی۔ ارحم کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ نبیلہ اتنے دن بعد بیٹے کی شکل دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

ارحم ان کے پاس فرصت سے بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ مامی جی نے اسے چائے لانے کے لئے بھیج دیا۔ وہ گاجر کا حلوہ گرم کر رہی تھی جب ارحم بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔ ”یہ تم مجھ سے اتنا بھاگتی کیوں ہو؟“ مومنہ کو اس نظریں آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے ٹرے میں چائے رکھ کر اسے تھمائی اور پھر باہر نکلنے لگی تھی کہ ارحم نے روک لیا۔ ”فکر مت کرو، تمہیں اٹھا کر یا بھگا کر لے جانا ہوتا تو میں کب کا یہ کام کر گزرتا۔ اس گھر میں تمہیں دلہن بنا کر لے کر جاؤں گا۔ وعدہ رہا۔“

”تمہیں اپنے بارے میں بہت خوش فہمی ہے۔“ مومنہ نے سنبھل کر تکیے لہجے میں کہا تھا۔ وہ اس کے طنزیہ انداز پر ہولے سے مسکرایا۔

”محترمہ! یہ خوش فہمی نہیں خود شناسی ہے۔ مجھے اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے۔“

”اونہہ...“ وہ پاؤں پٹختی، بڑ بڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

مگر اس پر ہمہ وقت ایک سو گوار سی کیفیت طاری رہتی۔ ہر کوئی الجھا الجھا فکر مند سا نظر آتا، یہ دل دہلانیوالی خاموشی مومنہ کو پہروں رلایا کرتی تھی۔ یہی فرمان ہاؤس چند سال پہلے قہقہوں اور مسکراہٹوں کا گہوارہ بنا رہتا۔ خوشیوں کا مرکز محفلیں ہر وقت آباد رہتیں۔

”نانا جان کے دوست شطرنج کی بساط بچھائے ایک دوسرے کو ہرانے کے چکر میں رات سے دن اور دن سے رات کر دیتے۔“

نبیلہ چائے بنا بنا کر ڈرائنگ روم میں پہنچاتی رہتیں۔ ساتھ ساتھ ان کی بڑ بڑا ہٹیں بھی جاری رہتیں۔

اس کے نانا وجاہت احمد کے صرف دو ہی بچے تھے فرمان اور نبیلہ۔

نبیلہ کی شادی کے چار سال بعد مومنہ پیدا ہوئی تھی۔ سہیل اور نبیلہ اپنی چھوٹی سی جنت میں بے انتہا خوش تھے۔ ننھی مومنہ کی قلقاریوں نے ان کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا تھا۔ مگر نہ جانے کس کی نظر ان کی

خوشیوں کو لگ گئی تھی۔ لاہور سے واپسی پر ان کی کار ایک ٹرالر سے ٹکرا گئی تھی۔ سہیل اور نبیلہ نے اسی وقت دم توڑ دیا تھا اور یوں مومنہ اپنے اس عظیم نقصان سے بے خبر اپنے نانا اور ماموں، مامی کی محبت بھری آغوش میں آگئی تھی۔

کرن کے ساتھ مختلف کھیلوں میں مشغول وہ بہت جلد بہل گئی تھی۔ وہ دونوں ہی مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بناتیں اور ارحم نہ جانے کب آکر پیروں کی ٹھوکروں سے گرا جاتا وہ دونوں ہی کئی کئی گھنٹے روتی اور چیختی چلاتی رہتی تھیں۔ پھر نانا جان اپنے ہاتھوں سے گڑیا کا گھر بنا دیتے۔

پھر وقت نے ایک دم ہی کروٹ بدلی تھی۔ نانا جان ایک رات چپکے سے آنکھیں موند گئے۔ مومنہ تو کتنے ہی دن بے یقینی کی کیفیت میں نانا جان کو ہر کمرے میں تلاش کرتی پھرتی تھی۔

نانا جان کی وفات پر اس نے پہلی مرتبہ ارحم کو بے تحاشا روتے دیکھا تھا۔ اس کی نانا جان سے دوستی بھی تو بہت تھی۔ نانا جان اسے بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

بچپن میں وہ بہت شریر اور جھگڑالو قسم کا تھا۔ محلے والوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے، اس میں غصہ اور انا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جب تک بدلہ نہ لیتا، سکون نہیں آتا تھا اسے۔ اپنے سے بڑے لڑکوں کو مار دھاڑ، دنگا فساد کر کے نہایت فخریہ بتایا کرتا۔ تھوڑا بہت سمجھا بچھا کر سب ہی خاموش ہو جاتے تھے۔ کوئی بھی زیادہ نوٹس نہ لیتا۔ سکول میں بھی کسی کو جھولے سے گرا کر زخمی کر دیا۔ کسی کا سر پھاڑ دیا بیٹ مار کر۔

فرمان نوکری کے سلسلے میں اکثر ہی گھر سے دور ہوتے تھے۔ وہ جب بھی گھر آتے تو پرانے دوستوں سے ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ وہ بچوں کو زیادہ وقت نہیں دے پاتے تھے۔ یہ عمر کا بہت نازک دور تھا اگر دادا جان اسے نہ سمیٹتے تو اس کی شخصیت میں نہ جانے کتنی دراڑیں اور پڑ جاتیں بابا کو فائلوں میں سر کھپاتے دیکھ کر وہ اکثر ہی ماں کا پلو پکڑ لیتا تھا۔

وہ اپنے ہی مسائل میں الجھی رہتی تھیں۔ کبھی کرن کے لئے کسٹروڈ بنا رہی ہیں کبھی مومنہ کی پونیاں بنائی جا رہی ہیں۔ کبھی رحیم کو ڈانٹ پڑ رہی ہے نہ پڑھنے کی وجہ سے۔ اس کی منمنناہٹیں اسی شور میں دبنے لگتی تھیں۔ اس کا مسئلہ درمیان میں ہی رہ جاتا اور نبیلہ کسی اور طرف نکل جاتیں۔ پھر اس نے توجہ حاصل کرنے کا نیا انداز سوچا۔ ضد، غصہ اور چیخ و پکار اپنی بات نہ سننے جانے پر وہ چلاتا رہتا۔ اس حد تک ضد کرتا کہ نبیلہ زچ ہو اٹھتیں۔

دادا جان نے اس کی انہی حرکتوں کے پیش نظر اس کے گرد دائرہ سا کھینچ لیا تھا۔ وہ کالج سے آتا اور دادا جان سے جڑ کر بیٹھ جاتا۔ ان کی بچپن کی شرارتیں، جوانی کے قصے نہایت دلچسپی سے سنتا۔

دادا جان گھڑ سواری کے ماہر تھے اور شکاران کا شوق تھا۔ ارحم نے دادا جان سے نشانہ باندھنا بہت جلد سیکھ لیا۔ پھر وہ اکیلا ہی دوستوں کے ساتھ شکار کرنے نکل جاتا تھا۔ اس کی بے باکی اور دلیری کے بارے میں سب ہی جانتے تھے۔ اسی لئے فرمان کی خواہش تھی کہ وہ آرمی جوائن کرے۔ باپ بیٹے میں پہلا جھگڑا بھی اسی بات پر ہوا تھا۔ ارحم جان بوجھ کر ایسے کام کرنے کی کوشش کرتا تھا جس پر فرمان تپ اٹھتے۔

نبیلہ ارحم کے انداز دیکھ دیکھ کر ہولتی تھیں۔ انہی دنوں رحیم نے اپنی کلاس فیلو سامعہ سے شادی کرنے کا اعلان کر دیا اور یوں گھر میں رحیم کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ بڑا اور پہلا بیٹا تھا سو فرمان نے جی بھر کر ارمان پورے کیے۔ برات، ولیمہ کا فنکشن اس قدر اعلیٰ تھا کہ لوگوں کی حسد و



رشتک سے آنکھیں ابل پڑیں۔ شادی کے دوران بے تحاشا کاموں میں الجھی بھاگتی دوڑتی مومنہ نہ جانے کب پورے کروفر کے ساتھ اس کے دل میں آن سہائی تھی کہ وہ دل کی بدلتی کیفیت پر حیران رہ گیا۔ وہ ہی مومنہ جسے وہ کسی قابل نہیں سمجھتا تھا۔ جس نے اس کی ماں کو اس سے چھین لیا تھا۔ وہ ہی مومنہ بڑی شان سے اس کے دل پر حکمران ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ارحم زیادہ وقت اپنے دوستوں کیساتھ باہر گزارتا تھا۔ اسی لئے وہ گھر والوں سے مزید دور ہوتا چلا گیا۔ کچھ وہ تھا بھی تک مزاج۔ اسی لئے بھائی، بہن اس سے گھل مل نہیں سکے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ کرن کو رحیم بھائی کے ساتھ لڑتے جھگڑتے، لاڈ کرتے دیکھتا تو عجیب سا احساس دامن گیر ہونے لگتا۔ کرن رحیم بھائی سے ضد کر کے پیسے نکلاتی، ہنسی مذاق بھی چلتا رہتا۔ ان دونوں کی نوک جھوک بھی اسے ناگوار گزرنے لگی تھی۔

دوران تعلیم ایک دوست کی اکیڈمی میں کچھ عرصہ انجوائے منٹ کے لئے اس نے جاب کی تھی۔ اسے یاد تھا جب پہلی تنخواہ ملنے پر اس نے کرن کو پانچ ہزار روپے دینے چاہے تو بابا نے کرن کو پیسے لینے سے منع کر دیا۔ ارحم کو بہت برا لگا تھا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ کیونکہ رات کو کرن نے ناصر ف اس سے خود مانگ کر پیسے لئے بلکہ بابا کی طرف سے معذرت بھی کی۔ وہ بھی بابا کے سخت روپے سے خائف تھی۔ بابا کا ارحم کے ساتھ اتنا اہانت بھرا رویہ دیکھ کر اس کا دل دکھتا تھا۔

دادا جان زندہ تھے تو کبھی کبھی گھر والوں کے درمیان بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ انہی کی زبانی گھریلو حالات اور خاندانی کھٹی میٹھی جھڑپوں کا بھی پتا چلتا رہتا۔ ان کے سامنے وہ سارے چولے اتار پھینکتا تھا۔ ہنسی، مسکراہٹیں، قہقہے طنز و مزاح سے محفل میں جان پڑ جاتی۔

ان کے جانے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اپنے اوپر بے حسی کا خول چڑھا کر سب سے الگ تھلگ ہو گیا۔ کبھی غلطی سے وہ بابا کے پاس بیٹھ جاتا تو وہ اس

قدر تاک تاک کر جملے پھینکتے تھے کہ مارے شرمندگی کے زمین میں دھنس جانے کو دل کرتا۔ پھر اس نے دو بدو مقابلے کا سوچ لیا۔ وہ ایک بات کرتے ارحم انہیں تپانے کی خاطر دس جواب دیتا۔ پہلے وہ سب کے نزدیک غصیلا چڑا اور بدمزاج تھا۔ اب اس پر ایک اور لیبل بھی لگ گیا تھا یعنی کہ بد لحاظی کا۔ بابا اس کی ”خوبیوں“ کو سب کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے کہ خاندان کے اکثر بزرگ اس سے کلام کرنا بھی پسند نہ کرتے۔ اس کی بد زبانی کے قصے خاندان بھر میں پھیل چکے تھے۔ لوگ اس کے سائے سے بھی گھبراتے۔

وہ کبھی بھولے سے بھی کسی تقریب میں چلا جاتا تو لوگوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ لڑکیاں بالیاں ایک دوسرے کے کانوں میں گھسی نہ جانے کیا کیا بولتی رہتیں۔ اسے شدید اہانت کا احساس ہوتا تھا۔ باپ کو غصہ

دلانے کے لئے اس نے کچھ عرصہ ماڈلنگ بھی کی مگر اس کام میں اس کا اپنا دل نہیں لگا تھا۔ فرمان نے جب اس پر توجہ دی تو اس وقت بہت دیر

ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ارد گرد سخت فولادی خول چڑھا لیا تھا نہ کسی کے قریب جاتا نہ کسی کو خود سے قریب آنے دیتا۔ ماں بہن، بھائی اور بھابی تک اس سے بات کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ دادا جان جب تک زندہ رہے وہ پڑھائی پر بھی بادل ناخواستہ توجہ دیتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ اور بھی تنہائی پسند اور خاموش طبع ہو گیا۔

ریٹائرڈ ہونے کے بعد فرمان بھی اب زیادہ وقت گھر میں ہی گزارتے تھے۔ لہذا ان کی ساری توجہ اب گھر پر ہی ہوتی تھی۔ ارحم کی خفیہ سرگرمیاں، رات رات بھر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی اور پھر کالج سے بھی غائب رہنا ان کی زیرک نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ ایک دم ہی اتنی آزادی کے بعد جب باپ کی بھرپور سختی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ مزید ضدی، بد لحاظ اور چڑا چڑا ہوتا چلا گیا۔

فرمان جس زاویہ نظر سے رحیم اور ارحم کو دیکھتے تھے۔ انہیں رحیم کے مقابلے میں ارحم کی شخصیت میں بہت جھول نظر آتا تھا۔ رحیم، تعلیم سے فراغت کے

بعد بینک میں اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہو گیا تھا جبکہ ارحم یونیورسٹی کو الوداع کہنے کے بعد پچھلے تین سالوں سے فارغ تھا۔ اس کی حرکتوں سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ نوکری کرنا چاہتا ہی نہیں۔ بڑے شاہانہ قسم کے مزاج پائے تھے محترم نے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ خلاف مزاج بات پر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ نبیلہ کی منت و سماجت اور التجاؤں کی وجہ سے ان دنوں وہ کسی اچھی فرم میں جاب کرنے لگا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک دو اچھی کمپنیوں میں بحیثیت منیجر کے ڈیڑھ دو ماہ کام کر چکا تھا۔ اپنی جھگڑا لو فطرت، بات بے بات غصہ کرنا اور ساتھی اہانت بھرے سلوک کی وجہ سے دو تین مرتبہ آفس سے بھی نکالا جا چکا تھا۔ فرمان اس کی ”حرکتیں“ دیکھ کر سخت پریشان تھے۔

ناشتے کی میز پر تقریباً تین دن بعد فرمان نے اسے موجود پایا تو اپنے غصے کو دبا نہیں پائے تھے۔ جبکہ وہ لاپرواہی سے ٹیبل بجاتا رہا۔

”امی! ناشتا دیں۔“ اس کے ہانک لگانے پر نبیلہ سرعت سے ٹرے میں مختلف لوازمات سجا کر کچن سے نکلیں۔ فرمان نے طنزیہ نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

”خاطریں تو اس طرح سے کرتی ہو گویا کہ لخت جگر ملک چلا کر آرہے ہیں۔ ایسے فارغ بیٹھ کر روٹیاں توڑنے والوں کو سر پر بٹھانے کی ضرورت نہیں۔“ خلاف توقع وہ باپ کی طنزیہ گفتگو سن کر بھڑکا نہیں تھا بلکہ نہایت ہی اطمینان سے ناشتہ کرتا رہا۔ رحیم نے اسے خاموش دیکھ کر سکون بھرا سانس خارج کیا۔ اسی پل سامعہ اس کا کوٹ اور بریف کیس لے آئی۔

”بڑے ٹھاٹ ہیں جناب کے“ دودھ کا گلاس اٹھاتے ہوئے ارحم نے بھائی اور بھابی کو دیکھ کر کہا تھا فرمان نے بھی اخبار سے نظریں ہٹائیں۔ رحیم کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں محبت بھرے تاثرات ابھرے۔

”دھیان سے گاڑی چلانا بیٹا۔“ فرمان نے شفقت سے کہہ کر ایک دفعہ پھر اخبار چہرے کے سامنے پھیلا لیا تھا یہ دیکھے بغیر کہ ارحم کے لبوں کی

مسکراہٹ چند سیکنڈ میں ہی غائب ہو گئی ہے اور پھر اس نے ناشتے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ نبیلہ اس کے بدلے بدلے تیار دیکھ کر پریشان ہو اٹھیں۔

”دودھ تو پی لو ارحم۔۔“

”بس پی لیا ہے۔“ وہ کرخت لہجے میں بولا۔

”نبیلہ، بیگم! اپنی متا سے مغلوب ہو کر رحیم کی حق حلال کی کمائی کا کباڑ امت کرو۔ ابھی بجلی، فون، گیس کے بل کے ساتھ دودھ والے کالمبا چوڑا بل بھی ادا کرنا ہے۔“ فرمان نے ایک مرتبہ پھر کاٹ دار لہجے میں کہا تھا۔ ارحم کی آنکھوں میں تنفر کی لہر اٹھی۔

”کیا جتنا چاہتے ہیں آپ مجھ پر۔“ وہ آگ بگولا ہو کر چلایا تھا۔ فرمان نے اخبار ایک طرف رکھ کر چشمہ اتارا اور پھر نہایت ہی اطمینان سے بولے۔

”میں کیا جتاؤ گا تم پر؟ اس قدر ڈھیٹ بندے پر اثر بھی کیا ہونا ہے۔“

”اللہ کے لئے فرمان، خاموش ہو جائیں اور ارحم بیٹا! جاؤ تم اپنے کمرے میں۔“ نبیلہ بھرائی آواز میں کہتے ہوئے گڑ گڑائی تھیں۔ اسی پل مومنہ

سیڑھیوں سے اترتی دکھائی دی۔ ارحم کے چہرے کے تاثرات پل بھر میں بدل گئے۔ چہرے کی سختیوں میں نرمی چھلکنے لگی۔ ارحم کے لبوں کی مسکان نے نبیلہ کو حیران کر دیا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں انہوں نے مڑ کر دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

”کیا بات ہے بیٹا! آج دیر سے اٹھی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟“ مومنہ نے جھک کر ماموں کو سلام کیا تھا۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ارحم ایک مرتبہ پھر باپ کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

”سر میں بہت درد تھا اسی لئے نماز پڑھ کر سو گئی تھی۔“ وہ نومی کو گود میں لے کر آہستگی سے بولی تھی۔ ارحم نے چونک کر اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

”تو کوئی ٹیلیٹ وغیرہ لے لینی تھی۔“ اس کی مداخلت پر فرمان کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ مومنہ نے بھی ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ جبکہ وہ لبوں پر ازلی دل جلانے والی مسکراہٹ سجائے نبیلہ کو دیکھ رہا تھا جو کہ اسے اٹھنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔

”تم اپنے مشورے اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔“ فرمان استہزائیہ بولے۔

”میرے مشورے ہی مستقبل میں اس کے کام آنے ہیں ڈیئر بابا صاحب۔“ وہ آنکھوں میں شرارت لئے مومنہ کے سرخ چہرے پر نگاہ ڈال کر بہت کچھ جتاتے ہوئے بولا تھا اور پھر اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر اٹھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا۔ مومنہ مارے شرم اور غصے کے سر نہیں اٹھا پارہی تھی جبکہ فرمان بھی تلملاتے ہوئے اٹھ گئے۔ وہ اپنی گود میں ہمکتے نومی کو کندھے سے لگائے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی جو کہ نبیلہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔

”نہ پریشان ہو بیٹا! تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔“

”مامی جی! نہ جانے یہ ارجم چاہتا کیا ہے۔ ماموں بھی کس قدر فکر مند رہتے ہیں اس کی طرف سے مگر یہ...“ وہ گال پر پھسلتا آنسو پونچھ کر تلخی سے بولی تھی۔ نبیلہ اب اور طویل سانس بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

”تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے...“ رات کے ایک بجے دیوار کود کر گھر میں داخل ہونے کے بعد اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ کچن میں جھانکا۔ لائٹ آن کی، کھانا گرم کر کے کھایا اور پھر اسی احتیاط کے ساتھ دبے پاؤں فرمان کے کمرے میں چلا آیا۔ لائٹ آن کرنے کے بعد انہیں گہری نیند سے جگایا اور پھر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ کر بڑے معصوم انداز میں پوچھا تھا۔ وہ کچھ لمحے تو آنکھیں پھاڑے مشکوک نظروں سے اسے گھورتے رہے اور پھر اس کا مطالبہ سن کر گویا پھٹ پڑے۔

”ایسی ناہنجار، بے غیرت اولاد نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ نہ جانے کس گناہ کی سزا ہو تم۔“



”یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔“ ارحم نے نہایت معصومیت سے انہیں اشتعال دلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ چلا اٹھے۔

”نبیلہ... نبیلہ...“ ان کے چیخنے پر برابر والے کمرے میں سوئی نبیلہ بھاگ بھاگ پھولی سانسوں سمیت کمرے میں آئیں اور پھر ارحم کو موجود دیکھ کر ان کے اعصاب پر گویا بھاری پتھر پڑا تھا۔ وہ سست سی پڑ گئیں۔

”کیا بات ہے؟“

”اس سے پوچھو“ رات بھر آوارہ گردی کر کے اب ڈیڑھ بجے میرے کمرے میں کیا لینے آیا ہے۔ یہ ذہنی مریض پاگل ہو چکا ہے بالکل پاگل۔“ فرمان نے تنفر و حقارت سے کہا اور پھر نبیلہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر دیوار سے دے مارا۔ اک چھنا کے کی آواز آئی تھی۔ گلاس کی کرچیاں جا بجا بکھر گئیں۔ نبیلہ نے نم آنکھوں سے ارحم کی طرف دیکھا اور پھر التجائیہ لب و لہجے میں بولی تھیں۔

”ارحم! میرے بچے! یہ کیا پاگل پن ہے۔ کیا صبح نہیں ہونا تھی۔ تم بھی ناحد کر دیتے ہو۔ کیوں تنگ کر رہے ہو ہمیں۔“

”میں تنگ کر رہا ہوں یا پھر آپ لوگ مجھے زچ کر رہے ہیں۔ یہ بخاری صاحب کیا لینے آئے تھے آج۔“ وہ کڑے تیوروں کے ساتھ استفسار کر رہا تھا۔ نبیلہ گڑ بڑاسی گئیں۔ جبکہ فرمان بھڑک اٹھے تھے۔

”یہ میرا گھر ہے اور مجھ سے ملنے یہاں کوئی بھی آسکتا ہے۔“

”وہ آپ سے ملنے آئے تھے یا پھر آپ نے انہیں بلوایا تھا۔“ ارحم نے تنک کر کہا۔ فرمان دانت پیس کر رہ گئے۔ ارحم اتنا بھی بے خبر نہیں تھا جتنا کہ وہ اسے سمجھتے تھے۔

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“ انہوں نے خود پر قابو پا کر تحمل سے کہا۔

”پھر وہ ہی بات‘ میں تنگ آگیا ہوں ایک بات دہرا دہرا کر۔“ وہ چیخا اور پھر ماں سے مخاطب ہوا۔

”امی! کہہ دیں ان سے کہ آج کے بعد مومنہ کے رشتے کے سلسلے میں اگر کوئی آیا تو گولی سے اڑا دوں گا اسے۔“ وہ غضب ناک ہو کر اٹھا اور پھر تن فن کرتا باہر نکل گیا۔ سیڑھیوں کی اوٹ میں کھڑی مومنہ حق دق اس کی پشت کو گھورے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں پھیلی نمی کو ہتھیلی کی پشت سے پونچھتے ہوئے اس نے دل میں اٹھتی نفرت کی لہر کو دبایا اور پھر تیزی سے بغیر سوچے سمجھے اس کے پیچھے چلی آئی۔ غصے اور اشتعال کے باعث وہ دستک دینا بھی بھول گئی تھی۔ وہ جو شرٹ کے بٹن کھول کر واش روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مومنہ کو آندھی و طوفان کی طرح آتا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

”مومی تم...“

”نام مت لو میرا اپنی گندی زبان سے کہیں۔ کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے، ہاں بولو، بتاؤ۔“ رندھی ہوئی آواز میں اس کے کندھے پر مکے برساتے ہوئے وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی اس کی وجہ سے ماموں پریشان تھے مامی جی بے کل اور کرن متنفر ہو رہی تھی۔ اپنی دوستوں کے ساتھ اس کے

متعلق طنزیہ گفتگو کرتی۔ کرن اسے بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ کالج سے گھر آکر وہ کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔ کرن کا رویہ اور تلخ لب و لہجہ اس کے دل پر گویا خنجر چلا گیا تھا۔ ”پہلے خود ہی ادائیں دکھا کر اپنا اسیر کرتی ہیں اور پھر...“ وہ کینیٹین میں آئی تو کرن، فریحہ لوگوں کے گروپ میں بیٹھی بڑی اجنبی نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولی تھی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی۔

”اب جاب چھٹی ہے تو راہیں بدل لی ہیں۔ ایسی زر پرست لڑکیوں کو دل چاہتا ہے کہ قتل ہی کر دیں۔ دوسروں کے دلوں کے ساتھ کھیل کر نہ جانے کس حس کو تسکین پہنچاتی ہیں۔“ کرن بات فریحہ سے کر رہی تھی اور دیکھ اسے رہی تھی۔ مومنہ کے تو بدن میں گویا جان ہی باقی نہیں رہی تھی۔ ٹانگیں بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں جبکہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ وہ بے حد بے یقینی سے اپنی بہنوں جیسی بے حد پیاری کزن کو دیکھ رہی تھی جو کہ نہایت بے دردی سے اس پر کیچڑ اچھال رہی تھی۔

مومنہ مرے مرے قدم اٹھاتی کینٹین کے احاطے سے باہر نکل آئی۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس کا گریبان پکڑ کر پوچھتی کہ تم نے کب دیکھا ہے مجھے ادائیں دکھاتے ہوئے، محبت کی پیٹنگیں بڑھاتے ہوئے۔ مگر دل میں اٹھتی شدید خواہش کو دبائے خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے گھر چلی آئی تھی۔ اور پھر آتے ہی بخاری انکل اور ان کی بیگم سے سامنا ہو گیا۔ ان کی دونوں شادی شدہ بیٹیاں بھی ہمراہ تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ بخاری انکل کی آمد کا کیا مقصد ہے۔ ماموں جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے تاکہ وہ ارحم نامی ”موزی“ سے بچ سکے۔ ارحم جس سے وہ شدید ترین نفرت کرتی تھی۔ اس کا نام سننا بھی اسے گوارا نہیں تھا کجا کہ زندگی بھر کا ساتھ۔

اس وقت بھی وہ پانی پینے کے لئے اٹھی تھی جب ماموں کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ارحم کی بلند آواز سنی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے

تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کینے کا گلا دبا دے۔ اس بات سے بے نیاز کے باپ دل کا مریض ہے۔ وہ اپنی ہی اکڑ اور گھمنڈ میں مبتلا ان سے بے وجہ الجھ رہا تھا۔ ارحم کے نکلتے ہی گویا اس پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ اس کے کمرے میں ہی خوب چیخ چلا کر اور دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد وہ خود ہی خاموش ہو گئی تھی۔ کیونکہ دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔ ارحم اسے ایک ٹک دیکھتا رہا یہاں تک کہ مومنہ گڑ بڑا کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اس نے ارحم کی شرٹ بھی پھاڑ دی تھی۔ وہ بہت آرام سے اس کے ہاتھ اپنی شرٹ سے ہٹا کر الماری کی طرف بڑھا۔ اک دوسری شرٹ نکال کر اس نے ہینگر بیڈ پر اچھالا اور پھر تیزی سے باہر نکلتی مومنہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بڑا غصہ آتا ہے میری جان کو۔ کیا پھول جھڑے ہیں تمہارے لبوں سے۔ ایک دفعہ پھر بولنا۔“ اس کی خوشنما آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ بڑے دلکش انداز میں بولا تھا۔ مومنہ کا رواں رواں سلگ اٹھا۔

”جو تم چاہتے ہونا وہ قیامت تک نہیں ہوگا۔ خود کو ختم کر لوں گی۔ مگر تم سے شادی نہیں کروں گی۔“ وہ نفرت سے بولی۔ ارحم نے قدرے سختی سے اس کے ہاتھ کو دبایا۔ اس کی بے ساختہ چیخ نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوانے کی سعی میں وہ اس کے قدرے قریب ہوئی تھی۔ ارحم نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر کندھوں کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور بولا۔

”کتنی مرتبہ تم سے کہا ہے کہ یہ مرنے مارنے کی باتیں نہ کیا کرو۔ اگر مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھ پر مر مٹو۔ کچھ فائدہ بھی تو ہو۔“ نچلے لب کا کونا دانتوں تلے دبا کر اس نے مومنہ کے گال کو چھوا تھا اسے گویا کرنٹ لگا۔

”چھوڑو مجھے۔“

”اوں... ہوں... آج اگر خوش قسمتی سے ہاتھ لگی ہو تو کیونکر موقع گنوا جائے۔ چلو تھوڑی دیر بیٹھو میرے پاس، باتیں کرتے ہیں۔ کچھ میرے دل کی سنو، کچھ اپنی سناؤ، ویسے بھی اب تو رات گزر رہی چکی ہے۔ فجر کا وقت ہونے

والا ہے ملائی صاحبہ... پھر جا کر نماز پڑھ لینا۔“ وہ نرم آواز میں کہتا اس کا ہاتھ پکڑے صوفے تک آیا۔ مومنہ نے گھبرا کر اسے پرے دھکیلنا چاہا تھا مگر شاید وہ بھی فولاد کا بنا تھا۔ جب کچھ اثر ہی نہ ہوا تو وہ بے بسی سے چیخی۔

”ارحم! میرا ہاتھ چھوڑو۔“

”ایک بات کہوں مومنہ! مجھے ضدی اور من مانی کرنے والی عورتیں قطعاً پسند نہیں ہیں۔ یہ ہٹ دھرمی مجھے بہت بری لگ رہی ہے۔ چلو بیٹھو یہاں۔“ وہ اسے صوفے پر پٹخ کر عین اس کے سامنے کشن لے کر کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ مومنہ کا کلیجہ گویا حلق میں آن پھنسا۔ اس وقت وہ اپنی جذباتیت کو کوس رہی تھی۔

”بھلا کیا ضرورت تھی اس منحوس کے کمرے میں آنے کی۔“ مومنہ تنفر سے سوچتے ہوئے اٹھی۔

”مجھے جانے دو۔“

”کہاں جانا چاہتی ہو پاگل لڑکی، بتاؤ مجھے تمہارے سارے راستے میرے دل کی طرف آتے ہیں۔ خوا مخواہ ”ان“ لوگوں کی باتوں میں آکر اپنی راہ کھوٹی نہ کر لینا۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولتا مومنہ کو اس پل کافی مختلف لگا تھا۔

”بابا تمہیں مجھ سے دور کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں، میں بہت برا ہوں اور دوسرے سب بہت اچھے ہیں اور وہ بخاری کا بیٹا۔“ ارحم کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

”خیر چھوڑو اس...“ مومنہ کو سرعت سے اٹھتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تھا۔ مومنہ تیزی سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی جبکہ ارحم سیٹی پر کوئی شوخ دھن گنگناتا بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹ گیا تھا۔

اگلی صبح بڑی خاموشی کے ساتھ آنگن میں اتری تھی۔ رحیم بھائی آفس جا چکے تھے۔ سامعہ بھابی اپنی کسی فرینڈ سے ملنے چلی گئی تھیں اور ماموں کسی دوست کی عیادت کے لئے گئے تھے۔ مومنہ کچن سمیٹ کر ماسی سے اپنی نگرانی میں

صفائی کروا کر مامی جی کے کمرے میں آئی تو ان کی گود میں سر رکھے ارحم کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”امی! آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کے بیٹے کے سر پر سہرا سجے۔ ویسے سنا ہے ماؤں کو تو بڑی آرزو ہوتی ہے اور آپ نہ جانے کیسی ماں ہیں۔ بیٹا بیاہ کے لئے بے تاب ہوا جا رہا ہے جبکہ اماں جان کو کوئی پرواہی نہیں۔“

”بڑا بد تمیز ہو گیا ہے تو ارحم... شرم نہیں آتی کیا۔“ مامی جی نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر چپت لگائی۔

”اچھا اگر شرماؤں تو پھر مان جائیں گی آپ۔“ وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔ مامی جی نے اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر پیشانی کو چوما اور بولیں۔

”تو جس لڑکی پر بھی ہاتھ رکھے گا، میں اس سے تیری شادی کر دوں گی۔“

”وعدہ رہا۔“



”پکا وعدہ“ بس تم مومنہ کو بھول جاؤ۔ تمہارے بابا کبھی نہیں مانیں گے۔ میں ان کے مزاج کو جانتی ہوں۔“ نبیلہ اس کے چہرے پر یک لخت پھیلتی افسردگی کو دیکھ کر آہستگی سے بولی تھیں۔ کچھ پل تو ارحم بول نہیں پایا تھا پھر جب بولا تو اس کا لہجہ ہٹایا تھا۔

”وہ کسی کی نہیں مانتے نہ اپنے فیصلے بدلتے ہیں تو پھر میں بھی ان کا بیٹا ہوں۔ وہ ہی کروں گا جو میرا دل کہے گا۔“ مامی جی نے پھر نہ جانے کیا کہا تھا۔ مومنہ اٹے قدموں لوٹ آئی۔ کچن میں کرن کھڑی چائے بنا رہی تھی۔ مومنہ چونک گئی۔

”تم کالج نہیں گئی ہو؟“

”نہیں...“ کرن نے بغیر مڑے روکھے لہجے میں کہا تھا۔

”کیوں؟“

”میری مرضی“ اس نے کپ میں چائے انڈیلی اور بسکٹ کی پلیٹ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ مومنہ کا دل بو جھل ہو گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور نکل جائے۔ اس کشیدہ گھٹے گھٹے ماحول میں دم الجھ رہا تھا۔ پھر بہت سے دن خوشگوار گزر گئے۔ ارحم ان دنوں کم کم ہی گھر آ رہا تھا۔ مامی جی بھی قدرے پر سکون ہو گئی تھیں کیونکہ ارحم کو ایک مرتبہ پھر خوش قسمتی سے جاب مل گئی تھی۔ اسے مصروف دیکھ کر ماموں جی بھی مطمئن ہو گئے۔ بس ایک مومنہ تھی جسے کسی پل سکون نہیں تھا۔ آتے جاتے ارحم کے شوخ فقرے، بے باک نگاہیں اسے بہت ڈسٹرب کرتی تھیں۔ وہ تو پہلے ہی بہت نڈر تھا۔ اس کی خاموشی پر مزید دلیر ہو گیا۔

اداس موسم کے رتجگوں میں

ہر ایک لمحہ بکھر گیا ہے

پھر ایسے موسم میں کون آئے

کوئی تو جائے

تیرے نگر کی مسافتوں کو سمیٹ لائے

تیری گلی میں ہماری سوچیں بکھیر آئے

تجھے بتائے کہ کون کیسے؟

اچھالتا ہے وفا کے موتی

تمہاری جانب کوئی تو جائے

میری زباں میں تجھے بلائے

تجھے منائے

ہماری حالت تجھے بتائے تجھے رلائے

تو اپنے دل کو بھی چین آئے

ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں کچن میں کھڑا وہ مسلسل گنگناتے ہوئے چائے بنا رہا

تھا اور ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے برتن دھوتی مومنہ کی طرف بھی دیکھ رہا

تھا جو کہ ماتھے پر بل لیے انتہائی ناگواری سے اسے سننے پر مجبور تھی۔

”ایک کپ دھو کر دو۔۔۔“ برنر بند کر کے اس نے پتیلی نیچے رکھی۔ مومنہ نے

بغیر کچھ کہے کپ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”اتنی للچائی نظروں سے میری چائے کو نہ دیکھو۔“ وہ جو اس برائے نام پتی

والی چائے کو بغور دیکھ رہی تھی ایک دم ہی نگاہیں ہٹا کر برتنوں کے ڈھیر کی

طرف متوجہ ہو گئی۔

”پیوگی۔۔۔“ بے حد سہولت سے کچن ٹیبل پر بیٹھ کر چائے کے سپ لیتا وہ

بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے دانت پیس کر کہا۔

”میں بھی کون سا تمہیں دے رہا تھا۔ بس ایویں ہی صلح ماری ہے۔“

”تم باہر نہیں جاسکتے۔“ اس کی بک بک سے تنگ آکر مومنہ نے غرا کر کہا

تھا۔

”نہیں“ ارحم نے خالی کپ اس کی طرف بڑھایا اور پھر بہت مزے سے بولا۔ ”اگر میں چلا جاؤں تو پھر تمہیں دیکھے گا کون... ستائے‘ جلائے گا کون... نہ نہ‘ میں دنیا سے جانے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ تم اتنی خوش نہ ہو۔“

”تم جاؤ گے یا پھر میں ماموں کو بلاؤں۔“ مومنہ نے پلیٹ پٹخ کر غصے سے کہا۔

”یہ ماموں کی دھمکی بھی خوب ہے۔“ ارحم نے اک ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ مومنہ کو اس کی دل جلانے والی مقابل کو زچ کرنے والی اسی مسکراہٹ سے چڑھتی تھی۔

”تم بہت ڈھیٹ ہو۔“

”ذرا نوازی ہے آپ کی، میری شان میں کچھ اور بھی قصیدے پڑھ دیجئے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ ارحم نے ٹیبل بجا کر دلنشیں انداز میں کہا تھا۔

مومنہ نے ٹونٹی بند کر کے چادر سے ہاتھ پونچھے اور پھر

تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔ دروازہ زور دار دھماکے سے بند کر کے وہ پلنگ پر ڈھے گئی تھی۔

ارحم کی فضول باتوں کو مسلسل سوچتے ہوئے وہ بھنا رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتے ہوئے اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا اور ایک بات تو طے تھی کہ اسے ارحم کا ساتھ کسی بھی حال میں قبول نہیں تھا۔ وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ آج سے نہیں بلکہ اس دن سے جب وہ اپنے چھ عدد دوستوں کے ساتھ ڈیکٹی کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ ان دنوں وہ سکول میں تھی جبکہ ارحم سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اخبار میں چھپنے والی خبر کو پڑھ کر کئی لمحے وہ گم سم رہی تھی اور پھر کتنی دقتوں کے ساتھ اس نے یہ روح فرسا خبر مامی جی کو سنائی تھی۔

”مگر وہ تو دوستوں کے ساتھ مری گیا ہے۔“ مامی جی نے ٹوٹے لہجے میں بمشکل کہا تھا۔ ان کا دل اس شرمناک حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے مومنہ کی طرف دیکھا جو کہ خود بھی بے یقین سی کھڑی تھی۔

رات تک بات دور دور تک پھیل گئی۔ پورے خاندان والوں کو بھی پتا چل گیا۔ ماموں نے سنا تو دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ رحیم بھائی کی ہمت بلکہ مہربانی کی وجہ سے وہ ایک رات تھانے میں رہنے کی بعد گھر آچکا تھا مگر ماموں کے عتاب سے بچ نہ پایا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ لاتوں، گھونسوں اور ٹھڈوں کے ساتھ اس کی پٹائی کی اور پھر گھر سے بھی نکال دیا۔ پوری رات فٹ پاتھ پر پڑے رہنے کے بعد وہ اپنے اسی دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ اس کی غمزدہ داستان سن کر دانش کتنے ہی پل ہنستا رہا۔

ارحم ہونٹ بھینچے اس کی لن ترانیاں سن رہا تھا۔ پھر فوراً ہی اپنی چکنی چڑی باتوں سے بہلا پھسلا کر منا لیا۔ دانش کے ساتھ رہتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کے مزاج کا مالک ہے۔ شراب و شباب کا دلدادہ وہ ایک

بگڑا ہوا امیر زادہ تھا۔ جس کے والدین نے انہی حرکتوں کی وجہ سے گھر سے نکال دیا تھا۔

اتنی سی عمر میں دانش نے بڑے بڑے کارنامے سر انجام دیے تھے۔ چوری، ڈکیتی کی وارداتوں کے علاوہ وہ اخلاقی حدود سے گر چکا تھا اور دانش کے ساتھ رہتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ ارحم بھی اس گندگی سے بچ پاتا۔ تقریباً تین ماہ بعد رحیم بھائی نے اسے دانش کے فلیٹ سے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس دوران اس میں کتنی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اس سے سب ناواقف تھے۔ رحیم بھائی اسے زبردستی گھر لے آئے تھے اور انہی کے مجبور کرنے پر اس نے ماموں سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ وہ کتنا بدل چکا تھا۔ نبیلہ اس کے انداز ملا حظہ کر کے ہولتی رہتی تھیں۔

رحیم بھائی نے ایک دفعہ پھر اسے درس گاہ کی راہ دکھائی۔ صد شکر کہ اس نے تعلیمی سلسلے کو دوبارہ جوڑ لیا تھا مگر اپنے دوستوں کے ساتھ کو اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ ماموں کے دھمکانے پر وہ بد لحاظی پر اتر آتا تھا۔ کچھ سوچ کر

انہوں نے ارحم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ مومنہ اور کرن ان دنوں میٹرک کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی تھیں۔ وہ اور کرن دونوں کوئی کورس کرنے کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان بحث بھی اسی بات پر ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوکنگ کا کورس کر لیا جائے جبکہ کرن کا کمپیوٹر کی طرف رجحان تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بحث تکرار میں اس قدر الجھی تھیں کہ ارحم کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ چونکیں تو وہ تب جب ارحم ان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”کہا فضول تکرار کیے جا رہی ہو۔ پہلے کوکنگ کا کورس کر لو پھر کمپیوٹر کا کر لینا۔“

”ارے واہ۔ یہ ٹھیک ہے۔“ کرن نے چٹکی بجائی۔ مومنہ کو بھی یہ مشورہ پسند آیا تھا۔ وہ دونوں ایک مرتبہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔ مگر مومنہ کا سارا دھیان ارحم کی طرف تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ارحم اسے

بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ پہلے پہل اس نے اپنا وہم جانا مگر ارحم کا یوں بے حد بے باکی سے دیکھنا اسے بہت برا لگا تھا۔

اس کی نگاہوں میں نہ جانے کون سے جذبے اٹھ اٹھیں مارتے تھے۔ مومنہ کبھی جان نہیں پائی تھی یا پھر جاننا چاہتی ہی نہیں تھیں۔ ارحم کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا دماغ پھوڑے کی طرح دیکھنے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر سونا چاہتی تھی۔ ابھی آنکھ لگے تھوڑی دیر ہوئی تھی جب عجیب سے غیر مانوس شور پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ چکراتے سر کو تھامتے ہوئے وہ بستر سے اٹھی اور پھر سلپروں میں اڑس کر تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے چلی آئی۔ لاؤنج میں ارحم کھڑا زور زور سے چلا رہا تھا اور مامی جی اسے ملامتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”شکر کریں میں نے اس کمینے کو جان سے نہیں مار دیا۔“ ماں کے غصیلے تیور دیکھ کر وہ قدرے نرم پڑا تھا۔



”ارحم! تم ایک جگہ ٹک کر نوکری کیوں نہیں کرتے۔ ہر نئی جگہ پر دشمنیاں پال لیتے ہو۔ کیوں نہیں تم میں صبر تحمل کا مادہ۔ کسی بات کو برداشت بھی کر لیا کرو۔ ہر ایک کو رعایا سمجھ رکھا ہے تم نے۔“ وہ تاسف سے کہتے ہوئے رو رہی تھیں۔

”شکر کیا تھا کہ ایک دفعہ پھر کافی اچھی نوکری مل گئی ہے۔ مگر تمہارے کرتوت۔“

”بس امی! آپ کو تو ساری خرابیاں مجھ میں ہی نظر آتی ہیں۔ اس گھونسو کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ جو خوا مخواہ پھنے خان بنا رعب جھاڑ رہا تھا مجھ پر۔“ اس نے پانی کا گلاس بھرا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔

”ساری دنیا بری ہے۔ بس ایک تم ہی اچھے ہو۔“ نبیلہ نے تلخی سے کہا۔ وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

”تعریف کا شکریہ۔“ وہ ان کے گٹھنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔

”بس کرو ارحم، نہ ستایا کرو مجھے۔“ نبیلہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ مومنہ گہرا سانس خارج کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ یہ تو اس کا معمول تھا۔ ہر نئی نوکری کو بغیر کسی وجہ کے لات مار آنا۔ اب بھی نہ جانے کیا معاملہ تھا۔ وہ جلتے کڑھتے آلو چھیلنے لگی۔ رات کو رحیم بھائی گھر آئے تو اس نئی خبر نے انہیں بھنا کر رکھ دیا تھا۔ کافی دیر گرج برس کر جب وہ خاموش ہوئے تو ماموں شروع ہو گئے۔ وہ اطمینان سے کھانا کھا کر ایک دفعہ پھر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

زلزلے آنے کے بعد کرن نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ جبکہ مومنہ، ماموں کے بے حد اصرار پر بھی رضا مند نہیں ہوئی تھی۔

ارحم کی مشکوک سرگرمیاں اسی طرح جاری تھیں۔ رات رات بھر گھر سے غائب رہنا۔ دیر سے آنا اور دن چڑھے تک سونا۔

ماموں اور ارحم کی بہت دن سے کوئی جھڑپ بھی نہیں ہوئی تھی۔ گھر کی فضاء پر امن تھی۔ ماموں زمینوں کے حساب کتاب کے سلسلے میں ملتان گئے تھے۔ ہفتہ بھر بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔

ان کے ساتھ ان کے عزیز ازجان دوست حیات عمر بھی تھے۔ وہ اور سامعہ بھابی کچن میں گھسی کھانا بنا رہی تھیں۔ کرن پڑھائی کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں گوشہ نشین ہو چکی تھی۔ کھانا بنا کر مومنہ نے ٹیبل پر لگایا۔ ارحم کی ملاقات ماموں سے کھانے کی میز پر ہوئی تھی۔ اس نے بڑے غور سے حیات عمر کو دیکھا تھا تاہم اس نے کچھ بولنے سے گریز کیا۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد گرین ٹی کا دور چلا۔

خلاف معمول ارحم بھی ان کی محفل میں بیٹھ گیا۔

رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ ماموں جی کے کہنے پر مومنہ، حیات عمر کو ان کے کمرے میں چھوڑنے کے لئے اٹھ گئی۔ سب کے اٹھنے کے بعد ارحم بھی خاموشی سے اٹھا اور اپنے کمرے میں جانے کی بجائے فرمان کے کمرے

میں چلا گیا۔ وہ اسے آتا دیکھ کر چونک سے گئے۔ ارحم خاموشی سے ان کے مقابل بیٹھ گیا اور پھر ان کی طرف دیکھے بغیر آہستگی سے بولا۔

”یہ حیات انکل کیوں آئے ہیں۔ آپ ان سے مل آئے تھے پھر انہیں ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ میری چھٹی حس جو پیغام مجھے دے رہی ہے کیا وہ ٹھیک ہے۔“ فرمان نے عینک اتار کر میز پر رکھی اور اس کی طرف رخ کیا۔

”تم نے جو کہنا تھا کہہ لیا۔ اب یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تم سے کلام کرنا نہیں چاہتا۔“

”بابا! پلیز...“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روکا۔ ”میں مومنہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ارحم کے لہجے میں پہلے جیسی تنیدی نہیں تھی۔ وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ بابا کی خاموشی اسے کسی طوفان کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ اسی لئے وہ الرٹ ہو گیا۔

”تم اب جاسکتے ہو۔“

”بابا! آپ کو کیا اعتراض ہے۔“ وہ پہلی مرتبہ تحمل سے بولا۔ ”مجھ میں کیا کمی ہے اور...“ نبیلہ کو اندر آتا دیکھ کر وہ ایک پل کو رکا۔

”ارحم! تم ادھر ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈ رہی ہوں۔ یہ لو تمہارا فون ہے۔“ نبیلہ نے کارڈ لیس اس کی طرف بڑھایا۔ ارحم نے کارڈ لیس ہاتھ میں پکڑ کر آف کا بٹن دبا دیا۔

فرمان سامنے رکھی کتاب میں گم ہو چکے تھے۔ ارحم نے نہایت اطمینان سے ان کے سامنے رکھی کتاب کو اٹھا لیا۔ اور پھر ماں کی طرف رخ کیا۔

”امی! آپ کے شوہر کی عدالت میں اپنا کیس رکھا ہے۔ بتائیں آپ کس کا ساتھ دیں گی۔“ خلاف توقع وہ بڑے خوشگوار لہجے میں بول رہا تھا۔ نبیلہ کو بے حد حیرت ہوئی۔

”تم یہ مقدمہ ہار جاؤ گے لہذا اس ٹاپک کو کلوز کر دو۔“ فرمان رکھائی سے بولے تھے۔

”یہ آپ کی بھول ہے۔“ ارحم نے سنجیدگی سے کہا۔

”بڑی خوش فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں“ فرمان تلخی سے بولے تھے۔  
”آپ دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔“ نبیلہ گھبرا اٹھیں۔

”حیات عمر کو آپ بھجوائیں گے یا پھر میں انہیں چلتا کروں۔“ ارحم زہر خند ہوا۔

”کسی بھی قسم کی فضول حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ...“ انہوں نے اسے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔

”آپ بھی کسی بھی قسم کا انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے یہ یاد رکھیے گا کہ مومنہ میری محبت ہے اور میری ہی بیوی بنے گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں بولا تھا۔ فرمان نے کچھ سوچتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تم یہاں بیٹھو اور نبیلہ تم فیصلہ کرنا۔“ فرمان نے آہستگی سے کہا اور پھر سنجیدگی سے بولے۔ ”یوں سمجھ لو کہ تم اس وقت ارحم کی ماں نہیں ہو اور نہ ہی مومنہ کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ ہے۔ میں تمہارے سامنے دو پر پوزل رکھتا ہوں۔ ایک تو حیات کا بیٹا ہے۔ نہایت شریف، باعزت پیشے سے منسلک

ہے۔ کردار کا مضبوط اور صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔ گھر میں خوشحالی بھی ہے۔  
قدر کرنے والے لوگ ہیں۔

دوسرا یہ میرا بیٹا ہے۔ خوب صورتی ہے مگر صرف ظاہری۔ کام دھام کرتا  
نہیں۔ خوبی بھی کوئی ایسی نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ کردار کے بارے  
میں بھی مشکوک ہے۔ لوٹ مار کرنے والوں میں بھی شامل رہا ہے۔ اب  
انصاف سے کام لو۔ بتاؤ کہ کون سا پر پوزل بہتر ہے جو تم کہو گی۔ وہ ہی  
ہوگا۔ یعنی کہ جس کے حق میں تم فیصلہ دو گی میں منظور کروں گا۔“ اپنی  
بات مکمل کر کے انہوں نے ارحم کے سرخ چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی  
آنکھوں سے گویا لہو ٹپک رہا تھا۔

”ہاں بھئی بولو۔“ فرمان نے نبیلہ سے کہا۔

”میں کیا کہوں۔“ وہ جزبز ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھیں۔ فرمان کے لبوں  
پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں کوشش کر رہا ہوں۔ بہت جلد نوکری مل جائے گی۔“ وہ ماں کے کچھ  
کہنے سے پہلے ہی سرعت سے بولا تھا۔ فرمان نے سامنے رکھا چشمہ اٹھا کر  
لگایا۔

”اب تم جاسکتے ہو۔“ وہ چند پل انہیں دیکھنے کے بعد دروازہ دھماکے سے بند  
کرتا تن فن کرتا باہر نکل گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد نبیلہ شوہر سے  
مخاطب ہوئیں۔

”کیوں اتنا سخت دل کر لیا ہے آپ نے۔ مان جائیں اس کی بات۔“  
”مان جاؤں۔ یعنی کہ مومنہ کی زندگی جہنم بنا دوں۔ اسے دلدل میں پھینک  
دوں۔“ وہ تنفر سے بولے تھے۔ نبیلہ ہاتھ مسلتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں۔

”اس نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی ہے اور...“

”بس، مزید کچھ مت کہو۔“ فرمان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں کچھ بھی کہنے سے  
روک دیا تھا۔

”کل حیات چلا جائے گا۔ چند دن تک وہ اور اس کی بیوی دونوں آئیں گے۔ چھوٹی سی رسم کرنے کا ارادہ تھا میرا۔ اب سوچ رہا ہوں کہ منگنی وغیرہ کے چکر میں نہ ہی پڑوں۔ اگلے ہفتے مومنہ کا نکاح ہے۔ تم خفیہ تیاری رکھو۔ سامعہ سے بھی کہہ دو اور ہاں اس کمینے کو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر کتاب کھول کر اس میں گم ہو چکے تھے۔ نبیلہ آنکھیں دوپٹے سے رگڑتی کھڑی ہو گئیں۔

اگلی صبح حیات عمر ملتان روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے جانے کے ساتھ ہی ارحم نے سکون بھرا سانس لیا تھا۔ ایک نادیدہ بوجھ کندھوں سے ہٹتا محسوس ہوا تھا۔ وہ بے حد ہلکا پھلکا ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر اس نے پرانی روٹین شروع کر دی تھی۔ صبح کا گیا رات بہت دیر سے گھر لوٹتا تھا۔ زیادہ تر کتابوں میں ہی سر گھسائے رکھتا۔ یا پھر طرح طرح کے نوٹس بنائے جاتے۔ رحیم بھائی کے بتانے پر پتا چلا تھا کہ وہ ان دنوں سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہے۔ فرمان نے سنا

تو بے حد حیران ہوئے۔ نبیلہ البتہ بہت خوش تھیں۔ ان کے سجدے ایک دفعہ پھر طویل ہو گئے۔ ایک مومنہ تھی جسے کسی پل چین نہیں تھا۔

وہ دن اتوار کا تھا کرن ناشتے کے بعد اپنی سہیلی نادیہ کے گھر چلی گئی تھی۔ سامعہ بھی رحیم بھائی کے ساتھ اپنے میکے گئی تھیں۔ صرف ماموں اور مامی جی گھر پر تھے۔ ارحم رات کو بھی گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے ناشتے کے بعد برتن سمیٹ کر دھوئے پھر کچن اور لاؤنج کی صفائی کی۔ ماسی آج چھٹی پر تھی۔ پائپ اور جھاڑو لے کر وہ صحن میں آئی۔ پہلے پتوں اور پھولوں کا ڈھیر اکٹھا کر کے ڈسٹ بن میں ڈالا اور پھر پائپ لگا کر صحن دھونے لگی۔ پائپ چڑھائے، ڈوپٹہ اتارا اور بڑے مگن انداز میں صحن دھو رہی تھی جب ارحم کی بائیک صحن میں آن رکی۔ وہ بغیر اس کی طرف دیکھے پائپ سمیٹ کر واپس لگانے لگی تھی۔ ارحم اندر جانے کے بجائے اس کے قریب چلا آیا۔

”کیا ہو رہا ہے ڈیر“ یہ ماسیوں والا حلیہ کیوں بنا رکھا ہے۔“ وہ اس کے دلکش نقوش دیکھتے ہوئے شگفتگی سے بولا تھا۔ مومنہ نے اس کی نظریں محسوس



کر کے ڈوپٹہ اچھی طرح پھیلا لیا اور پھر واپس اور جھاڑو اٹھا کر پچھلے صحن میں رکھنے کے لئے چلی گئی۔ ارحم ہونٹوں کی تراش میں مسکان دبائے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ مومنہ کچن میں آئی تو ارحم کو اپیل شیک بناتے دیکھ کر چونکی اور پھر سبزی کی ٹوکری اٹھا کر لاؤنج میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ارحم بھی جگ، گلاس اٹھائے آگیا تھا۔

”کب تک غم کی تصویر بنی رہو گی۔ نکل آؤ اس دکھ کی کیفیت سے۔ منگنیاں تو ٹوٹتی ہی رہتی ہیں۔“ جگ میں برف کے کیوبز ڈالتے ہوئے اس نے شریر لہجے میں کہا تھا۔ مومنہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اتنی ظالم نظروں سے نہ دیکھو، سچ مچ مرجاؤں گا میں۔“ اسے مسلسل بولتا دیکھ کر مومنہ نے چھری پتختی اور کھڑی ہو گئی۔

”کہاں جا رہی ہو۔ بیٹھو ادھر...“ مومنہ کو اٹھتا دیکھ کر اس نے ہانک لگائی۔ وہ سنی ان سنی کر کے مامی جی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ بھی جارحانہ

تیور لئے اس کے پیچھے ہی گیا تھا۔ مامی جی اسے آندھی طوفان کی طرح آتا دیکھ کر دہل گئیں۔

”مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ آنا تو آخر تم نے میری ہی بانہوں میں ہے۔ تو پھر اتنا گریز کیوں؟“ اس کا گداز بازو اپنی آہنی گرفت میں لے کر وہ سختی سے بولا تھا۔

”ارحم! یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ نبیلہ بمشکل اٹھی تھیں۔

”بتاؤ نا جانم، خاموش کیوں ہو؟“ اس کی گردن کے گرد بازو جمائے کر کے ارحم نے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔ مومنہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لہرا کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا۔ نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی اس میں۔ ارحم ساکت نظروں سے کچھ پل اسے گھورتا رہا اور پھر جھٹکا دے کر اسے بیڈ پر گرا دیا۔ نبیلہ نے لپک کر اسے تھاما تھا۔ ورنہ شاید وہ چکنے فرش پر آن گرتی۔ ارحم کے خونخوار تیور دیکھ کر نبیلہ کی جان پر بن آئی تھی۔ انہوں نے دروازہ کھول کر اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

”یہ تھپڑ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا مومنہ ڈیر۔ میرا باپ کہتا ہے ارحم بہت برا ہے۔ میں تمہیں برا بن کر دکھاؤں گا۔“ وہ دھیمے لہجے میں غرا کر بولا تھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ نبیلہ سرعت سے نیم بے ہوش مومنہ کی طرف لپکی تھیں۔

☆☆☆

ایک ہفتہ لگاتار گھر میں رہنے کے بعد وہ ایک دفعہ پھر گھر سے غائب ہو گیا تھا۔ فرمان نے اسی موقع پر غنیمت جان کر ملتان فون کر کے حیات عمر کو بلوالیا تھا۔ وہ اپنی دو بیٹیوں اور بہو کے ساتھ رات کو ہی آگئے تھے خوب لدے پھندے سے۔ پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکروں سمیت۔ گھر میں نامانوس سی ہلچل مچ گئی تھیں۔ سامعہ بھابی اور ماما جی بازار کے چکر لگانے میں مصروف ہو گئیں۔ کرن اس تمام ہنگامے سے قطعاً بے نیاز نظر آتی تھی۔ اس نے مومنہ کے ساتھ بات چیت بالکل بند کر رکھی تھی۔ مومنہ چاہ کر بھی اس کے بے گانگی بھرے روئے کو کھوج نہ سکی۔

جمعہ والے روز سہ پہر کے وقت اس کا نکاح تھا۔ مومنہ کی دو خالائیں ایک پھوپھی اور دیگر رشتے دار صبح ہی آپہنچے تھے۔ لڑکیوں بالیوں نے ڈھولک منگوا لی تھی۔ اور اب بے سرے راگ الاپے جارہے تھے۔ لاؤنج میں ایک طوفان بد تمیزی مچا تھا۔ بچے چلا چلا کر ماؤں کے دوپٹے پکڑے رونے دھونے میں مصروف تھے۔ کچھ بزرگ خواتین بڑے کمرے میں سرجوڑے کانوں میں گھسی گھسر پھسر کر رہی

تھیں۔ یقیناً غیبتیں ہی کی جارہی ہوں گی یا پھر اس اچانک نکاح کی وجہ معلوم کرنے کی کوششوں میں ہلکان ہو رہی ہوں گی۔

کچھ مہمان خواتین اور بیاہتا لڑکیاں جن نظروں سے مومنہ کو دیکھتی تھیں وہ اپنے آپ میں ہی کٹ کر رہ جاتی۔ جی چاہتا تھا کہ خود کو ختم کر لے۔ کسی سے نگاہ ملانے کے لائق نہیں رہی تھی وہ۔ ارحم نے پورے خاندان میں جس طرح رسوا کیا تھا یہ کوئی معمولی بات تھوڑی تھی۔ وہ انہی کاٹ دار، طنزیہ نگاہوں سے چھپتی پھر رہی تھی۔

اس نازک وقت میں اسے اپنے ماں باپ بہت یاد آتے تھے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو اپنی بیٹی کو یوں بے سائبان نہ ہونے دیتے۔ وہ پہروں ان کی تصویر تکتی اور ان سے باتیں کرتی۔ دل زیادہ گھبراتا تو مامی جی کی آغوش میں سرچھپا لیتی۔ اس کڑے وقت میں اسے کسی بہت اپنے کی بڑی شدت سے کمی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی ایسا دوست، ہمزاز جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے سارے خدشات کہہ ڈالتی۔ دل کی بھڑاس بھی خوب نکالتی۔ کرن کا رویہ اسے بہت تکلیف پہنچا رہا تھا۔ وہ اس سے متنفر تھی۔ بات کرنا تو دور وہ مومنہ کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ کرن کے متعلق سوچتے ہوئے بے اختیار رودی۔ سامعہ بھابی کسی کام کے سلسلے میں ادھر آئیں تو اسے روتا دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

”کیا بات ہے گڑیا! ادھر کیوں بیٹھی ہو۔ سب کے درمیان بیٹھو، ہنسو بولو۔“ وہ اس کی زد کے باوجود زبردستی اٹھا کر لاؤنج میں لے آئی تھیں۔ لڑکیوں نے اسے دیکھ کر اپنے ولیم مزید بلند کر لیے۔

اسی پل بارات آجانے کا اعلان ہوا تھا۔ شہروز کی دو بھابیاں، ماں اور رشتہ دار خواتین ابھی ابھی پہنچی تھیں۔ ان کے آنے کے ساتھ ہی بھگدڑ مچ گئی۔ مامی جی کے کہنے پر مومنہ کو اوپر پہنچا دیا گیا تھا۔ اسی پل مولوی صاحب بھی آگئے۔ سامعہ بھابی مہمانوں کی تواضع میں لگی ہوئی تھیں۔ کرن ہنوز غائب تھی۔ مومنہ لرزتے قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی تو اس کے پیچھے ہی شہروز کی بہنیں بھاری بھر کم شاپر اٹھائے چلی آئی تھیں۔ اب وہ بڑے چاہ سے مومنہ کو ایک ایک چیز دکھا رہی تھیں۔ وہ بے دلی سے دیکھتی رہی۔ شہروز کی چھوٹی بہن مومنہ کے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی۔ اس کے لبوں پر بڑی پیاری سی مسکان تھی۔ وہ بار بار فرط محبت سے اس کے ساتھ لپٹ جاتی۔ ”ہمارے ابا کی پسند لاجواب ہے۔“ شہروز کی آپا نے پیار سے کہا۔

اسی پل سامعہ بھابی بڑی سی چادر لے کر اندر آئیں۔ ان کے پیچھے ایک بزرگ اور رحیم بھائی بھی تھے۔ سامعہ بھابی نے اشارے سے تمام لڑکیوں کو باہر نکلنے کو کہا۔

ان کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے نکاح کی کارروائی شروع کی۔ اسی پل دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ اندر آتے ارحم کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔ سامعہ بھابی فق چہرے کے ساتھ رحیم بھائی کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ کم و بیش ایسے ہی تاثرات سب کے چہروں پر نظر آرہے تھے۔ ارحم کا دایاں بازو زخمی تھا۔ چہرے پر بھی زخموں کے نشان تھے۔ وہ اس سے بے نیاز ایک ٹک باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے پتھر یلے تاثرات اور آنکھوں سے لپکتے شعلے دیکھ کر مومنہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ چہرے کا رنگ دھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ مولوی صاحب اس صورتحال کو سمجھے بغیر ایک دفعہ پھر کارروائی شروع کرنے لگے تھے جب ارحم نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کے لئے کہا۔

”پلیز مولوی صاحب آپ چند منٹوں کے لئے باہر تشریف لے جائیں۔ مجھے اپنے والد محترم سے ضروری بات کرنا ہے۔“ اس نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے فرمان کی طرف دیکھا۔ جن کی رنگت پل بھر میں ہی زرد ہو گئی

تھی۔ مولوی صاحب بغیر کچھ کہے رجسٹر سنبھالے باہر نکل گئے تھے۔

”میری خواہش، میری چاہت، میری محبت کا خوب جنازہ نکالا جا رہا ہے۔“ اس نے پیٹوں میں جکڑے بازوؤں کو دباتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔

”ارحم! اللہ کے لئے کوئی ڈرامہ مت کرو۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہے۔ ہماری عزت کو خاک میں مت ملاؤ۔“ رحیم بھائی نے التجائیہ لب و لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”ڈرامہ میں نہیں بلکہ آپ لوگ میری زندگی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ ان لوگوں کو عزت کے ساتھ رخصت کر دیں۔ ورنہ نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔“ اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ فرمان سینہ مسئلے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے۔ رحیم بھائی بابا کے پیچھے لپکے تھے۔ سامعہ نے بھی ان کی پیروی کی۔ مومنہ بے اختیار ارحم کی طرف بڑھی تھی۔



”اللہ کے لئے ارحم یوں مت کرو۔ مجھے ذلتوں کے اندھے گڑھے میں مت پھینکو۔ مجھے لوگوں کی نگاہوں سے مت گراؤ۔“ وہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر بلک اٹھی۔

”تمہیں لوگوں کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں کی تو فطرت ہے باتیں بنانے کی۔ بس میرے اور اپنے متعلق سوچو۔ وارننگ دی تھی میں نے تمہارے ماموں جان کو، مگر انہیں بھی عزت راس نہیں آتی۔ اب مجھے تو اپنی ناؤ ڈوبنے سے بچانا ہی ہے اور اس کے لئے میں کس حد تک گر جاؤں گا یہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ابھی اور اسی وقت انکار کردو ورنہ...“ وہ دانت پیس کر تنفر سے بولا تھا۔ مومنہ اس کے لہجے میں چھپی وحشت کو محسوس کر کے لرز اٹھی۔ تبھی دھاڑ سے دروازہ کھلا اور ماموں جان خطرناک تیور لئے ارحم کی طرف بڑھے۔ ان کے ہاتھ میں پستول تھا۔

”کیا کر لو گے تم، ہاں بولو، میں بھی تو دیکھوں کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ ابھی تمہارا کام تمام کرتا ہوں۔ ایسی نافرمان، بے غیرت اولاد کو قتل کر دینا ہی بہتر

ہے۔“ وہ پسینے سے شرابور الجھی سانسوں کو بمشکل ہموار کر کے بول رہے تھے۔ رحیم بھائی نے پیچھے سے آکر ان کا پستول والا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ نبیلہ بھی لرزتی کانپتی آگئی تھیں۔

”بابا! پلیز خاموش ہو جائیں۔ گھر میں بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو ہماری عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔“

”کون سی عزت کی بات کر رہے ہو۔ سر جھکا دیا ہے اس نے میرا آج۔“ انہوں نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ ارحم بڑے اطمینان کے ساتھ کمرے میں رکھی واحد کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا تھا۔

”اگر آپ ان لوگوں کو جواب نہیں دے سکتے تو میں یہ نیک فریضہ سرانجام دے دیتا ہوں۔“ حیات عمر کو اندر آتا دیکھ کر وہ لب بھینچ کر خاموش ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے فرمان! دیر کس بات کی ہے۔“ انہوں نے کچھ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔



”یہ ارحم بیٹے کو کیا ہوا ہے۔“ ان کی نظریں ارحم کے زخمی بازو پر ٹھہریں تو وہ کچھ حیران سے فرمان کی طرف پلٹے۔

”کچھ زیادہ نہیں انگل! چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ایسے حادثات میرے ساتھ اکثر ہوتے رہتے ہیں لیکن ایسی معمولی چوٹیں مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ چوٹ تو دراصل وہ لگی ہے جس کا زخم کافی گہرا اور افیت ناک ہے اور جانتے ہیں کہ اتنا بڑا گھاؤ لگانے والا کون ہے۔ یہ آپ کے محترم دوست۔ اپنے بیٹے کے دل کو کھلونا سمجھ رکھا ہے انہوں نے۔“ اس نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“

”کہنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں۔ بس مختصر یہ سمجھ لیجئے کہ بابا کو دوسروں پر فیصلے مسلط کرنے کی عادت ہو چکی ہے۔ مومنہ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر رہے ہیں۔“ ارحم نے گویا ان کے سروں پر دھماکہ کیا تھا۔ حیات عمر بے

یقینی سے اپنے دوست کی طرف دیکھنے لگے تھے جبکہ مومنہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی لہرا کر زمین پر آن گری تھی۔

جب اس نے آنکھ کھولی تو ہسپتال کے کمرے میں خود کو موجود پایا۔ اس پر اتنی بڑی قیامت گزر چکی تھی اور وہ پھر بھی زندہ تھی۔ پورے سترہ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد وہ آج گھر آئی تھی۔ پورے گھر پر چھائی خاموشی اور وحشت محسوس کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ مامی جی نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر بے ساختہ ساتھ لگا لیا۔

حیات عمر گرجتے برستے آگ بگولا ہوئے اسی دن ملتان روانہ ہو گئے تھے۔ فرمان کی لاکھ منت سماجت کے باوجود انہوں نے حیات سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی یہاں تک کہ کرن کے رشتے کی بات بھی کر ڈالی مگر وہ تو گونگے بہرے ہو گئے تھے۔ دراصل مومنہ سے اپنے بیٹے کا نکاح وہ اس لئے کرنا چاہتے تھے کہ مومنہ کی تمام جائیداد اور گھر وغیرہ جہیز میں انہیں مل

جائے گا اور وہ ملتان چھوڑ کر لاہور آن بسیں گے۔ جب بازی پلٹتی دیکھی تو غصے کے مارے اسی دن فرمان سے تمام تعلق توڑ کر چلے گئے۔

”نہ رو میری بچی۔“ مامی جی کے بوڑھے چہرے پر بھی آنسو پھیل گئے تھے۔ سامعہ بھابی اسے تھام کر کمرے میں لے گئیں اور مامی جی نڈھال سی تخت پر گر پڑیں۔

یہ چند ہفتے کیسے گزرے تھے ان کا دل ہی جانتا تھا۔ اتنی ذلت اور رسوائی اٹھائی تھی ان دنوں میں کہ دل سے جینے کی امنگ تک ختم ہو گئی۔ فرمان نے بھی گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ اگر کوئی بھولے بسرے آ بھی جاتا تو وہ بغیر ملے ہی اسے بھجوا دیتے۔ ارحم اس دن کے بعد سے دوبارہ گھر نہیں آیا تھا۔

یوں ہی دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ بہار کا آغاز ہوا تو درختوں پر کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ موسم بھی کافی خوشگوار ہو گیا۔ کیاریوں میں لگے پھول کھل اٹھے تھے۔ مگر اس کے دل پر موسم خزاں نے بسیرا کر لیا تھا۔ انہی دنوں میں سامعہ بھابی کی خالہ نے کرن کو اپنے بیٹے کے لئے مانگ لیا تھا۔ یوں کرن کی

شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ گھر پر چھایا جمود ایک دم ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کرن نے بیاہ کر کینیڈا چلے جانا تھا۔ اسی لئے اس کے سسرال والوں کو بہت جلدی تھی۔ کرن کی شادی کی مصروفیت میں دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

مہندی کی رات کرن نے بہت ضد کر کے ارحم کو بلوایا تھا۔ اس کے اصرار اور ضد کی وجہ سے ماموں بھی مان گئے تھے۔ مہندی کا فنکشن بہت شاندار ہوا تھا۔ ارحم کافی دیر سے آیا۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی مومنہ منظر سے ہٹ گئی تھی۔ وہ اس صورت سے شدید ترین نفرت کرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارحم کی اس پر نگاہ پڑے۔ کمرے میں آکر اس نے اپنے سچے سنورے روپ کو بگاڑا اور تمام جیولری کو اتار پھینکا اور پھر دوبارہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ دو خوب صورت آنکھوں میں اسے نہ پا کر مایوسی کے رنگ اتر آئے تھے۔

بارات اور ولیمہ کے فنکشن میں بھی اس نے بڑی احتیاط برتی تھی۔ جہاں کہیں بھی ارحم کی موجودگی کا امکان ہوتا وہ غیر محسوس طریقے سے ہٹ جاتی۔ ولیمہ

کے بعد ارحم ہوٹل سے ہی واپس جا رہا تھا اور مامی جی اسے جانے نہیں دے رہی تھیں۔ پھر نہ جانے ان کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئیں۔ وہ رحیم بھائی کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر چلی گئی تھی۔

شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو ایک دفعہ پھر زندگی معمول پر آگئی تھی۔ اس دوران کرن صرف دو مرتبہ آئی تھی رہنے کے لئے۔ کینیڈا جانے سے پہلے ایئرپورٹ پر اس کے گلے سے لگ کر کرن بہت روئی تھی۔ مومنہ بھی آنسو ضبط کرتی اسے تسلیاں دیتی رہی۔

”مجھے معاف کر دینا مومی! میں اپنے بھائی سے بہت محبت کرتی ہوں اس لئے...“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ اسی پل کرن کی سسرالی فیملی بھی آن پہنچی تھی۔ ڈھیروں دعاؤں کے سائے تلے کرن کو رخصت کر کے جب وہ لوگ گھر آئے تو سب ہی افسردہ تھے۔ مامی جی تو آتے ہی کمرے میں گھس گئی تھیں۔ ماموں اسٹڈی روم میں چلے گئے تھے۔ رات کا کھانا تیار کر کے وہ

ماموں کو بلانے کی غرض سے اسٹڈی روم میں گئی تو انہیں گہری سوچ میں گم پایا۔

”کیا بات ہے ماموں جان؟“

”کچھ نہیں بیٹے! بس اس ارحم کی وجہ سے پریشان ہوں۔ تم بتاؤ کھانا تیار ہے۔“ وہ گول مول لہجے میں کہتے ہوئے بولے تھے۔

”جی ہاں۔ آپ ہاتھ دھو کر آجائیں میں کھانا لگواتی ہوں۔“ مومنہ آہستگی سے کہہ کر باہر نکل گئی تھی۔ وہ رات بھر ماموں کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ جب وہ باہر آئی تو سامعہ بھابی کو پریشانی کے عالم میں سٹلتے پایا۔

”بھابی کیا ہوا ہے؟“

”امی کی طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی۔ رحیم انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔“ اس کے پوچھنے پر انہوں نے سنجیدگی سے بتایا تھا۔ وہ بھی پریشان ہو اٹھی۔

”کون سے ہسپتال میں گئے ہیں۔ مجھے بھی لے چلیں۔“ مومنہ بے اختیار رو دی تھی۔ سامعہ نے اسے ساتھ لگالیا۔

”اصل میں ارحم کو فون کیا ہے میں نے رحیم نے کہا تھا کہ اسے فون کر دوں۔ ابھی کچھ دیر بعد وہ فون کرے گا۔ اس سے بات کر لوں پھر چلتے ہیں۔“ مومنہ لرزیدہ قدموں سے چلتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

بار بار ٹرائی کرنے کے باوجود جب ارحم سے بات نہ ہو سکی اور نہ ہی اس نے فون کیا تو وہ دونوں ہسپتال چلی آئی تھیں۔ صد شکر کہ مامی جی طبیعت زیادہ خراب نہیں تھی۔ مختلف ٹیسٹ وغیرہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے انہیں فارغ کر دیا تھا۔ ارحم کو ہسپتال میں دیکھ کر مومنہ کچھ حیران ہوئی تھی تاہم اس نے اپنے تاثرات سے ظاہر ہونے نہیں دیا۔

مامی جی کے بے تحاشا اصرار پر وہ ان کی سات نسلوں پر احسان کرتا گھر چلا آیا تھا۔ اسے گھر میں اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر مامی جی منٹوں میں بھلی چنگی ہو گئی تھیں اور اب کچن میں کھڑی اس کی پسندیدہ ڈشز بنوا رہی تھیں۔

مومنہ کی تلملاہٹیں عروج پر تھیں چکن دھوتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

”اونہہ... گویا صاحبزادے محاذ پر سے ہی تو لوٹے ہیں۔“ وہ دانت کچکچاتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔

”جس موڈ میں تم میرے لئے کھانا بنا رہی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ضرور فوڈ پوائزن کا شکار ہو جاؤں گا۔ پلیز مٹھاس کا تڑکے ضرور لگانا تاکہ بیلنس رہ سکے۔“ وہ اس کے عین پیچھے کھڑا ہو کر چلایا تھا۔ مومنہ اچھل کر قدرے دور ہٹی اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر سالن میں زور زور سے چمچہ چلانے لگی۔ ارحم پانی پی کر چلا گیا تھا۔ کھانے کی میز پر جب مامی جی نے بڑے دلار سے اس کی پلیٹ میں سالن ڈالا تو وہ مشکوک نظروں سے مومنہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ مومنہ سنجیدگی کے ساتھ چاول ٹونگنے لگی۔ پہلے ہی نوالے کے ساتھ ارحم نے چونک کر ایک مرتبہ پھر مومنہ کا جائزہ لیا۔ مومنہ کی طرف قدرے جھک کر ارحم نے کہا۔ میٹھے قورمے اور نمکین ٹرائفل کو انجوائے کرنے کے بعد جب

پھینکی بدمز اچائے ملی تو وہ عیش عیش کر اٹھا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک مومنہ کی کوکنگ کی تعریفیں کیے جا رہا تھا۔ مومنہ جلتی بھنتی نماز پڑھنے کے لئے چلی گئی۔

وہ جو سوچ رہی تھی کہ ان نو دس مہینوں میں ارحم یقیناً کچھ بدل چکا ہوگا۔ یا پھر کم از کم اپنی گھٹیا حرکتوں پر شرمندہ ہوگا۔ مگر یہ صرف اس کی بھول تھی۔ چند دن تک گھر کی فضاء پر امن رہی تھی اور وہ ایک دفعہ پھر اپنی اوقات دکھا گیا تھا۔ اس دفعہ ماموں بھی خاموش رہے تھے۔

دوسری رات نبیلہ نے فرمان کے سامنے ایک مرتبہ پھر یہی ذکر چھیڑ دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک سوچتے رہے تھے پھر جب بولے تو ان کے لہجے میں واضح شکستگی تھی۔ جبکہ نبیلہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

”تم مومنہ سے پوچھ لو۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ وہ مانے گی۔“

”یہ آپ مجھ پر مجھ پر چھوڑ دیں۔“ نبیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اس رات انہیں بڑی پر سکون نیند آئی تھی۔

صبح ہوتے ہی انہوں نے موقع دیکھ کر مومنہ سے بات کرنے کی ٹھانی۔ وہ ان کی بات سن کر بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

”تم نے جواب نہیں دیا بیٹا!“ انہوں نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں ماجی۔ آپ میرے لئے بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں۔“

”ارحم بہت اچھا ہے بیٹا! ہم لوگ جیسا اسے سمجھتے ہیں۔ درحقیقت وہ ویسا نہیں ہے۔“ نبیلہ نے گہری سانس خارج کر کے کہا تھا۔ مومنہ بے چینی سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

”جس کا کوئی کردار نہ ہو۔ جسے رشتوں کا شرم لحاظ نہ ہو۔ جو انسانیت کے معیار سے گر کر بیچ قسم کی حرکتیں کرے۔ وہ واقعی بہت اچھا ہوتا ہے۔“ مومنہ نے تلخی سے سوچا۔

”اب تو وہ سرکاری نوکری کرنے لگا ہے۔ پہلے سے بہت حد تک بدل گیا ہے۔ کیا پتا تمہارے وسیلے سے اللہ اسے اور ہدایت دے دے۔“ مامی جی نرم



آواز میں کہہ رہی تھیں۔ ”ہاں بالکل! پہلے ڈکیتیاں کرتا تھا اب کرواتا ہوگا۔ پہلے رشوت دیتا تھا۔ اب لیتا ہوگا۔“ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

”بیٹا! کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو اور ہاں ایک بات دھیان میں ضرور رکھنا کہ ارحم تمہیں بہت چاہتا ہے۔“

”آگے کنواں اور پیچھے کھائی ہے۔“ وہ زیر لب بڑ بڑائی تھی۔ پھر چند پل سوچنے کے بعد بولی۔

”ٹھیک ہے ماما جی! مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔“

”میری پیاری بیٹی۔“ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے مومنہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ یہ خوشخبری ارحم تک بھی پہنچ چکی تھی اور دوسرے ہی پل وہ اس کے سامنے تھا۔

”مجھے یقین نہیں آرہا۔ مومی ڈارلنگ کہ تم مان گئی ہو۔“ وہ جگر جگر نظروں سے اس کے حسین چہرے کے اک اک نقش کو اپنی نگاہوں کے ذریعے دل میں اتار رہا تھا۔

”میں آج بہت خوش ہوں۔“ وہ واقعی ہی خوش بھی تھا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

مومنہ کی رضا مندی پا کر نبیلہ نے فوراً شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اب وہ وقت ضائع کیے بغیر جلد از جلد ان دونوں کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ شادی کے سلسلے میں ہونے والے تمام اخراجات ارحم نے خود اٹھائے تھے۔ بری، زیورات اور ہوٹلز کے بلز وغیرہ سمیت تمام چیزوں پر وہ دل کھول کر پیسہ خرچ کر رہا تھا۔

خاندان والوں کو بھی ایک مرتبہ پھر چٹ پٹا موضوع مل گیا تھا۔ کئی شرپسند خواتین تو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے اور لگائی بجھائی کرنے پہنچ بھی گئی تھیں۔

”اری نبیلہ! میں تو کہتی تھی کہ دال میں کچھ کالا تو ضرور ہے۔ ورنہ کیوں اتنی ہیرے جیسی لڑکی کا رشتہ کسی جگہ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔“

”جب لڑکا اتنا دیوانہ ہو رہا تھا تو تم لوگ ہی عقلمندی کا ثبوت دے دیتے۔ کیا ضرورت تھی جگہ جگہ لڑکی کی بات چلانے کی۔ خوا مخواہ ہر دفعہ رسوائی ہی اٹھائی ہے۔“ کوئی اور خاتون بھی چٹخارے لے کر کہتی تھیں۔ اس پل مومنہ کا دل ڈوب مرنے کو کرتا تھا۔

”ویسے سنا تھا کہ مومنہ نہیں مان رہی۔ کیا اب راضی ہے یا تم لوگ ہی زبردستی کر رہے ہو۔ ویسے اتنی دفعہ رشتہ چھوٹا، منگنی ٹوٹی اب تو تمام کس بل نکل چکے ہوں گے مومنہ کے۔ بھلا ارحم میں کیا کمی ہے۔“

عدیلہ خالہ بھی بڑھ چڑھ کر بولی تھیں۔ اس پل سامعہ بھابی، مامی جی کی مدد کو آپہنچی تھیں اور پھر ایسے ٹکا ٹکا کر جواب دیتی تھیں کہ سب کی ہی جی بھر کے تسلی و تشفی ہو جاتی۔ مگر مومنہ کے دل میں ان کے نوکیلے الفاظ تیر کی طرح پیوست ہو کر رہ جاتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ گھنٹوں کڑھتی رہتی۔ جی چاہتا تھا کہ خود کو ختم کر لے مگر مرنا بھی تو آسان نہیں تھا۔ ماموں

کے بوڑھے وجود کو دیکھ کر اس کے سارے ارادے ڈانواں ڈول ہو جاتے تھے۔

ماموں اور ارحم کی اب بھی کسی نہ کسی بات پر جھڑپ ہو جاتی تھی۔ ان کا دل اب بھی ارحم کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ اول روز سے جو گرہ لگی تھی ابھی تک نہ کھل سکی۔ کچھ وہ اپنی ”حرکتوں“ کی وجہ سے مزید مشکوک ہو گیا تھا۔ اوپر سے اس کے شاہانہ اخراجات اور ٹھاٹ باٹ انہیں کھٹکتے تھے۔ فرمان کو گویا یقین تھا کہ ارحم بھی اس محکمے کے دوسرے بدنام افسروں کی طرح اوپر کی آمدنی سے بینک بھر رہا ہے۔ اتنی قلیل مدت میں فرنشڈ گھر، ذاتی گاڑی ان کے شبہات پر مہر لگانے کے لئے کافی تھی۔

”اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟“ اس دن بھی وہ کافی دیر سے تھکا ہارا گھر آیا تو آتے ہی باپ کی اس تفتیش پر چڑا اٹھا۔

”ڈاکہ ڈال کے آیا ہوں۔ اسی لئے دیر ہو گئی ہے۔“

”تم سے ایسی ہی امید تھی۔ نیک کام کی توقع کی ہی نہیں جاسکتی تم سے۔“  
انہوں نے بھی طنزیہ کہا۔ وہ خاموشی سے ماں کو پیسے پکڑا کر اوپر جانے لگا  
تھا۔ جب باپ کے تلخ الفاظ نے اس کے قدموں کو زنجیر کر لیا۔

”پیسے کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ حرام، حلال کا فرق بھول جاتا  
ہے۔“

”پہلے آوارہ اور عیاش تھا اب راشی بھی ہو گیا ہوں۔ چلیں ایک خوبی اور  
سہی۔“ اس نے گویا خود کو داد دی تھی اور پھر استہزائیہ مسکراتے ہوئے  
سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد نبیلہ شوہر سے الجھ پڑی تھیں۔  
”کبھی تو بخش دیا کریں اسے۔ آپ کی انہی باتوں کی وجہ سے آج وہ اتنا بد  
لحاظ ہو گیا ہے۔ اگر۔۔“

”اچھا، اچھا اب تقریر جھاڑنے نہ بیٹھ جانا۔ ذرا کرن کا نمبر ملاؤ۔ میں اس سے  
بات تو کروں۔ کافی دن ہو گئے ہیں اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔“

”کرن نہیں آسکے گی۔ شادی پر۔ ڈاکٹر نے اسے سفر کرنے سے منع کر رکھا  
ہے۔ ورنہ وہ تو اڑ کر پہنچتی۔“ نبیلہ کے لبوں پر پر شفقت مسکان پھیل گئی  
تھی۔

...☆☆☆...

وہ اس وقت ارحم کے بیڈ روم میں بیٹھی بڑے عجیب قسم کے احساسات کا  
شکار تھی۔ اس مقام پر کیسی بے بسی نے آن لپیٹا تھا کہ وہ دل کے ہزار دفعہ  
انکار کرنے کے بوجہ آج اس کے لئے سچ سنور کر بیٹھی تھی۔ جس نے اس  
کی زندگی کا لمحہ لمحہ اجیرن کر رکھا تھا۔ پل پل کانٹوں پر گزرا تھا اس کا۔ حتیٰ  
کہ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ سانسیں بوجھ لگنے لگی تھیں۔ دل میں عجیب  
طرح کے وسوسے سر ابھار رہے تھے۔ وہ کون سا ایسا جذبہ تھا جس کے تحت  
آج وہ ارحم کی سچ سجائے بیٹھی تھی۔

مامی جی کی ممتا بھری مجبوری۔ ماموں جان کی بے بسی۔

رحیم بھائی کی التجا۔ لوگوں کے کاٹ دار لہجے، سوال کرتی نگاہیں یا پھر دل میں کنڈلی مارے بیٹھی نفرت۔

وہ جان نہیں پائی تھی کہ کون سا جذبہ طاقتور ہے۔ سوچوں میں الجھے اسے پتا نہیں چل سکا تھا کہ کب رحم کمرے میں داخل ہوا ہے۔ مومنہ نے چونکتے ہوئے سراٹھا کر دیکھا تو وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہونٹوں کی تراش میں مسکراہٹ دبی تھی جبکہ آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

”کیا بہت اچھا لگ رہا ہوں۔“ اسے ایک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ شرارت سے بولا تھا۔ مومنہ نے کچھ گڑ بڑا کر نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ رحم مسکراتے ہوئے اس کے عین سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“ اس نے مومنہ کے وجود سے پھوٹی روشنیوں کو دل میں اتارتے ہوئے مخمور لہجے میں کہا تھا۔

”لو مومنہ ڈارلنگ! آج تمہیں فتح کر ہی لیا ہے۔“ رحم نے کمال بے تکلفی سے اس کی حنائی نرم و گداز ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے کر ہولے سے دبایا۔

”فتح دلوں کی ہوتی ہے۔ جسموں کی نہیں۔ تم جیسے نفس کے غلام کیا جانیں۔“ مومنہ نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑواتے ہوئے ترشی سے کہا۔

”چلو تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ جب تم دسترس میں آچکی ہو تو دل تک رسائی کون سا مشکل کام ہے۔“ رحم نے نرمی سے اس کے گلابی ملائم گال کو چھوا۔

”خیر سے اپنی شکست پسند آئی یا نہیں۔“ اس نے چڑانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجالی تھی۔ مومنہ کے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی۔

”جیسے تم گھٹیا ہو، ویسی ہی گھٹیا تمہاری گفتگو ہے۔“ وہ سلگتے ہوئے سنبھل کر اس کے قریب سے اٹھی تھی اور پھر دوسرے ہی پل لہرا سی گئی۔ رحم نے اس کا ہاتھ پکڑا کر جھٹکا دیا تھا۔

”چھوڑو مجھے کمینے انسان۔“ وہ دبی آواز میں چلائی۔

”زبان کو ذرا کنٹرول میں رکھو اور زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہنا ہے تو پرانے نخرے بھول جاؤ۔“ دھیمی آواز میں فرماتے ہوئے اس نے مومنہ کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا تھا کہ تکلیف کے مارے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ پھر وہ اٹھا اور روم فریج سے پیپسی کاٹن نکال لایا۔ ایک ہاتھ میں ٹن پکڑے دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو دبوچے وہ آئینے کے سامنے اسے کھڑا کر کے بغور دیکھنے لگا تھا۔

وہ کچھ حیران اور خوف زدہ سی اس کے بدلے بدلے تاثرات کو دیکھنے لگی تھی۔ پھر ارحم نے دیکھتے ہی دیکھتے پیپسی سے بھرے ٹن کو پوری شدت کے ساتھ آئینے پر دے مارا تھا۔ چھوٹی بڑی ڈھیروں لکیریں آئینے کے درمیان پڑ کر اسے بدنما کر رہی تھیں۔ مومنہ نے وحشت بھری نظروں سے اس کی لال انگارہ آنکھوں کو دیکھا۔ پھر ارحم نے ان ٹوٹے کانچ کے ٹکڑوں کو اسے اٹھانے کے لئے کہا تھا۔ وہ سہمتے ہوئے اس سے کچھ دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”انہیں اٹھاؤ۔“ وہ زور سے دھاڑا۔

”مم... میں...“ مومنہ ہکلاتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں تم...“ اس نے تلخی سے کہا۔ مومنہ لہنگا سنبھال کر آہستگی سے کرسیاں اٹھانے لگی تھی۔ اک ننھا منھا کانچ کا ٹکڑا اس کی انگلی میں چبھا تھا اور اک نوکیلا کانچ دل میں۔ پتا نہیں تکلیف دل کو زیادہ ہوتی تھی یا پھر انگلی کو۔ اس کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ اسی پل ارحم نے پلٹ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا اور پھر یکے بعد دیگرے تین چار تھپڑ اس کے نرم رخساروں پر دے مارے وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

”یہ وہ تھپڑ ہے جو تم نے مجھے مارا تھا۔ شاید تم بھول چکی ہو مگر میں نہیں بھولا ہوں۔ اپنی بے عزتی کا وہ لمحہ یاد ہے مجھے۔ کیسے میری انا کو زخم زخم کیا تھا تم نے، مرد کا انتقام نہیں دیکھا ہے اور پھر میرے جیسے مرد کا۔“

وہ طیش کے عالم میں بولتا چلا گیا تھا اور مومنہ اس کے لبوں سے نکلنے والے شعلوں کی تپش سے سرتاپا جھلس رہی تھی۔ ارحم کچھ لمحے مزید لفظوں سے



چھلنی کرنے کے بعد واش روم میں گھس گیا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے شاور لیا تو اعصاب کچھ پر سکون ہو گئے تھے۔ وہ باہر نکلا تو مومنہ کو اسی کیفیت میں مجسمہ بنے گم سم کھڑے پایا۔

”محترمہ! کیا کھڑے کھڑے ہی رات بتانے کا ارادہ ہے۔“ وہ بال بناتے ہوئے نرمی سے بولا تھا۔ مومنہ نے بھیگی آنکھوں سے اس کے پل پل بدلتے موڈ کو ملاحظہ کیا۔

”اب جاؤ بھی، چینیج کر آؤ۔“ پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد وہ بیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ مومنہ مرے مرے قدم اٹھاتی ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ آدھے گھنٹے بعد جب خوب رو کر دل کی بھڑاس نکال کر وہ باہر آئی تو کمرے میں نیلگوں روشنی کا غبار پھیلا تھا۔ وہ سنبھل کر چلتے ہوئے بیڈ تک آئی اور پھر بیڈ کے کنارے پر ٹک کر اس نے کمبل اپنے ارد گرد پھیلا لیا تھا۔ ارحم چونکا، ٹھٹکا اور پھر اس کے لب مسکرا اٹھے تھے۔

”رونمائی کا تحفہ نہیں لینا۔“ مومنہ کے بازو پر ہاتھ رکھے وہ بڑی گہری جذبے لٹاتی نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

”جو مل چکا ہے وہ ہی کافی ہے۔“ اس نے ترشی سے کہا۔

”مگر میں اسے کافی نہیں سمجھتا۔ آفٹر آل تمہیں یہ بھی بتانا ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“ وہ دھیمے بوجھل لہجے میں کہتا اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے چکا تھا اور وہ چاہ کر بھی کوئی مزاحمت نہیں کر پائی تھی۔



شادی کے چوتھے روز ہی اس نے مومنہ کو پیکنگ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ مامی جی نے سنا تو ارحم کے خوب ہی لٹے لئے۔ وہ لاپرواہی سے سنتا رہا۔

”آخر ضرورت کیا ہے تمہیں علیحدہ رہنے کی۔ اتنا بڑا تو گھر ہے۔ اگر تم چاہو تو اوپر والے پورشن میں الگ ہو جاؤ۔ مگر یوں ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے دوسری جگہ رہنے کی کوئی تک بھی بنتی ہے؟“

”مامی جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ جب پوسٹنگ ہوگی تو پھر دیکھا جائے گا اب۔۔۔“  
مومنہ بھی ان کی سپورٹ پا کر آہستگی سے منمنائی تھی۔ ارحم نے مڑ کر اسے  
کٹیلی نگاہوں سے گھورا۔

”تم سے کس نے مشورہ مانگا ہے۔“

”آخر ’وجہ‘ کیا ہے؟“ نبیلہ انہیں آپس میں الجھتا دیکھ کر جھنجلا کر بولی تھیں۔  
مومنہ کے چیزیں سمیٹتے ہاتھ اک پل کور کے تھے۔ ”نہ جانے کیا ارشاد کرے  
گا۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔

”سب سے بڑی ’وجہ‘ آپ کے یہ بھانت بھانت کے رشتے دار ہیں۔ جو کہ  
منہ اٹھائے کبھی آرہے کبھی جارہے ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو انہوں نے ہی میری  
’بیوی‘ کو دیکھا ہوگا۔ جب دیکھو جونکوں کی طرح میری بیوی سے چمٹے رہتے  
ہیں۔ اب آپ انہیں یہاں سے چلتا بھی کریں۔ آخر حد ہوتی ہے کسی بات  
کی۔“ مامی جی نے یہ نامعقول ’وجہ‘ سن کر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

”تم اس لئے اپنا گھر چھوڑ رہے ہو۔“ نبیلہ نے تاسف سے کہا۔

”نہیں، میں کب گھر چھوڑ رہا ہوں۔ بس چند دن تک اپنی بیوی کے ساتھ پر  
سکون ماحول میں رہنا چاہتا ہوں۔“

”حد ہوتی ہے بے حیائی کی۔ یہ کیا بیوی، بیوی کی رٹ لگا رکھی ہے اور کیا  
ادھر سکون نہیں ہے۔“ نبیلہ تلملا اٹھیں۔

”آپ کیا روایتی ساسوں والی جیلیسی فیل کر رہی ہیں۔“ ارحم نے کچھ چونک  
کر ماں کی طرف دیکھا تھا۔

”لو اور سن لو۔۔۔“ نبیلہ نے مومنہ کی طرف رخ کیا۔ ”یہی بات سننے کی کسر  
رہ گئی تھی۔“

”دیکھ لیں امی میں اپنی ’بیوی‘ کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی ہونے نہیں  
دوں گا۔“

”پھر بیوی۔۔۔“ نبیلہ بھنا اٹھیں۔

”خود چاہے جتنی مرضی زیادتیاں کر لے۔ دوسروں کو نہیں کرنے دے گا۔“  
مومنہ منہ ہی منہ میں بددائی۔

”یہ تم کیا من من کر رہی ہو۔“ ارحم نے مومنہ کے ہلتے لبوں کو دیکھ کر کہا تھا اور پھر بالوں میں برش کر کے اسے تیار رہنے کا آرڈر دے کر گاڑی کی چابی اٹھائے باہر نکل گیا تھا۔ مومنہ اس کے نکلتے ہی نبیلہ کی طرف لپکی۔  
”مامی جی! مجھے ارحم کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔ پلیز اسے منع کریں۔“ دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ کر اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔ نبیلہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔ فرمان نے سنا تو فوراً ہی دو ٹوک انداز میں انکار کر دیا۔  
”تم صبح کے گئے رات دیر سے گھر آتے ہو اور کبھی کبھی تو رات بھر غائب رہتے ہو۔ یہ اکیلی کیسے رہے گی۔“

”اکیلی کہاں ہوگی۔ ملازمہ کا بندوبست کر دوں گا۔“ ارحم نے اپنے تئیں ایک اور معقول بہانہ تراشا تھا۔ فرمان خفگی سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔

”اپنا بھرا پراگھر چھوڑ کر یہ ملازمہ کے ساتھ رہے گی۔“ نبیلہ نے ناراضگی سے کہا تھا۔

”اف امی! ایک تو میں آپ لوگوں کی اس بے جا روک ٹوک سے بہت تنگ ہوں۔“ ارحم نے ناگواری سے سر جھٹکا۔ رحیم کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ جبکہ سامعہ بھابی مسکرا اٹھیں۔

”اصل میں دیور جی کو ہماری مداخلت ناگوار گزرتی ہے۔“ فرمان کے اٹھتے ہی سامعہ بھابی نے شرارت سے کہا تھا۔

”تو اور کیا۔“ ارحم نے بھرپور انداز میں تائید کی تھی جبکہ مومنہ کا سرمارے حیا کے جھک گیا تھا اور پلکیں بوجھل ہو گئیں۔

”نہ جانے کیا خناس بھرا رہتا ہے اس کے دماغ میں۔“ ان دونوں بھائیوں کے جانے کے بعد نبیلہ سر تھام کر بولی تھیں۔ سامعہ برتن سمیٹنے لگی تھیں جبکہ مومنہ لاؤنج میں آکر ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔ پھر سامعہ کی کزن آگئیں تو ان کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ لپچ آورز میں ارحم کو

گھر دیکھ کر سامعہ کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ بھی انہیں مسلسل کھانستا دیکھ کر حیران ہوا۔

”کیا بات ہے بھابی۔“

”کچھ نہیں بس تمہیں خلاف معمول گھر میں دیکھ کر بے حد حیرت ہو رہی ہے۔“ وہ شرارت آمیز لہجے میں بولیں۔ ارحم کندھے اچکاتا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ مومنہ بیڈ پر نیم دراز کوئی فیشن میگزین دیکھ رہی تھی۔ اسے بے وقت آتا دیکھ کر کم و بیش سامعہ بھابی جیسے ہی تاثرات مومنہ کے چہرے پر ابھرے تھے۔

”تم اس وقت۔“ ارحم کے ماتھے پر سلوٹوں کا جال نمودار ہو گیا تھا۔ چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے۔

بریف کیس صوفے پر پٹخ کر اس نے جوتوں کے تسمے کھولے۔

”یہ میرا گھر ہے۔ جب مرضی آؤں جاؤں۔ تم کون ہوتی ہو حساب رکھنے والی۔“ وہ تڑخ کر بولا تھا۔ مومنہ نے میگزین بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ اصل میں پہلے تم اس وقت کبھی بھی گھر نہیں آئے ہونا۔ اسی لئے۔“ وہ صفائی پیش کرتی جز بزی ہو گئی۔

”اچھا، اچھا۔ اب باتیں نہ بگھاؤ، کچھ کھانے کو ہے تو لا دو۔“ ارحم ہاتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے تحکم سے بولا تھا۔ مومنہ بڑ بڑاتی ہوئی نیچے چلی آئی۔

لنچ ٹائم میں وہ تینوں خواتین ہی ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے کبھی اپنے لئے اہتمام نہیں کیا تھا۔ ہلکے پھلکے سینڈویچز لئے جاتے۔ ماموں دوپہر کو کچھ نہیں کھاتے تھے سوائے پھلوں کے جو س کے۔ رحیم بھائی رات کو گھر آتے تھے اور ارحم کبھی ہوتا تھا کبھی نہیں۔ اسی لئے زیادہ تر اہتمام ڈنر پر ہی کیا جاتا۔

کچھ پریشانی کے عالم میں اس نے فریج میں جھانکا۔ آٹے کا باؤل نکال کر تین عدد پھلکے بنائے۔ کباب فرائی کیے۔ سلاد بنایا۔ رات کے چاول پڑے تھے انہیں

مانیکرو ویو میں گرم کیا۔ ٹرے میں سادہ سا لچ سجا کر جب وہ اوپر آئی تو ارحم لیٹا میگزین دیکھ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے ٹرے اس کے سامنے رکھی۔  
 ”یہ کباب ہیں۔“ اس نے ٹوٹے ہوئے ادھ جلے کباب کو اس کے سامنے لہرایا۔ مومنہ لب بھینچ کر رخ پھیر گئی تھی۔

”کتنی پھوہڑ عورت ہو تم، کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتیں اور یہ چاول کتنے بد ذائقہ اور پھیکے سے ہیں۔ کوکنگ کا کورس اچھا کیا ہے کہ کچھ بنانا نہیں آتا۔ کبھی بیٹھے کو فتنے کھلاتی ہو کبھی تیز نمک والا ٹرائفل۔ اٹھالو یہ سب۔“ وہ ٹرے پرے دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر پاؤں پٹختا باہر نکل گیا۔  
 ”اونہہ“ مومنہ نے نخوت سے سر جھٹکا۔

”میں کیوں پکا پکا کر تمہیں ٹھنساؤں۔“ وہ غصے سے بلند آواز میں بولی تھی اور پھر برتن اٹھا کر باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

اس دن موسم بہت خوش گوار تھا۔ آسمان سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ارحم نے اسے آفس سے فون کیا تھا کہ وہ تیار ہو جائے کسی دوست کی طرف جانا تھا۔ مومنہ نے سن کر بے دلی سے ریسپور کریڈل پر ڈال دیا۔ اس کا ارحم کے ساتھ جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے دوست کس قسم کے ہوں گے۔ یہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اوباش، آوارہ۔ ایسے لوگوں کو دعوت وہ کیوں قبول کرتی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ارحم سے کس قسم کا بہانہ کر کے جان چھڑوائے۔

کافی دیر سوچنے کے بعد اسے کوئی بھی معقول بہانہ نہیں سوچا تھا۔ پھر جب ارحم کے آنے کا وقت ہو گیا تو وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی تھی۔ اچانک ہی ایک خیال کوندے کی طرح لپکا تھا۔ وہ فوراً ہی

نچلے پورشن میں قدرے الگ تھلگ بنے اسٹور روم کی طرف بڑھ گئی۔

ان کا اسٹور کافی کشادہ اور ہوا دار تھا۔ مامی جی کی پرانی پیٹیاں اور سامعہ بھابی کے جہیز کا وہ سامان جو استعمال نہیں ہوتا تھا اسی اسٹور کی زینت بنا ہوا تھا۔ نانا



جان کا پلنگ بھی ایک دیوار کے ساتھ لگا کر رکھا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے لاک کھول کر اندر آگئی اور پھر اچھی طرح دروازہ بند کر کے پلنگ پر دھم سے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد وہ سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی اوّل تو کچھ سجھائی ہی نہیں دیا تھا اور نہ ہی وہ سمجھ پائی تھی کہ وہ ہے کہاں۔ جب ذہن قدرے بیدار ہوا تو وہ سرعت سے اٹھی۔ لانبے گھنے بالوں کو سمیٹا۔ دوپٹہ درست کر کے اس نے سیلپر پیروں میں اڑسے اور پھر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ رات کے گہرے سائے ہر سو پھیل چکے تھے۔ چاند افق پر چمک رہا تھا اور صحن کی تمام لائنیں بھی آن تھیں۔ اس نے لاؤنج میں آکر گھڑی پر نگاہ دوڑائی تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اسی پل سامعہ بھابی کچن سے باہر نکلی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کی چیخ نکل گئی۔

”کہاں تھیں تم مومی۔“

”میں اسٹور میں سو رہی تھی۔ کیوں خیر تو ہے۔“ اس نے لمبی سی جمائی روک کر کہا تھا۔ سامعہ بھابی نے اک زور دار دھپ اس کی کمر پر لگائی۔

”بے وقوف لڑکی! کہاں کہاں نہیں تلاشا ہم نے تمہیں۔ گھر کا چپا چپا چھان مارا۔ ویسے میرا خیال تھا کہ ضرور اسٹور میں گھسی ہوگی۔ جب بھی تمہاری کسی کے ساتھ ناراضگی ہوتی تھی تو تم اسٹور میں چھپ جاتی تھیں۔ امی بھی کہہ رہی تھیں کہ سامی اسٹور میں دیکھو مگر میں نے سوچا کہ تم اب بڑی ہو گئی ہو اور شادی شدہ بھی۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا ہے۔ ذرا فون کر کے ارحم کو بتا دوں۔ کیسا طوفان اٹھا رکھا تھا ابھی اس نے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی گھر آیا تھا۔ اب دشمن کی طرف تمہیں لینے کے لئے گیا ہے۔“ سامعہ بھابی شگفتگی سے کہتی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئیں۔ مامی جی بھی نماز پڑھ کر باہر آگئی تھیں اور پھر اسے دیکھ کر خوب ہی ڈانٹا، لتاڑا۔

”دشمن کی طرف جانا تھا تو بتا تو دیا ہوتا۔“

”میں شمن کی طرف کب گئی تھی۔ میں تو اسٹور میں سو رہی تھی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے نبیلہ کی گردن میں بائیں جھانک کر دیں۔ اسی پل ارحم تنٹناتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ اس پر نگاہ پڑی تو غصے سے چیخ گیا۔

”شرم نہیں آتی ایسی گھٹیا حرکت کر کے۔“ وہ مومنہ کے قریب آکر دھاڑا تھا۔ وہ نبیلہ کے مزید قریب ہو گئی۔

”اے ہے۔ کیا کیا ہے اس نے۔ اسٹور میں سو رہی تھی۔“ نبیلہ نے فوراً ہی حمایت کی۔

”اس سے پوچھیے، ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کرنے پر کیا سزا دوں اسے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ عمیر کے گھر جانا ہے مگر یہ محترمہ اسٹور میں قیلولہ فرما رہی تھیں۔“ وہ آگ بگولا ہو کر چلایا تھا۔ نبیلہ نے خفگی سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”یہ سزائیں تم دینا اپنے مجرموں کو تھانے میں۔ خبردار ایسی بات کبھی زبان سے نکالی اور رہی بات دعوت کی تو بھول گئی تھی بے چاری۔“ نبیلہ نے

سرے سے بات ہی ختم کر دی تھی۔ وہ غصے سے دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ مومنہ بھی بھرپور مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا شاید واش روم میں تھا۔ مومنہ بیڈ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ پہلی مرتبہ ارحم کو خوب ستا کر اسے بہت لطف آیا تھا۔

”اصل میں میں بھول گئی تھی کہ تم نے مجھے کہیں جانے کے لئے کہا تھا۔“ مومنہ نے جان بوجھ کر لہجے میں شرمندگی بھری۔ ارحم نے مڑ کر اس پر اک سلگتی تیکھی نگاہ ڈالی۔

”زیادہ ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جانتا ہوں میں کہ تم میرے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھیں۔ اگر صاف لفظوں میں مجھے اس وقت بتا دیتیں تم، تو میں عمیر سے معذرت کر لیتا مگر خیر کوئی بات نہیں۔“ وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتا بیڈ کی دوسری طرف آکر لیٹ گیا۔ مومنہ قدرے گڑ بڑاسی گئی تھی۔ ارحم نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔ شاید وہ بہت تھکا ہوا تھا اسی لئے جلد

ہی سو گیا۔ جبکہ مومنہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ اب نیند کا آنا ممکن نہیں تھا۔ اسی لئے کرن کے کمرے سے کوئی بک نکال کر لے آئی۔ کتاب کافی دلچسپ تھی۔ لہذا وہ پڑھتی ہی چلی گئی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب اس نے کتاب بند کر کے سائید ٹیبل پر رکھ دی۔ اسی پل ارحم کے موبائل کی بیپ بج اٹھی۔ اس نے سنی ان سنی کر کے کمبل سر تک تان لیا۔ تیسری بیل پر ارحم نے فون ریسیو کر لیا تھا اور پھر تیزی سے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ مومنہ کو کافی حیرت ہوئی۔

”کس کا فون ہو سکتا ہے۔“ اک فطری سا تجسس سر ابھار رہا تھا۔ ارحم نے واپس آکر موبائل ٹیبل پر رکھا اور پھر دوبارہ اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ اس دوران اس نے کمبل پرے ہٹا کر مومنہ کے سو جانے کی تصدیق بھی کی تھی۔ وہ جان بوجھ کر سوتی بن گئی۔ ارحم ایک دفعہ پھر سو چکا تھا جبکہ مومنہ پوری رات جاگتی رہی۔ بہت کان لگا کر سننے پر بھی وہ ارحم کی بات سمجھ نہیں پائی تھی۔ ارحم بہت آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا۔

اگلی رات بھی بالکل اچانک ہی اس آنکھ کھل گئی تھی۔ ارحم فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ آج وہ واش روم میں جانے کے بجائے بیڈ روم میں ہی تھا اور اس آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ مومنہ بآسانی سن سکتی تھی۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کیس فائل اوپر تک پہنچا دی ہے۔ اب میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ عدالت جانے یا پھر وکیل۔ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر پاؤں گا۔“ وہ ایک دم ہی بھڑک کر تلخی سے بولا تھا پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے دوسری طرف موجود شخص کی بات سنی اور پھر بولا۔

”کمال کرتے ہو یا! سمجھا کرو، میں کیوں تم سے جھوٹ بولوں گا۔ ویسے بھی چھپلی مرتبہ میں نے تمہیں وارننگ دی تھی۔ صرف دوستی کا لحاظ کر کے تمہیں چھوڑا تھا۔ تمہیں ایک اور موقع دیا تھا تاکہ تم سنبھل سکو۔ مگر تم جیسے سنبھلنے والے نہیں ہوتے۔“ اب کے اس کا لہجہ سخت کڑوا تھا۔ مومنہ سانس روکے سنتی رہی۔

”یہ ڈرگھس کا معاملہ ہے۔ چھوٹی موٹی واردات مت سمجھو اور پھر پاؤڈر کی شکل میں موت بیچنے والوں کو سزا دلانا تو عین ثواب کا کام ہے۔“

”ہا۔۔۔ ہا ہا تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ بڑی نیک روح آن سائی ہے میرے اندر ڈیرِ دانش! اب میں انیس بیس سال کا کم عمر لڑکا نہیں ہوں جسے تم بہلا پھسلا کر نشے کا عادی بنا دینا چاہتے تھے۔ یہ تو میرے بھائی کی مہربانی تھی جو وہ مجھے تمہارے چنگل سے زبردستی چھڑوا لائے تھے۔“

”یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔ میں تم جیسوں سے نبٹنا خوب جانتا ہوں اور ہاں آئندہ یہاں فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گندے گدھے۔“ ارحم نے موبائل آف کر کے موٹی سی گالی دی تھی اسے۔ مومنہ نے خاموشی سے کروٹ بدل لی۔ اس کا دل ابھی تک لرز رہا تھا جبکہ سوچیں منتشر تھیں۔ رات بھر وہ اسی کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

صبح ارحم کافی دیر سے اٹھا تھا اور اٹھتے ہی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ مومنہ خود بھی یہی چاہتی تھی اسی لئے بغیر جھگڑا کیے مان گئی۔ ماموں اور مامی

جی نے ڈھیروں نصیحتوں اور دعاؤں کے سائے تلے اسے ارحم کے ہمراہ بھیجا تھا۔

اس کا گھر قدرے سنسان علاقے میں تھا۔ کافی کشادہ اور خوبصورت بنگلہ تھا۔ مومنہ کو یہاں چھوڑ کر وہ خود دفتر چلا گیا تھا۔ مومنہ حیران تھی کہ وہ اب نہایت ذمہ داری کے ساتھ آفس جاتا تھا۔ اس نے کبھی غیر ضروری چھٹی بھی نہیں کی تھی۔

گھر میں ایک عدد ملازمہ کے علاوہ اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ملازمہ کافی باتونی تھی۔ اسی کے بتانے پر مومنہ کو پتا چلا تھا کہ ارحم نے یہ گھر کافی پہلے کا خریدا ہوا ہے۔ ارحم جب بھی گھر سے غائب ہوتا تھا اسی بنگلے میں قیام کرتا۔

”صاحب کے دوست یار ادھر اکٹھے ہو کر بہت ہلہ گلہ کرتے تھے۔ میں اور میرا ابا کافی عرصہ سے ادھر ملازم ہیں۔“ مومنہ کو بھلا اس کے قصوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ بے دلی سے سنتی رہی۔

شام کو ارحم کافی جلدی آگیا تھا۔ کھانا انہوں نے ساتھ ہی کھایا۔ کھانا کھا کر ارحم تو اسٹڈی روم میں چلا گیا تھا جبکہ مومنہ اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ اس فون کال نے مومنہ سے اتنا بڑا فیصلہ کروایا تھا۔ دراصل وہ ارحم کی پرت در پرت چھپی شخصیت کے راز جاننے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ارحم کہاں تک اس دلدل میں دھنسا ہے۔ ایسی ہی خفیہ کالز بہت پہلے فرمان ہاؤس میں خصوصاً ارحم کے لئے آتی تھیں مگر اس وقت مومنہ نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔

یہ دانش نامی شخص وہ ہی تھا جس کے گروپ میں کبھی ارحم شامل رہا تھا۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ کسی بھی گینگ کے لوگ فون پر ہمیشہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظروں میں دھول جھونک سکیں۔ ان کی تمام میٹنگز خفیہ ہوتی ہیں۔ وہ جتنا سوچتی ذہن اتنا ہی الجھتا۔ وہ ارحم کے موجودہ رویے پر نظر کرتی تو اسے پہلے کے مقابلے میں ارحم کافی بدلہ بدلہ سا محسوس ہوتا تھا۔

اگرچہ وہ اس کے دھوپ چھاؤں والے رویے کی ابھی عادی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ کبھی وہ بادلوں کی طرح گرجنے لگتا تھا اور کبھی ساون کی بارشوں کی طرح برستا۔ کبھی بہت ہی اچھا خیال رکھنے والا بن جاتا اور کبھی بے حد بے حس اور کٹھور۔

رات کے ڈیڑھ بجے جب ارحم آیا تو اسے جاگتا پا کر کافی حیران ہوا تھا۔ ”تم ابھی تک سوئی نہیں ہو۔ کیا میرا انتظار کر رہی تھیں۔“ ارحم کی گبھیر آواز سن کر وہ چونک اٹھی۔

”انتظار اور وہ بھی تمہارا۔“ مومنہ استہزائیہ انداز میں ہنسی تھی۔ ارحم کی نگاہوں میں ناگواری در آئی تھی۔ لبوں کی مسکان غائب ہو گئی۔

”کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کیا کرو۔“

”مجھے تو اسی طرح بات کرنا آتی ہے۔ جو شیریں گفتگو کرتی ہیں تم انہیں لے آؤ۔“



”ہوں یہ ٹھیک ہے۔ ویسے تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“ وہ مسکرایا۔

”میں تو جان چھوٹنے پر شکر ادا کروں گی۔“ وہ تلخی سے بولی تھی۔

”اتنی بے زار ہو مجھ سے۔“ مومنہ کے قریب سہولت سے بیٹھتے ہوئے اس کے دراز بالوں کی لٹ کھینچتے ہوئے وہ دلکشی سے بولا تھا۔ مومنہ نے ناگواری سے اس کے ہاتھ کو جھٹکا۔ ارحم نے نہایت اطمینان سے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہ شدید کوفت زدہ ہوگی۔

”بتاؤ نا۔ بہت برا لگتا ہوں میں تمہیں۔ اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے۔ ویسے میں نے بھی تو تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ پہلے زبردستی شادی کی اور اب زبردستی محبت کرواؤں گا۔“ اس کی گرم سانسوں کی حدت سے مومنہ کے رخسار تپ اٹھے تھے۔ وہ جھنجلا کر اس سے دور ہٹی۔ ارحم کی قربت ہمیشہ اسے وحشت زدہ کر دیتی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو۔“ مومنہ کو اٹھتا دیکھ کر اس کا نرم لہجہ کر خنگی میں بدل گیا تھا۔ ارحم نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے اپنے پاس گرا لیا۔

”جہنم میں...“ وہ چیخی۔

”مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ تمہارے بغیر تو جنت میں بھی کیا خاک مزا آئے گا۔“ ارحم اپنے مخصوص مغرورانہ لب و لہجے میں بولتا اسے انتہائی زہر لگا تھا۔

”جس کا تم جیسا شوہر ہو اسے تو جہنم بھی قبول نہیں کرے گی۔“

”مجھ جیسے تمہاری کیا مراد ہے؟ یعنی کہ خوبصورت، اسمارٹ ذہین وغیرہ وغیرہ۔“ وہ ایک مرتبہ پھر اس دسترس میں تھی اور وہ اس پر اپنے پیار کی شدتیں لٹا رہا تھا۔

”انسانیت کا قاتل، ملک کا دشمن، معاشرے کا ناسور۔“ مومنہ نے غصے سے کہا۔

”زبردست“ وہ اسے داد دیے جا رہا تھا۔ سراہ رہا تھا۔ اس کی خوبصورتی کی تعریف کر رہا تھا۔ مومنہ بے بسی کے احساس سے اس کے سینے میں منہ چھپا کر بے تحاشا رو دی تھی۔

مومنہ کی آج سالگرہ تھی اور یہ دن وہ کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ دفتری تمام کام اگلے دن پر ڈال کر وہ جلدی آفس سے اٹھ گیا تھا۔

ایک فلاور شاپ سے خوبصورت گلابوں کا بوکے بنوا کر وہ جیولری کی شاپ پر آگیا مگر کافی دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد اس کی نگاہوں میں کوئی چیز بیچ نہیں رہی تھیں۔ اسی اثناء میں اس کی نگاہ رمشا پر پڑی تھی۔ رمشا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر رکی تھی۔ ارحم ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر رمشا تک پہنچ گیا تھا۔

”کہاں غائب ہو گئی تھیں تم۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔“

”دبئی چلی گئی تھی میں... تم سناؤ کیسے ہو؟“ رمشا نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا تھا۔ جبکہ ارحم کے چہرے پر اضطراب کے سائے پھیل گئے۔

”دوبئی کیوں... اور پھر وہ کہاں ہے؟“

”دانش نے بھیج دیا تھا۔“ رمشا اسی بے نیازی سے بولی۔

”مگر یوں...“

”اتنے سالوں بعد دوبارہ ملے ہیں۔ آؤ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ رمشا کے کہنے پر وہ دل میں بڑھتی بے قراری و بے چینی پر قابو پائے پڑا ہٹ چلا آیا تھا۔

”کیا کر رہے ہو آج کل، ویسے تم اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ بہت بدل گئے ہو۔“ رمشا نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ دبئی کیوں چلی گئی تھیں۔“

”ہم جیسے دوسروں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ ہماری اپنی مرضی کہاں ہوتی ہے۔ میں اپنی ماں کے اشارے پر چلتی ہوں اور میری ماں دانش کے۔“ رمشا کی بے نیازی کا خول چٹخ گیا تھا۔ ہونٹ چباتے ہوئے اس نے افیت سے کہا۔

”میں... خود تمہاری تلاش میں تھی ارحم! میں نے تمہیں کچھ باتیں بتانا ہیں۔ بہت بوجھ ہے میرے دل پر، ضمیر پر۔“ ویٹر کو مطلوبہ اشیاء کا آرڈر دے کر

ارحم ایک مرتبہ پھر رمشا کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جو کہ انتہائی دلگیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”تم سے بچھڑنا کوئی آسان تھوڑی تھا مگر میں بھی کیا کرتی۔ مجبوریوں نے قدموں کو زنجیر کر رکھا تھا مگر ایک بات، جسے تم بھی سننے کو بے تاب ہو رہے ہو۔“ وہ چند پل کے لئے رکی اور آنکھ ٹوٹے موتی کو انگلی کی پور سے چن کر بولی۔ ”میں نے تمہاری امانت میں بالکل بھی خیانت نہیں کی۔ وہ میرے پاس محفوظ ہے مگر اب میں اس کی حفاظت زیادہ دیر نہیں کر سکوں گی۔“ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

مومنہ کی آنکھ صبح کافی دیر سے کھلی تھی۔ ارحم آفس جا چکا تھا۔ فریش ہونے کے بعد جب وہ باہر آئی تو ملازمہ نے اسے کسی کی آمد کے متعلق بتایا تھا۔ مومنہ دوپٹہ درست کرتی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ سامنے صوفے پر ایک

سوٹڈ بوٹڈ شخص بیٹھا تھا۔ مومنہ کو آتا دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

”فرمائیے کس سے ملنا ہے؟“ مومنہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ملنا تو ارحم سے تھا۔ بہت ضروری کام ہے اس سے۔ مگر پہلے آپ اپنا تعارف تو کروادیں۔“ اس کے چہرے پر پھیلا وقار، آنکھوں میں ٹھہری سنجیدگی اور مضبوط لب و لہجے کی وجہ سے مقابل قدرے متاثر ہوا تھا اسی لئے لہجے میں شائستگی بھر کر بولا۔

”میں ارحم کی بیوی ہوں۔“ مومنہ نے بمشکل اپنا تعارف کروایا تھا۔ اب کے وہ شخص چونک سا گیا۔

”اوہو تو ارحم شادی کر چکا ہے اور مجھے بتایا ہی نہیں۔ ایسی بھی کیا پردہ داری۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”ارحم اس وقت دفتر میں ہوتا ہے۔ وہیں ملاقات کریں۔“ مومنہ جتاتے ہوئے بولی تھی اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”سنیے ذرا‘ جب ارحم آئے تو اسے بتا دیجیے گا کہ پرانے یار آئے تھے۔ مجھے دانش غیور کہتے ہیں اور ہاں اس سے کہیے گا کہ اپنے آدمیوں کے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کرتے اس کی جو ڈیمانڈ ہوگی وہ میں پوری کروں گا۔“ مومنہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ٹیبل پر رکھی چابیاں اٹھا کر باہر نکلتا چلا گیا۔

”او... تو یہ ہے دانش غیور۔“ مومنہ کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔ وہ صوفے پر سر تھام کر بیٹھ گئی تھی۔ اسی پل ملازمہ چلی آئی۔

”بیگم صاحبہ! ناشتہ لگا دوں۔“

”رہنے دو۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”بات سنو رانی!“ اس نے باہر نکلتی رانی کو آواز دے کر روکا۔

”تم اس شخص کو جانتی ہو، میرا مطلب ہے کہ یہ پہلے بھی یہاں آتا ہے۔“

اس نے کچھ سوچتے ہوئے رانی سے استفسار کیا۔ لیکن جس طرح رانی کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور جس طرح وہ گڑ بڑا سی گئی تھی۔ مومنہ کا شک یقین میں بدل گیا۔

”میں نے کیا پوچھا ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔

”وہ جی، اصل میں...“ مومنہ کے دھمکانے پر وہ لرزیدہ آواز میں بتانے لگی تھی۔ مومنہ پر سوچ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر رانی کو جانے کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

شام کو مامی جی کا فون آگیا تھا۔ وہ اسے گھر آنے کا کہہ رہی تھیں۔ اس نے کل تک آنے کی ہامی بھر کر فون رکھ دیا۔ اسی پل ارحم کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اس کے مقابل تھا اور غصیلے تیوروں کے ساتھ اسے گھورے جا رہا تھا جبکہ مومنہ بھی بھری بیٹھی تھی۔ اس کے استفسار پر وہ بھی پھٹ پڑی۔

”مامی جی کہتی تھیں کہ تم برے نہیں ہو بس نظر آتے ہو۔ انہیں کیا پتا کہ تم کہاں تک گندگی میں دھنسے ہو۔ اپنے پروفیشن کے ساتھ اس حد تک بے ایمانی، او میرے اللہ۔ ماموں جیسے محب الوطن کا بیٹا اس حد تک غدار۔“

”میں تم سے پوچھ رہا کہ تم دانش کے سامنے کیوں گئی تھیں اور یہ رانی کہاں مر گئی تھی۔“ وہ مومنہ کی کسی بھی بات پر دھیان دیے بغیر اپنی بات بار بار دہرا رہا تھا۔

”اس کے سامنے نہ جاتی تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم کون سے کرتوت مجھ سے چھپا رہے ہو۔ کتنے گرے ہوئے شخص ہو تم ارحم! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم دوست کی خاطر اس قدر اندھے ہو جاؤ گے۔ بتاؤ ذرا اتنی دولت جمع کر کے تم نے کیا کرنا ہے۔ اس پیسے کا کیا فائدہ جو دوزخ کا ایندھن بنے گا۔ یہ حرام تمہاری رگوں میں رچ بس گیا ہے۔“

”بس بہت ہو چکا“ بند کرو اپنی بکواس۔“ اس نے غضبناک ہو کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا۔

”میرے معاملات میں تمہیں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

خبردار جو آئندہ کبھی تم نے کسی بھی ایسے شخص سے ملنے کی جرأت کی۔“

اس نے دھاڑتے ہوئے کہا تھا۔ مومنہ روتے ہوئے تیزی سے الماری کی

طرف بڑھی۔ چادر اور پرس نکال کر اس نے ارحم کی طرف نفرت سے دیکھا۔

”صرف اور صرف یہی جاننے کے لئے تو میں تمہارے ساتھ یہاں آئی تھی کہ تم کتنے نیک اور پارسا ہو۔“

”کہاں جا رہی ہو۔“ ارحم نے غرا کر کہا۔

”اپنے گھر جا رہی ہوں۔“ وہ بھی بلند آواز میں چلائی تھی۔ ارحم نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور پھر واش روم کی طرف جاتے جاتے رکا۔

”اگر تم یہاں سے نکلیں تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔“ مومنہ نے بھیگی

پلکوں کو پونچھ کر پرس اٹھایا اور اندرونی دروازہ عبور کر کے پورچ میں

آگئی۔ ڈرائیور کے ہمراہ جب وہ فرمان ہاؤس پہنچی تو رات کے نو بج رہے

تھے۔ مامی جی اسے یوں ٹوٹی بکھری حالت میں دیکھ کر دہل گئیں۔ مامی جی کے

قریب پہنچنے تک وہ لہرا کر زمین پر گرتی چلی گئی تھی۔



”آپ دادی بننے والی ہیں۔“ ڈاکٹر ملیحہ نے نبیلہ کے قریب جھک کر خوشخبری سنائی تھی۔ وہ جو بے دم سی صوفے پر بیٹھی ارحم کو کو سے جارہی تھیں ایک دم ہی چونک گئیں اور پھر ان کے لب پر بڑی جاندار قسم کی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ ماموں جی کو پتا چلا تو وہ بھی خوشی سے کھل اٹھے۔ اسی شام کینیڈا سے فون آیا کہ کرن کا بیٹا ہوا ہے۔ ایک ساتھ دو خوشخبریاں سن کر گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

سب بے حد خوش تھے بس ایک وہ ہی غمزدہ تھی۔ وہ کیسے ماموں جی کو بتاتی کہ ان کا بیٹا ملک دشمنوں کا ساتھی ہے۔ اتنی بڑی پوسٹ پر بیٹھا کتنی آسانی کے ساتھ ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کی رگوں میں نشے کا زہر بھر کر انہیں کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے والوں میں شامل ہے۔ اس بوجھ کو اٹھائے وہ کتنی بے حال تھی۔ وہ کس کے ساتھ اس غم کو شیر کرتی۔ کسے اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر دیتی۔

ماموں اور مامی جی تو ایسی کسی خبر کو سنتے... ہی صدمے سے شاید مر جاتے۔ اس ٹینشن کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی تھی اور پھر جو ”خوشخبری“ ڈاکٹر ملیحہ نے اسے سنائی تھی۔ اسے سن کر رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔

اسے ادھر آئے ہوئے تقریباً پچیس دن ہو گئے تھے مگر ارحم نے یہاں جھانکا تک نہیں تھا۔ مامی جی ممتا سے مجبور اسے فون کر لیتی تھیں۔

مومنہ اب ارحم کے ساتھ مزید کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے ارحم سے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں مومنہ نے سامعہ بھابی کو راز داں بنا لیا۔ دوسرے دن جب مامی جی آرام کرنے کی غرض سے بیڈ روم میں گئیں تو وہ موقع پا کر سامعہ بھابی کے کمرے میں آ گئی۔ اس کی تمام بات سن کر سامعہ حیران پریشان ہی تو رہ گئی تھیں۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے کیا فضول بکواس کر رہی ہو مومی!“

”یہ بکواس نہیں ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ آپ میرا ساتھ دیں گی یا نہیں۔“ وہ اٹل لہجے میں بولی تھی۔ سامعہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اپنے بچے کا قتل کرنا چاہتی ہو۔ تمہیں شرم نہیں آئی ایسی بات سوچتے ہوئے۔“

”اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ مجھے جلد از جلد ارحم سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے اور اس مصیبت کی وجہ سے میرے کیس میں رکاوٹ پڑ سکتی ہے۔“

”تم پاگل ہو چکی ہو۔“

”ہاں پاگل ہی سمجھ لیں۔ میں اس راشی کا بچہ پیدا کروں۔ کبھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ سامعہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں۔ مگر وہ گویا کان بند کر چکی تھی۔ پھر بہت سارے دن اسی خاموشی سے گزر گئے۔ مومنہ نے ایک ڈاکٹر سے بات کر لی تھی۔ آج اس نے چیک اپ کروانے کے لئے جانا تھا۔ اسی شام ہی ارحم چلا آیا۔

”کیسی ہو ڈارلنگ۔“ وہ مامی جی کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے چڑاتے ہوئے بولا تھا۔ مومنہ بہری بنی اور ٹی وی پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔

”امی! میں پایا بننے والا ہوں۔“ اب وہ اپنی ماں سے مخاطب تھا۔ نبیلہ نے اس کی پیشانی کو چوما۔

”جب خود باپ بنو گے پھر ماں باپ کی تکلیف کا احساس ہوگا تمہیں۔“ فرمان نے قریب سے گزرتے ہوئے چوٹ کی تھی وہ آنکھیں موندے مسکراتا رہا۔

”اب سدھر جاؤ بیٹے تم۔“ نبیلہ اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

”میں تو سدھرنے کے لئے تیار ہوں اگر کوئی سدھارنا چاہے تو...“ ارحم نے آنکھیں کھول کر مومنہ کی طرف دیکھا تھا جو بے نیاز سی ریموٹ کے بٹنوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

”تم نے کب تک یہاں ڈیرہ لگائے رکھنا ہے“ اسے باہر نکلتا دیکھ کر ارحم نے ہانک لگائی تھی۔ نبیلہ جھٹ سے بولیں۔

”اسے اب یہیں رہنے دو۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ وہاں کون خیال رکھے گا۔“ نبیلہ کے کہنے پر اس نے خاموشی سے سر ہلایا تھا۔ کھانا کھا کر جب

وہ اوپر آیا تو مومنہ کبیل تانے سو رہی تھی یا پھر سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ ارحم نے گنگناتے ہوئے اس کے اوپر سے کبیل کھینچا۔

”کیا تکلیف ہے۔“ وہ تڑخ کر بولی تھی۔

”یہ بتاؤ کہ اتنی بڑی خوشخبری تم نے مجھ سے کیوں چھپائی۔ اگر سامعہ بھابی نہ بتاتیں تو میں تو بے خبری میں ہی مارا جاتا۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیوں مومنہ۔“ وہ سامنے رکھے صوفے پر بیٹھتا سنجیدگی سے بولا تھا۔ مومنہ نے اپنی آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔

”بدگمانیوں کی اتنی بڑی فصلیں کھینچ رکھی ہیں تم نے۔ کبھی مجھے سمجھنے کی تم نے کوشش ہی نہیں کی۔ اپنی صفائی پیش کرنا مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ اب بھی اگر اسی اصول پر کار بند رہا تو تم تو پوری ناؤ ڈبو دو گی میری۔

چلو تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔“ وہ گہرے لہجے میں بولتا کھو سا گیا تھا۔

”جب پھوپھو کی ڈیٹھ ہوئی تب میں بارہ سال کا تھا اور بارہ سال کا بچہ اچھا خاصا سمجھ دار ہوتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد تم ہمیشہ کے لئے ہمارے گھر

آگئی تھیں۔ ہمہ وقت روتی بسورتی گڑیا سی مومی مجھے کتنی اچھی لگتی تھی۔ مگر وہ گڑیا مجھے لفٹ نہیں کراتی تھی۔ مجھ سے دور دور بھاگتی۔ رحیم بھائی کو دیکھ کر جب مومی ان کی طرف لپکتی تھی تو مجھے غصہ آتا۔ رحیم بھائی کرن کو اور اسے بایک پر بٹھا کر باہر لے جاتے۔ واپسی پر ان کے ہاتھوں میں چاکلیٹس اور آئس کریم کے کپ ہوتے تھے۔ شاید کرن اور وہ دونوں ہی محلے کے دوسرے بچوں کی طرح مجھ سے ڈرتی تھیں۔ میری دہشت سے تو بچے بھی پارک میں کم کم آتے تھے۔ سکول میں بھی ہر کوئی مجھ سے دور دور بھاگتا۔ میرے اندر شاید غصہ بہت تھا۔ خلاف مزاج بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ کچھ امی اور بابا کے رویوں نے مجھے اذیت پسند بنا دیا تھا۔

پہلا بچہ اور آخری بچہ ماں باپ کا منظور نظر ہوتا ہے اور جو درمیان میں ہوتا ہے وہ ہمیشہ ہی نظر انداز کیا جاتا ہے۔ میں فطرتاً مختلف تھا اور شاید حساس بھی، رحیم بھائی کی موجودگی میں میری شخصیت دب گئی تھی۔ میں نے دوسروں کی نظروں میں آنے کے لئے عجیب و غریب حرکتیں کرنا شروع

کر دیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ میری شخصیت مزید مسخ ہوتی جا رہی ہے۔ کالج میں پہنچ کر مجھے اپنے جیسے ہی دوست بھی مل گئے۔ ان کی کمپنی میں میری انا کی تسکین کے لئے بہت سی چیزیں تھیں۔ وہ مجھے سراہتے تھے۔ میری کسی بھی بات پر انہیں غصہ نہیں آتا تھا۔ میں انہیں گالیاں بھی دیتا تو وہ ہنستے رہتے وہ دراصل بے حس تھے اور مجھے بھی بے حس بنا دینا چاہتے تھے۔

وہیں پر میری ملاقات دانش سے ہوئی تھی۔ وہ بڑی عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ میری طرح وہ بھی کالج میں پڑھنے نہیں انجوائے کرنے آتا تھا یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ دانش نشہ بیچتا ہے۔ کم عمر لڑکوں کو اس غلاظت کا عادی بناتا ہے۔ میری اور اس کی دوستی دونوں میں پروان چڑھی تھی۔

اس کے ساتھ مل کر چھوٹی موٹی وارداتیں کرنا، گاڑیاں لوٹنا یا پھر کسی نہ کسی لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرنا۔ میرے لئے یہ سب تھرل تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہ ایڈونچرز میرے لئے کتنے خطرناک ثابت ہوں گے۔ دانش کی بہت سی

لڑکیوں کے ساتھ دوستی تھی یہ دوستی تمام اخلاقی حدود پار کر چکی تھی۔ اس نے میری بھی چند ایک لڑکیوں سے دوستی کروادی۔ ان میں رمشا تھی۔ شروع شروع میں وہ مجھے اچھی بھی لگتی تھی۔ ہماری دوستی بہت گہری ہو چکی تھی۔ جس میں بڑا ہاتھ دانش کا تھا۔

پھر ایک دن پولیس کا چھاپہ پڑا تھا۔ میں اور سہیل دانش کا وفادار ملازم پکڑے گئے جبکہ دانش بھاگ گیا تھا۔ ایک رات حوالات میں رہ کر میں واپس آگیا تھا۔ اس رات میں نے دل میں عہد کیا تھا اور یہ عہد گھر جانے تک قائم رہا۔ بابا نے جب مجھے دھتکارا، مارا پیٹا اور گھر سے نکالا تو میں ایک دفعہ پھر دانش کے چنگل میں جا پھنسا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ رحیم بھائی مجھے لے آئے تھے مگر دانش کا ساتھ بہت مضبوط تھا۔ اسی لئے تو...“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ کیسے اپنی عزیز از جان بیوی کو اپنے تاریک ماضی کے انتہائی تکلیف دہ پہلو کے بارے میں بتاتا۔



مومنہ کو بے چینی نے گھیر لیا تھا۔ اسے لگا کہ ارحم اس سے کچھ چھپانا چاہتا ہے۔

”مختصر یہ کہ مجھے بہت دیر بعد دانش کے ارادوں کا پتا چلا تھا۔ وہ مجھے تھوڑی تھوڑی مقدار میں ڈرگھس دے کر اس حد تک مجھے عادی کر دینا چاہتا تھا کہ میں ایک پڑیا کی خاطر اس کے لئے جان تک دے دوں۔

اس دوران مجھے احساس ہوا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں نے خود کو بہت جھٹلایا، سمجھایا مگر دل نادان کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہ تھا۔

بابا کے کٹیلے رویے، طنزیہ باتیں اور تمہاری ڈھکی چھپی نفرت مجھے بہت تکلیف دیتی تھی۔ میں بابا کو کچھ بن کر دکھانا چاہتا تھا۔ مگر میرا ماضی ہر پل سامنے

آکھڑا ہوتا۔ اسی لئے میں مزید ضدی اور سرکش ہوتا چلا گیا۔ جس دن میں نے سی ایس ایس کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کیا تھا وہ دن بھی خوشیوں کا پیغامبر بن کر نہیں آیا۔ بابا کو طنز کرنے کا ایک اور موضوع مل گیا تھا۔ کبھی

کبھی جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور نکل جاؤں۔ مگر میرا مشن مجھے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے روکتا تھا۔ دانش کے ہاتھ مزید لمبے ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی جڑیں دور دور تک پھیلا لی تھیں اور مجھے ان جڑوں کو آہستہ آہستہ کاٹنا تھا۔ اللہ نے مجھے سرخرو کرنا تھا سی کل دانش کا قصہ تمام کرنے کے بعد آج خود کو کسی قابل سمجھ رہا ہوں۔

آج جب ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں تو اپنے جذباتی پن پر مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ بابا مجھ جیسے بگڑے سپوت سے تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتے تھے اور میں انہیں اس حد تک زچ کر دینا چاہتا تھا کہ وہ مجبور ہو کر تمہیں میرا بنا دیتے۔ اگرچہ میری محبت تو آخر کامیاب ہو گئی تھی مگر ان تمام گھٹیا حرکتوں کو سوچ کر مجھے بے حد پشیمانی ہوتی ہے۔

میری تمہارے ساتھ شادی کروانے میں زیادہ ہاتھ میری پیاری بہن کرن کا ہے۔ جب میں ایکسڈنٹ کی وجہ سے ہسپتال میں ہڈیاں تڑوائے پڑا تھا۔ میری بہن نے فوراً مجھے مطلع کیا کہ تم کسی اور کی ہونے جا رہی ہو۔ اگر میں کچھ



کر سکتا ہوں تو کر لوں۔ اس وقت مجھے کرن پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ میں جو سب کے ساتھ ساتھ کرن سے بھی متنفر تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ رحیم بھائی سے پیار کرتی ہے میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ رحیم بھائی امی، بابا سب مجھے چاہتے تھے بس ان کی محبتوں کے انداز مختلف تھے۔ بابا مجھ سے محبت کرتے تھے اسی لئے وہ مجھے بگڑنے سے بچانا چاہتے تھے مگر میں کم فہم سمجھ ہی نہ سکا۔“ مومنہ حیران سی اس کی تمام باتوں کو سن رہی تھی۔

”خیر چھوڑو اس بات کو... تم مجھے یہ بتاؤ کہ میرے بچے کو کیوں مارنا چاہتی ہو۔ اگر آج سامعہ بھابی فون کر کے مجھے تمہارے جذباتی فیصلے کے متعلق نہ بتاتیں تو میرے اور تمہارے درمیان شاید فاصلے بڑھ جاتے۔“ وہ خاموش ہوا تو مومنہ بے چین ہو کر بول اٹھی۔

”اگر تم پہلے دن ہی تمام حقیقت سے آگاہ کر دیتے تو ماموں، مامی اور ہم سب یوں پریشان تو نہ ہوتے۔“

”مجھ جیسے رشوت خور، جھوٹے شخص کی بات پر یقین کسے آتا۔“ مومنہ شرمندہ سی سر جھکا گئی تھی۔ ارحم نے اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے تھے۔ پورے چاند کی رات تھی۔ ستارے خوب دمک رہے تھے۔ ٹھنڈی پر نم ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔

”میرا ماضی میرے لئے باعث شرمندگی ہے۔ میں نے ناصر ف امی بابا بلکہ تمہیں بھی بہت تنگ کیا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔“ وہ دھیمے پر اثر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مومنہ نے آہستگی سے بیڈ کرواؤن سے ٹیک لگالی۔ دھند لکے ابھی چھٹے نہیں تھے۔ منظر صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر پھر بھی مومنہ کو بہت پر سکون نیند آئی تھی۔



کرن اپنے چھ ماہ کے گول مٹول، گول گوتھنے بیٹے عمار کے ساتھ پاکستان آئی تو گھر میں خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔

”تمہیں اور بھائی کو ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر میں کس قدر مسرور ہوں۔“  
ایئرپورٹ پر اس سے لپٹتے ہوئے کرن نے بڑے جوش سے کہا تھا۔ مومنہ بھی مسکرا دی۔

کرن کے آنے سے رونقیں دوبالا ہو گئی تھیں۔ گھر میں ہر وقت ہنگامہ سا رہتا تھا۔ یہی کرن اتنی کم گو ہوا کرتی تھی اور اب وہ باتوں میں کسی کو باری نہیں لینے دیتی تھی۔ مامی جی تو اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھیں۔  
”اے کرن! کینیڈا جا کر تو تیری زبان اتنی گز بھر کی ہو گئی ہے۔ نئی تو نہیں لگوالائی ہو۔“ وہ مشکوک نظروں سے اسے گھورتیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔

”سنو مومی! میرے بھتیجے کو بالکل میرا جیسا ہونا چاہیے۔ یہ تصویر میں اسی لئے تمہارے کمرے میں لگا رہی ہوں۔ تاکہ تم صبح و شام اس کا دیدار کرو۔“  
کرن نے اپنی فل سائز تصویر اس کے کمرے میں لگاتے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا۔ مومنہ ڈسٹنگ کرتے ہوئے مسکرا دی۔

”اللہ نہ کرے وہ تمہارے جیسا ہو۔ اتنا موٹا اور کالا سا۔“ اندر آتے ارحم نے کرن کو چڑاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ایک دم ہی بھڑک اٹھی۔  
”میں ایسی ہوں۔“

”نہیں بالکل بھی نہیں۔ میری بہن تو اتنی خوبصورت ہے۔ کچھ کچھ لمبے لمبے دانتوں والی، الجھے الجھے بالوں والی مخلوق سے ملتی جلتی۔“

”بھائی...“ کرن رو دینے والی ہو گئی تو ارحم نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ مومنہ ان کی باتوں کو انجوائے کر رہی تھی۔ تبھی مامی جی روتے چلاتے عمار کو اٹھائے چلی آئیں۔

”سنجھالو اپنے آفتی طوطے کو... ایسے حلق پھاڑ کر روتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔“  
اتھل پتھل سانسوں کو ہموار کرتی وہ عمار کو کرن کی گود میں دے کر صوفے پر ڈھے گئیں۔

”آپ کا پوتا تو جیسے روتا ہی نہیں۔“ کرن نے مصنوعی غصے سے کہا۔

”ہاں تو اور کیا میرا نومی تو بڑا پیبا بچہ ہے۔“ انہوں نے فوراً نومی کی حمایت کی تھی۔

ارحم ایک دفعہ پھر بن ٹھن کر ڈریسنگ روم سے نکلا تو نبیلہ بے حد حیران ہوئیں۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”ایک ضروری کام یاد آگیا ہے ابھی آتا ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ اس کے پیچھے کرن اور مامی جی بھی نکل گئی تھیں۔ مومنہ تھوڑی دیر آرام کرنے غرض سے لیٹی ہی تھی کہ فون کی بیل گنگنا اٹھی۔ اس نے کچھ کوفت کے عالم میں ریسیور اٹھایا۔

”ارحم سے بات کراؤ۔“ دوسری طرف کوئی خاتون تھیں۔

”وہ تو اس وقت گھر نہیں ہیں۔ آپ کچھ دیر بعد فون کر لیجیے گا۔“ مومنہ نے نرمی سے کہا تھا۔

”کہاں ہے وہ؟ جب بھی فون کرتی ہوں گھر میں نہیں ملتا یہ کہو کہ تم میری اس سے بات نہیں کروانا چاہتیں“ وہ جو کوئی بھی تھی انتہائی کر خنگی سے بولی تھی۔ مومنہ کا غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا تاہم اس نے لہجے کی نرمی کو برقرار رکھا۔

”آپ ان سے موبائل پر رابطہ کر لیں۔“ نمبر لکھوا کر مومنہ نے فون بند کر دیا تھا۔

”نہ جانے کون فضول عورت تھی۔“ اس نے تلخی سے سوچا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

اس کی آنکھ عجیب سے نامانوس شور کی آواز سے کھلی تھی۔ وہ سرعت سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو لاؤنج میں اک اجنبی مگر اسٹائلش سی لڑکی اور اس کے ساتھ کھڑی چار پانچ سالہ بچی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ لڑکی ماموں سے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ سرخ انگارہ آنکھیں لئے اس کی بات سن

رہے تھے جبکہ مامی جی بے دم سی صوفے پر بیٹھی تھیں۔ کرن نے ان کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جبکہ وہ نیچی۔

مومنہ نے دو قدم آگے بڑھ کر اس بچی کو بغور دیکھا تھا۔ اک لمحے کو اس کے دل کی دھڑکن بھی تھم سی گئی تھی۔

”یہ ارحم کی بیوی مومنہ ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ اس کے قریب چلی آئی تھیں۔ مومنہ نے سوالیہ نظروں سے مامی جی کی طرف دیکھا تو انہوں نے جانے کیوں نگاہیں چرائی تھیں۔

”اوکے ثمر جانو، اب میں چلتی ہوں تم اچھی بچی بن کر اپنی ماما اور دادو، دادا کے ساتھ رہنا ٹھیک ہے ناں۔“ بچی نے تابعداری سے سر ہلایا تھا۔ وہ نزاکت سے اس کے گال پر بوسہ دے کر ہوا کے جھونکے کی طرح نکلتی چلی گئی۔

”رحیم! فون کرو اس بے غیرت کو، کہاں ہے وہ۔ کیوں پل پل مار رہا ہے ہمیں۔“ وہ سینہ مسلتے ہوئے بے جان لہجے میں بولے تھے۔ مومنہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے ایک مرتبہ پھر بچی کی طرف دیکھا۔

ثمر کی آنکھیں، ہونٹ، رنگت ایک ایک نقش بول کر بتا رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ مومنہ کی ٹانگیں بوجھ سہارنے سے قاصر ہو گئی تھیں۔ وہ بے دم سی سیڑھی پر بیٹھی چلی گئی۔

پورے ایک گھنٹے بعد ارحم کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ وہ آندھی، طوفان کی طرح اندر آیا۔ اس کی بے قرار نگاہوں نے کونے میں کھڑی ثمر کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”کیا رمشا اسے چھوڑنے آئی تھی؟“ ارحم اسے چوم رہا تھا۔ پیار کر رہا تھا۔ مومنہ نے ایک اور تکلیف دہ منظر دیکھا۔ مومنہ کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ بھیگ رہا تھا۔

”میں نے کہاں کہاں نہیں تمہیں ڈھونڈا۔“ ثمر کا ماتھا چومتے ہوئے اسے اچانک ان سب کا خیال آیا تھا۔ اس نے کچھ پشیمان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ آخری سیڑھی پر سر جھکائے بیٹھی مومنہ کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”بتاؤ ارحم! تمہارے کس کس گناہ کی پردہ پوشی کریں۔ کیوں لمحہ لمحہ ہمیں ذلیل کر رہے ہو۔“ مومنہ نے ماموں جی کی بھیگی لرزیدہ آواز سنی۔ اس کا دل اتھاہ گھرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ ”میں کہہ رہی ہوں ارحم کہ اسے یہاں سے لے جاؤ ورنہ...“ مامی جی نے چیخ کر کہا تھا۔

”یہ میری بیٹی ہے اور یہ ادھر ہی رہے گی۔“ مومنہ نے ارحم کو کہتے سنا۔ اس کے دل میں گویا تیر پیوست ہو گیا تھا۔

”ناجائز بیٹی“ نبیلہ حقارت سے بولی تھیں۔

”نہیں امی! اللہ کے لئے میری بیٹی کو یہ گالی مت دیں۔ میں نے رمشا سے نکاح کیا تھا۔“ اس نے تڑپ کر کہا۔ ان سب کے سروں پر گویا آسمان آن گرا تھا۔

”میں کہتی ہوں ارحم کہ اسے لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ نہ جانے کہاں تربیت میں کمی رہ گئی تھی کہ

آج ہمارے بوڑھے سروں میں خاک ڈال دی ہے تم نے۔“ نبیلہ بے تحاشا روتے ہوئے اسے کوس رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ میری بیٹی کو قبول نہیں کرتے تو پھر میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولتا ہوا مومنہ کے قریب چلا آیا تھا۔

”آؤ مومنہ! چلیں اپنے گھر...“ وہ بڑی آس بھری نگاہوں میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مومنہ نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا۔

”یہ کہیں بھی نہیں جائے گی۔ سنا تم نے۔“ ماموں نے دھاڑ کر کہا۔

”اٹھو مومی“ ارحم گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کر التجائیہ لب و لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ فرعونیت و تکبر بھرا انداز مفقود تھا۔

”تمہیں دھکے دے کر نکالوں یہاں سے۔“ فرمان چلائے۔

”تو پھر تم نہیں چلو گی میرے ساتھ۔“



”کبھی نہیں“ اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔ وہ اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”تم رمشا سے شادی کرلو۔“ دانش تیسرا بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے راز داری سے بولا تھا۔

”ہوں، ہوں رمشا سے“ وہ سرخ آنکھوں کو دباتے ہوئے لڑکھڑاتی آواز میں کہہ کر صوفے پر ہی دراز ہو گیا تھا۔

”ہاں رمشا سے۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہے اور پھر اس وقت تمہیں ایک گھر کی ضرورت ہے۔ والدین تمہارے تو ہیں ہی بے حس۔ انہیں تمہاری خواہشات سے کیا غرض۔ مجھے ہی تمہارا خیال رکھنا پڑے گا اور اس سے بہتر ہے کہ تم شادی کرلو۔ ٹھیک ہے نا۔“ دانش ہونٹوں پر شیطانی مسکان سجا کر بولا۔

”ہاں ٹھیک ہے... رمشا... بہت اچھی ہے۔“ وہ بمشکل بول رہا تھا۔

”تو پھر صبح یہ نیک فریضہ سرانجام دیں گے۔“ دانش چہک اٹھا تھا پھر جب ارحم کی آنکھیں نیند سے بند ہو گئیں تو دانش نے مسکراتے ہوئے رمشا کا نمبر ملایا۔

”وہ تم سے شادی کے لئے تیار ہے۔“

”کیا... تم سچ کہہ رہے ہو۔“ رمشا بے یقینی سے چلائی۔

”ہاں بالکل سچ... کل تم آجانا میرے فلیٹ پر۔“ دانش نے تمام پروگرام بالا ہی بالا طے کر لئے تھے۔ دراصل وہ ایک تیر سے دوشکار کرنا چاہتا تھا۔

”تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا۔“

”ہاں یاد ہے۔“ رمشا مسرور، بے حد مسرور تھی۔

دوسری صبح وہ خوب تیار ہو کر دانش کی طرف آگئی تھی۔ دانش کے تین چار دوست اور بھی موجود تھے۔ وہ سب چہک رہے تھے بول رہے تھے مگر ارحم کچھ گم سم سا خاموش خاموش ان کے درمیان بیٹھا تھا۔

”دانش یہ سب کیا ہے؟“ وہ بے قرار سا دانش کے کمرے میں آکر آہستگی سے بولا تھا۔

”کیا ہے؟“ دانش الٹا ادھر ادھر دیکھ کر خود کو لاپرواہ ظاہر کرنے کی ناکام ایکٹنگ کرنے لگا۔

”میں اور رمشا سے شادی۔“ وہ الجھ رہا تھا اور دانش جیسے چالباز بندے کو دوسروں کی الجھنیں دور کرنے میں کمال حاصل تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ارحم کی برین واشنگ کرنے کے بعد اسے نکاح کے لئے رضا مند کرچکا تھا۔ یوں اس نے بیس سال کی عمر میں رمشا نامی طوائف سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد وہ دونوں ایک اور فلیٹ میں شفٹ ہو گئے تھے۔ شادی کے تیسرے مہینے دانش نے رمشا کو دبئی بھجوا دیا۔ ارحم کو پتا چلا تو وہ بھناتا ہوا دانش کے فلیٹ میں آیا۔ خوب گرجنے برسنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر دانش کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا تھا۔

”یار! میرا دھندا تو ایسا ہی ہے اور پھر اپنے ہی تو ساتھ دیتے ہی ایسے کا موں میں۔ رمشا کو بھیجنا میری مجبوری تھا اور اس کی خواہش پوری کرنا بھی۔“

دراصل دانش نے رمشا سے ڈیل کر رکھی تھی اور اسی ڈیل کے تحت وہ دوہی سفید پاؤڈر کے پیکٹ یعنی کہ ہیروئن بیچنے کے لئے گئی تھی۔ رمشا، دانش کے اس حسین دوست پر فدا ہو چکی تھی اور ارحم کے ساتھ کے بدلے میں وہ دانش کی ہر جائز ناجائز بات بخوشی مانتی تھی۔ رمشا کے آنے کے صرف ڈیڑھ مہینے بعد دانش نے ارحم کو مجبور کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ رمشا کو طلاق دے دے۔ پھر وہ رمشا پر کیچڑ اچھالتا رہا۔ اس کے ماضی کے تمام اوراق کھول کر دانش نے ارحم کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔

ارحم نے جب دانش کے مجبور کرنے پر رمشا کو طلاق دی تو وہ حاملہ تھی۔ رمشا نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ دانش نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی اور یہ کہا تھا کہ ارحم کو بچے کے متعلق بتانے کی ضرورت نہیں۔ پھر اچانک منظر سے غائب ہو گئی تھی صرف اور صرف اپنا بچہ بچانے کے لئے۔

چھ سال بعد وہ ارحم کی ”امانت“ اسے لوٹانے کے لئے دوہئی سے یہاں آئی تھی۔ وہ بھی اب شادی کرچکی تھی اور اس کا شوہر ثمر کو رکھنے پر تیار نہیں تھا اور ادھر خانم (ماں) ثمر کو جھپٹنے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ ہیرا منڈی میں نہ جانے اس کی پھول سی بچی کی خانم کیا قیمت لگاتی۔ ثمر کو اس کے باپ کے حوالے کر کے وہ مطمئن ہوچکی تھی۔

☆☆☆

اپنی بیٹی کے ہمراہ جب وہ ”فرمان ہاؤس“ سے نکلا تو دل بے اختیار رو دیا تھا۔ وہ آج زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ ثمر پچھلی سیٹ پر سوچکی تھی۔ تھک ہار کر اس نے اسٹیرنگ پر سر پٹخ دیا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے رمشا نے اسے فون کیا تھا۔

”ارحم! اگر اپنی بیٹی کو بچانا چاہتے ہو تو بچالو۔ ورنہ میری ماں کا تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ ثمر کو ہر صورت ڈھونڈ نکالے گی۔ ابھی تک تو میں نے اسے اپنی ماں

سے چھپا کر رکھا ہوا ہے مگر کب تک، اگر چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی محفوظ رہے تو اسے اپنے پاس رکھ لو۔“

”پاپا!“ ثمر کسمسا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس نے کنپٹیاں دباتے ہوئے مڑ کر دیکھ اور پھر گاڑی اسٹارٹ کردی۔ گھر آکر اس نے ثمر کو رانی کے حوالے کیا اور خود اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گیا۔

صبح تک اس کی حالت بے حد خراب ہوچکی تھی۔

جب وہ اٹھا تو سر بے حد بو جھل تھا۔ رانی اس سے ناشتے کا پوچھنے آئی تو اس نے رانی کو جھڑک دیا۔ کچھ دیر بعد ثمر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگئی تھی۔ ارحم کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”پاپا! ماما نہیں آئیں۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتی معصومیت سے بولی تھی۔

”ماما رات کو روکیوں رہی تھیں، اور ہمارے ساتھ بھی نہیں آئیں،“ ثمر نے اپنا منسا ہاتھ اس کے گال پر رکھ کر افسردگی سے کہا تھا۔ ارحم کچھ حیران ہوا۔

”پاپا! ماما کیا خفا ہیں۔ رمشا آنٹی بول رہی تھیں کہ ثمر کی ماما خفا ہیں اس سے‘ پاپا میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا مگر پھر بھی ماما خفا ہیں۔“ ثمر کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

”ماما نے مجھے پیار بھی کیا۔“ وہ آزر دگی سے بولی۔

اسی پل ارحم کا پرسنل سیل بجنے لگا تھا۔ فون سن کر وہ فوراً ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ یونیفارم پہن کر جب وہ باہر آیا تو ثمر مومنہ اور اس کی شادی والے روز کھینچی گئی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

”پاپا! ماما کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔“

”ہوں... ثمر جانو! ایسا ہے کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ آپ رانی کے پاس رہنا میں رات کو دیر سے آؤں گا۔“ ارحم جلدی جلدی بول رہا تھا۔ ثمر نے سمجھداری سے سر ہلا دیا۔ اس کے جانے کے بعد ثمر رانی کے پاس آگئی تھی۔ رانی نے کارٹون لگا دیے تھے۔ ثمر کچھ دیر تو دیکھتی رہی پھر بے زار ہو کر اٹھ بیٹھی۔

”سنو رانی! تمہیں ماما کے گھر کا پتا ہے۔“ ریموٹ کو ہاتھ میں لہراتے ہوئے اس نے ٹی وی میں گم رانی کو مخاطب کیا۔

”ہیں جی، بھلا مجھے کیا پتا۔“ رانی ٹی وی پر نگاہیں جمائے جمائے بولی۔

”فون نمبر کا تو پتا ہوگا تمہیں۔ میری بات کروا دونا“ ثمر نے کچھ جھنجلا کر کہا۔

”بھلا مجھے کیا پتا آپ کی ماں کا۔“ رانی منہ ہی منہ میں بد بدائی۔

”بتاؤ نا کیا نمبر ہے۔ مجھے ماما سے بات کرنا ہے۔“ ثمر ضدی لہجے میں بولی تھی۔ رانی نے جزبہ ہو کر دراز میں سے ڈائری نکالی اور ثمر کو تھما دی۔

”ایک تو ان بڑے لوگوں کے بچے بھی آفت ہوتے ہیں۔“

ثمر بڑے انہماک سے نمبر دیکھ رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ڈائری پھینک کر کھڑی ہو گئی۔

”مجھے چپس بنا دو۔“ ثمر نے ٹھنک کر کہا۔ اسی پل ڈرائیور اکرم (درانی کا شوہر) آگیا تھا ثمر نے ایک دفعہ پھر ماما کے پاس جانا ہے کی رٹ لگا دی تھی۔ اسی پل کرن کا فون آگیا تھا۔ ثمر بے قراری سے فون کی طرف لپکی۔

”آئی! ماما سے بات کرنی ہے۔“

”بیٹے! ماما واش روم میں ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں آپ کے پاس۔“ کرن نے نرمی سے دو چار مزید باتیں کر کے فون بند کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر تک رانی نے اسے چپس کھلا کر سلا دیا۔ شام تک کرن آگئی تھی۔ ثمر اسے اکیلا دیکھ کر اداس ہو گئی۔

”ماما تو آئی نہیں۔“

”بھائی کہاں ہیں۔“ کرن نے ثمر کو گود میں بٹھا کر رانی سے استفسار کیا۔

”وہ جی دفتر سے ابھی نہیں آئے۔“

”ٹھیک ہے پھر میں چلتی ہوں۔ بھائی آئیں تو انہیں بتا دینا۔“ وہ کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد چلی گئی تھی۔ گھر آئی تو لاؤنج میں ہی مومنہ سے سامنا ہو گیا۔

”مامی جی تمہارا پوچھ رہی تھیں۔“

”بتایا تو تھا میں نے انہیں۔“ کرن روکھے لہجے میں کہہ کر ماں کے کمرے میں گھس گئی۔ مومنہ بھی پاؤں پٹخ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ تبھی فون کی گھنٹی گونج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا یا تو دوسری طرف ثمر کی آواز سن کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”مومنہ ماما سے بات کرنی ہے۔“ مومنہ نے شدید غصے کی لہر کو دباتے ہوئے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔ بیل ایک مرتبہ پھر ہونے لگی تھی۔ اس نے جھجلا کر ریسیور اٹھایا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ چیخ کر بولی تھی۔

”ماما! آپ میرے پاس آجائیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“



”باپ کہاں ہے تمہارا... اور ہاں مجھے ماما شاما کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہیں ہوں تمہاری ماں سمجھیں تم۔“ وہ تو آگ بگولا ہو گئی تھی۔

”لیکن رمشا آنٹی تو کہتی ہیں۔ مومنہ ماما ہی میری ماما ہیں۔“ وہ اس کے تلخ لہجے سے خائف ہو گئی تھی۔ مومنہ فون پیچ کر اوپر چلی گئی تھی جبکہ دوسری طرف ثمر نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔

مومنہ کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ غصے کی شدت سے ماتھے کی رگ پھڑکنے لگی۔ یہ غصہ، یہ جھنجلاہٹ، حسد و رقابت کی وجہ سے تھا اور حسد اور رقابت کا جذبہ اس وقت ابھرتا ہے جب درمیان میں محبت ہو۔

”تو کیا مجھے ارحم سے محبت ہو گئی ہے۔“ وہ حیران حیران سی زیر لب بڑبڑائی۔ رمشا اور ثمر کا سن کر جلنا، کلشنا، ان سے نفرت کا اظہار کرنا۔ مومنہ نے دل کو ٹٹولا تو جواب ہاں میں پا کر وہ ششدر رہ گئی تھی۔

یہ تمام رات اس نے جاگتے گزار دی تھی۔ نہ جانے کون سا پہر تھا جب دروازہ زور دار آواز میں دھڑ دھڑایا گیا۔ مومنہ مندی مندی آنکھیں کھول کر دروازے تک آئی۔ سامنے رحیم بھائی کھڑے تھے۔ وہ گھبرا اٹھی۔

”کیا بات ہے رحیم بھائی۔“

”ارحم کی گاڑی پر سہیل نامی شخص نے فائرنگ کر دی ہے۔ اس وقت وہ ہسپتال میں ہے۔ چلو تم میرے ساتھ۔“ مومنہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی تھی اور پھر بے جان ٹانگوں کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے نیچے آئی تو ماما جی اور کرن کو بے تحاشا روتے پایا۔ ماموں کی حالت بھی کافی خراب تھی۔ وہ تو ویسے بھی ہارٹ پینٹ تھے۔ سامعہ بھابی اور کرن نے انہیں تھام رکھا تھا۔ جب وہ ہسپتال پہنچے تو بہت سے اخباری نمائندے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ڈاکٹرز کی ٹیم الرٹ تھی۔ مومنہ پوری رات ٹھنڈے فرش پر بیٹھی ساکت سی آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کو دیکھتی رہی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے منظر لہرا رہے تھے۔ کرن کی گود میں دہکی شمر کو غیر ارادی طور پر اپنی طرف کھینچ کر سینے میں پھینچتے ہوئے وہ بے آواز رودی تھی۔

رحیم بھائی بتا رہے تھے کہ سہیل، دانش کا وفادار ملازم تھا۔ نہ جانے کیسے بچ بچا کر سہیل کراچی بھاگ گیا تھا۔ یقیناً اپنے مالک کا بدلہ لینے کے لئے وہ لاہور آیا تھا مگر اس دفعہ موت کے خطرناک شکنجے سے بچ نہ پایا۔

بیالیں گھنٹوں کے صبر آزما انتظار کے بعد ارحم کو ہوش آیا تھا۔ ڈھیروں کے حساب سے صدقہ و خیرات کیے۔ کھانا پکوا کر یتیم خانے بھجوا دیا۔ ماما جی تو ارحم کے ہزار مرتبہ کہنے پر بھی ہسپتال سے گھر نہیں گئی تھیں۔

ڈیڑھ ماہ بعد اسے ڈسچارج کیا گیا تھا۔ اس دوران کئی مرتبہ ان کا سامنا ہوا تھا ارحم ہر دفعہ ہی اسے دیکھ کر آنکھیں موند لیتا۔ اس دن بھی جب وہ ارحم کے لئے فریش جوس لے کر آئی تو ارحم نے پینے سے انکار کر دیا۔ مومنہ اس کی بے رخی پر بے اختیار روپڑی۔ وہ سب سے ہنستا بولتا تھا سوائے اس کے۔

”کیوں کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ اس طرح۔ آپ کے ”فراڈ“ پر ناراض مجھے ہونا چاہیے تھا اور خفا آپ ہو گئے ہیں۔“ ارحم اس کے ”آپ جناب“ کہنے پر چونک اٹھا۔

”ننانا اتنے احترام سے بلاؤ مجھے۔ خواہ مخواہ ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور یہ فراڈ والی کیا بات ہوئی۔ میں تو خود موقع کی تلاش میں تھا۔ تمہیں اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا مگر...“ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”ارحم پلیز۔“

”جاؤ تم اب... میں سونا چاہتا ہوں۔“ وہ رکھائی سے بولا، مومنہ لب بھینچتے ہوئے اٹھی اور ٹیرس پر آکر ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ماما آپ ادھر ہیں اور میں آپ کو نیچے ڈھونڈ رہی تھی۔“ شمر نے اپنا نرم ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر قدرے جھک کر کہا۔ مومنہ نے چہرہ صاف کر کے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اسی پل فٹ بال سے کھیلتا نومی بھی آگیا۔

”ثمر! تمہیں چاچو بلا رہے ہیں۔“

”ہائیں ماما چلیں۔“ ثمر اچھلتی ہوئی اٹھی تھی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”آپ جاؤ بیٹا! میں ابھی آتی ہوں۔“ اس نے نرمی سے کہہ کر ثمر کو بھیجا اور پھر آسمان کی وسعتوں میں نہ جانے کیا کھوجنے لگی تھی۔ چند دن پہلے رمشا کی کال آئی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر رمشا کے متعلق سوچنے لگی۔

”میں نے ثمر کو یہ نہیں بتایا کہ میں اس کی ماں ہوں ہمارے ہاں ماں بننا گالی سمجھا جاتا ہے۔ میں ثمر کی آنٹی ہوں اور جانتی ہو مومنہ کہ ثمر کی ماں کون ہے۔ اس کی ماں تم ہو۔ میں نے ثمر کو بتایا ہے کہ مومنہ ہی اس کی ماں ہے۔ ارحم کی بیوی کوئی بھی ہوتی اسے ثمر کی ہوئے بھی ”ماں“ کا انتظار کیا ہے۔ ثمر کو آغوش میں لے لو مومنہ! اسے میری التجا سمجھ لو۔“ اس وقت تو

مومنہ نے تنفر سے فون بند کر دیا تھا مگر جس رات ارحم ہسپتال میں تھا اس رات ثمر جس طرح بے قراری سے اس کی طرف لپکی تھی اور بے تحاشا روئی تھی۔ اس پل مومنہ کو اپنا دل موم کی طرح پگھلتا محسوس ہوا تھا اور وہ

بے یقینی سے اس کے دوپٹے کا پلو تھام کر کہہ رہی تھی۔ ”ماما! مجھے چھوڑ کے مت جانا۔“

نہ جانے کتنی دیر وہ سوچوں میں الجھتی رہی۔ سامعہ بھابی کی آواز سن کر وہ تیزی سے نیچے چلی آئی تھی۔ ماما جی نومی اور ثمر کو اپنے دائیں بائیں بٹھا کر کھانا کھلا رہی تھیں۔ جبکہ ماموں کی گود میں ثمر کی گڑیا تھی جسے کمبل میں لپیٹ رکھا تھا اور وہ بار بار مڑ کر اپنی گڑیا کو دیکھ رہی تھی۔

”دادا ابو! گڑیا کو فیڈر دیں یہ رو رہی ہے۔“

”کہاں رو رہی ہے۔ آواز تو نہیں آئی۔“ نومی نے حیرانی سے کہا۔ ثمر نے کچھ خفگی سے نومی کی طرف دیکھا تھا اور ایک دفعہ پھر انہیں نیا حکم دیا۔

”دادا ابو! گڑیا کو اب سلا دیں۔ اسے نیند آرہی ہے“

”سورہی ہے بیٹا! دیکھو تو اس کی آنکھیں بند ہیں“ ماموں نے بلند آواز میں اسے یقین دہانی کروائی تھی وہ کچھ مطمئن ہو کر کھانا کھانے لگی تھی۔ مومنہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

سامعہ بھابی نے ارحم کا کھانا ٹرے میں سجا دیا تھا۔ وہ ٹرے اٹھا کر ثمر کو ساتھ لئے اوپر آگئی۔ ارحم کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ ”دیکھوں تو ٹائم کیا ہو رہا ہے۔ سونا نہیں تم نے۔“ ارحم نے خفگی سے ثمر کی طرف دیکھا۔ وہ سرعت سے بیڈ پر چڑھ گئی۔ مومنہ نے ارحم کی طرف ٹرے بڑھا دی تھی۔ پھر جب ثمر کے لئے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو وہ باپ سے الجھ رہی تھی۔

”ادھر ماما سوئیں گی ادھر میں اور ادھر گڑیا تو پھر پاپا کہاں سوئیں گے۔“ ثمر ہاتھ کے اشارے سے اسے بتاتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

”پاپا کا بستر اسٹڈی روم میں لگا دیں گے۔“ مومنہ نے شرارت سے کہا۔ ارحم بے نیازی سے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ وہ کھانا کھا چکا تو مومنہ اس کے لئے چائے بنا لائی۔ چائے دیکھ کر اس نے منہ بنا لیا تھا۔

”مجھے نہیں پینی چائے وائے۔“

”دودھ تو آپ پیتے نہیں ہیں۔ چائے میں تھوڑی سی پتی ڈالی ہے میں نے۔“ مومنہ نے مگ اس کے ہاتھ میں تھمایا تو اس نے بمشکل ہی دو تین سیپ لے کر مگ اسے واپس پکڑا دیا۔ مومنہ گہری سانس خارج کر کے ثمر پر کسبل پھیلانے لگی تھی جو کہ گڑیا کو ساتھ لگائے سو بھی چکی تھی۔ لائٹ آف کر کے جب وہ باہر نکلنے لگی تو ارحم نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ وہ بغیر کچھ کہے پلٹ آئی۔

”ان نوازشات کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔ مجھ غریب پر کیوں احسانات کی بوچھاڑ کی جا رہی ہے۔“

”میں کوئی احسان نہیں کر رہی۔ یہ میرا فرض ہے“ وہ اس کے طنز کو نظر انداز کر کے آہستگی سے بولی تھی۔

”بڑی جلدی فرائض یاد آگئے ہیں۔“

”آپ جو بھی کہہ لیں۔“ مومنہ نے بات سمیٹی۔ ویسے بھی بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اٹھنے لگی تو ارحم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ بیٹھو ادھر۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولنے لگا۔

”اگر مجھے خبر ہوتی کہ دو چار گولیاں لگنے کے بعد میری ویلیو اتنی بڑھ جائے گی تو یہ کام کچھ عرصہ پہلے ہی کروالیتا۔“ مومنہ نے بے حد ناراضی کے عالم میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اب بھی یقیناً طنز ہی کر رہا تھا۔ مومنہ تپ اٹھی۔

”سوچا تھا کہ اب تو آپ ضرور سدھر جائیں گے مگر...“

”میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد تم بھی کہہ دو گی کہ ارحم مجھے تم سے محبت ہے مگر...“ ارحم نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

”آپ نے جو بات کرنی ہے کریں۔ مجھے جاکر نماز ادا کرنی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”کر لیتے ہیں بات بھی۔ اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں۔“

”ارحم پلیز۔“ مومنہ زچ ہو اٹھی۔

”ہاں... تو میں نے تم سے یہ کہنا تھا کہ تم کچھ موٹی نہیں ہوتی جارہیں۔“ ارحم اسے اٹھتا دیکھ کر ایک مرتبہ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولا۔

”آپ کو یہ کہنا تھا۔“ مومنہ دانت پیس کر بولی۔

”کہنا تو بہت کچھ ہے تم سنو تو سہی۔“ وہ جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا۔ مومنہ سمجھ چکی تھی۔ اسی لئے سہولت سے اٹھی مگر ارحم نے اسے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اب وہ کچھ سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم چاہو تو ثمر کو بورڈنگ بھجوا دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ثمر کی وجہ سے تم ذہنی اذیت کا شکار نہ ہو۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ آہستگی سے بولا تھا۔ مومنہ چونک سی گئی۔

”میں اب بھی خوش ہوں۔“



”نہیں...“ ارحم نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں جانتا ہوں کہ ثمر کی موجودگی تمہارے لئے باعث تکلیف ہے۔“

”آپ غلط سوچ رہے ہیں۔“

”جو میرے عذاب ہیں وہ میں ہی بھگتوں گا، تم کیوں اذیت کا شکار ہو۔ میری

سزا یہی ہے کہ میں تم سے دور رہوں۔“ وہ کرب سے بولا تھا۔ مومنہ کی

پلکیں نم ہو گئیں۔

”میری خوشی اسی میں ہے کہ ثمر اپنے والدین کے پاس رہے۔ آپ زیادہ

ڈائلا گزمت جھاڑیں۔“ مومنہ نے محبت سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا

ارحم نے چونک کر اس کے چہرے پر لکھی سچائی کو پڑھا۔

”تم سچ کہہ رہی ہو۔“

”ہاں بالکل۔“ وہ مضبوط لب و لہجے میں بولی تھی۔

”اصل میں مومی! میں یہ نہیں چاہتا کہ جب ہمارا بچہ ہو اور تمہاری توجہ کا مرکز بس وہ ہی بن جائے۔ اس طرح ثمر نظر انداز ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کہ ثمر میرے جیسی محرومیوں کا شکار ہو۔ میں اپنے بچوں میں تفریق کر کے انہیں دہری شخصیت کا مالک نہیں بناؤں گا کہ وہ خود کو اجاگر کرنے کے لئے کسی غلط راستے کا انتخاب کر لیں۔“ اس کے لہجے میں محرومیوں کے کانچ چٹخ رہے تھے۔

”ایسا کبھی نہیں ہوگا ارحم! میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں رکھوں گی۔ ثمر

کی حیثیت اور اہمیت اپنی جگہ ہوگی۔ آپ ایسا سوچئے گا بھی نہیں۔“ اس نے

یقین بھری مسکراہٹ لبوں پر سجائی تو ارحم بھی آسودگی سے مسکرا دیا۔

”ویسے ہمارا ”ولی عہد“ آئے گا کب؟“

”کون؟“ وہ اپنے ہی دھیان میں تھی چونک کر بولی۔

”ہمارا بیٹا۔“ وہ مومنہ کے چہرے پر پھیلتی شفق کو دیکھ کر مسکرایا تو مومنہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوا کر تیزی سے اٹھی۔ وہ اسے پکارتا ہی رہ گیا تھا۔

”ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہے۔ اٹھ نہیں سکتا میں، اچھی مجبوری ہے۔ چلو خیر کبھی تو ہاتھ آؤگی نا۔“ وہ اسے دھمکا رہا تھا۔ مومنہ مسکراتے ہوئے وضو کرنے چل دی۔ اس پر سجدہ شکر واجب ہو گیا تھا اور وہ کیوں نہ اس رحیم کریم رب کا شکر ادا کرتی جس نے ایک مرتبہ پھر اسے ارحم لوٹا دیا تھا۔

ارحم نے بھی آسودگی سے آنکھیں موندیں۔ اندھیرے چھٹ گئے تھے۔ دو دھیا روشنی چہار سو پھیل گئی تھی۔



شام کا سہانا سماں تھا۔ صبح ہونے والی بارش نے ہر شے کو نکھار بخش دیا تھا۔ وہ موسم کی دلفریبی کو انجوائے کرتی بیل گم چباتی تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی، جہاں اس کی پیاری ننا اس کے انتظار میں سخت جھلائی ہوئی تھیں۔

مارکیت سے خریدا ہوا سامان اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ بریڈ، انڈے اور کوکیز وغیرہ۔ ایک ڈبہ مینگو بنانا جیلی کا بھی تھا۔ وہ ناشتے میں جیلی بریڈ کے

ساتھ شوق سے لیتی تھی اور اسے کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔ وہ کھاتی تھی اور بے تحاشا کھاتی تھی، جس طرح بے تحاشا کھانے کا شوق پڑھنے کا شوق اسے وراثت میں ملا تھا۔ اس طرح کھانے کا شوق بھی وراثتی تھا۔ نانا اور متین پکانے میں ماہر تھے اور وہ کھانے میں۔

”ولنشیا“ میں ننانے جب گھر لیا تو فریا نے خوب واویلا مچایا۔ ڈیفنس سے اٹھ کر ولنشیا میں شفٹنگ کی کم از کم فریا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جس قدر بلند اور عالی شان اس ایریے کی عمارتیں تھیں، اتنے ہی بلند اور پتھرے لوگوں کے روئے تھے۔ سرد اور اجنبی۔ فریا تو یہاں آکر خوب بدمزہ ہوئی۔ ابھی پچھلے دنوں جاگنگ کے دوران اسے نے ایک آنٹی کو ہیلو بولا تو وہ اسے نہ جانے کیوں گھورنے لگی تھیں۔ پھر بغیر کچھ کہے پارک کی طرف چل دیں۔ فریا نے اس تجربے سے لطف اندوز ہونے کے بعد تعلقات بنانے سے توبہ کر لی۔

ایل بلاک سے مارکیٹ کا فاصلہ تو اتنا نہیں تھا۔ تاہم فریا جان بوجھ کر لمبا رائونڈ لے کر آئی تھی اور اس تھکا دینے والی رائونڈ کی وجہ یہ قیامت موسم

تھا۔ موسم کی خوب صورتی کو انجوائے کرتے اور گنگناتے ہوئے فرسٹ ٹرن لینے کے بعد وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ ہری پچیلی، خوشنما پھولوں سے ڈھکی بیولوں والی اس کے گھر کی بیرونی دیوار آگے بنے فٹ پاتھ پر ایک طرف رکھے پتھرے پینچ پر بیٹھا وہ کوئی انسانی وجود تھا۔ سسکیوں کی وقفے وقفے سے آتی آواز اور اس کا ہلتا ہوا وجود دیکھ کر فریا کا شک یقین میں بدل گیا تھا، وہ جو کوئی بھی تھا گھٹنوں پر سر جھکائے یقیناً رو رہا تھا۔ مگر وہ تھا کون؟ فریا کا فطری تجسس عود کر آیا۔ وہ دو قدم کا فاصلہ مٹاتے اس کے قریب چلی آئی۔

”ہیلو مین!“ فریا نے گلا کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ اتنا اندازہ تو اسے ہو چکا تھا کہ مقابل صنف مخالف میں سے ہے۔

”تم رو رہے ہو؟“ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ سسکیوں کی آواز آنا فوراً بند ہو چکی تھی۔

”تم کون ہو؟“ فریا نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

”ادھر دیکھو پلیز!“ اب فریا نے چٹکی بجا کر مصنوعی التجا کی تھی۔

”ارے کچھ تو بولو۔ کم از کم سر تو اوپر اٹھاؤ“ فریا کو غصہ آگیا۔

”تم کہیں ڈیف تو نہیں؟“ وہ ایک دم اچھل کر دور ہٹی۔

”گو نگے، بہرے کچھ تو بولو۔“ وہ سخت جھنجلائی۔

”اف گو نگے، بہرے بولنے سنتے کہاں ہیں۔“ فریا نے اپنا ماتھا پیٹا۔ ”مگر غوں

غاں تو کر سکتا ہے نا۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

”اے مسٹر کیا تکلیف ہے تمہیں۔ کیوں رو رہے ہو؟“ اب کے سارا لحاظ

بالائے طاق رکھ کے وہ غصے سے دھاڑی۔

”آپ کو کیا تکلیف ہے؟“ گو نگے کو زبان لگ گئی تھی۔ گٹھنے پر سر جھکائے ہنوز

اسی پوزیشن میں بیٹھی ہوئے بھرائی سی آواز سنائی دی تھی۔

”شکر ہے بولے تو سہی۔“ فریا نے گہرا پرسکون سانس خارج کیا۔ ”مجھے کوئی

تکلیف نہیں، خدا نخواستہ صرف اتنا پوچھ رہی ہوں، یہاں کیوں بیٹھے ہو۔“

”آپ سے مطلب؟“ کافی ناراضی سے روٹھے روٹھے لہجے میں کہا گیا تھا۔ فریا

کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”تم ہمارے گھر کے سامنے ہی بیچ پر بیٹھے ہوئے کوئی چور اچکے بھی ہو سکتے

ہو۔ اٹھو یہاں سے۔“

”یہ آپ کا گھر ہے اور یہ بیچ بھی۔ آئی ایم سوری۔“ گٹھنوں سے سر اٹھا لیا گیا

تھا۔ گہری سبز سوچی سوچی آنکھوں میں ابھی تک ڈھیروں نمی چمک رہی تھی۔

”آر یو فارنر؟“ فریا کا لہجہ اور انداز دونوں بدل گئے تھے۔ شہد رنگ بالوں

والے سر سے کیپ اتر چکی تھی۔ مغربی نین نقوش اسٹریٹ لائٹس کی

روشنیوں میں واضح ہوتے چلے گئے تھے۔

سرخ ہونٹوں کے کونے کچلتا وہ اجنبی لڑکا ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی فریا کو اس کے طویل قامت ہونے کا اندازہ ہوا۔ فریا اس کے سامنے بونی سی لگنے لگی تھی۔

”نو...“ اپنی شرٹ کی آستنیوں سے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ رخ موڑ گیا تھا۔

”شکل سے تو فارز لگتے ہو، خیر۔“ فریا ہونٹ سکیرے بغور اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ بیس سال کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر سنہری رواں چمک رہا تھا۔ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ، فریا نے اندازہ لگایا۔ وہ اس سے دو ڈھائی سال چھوٹا ہی تھا، سو اس لیے اس نے اپنے لہجے میں کچھ رعب سمویا۔

”تم رو رہے تھے، مگر کیوں؟ اتنے بڑے ہو کر روتے ہو۔“

”رونا کیا صرف بچوں کا ہی حق ہے، کیا آپ نہیں روتیں۔“ بہت شستہ اردو میں بغیر اس کی طرف دیکھے پوچھا گیا تھا۔ ساتھ وہ جانے کے لیے مڑنے لگا تھا۔ مگر فریا بھی کمال پھرتی سے اس کے سامنے

آگئی۔

”ایسے تو تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“

”کیوں؟ کھانا کھانا ہے کیا؟“ آپ کو کیسے خبر ہوئی کہ میں صبح سے بھوکا ہوں۔ اس تمام عرصے میں وہ شاید خود کو سنبھال چکا تھا، تب ہی کافی اعتماد سے پوچھنے لگا۔

”کھانا بھی کھلا سکتی ہوں۔“ فریا اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ازلی اعتماد میں بولی۔

”مگر پہلے رونے کی وجہ بتائو۔“

”پہلے کھانا کھلا دیں... وجہ بعد میں پوچھئے گا۔“ وہ اس سے بھی زیادہ بولڈ تھا۔ تاہم فریا نے غور کیا، اس کے چہرے پر سادگی اور معصومیت تھی۔ وہ عیار اور مکار تو نہیں لگتا تھا مگر اس طرح کسی پر اعتبار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سوچ میں گم ہو گئی۔



”میں نے آپ کو مشکل میں پھنسا دیا ہے، چلتا ہوں، یہاں بغیر پریشانی کے بیٹھ گیا تھا۔ اکیچو نکلی! میں شدید ڈپریشن تھا، سو پتا نہیں چلا، سوری اگین۔“ وہ پلٹنے لگا تھا۔ جب فریا نے پھر سے بازو آگے کر کے اس کا راستہ روکا۔

”رکو تو... کھانا کھائے بغیر جائو گے، اور نہ جانے گھر جا کر تمہیں کھانا ملے گا بھی یا نہیں، اور پتہ نہیں تمہیں کتنی دور جانا ہے۔“ فریا فرائے سے بول رہی تھی۔ وہ رک گیا تھا ٹھٹکا بھی تھا اور نم آنکھوں سے مسکرایا۔

”کھانا گھر جا کر نہیں ملے گا، اتنا مجھے یقین ہے، مجھے بہت دور نہیں جانا، یہ سامنے میرا گھر ہے۔“ وہ مہرون گیٹ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ چار منزلہ وسیع و عریض عالی شان سی کوٹھی اس بلاک کے سب ہی گھروں میں الگ نظر آتی تھی۔

”صبح سے بھوکے ہو، کیا رات بھی فاقے کے ساتھ گزارنی ہے؟“ فریا سنجیدگی سے بولی۔

”مجھے فاقوں کی عادت ہے۔“ وہ سنجیدگی کے ساتھ مسکرایا۔

”آج میرے توسط سے تمہیں فاقہ نہیں کرنا پڑے گا۔“ فریا نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا جبکہ وہ رویا رویا لڑکا سچ مچ گھبرا گیا تھا۔

”آپ... آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”مائی سویٹ نیم فریا عتیق۔“ اس نے پلٹ کر جواب دیا تھا۔ ”اپنا نام بتاؤ؟“ آواز میں بلا کا رعب تھا۔ اجنبی اور گھبرایا۔ چونکہ گیٹ کھل چکا تھا اور فریا پیچھے ہٹے اسے اندر جانے کا اشارہ کر رہی تھی، وہ گھبراتا نہ تو اور کیا کرتا۔

”آپ بھی چکو، مجھے خود بہت شدید بھوک لگ رہی ہے۔“ فریا اسے اپنی جگہ پر جمے دیکھ کر بے صبری سے بولی۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی تھی۔ جوں ہی وہ دونوں لائونج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے ننا کی خفا خفا سی آواز سنائی دی۔

”فری! کہاں رہ گئی تھیں تم، فکر کے مارے میرا برا حال تھا، میں تو...“ فری کے ساتھ کھڑے نوجوان کو دیکھ کر ننا ایک دم خاموش ہو گئیں۔

”یہ کون ہے؟“ ان کی سوالیہ نگاہیں فریا پر جمی ہوئی تھیں۔

”مائی نیو فرینڈ۔“ ننا کے ساتھ ساتھ وہ بھی حیران بلکہ شاکڈ تھا۔

”اپنا نام تو بتائو۔“ فریا نے ساتھ کھڑے مجسمے کو زور سے ٹھوکا دیا۔

”محمد حمزہ۔“

”اوہ!“ ننا کے ساتھ فریا بھی پرسکون ہو گئی تھی، کیونکہ وہ اسے غیر مسلم سمجھ رہی تھیں۔

”اس کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ ننا حمزہ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ اس کی سوچی آنکھیں اور سرخ تپا تپا سا چہرہ اور کہانی سنا رہا تھا۔

”طبیعت تو اس کی ٹھیک ہے البتہ ہم دونوں کو سخت بھوک لگی ہے۔ آپ کھانا تو لگوائیں۔“ فریا ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”کھانا تو بنگالی جی کب کا لگا چکے ہیں۔“ ننا سنبھل کر مسکرائیں۔ ”یہ بھوک اور نیند کی بہت کچی ہے۔“ اب وہ حمزہ کو بتا رہی تھیں۔

”حمزہ! یہ مٹن اور آلو پالک ٹرائی کرونا! اچھا یہ گولا کباب تو چکھو۔ اور اس اچاری ہانڈی کا تو سواد ہی الگ ہے یار! یہ دیسی ککڑ اور چائینیز رائس میرے فیورٹ ہیں۔ تم نے چاول کیوں اتنے کم لیے ہیں اور لو نا یار! کھائو اور کھاتے جاؤ، ہم کھانے کے لیے ہی دنیا میں آئے ہیں۔“

جب تک ڈنر چلتا رہا فریا کی زبان بھی اسی رفتار سے چلتی رہی۔ حمزہ بوکھلایا بوکھلایا سا اسے بولتا دیکھتا رہا۔ وہ حیران تھا۔ یہ لڑکی کیا چیز تھی۔ ابھی وہ تنہا باہر بیٹھا رو رہا تھا اور اب اس لڑکی کے برابر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ ننا کی مزاحیہ باتیں، متین (شیف) کے چٹکے اور فریا کی بے ساختہ ہنسی۔ ”زندگی میں ہنسا اور مسکرایا بھی جاتا ہے۔“ وہ اس گھر میں صرف دو لوگوں کی موجودگی میں حیران حیران سا سوچ رہا تھا۔ وہ زبر دستی گرین ٹی پلا کر گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔

”دوست! زندگی میں بہت سارے غم اور صدمات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ دکھوں میں بزدل روتے ہیں۔ خوشی کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ تم نے کبھی ایسی

کوشش کی؟ اگر نہیں کی تو اب ضرور کرنا، اوکے گڈ بائے۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔ بے حد اجلی شفاف اور کھلی کھلی سی بے ریا مسکراہٹ۔ وہ دم بخود کھڑا

تھا۔ اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زمین اپنے مرکز سے ہٹ رہی

ہے۔ نہیں زمین تو وہیں تھی۔ ستاروں سے سجا آسمان بھی پہلے کی طرح روشن

تھا۔ بدلا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ زندگی رواں دواں تھی۔ سانس پہلے کی طرح چل

رہی تھی۔ ہاں! ایک چیز کے بدلانے محمد حمزہ کو ٹھٹکا دیا تھا۔ سینے میں

دھڑکتا دل۔ یوں لگ رہا تھا پورے وجود کی ہر رگ میں دھڑک رہا ہے۔

”یہ میرے دل کو کیا ہوا ہے؟“ وہ سوچ رہا تھا اور لب کچھ اور فریاد کر رہے

تھے۔

”گڈ بائے، ضرور مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ میں۔ میں کیا پھر... ملنے کی امید

رکھوں؟“

”کس سے ملنے کی امید؟“ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پوچھ رہی تھی۔

”اس لڑکی سے جس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔“

☆☆☆

بارش میں بھینگنا اسے شروع سے پسند تھا۔ ننا کے منع کرنے کے باوجود صبح سے برستی بارش میں بھینگنے کا مزہ لے رہی تھی۔ متین کو پکوڑے بنانے اور سوچی کا حلہ تیار کرنے کا آرڈر کر رکھا تھا۔ ننا چاہتی تھیں وہ کم از کم ایک اُبلا انڈہ کھا لے۔ جبکہ فریاد نے ننا کو تسلی دی تھی کہ وہ اطمینان رکھیں۔ پکوڑے اور حلہ کھانے کے بعد وہ چائے اور دو عدد بوائٹڈ ایگ کھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ننا اون سلائیوں کے ساتھ الجھ رہی تھیں۔ فریا چپکے سے ٹیس پر پہنچ گئی۔ فریا

کے ممی، ڈیڈی باہر ہوتے تھے۔ بہت بچپن میں ننا نے اسے گود لیا تھا۔ اسے

بھی ننا کے علاوہ کسی اور سے انسیت نہیں رہی تھی۔ اس سے چھوٹا بھائی

تھا۔ جو ممی، ڈیڈی کے ساتھ رہتا تھا۔ دو، تین سال بعد ممی اور بھائی چکر

لگاتے تھے۔

ننانے ڈیفنس والا گھر بیچا تو فریا حیران رہ گئی۔ پہلے پہل بہت غصہ بھی کیا، مگر کچھ عرصے بعد اسے گھر بیچنے کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے اکلوتے ماموں کو کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ سو ننانے وہ گھر بیچ کر نسبتاً چھوٹا اور سستا گھر لے لیا تھا۔ فریا کو بہت غصہ آیا، پھر وہ ماموں کی مجبوری اور ننانا کی محبت کو سمجھ گئی تھی۔ ماموں مع فیملی دبئی مقیم تھے۔ انہیں ممی کی طرح خاص خاص تہواروں پر آنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

فریا نے ابھی حال ہی میں اپنا ماسٹرز مکمل کیا تھا۔ ان دنوں وہ جاب بھی کرنا چاہتی تھی، مگر ننانا کو اس کا جاب کرنا بالکل پسند نہ تھا۔ پڑھائی میں وہ بہت اچھی تھی۔ اس کا شمار ہمیشہ سے ذہین سٹوڈنٹس میں رہا تھا۔ اسی لیے اپنی کلاس فیلوز اور دیگر کزنز جو کبھی اس کی ہم جماعت تھیں۔ ان سب کو پہلے چھوڑ چکی تھی اور ننانا فخریہ کہا کرتی تھیں کہ...

”ذہانت تو فریا نے مجھ سے وراثت میں لی ہے۔ اس کے ساتھ کی تو بی ایس سی اور بی بی اے میں اٹکی ہوئی ہیں۔“

”فری کپڑے چینج کرلو، یہ سرما کی بارش ہے، ٹھنڈ میں مرنا ہے کیا...“ ننانے اون کے گولے کو اٹھا کر لپیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ شاید نئے سویٹر کاڈیزائن بنا چکی تھیں۔

”تو کیا ہوگا؟“ فری نے لاپرواہی سے سر جھٹکا۔ پانی کی کئی بوندیں بالوں سے ٹپکنے لگی تھیں۔

”بیمار پڑ جائو گی۔“ ننانے خفگی سے کہا۔

”اٹھ بھی چکو“

”پہلے سو جی کا حلوہ تو کھالوں اور پکوڑے ود ناریل کی چٹنی۔“ فریا نے چٹخارہ لیا۔

”کچھ بھی نہیں ملے گا۔ جب تک آپ نانا جی کی بات نہیں مانتیں۔“ متین (بنگالی جی) کفگیر لہراتے کچن سے برآمد ہوئے۔

”یہ زیادتی ہے۔“ فریا ٹھٹک کر رہ گئی۔

”آپ ہمارا بات نہیں مانتیں۔ ننا جی کا بات نہیں مانتیں۔ کھانا تو بالکل نہیں ملے گا۔“ متین جسے فریا بنگالی جی کہا کرتی تھی۔ اپنا حکم صادر فرما کر کچن میں غروب ہو گئے تھے۔ فریا چیخ کر کے آئی تھی، ننا کسی سے باتوں میں مصروف تھیں۔

”ننا! کون آیا ہے؟“ وہ بالوں میں تولیہ لپیٹے ٹھٹھرتی ہوئی لائونج میں داخل ہوئی۔

”تم.....“ فریا، وقاص کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔

”مجھے دیکھ کر تم فریز کیوں ہو گئی؟“

”شٹ اپ...“ وہ دوسرے ہی پل ہنستے ہوئے وقاص کے قریب آئی۔

”کہاں دفع ہو گئے تھے؟“ اس نے وقاص کے بازو پر دھموکا جڑا۔

”کوئیٹہ... پھوپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ وقاص نے ہائے وائے کرتے ہوئے بتایا۔

”اور تم سے اچھا تیماردار تو شاید پھوپھو کو ملنا بھی نہیں تھا۔ مسٹر بین!“ فریا نے بھنا کر کہا۔

”پھر کہا مجھے مسٹر بین۔ ننا سمجھا لیں۔ اپنی اس ہری مرچ جیسی نواسی کو، میں مسٹر بین کی طرح مجبوراً مجبوظ الحواس ہوں۔“ وقاص عادت کے مطابق فوراً بھنا اٹھا تھا۔ مسٹر بین کا طعنہ تو اسے کرنٹ کی طرح

لگتا تھا۔

”مسٹر بین مجبوظ الحواس ہیں تم تو بہت لکی ہو۔ اپنے فیورٹ کامیڈین کا ٹائٹل تمہیں دے رہی ہوں۔ خود کو خوش قسمت تصور کرو، تم مسٹر بین جونیر ہو۔“ فریا مسلسل وقاص کو چڑا رہی تھی۔

”موٹی بھینس! کبھی خود کو آئینے میں دیکھا ہے غور سے۔ بگ باس کی ڈولی جیسی ہو جائو گی، اگر اسی رفتار سے کھاتی رہیں۔“



بنگالی جی چائے کے لوازمات سے بھری ٹرالی گھسیٹ کر لائے تھے اور فریا نے جھٹ پٹ پکوڑوں سے بھری ڈش اٹھالی تھی اور اب وہ چٹنی میں ڈبو ڈبو کر پکوڑے کھا رہی تھی۔

وقاص نے سوچی کا حلوہ چکھا۔

”بنگالی جی سے کیا کیا بنواتی رہتی ہو۔ یہ دیسی گھے کے تڑکے کھا کھا کر موٹی ! پھٹ جاؤ گی۔“ وقاص نے بلوریں سی پیالی ٹرالی میں رکھ کر چائے کا کپ اٹھالیا۔

”مسٹر بین ! میری صحت دیکھ کر مت جلا کرو۔ یہ بتائو میری جاب کا کیا بنا ہے؟“ فریا اب حلوے سے بھرپور انصاف کر رہی تھی۔

”اس قدر اتاولی مت بنو۔ ورنہ آفس میں ایک ویکنسی تو ہے۔“ وقاص آنکھوں میں شرارت بھر کر بولا۔

”کمیٹے ! میرے بارے میں تم نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا۔“ فریا کو شدید صدمے نے گھیرا۔

”یہ چائے کا ایک اور کپ پی لینے دو، پھر بتاتا ہوں۔“ وقاص بڑے بڑے سپ لیتا کھڑکی کی طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ کپ ابھی ابھی اس کے ہاتھ میں تھا اور آخری گھونٹ لے کر ہاتھ ہلاتا دروازے کی طرف بڑھا۔

”چپڑاسی کی ویکنسی خالی ہے۔ کام بھی مشکل نہیں، تمہارے لیے اس سے اچھی جاب کوئی اور مجھے نہیں ملے گی۔“

”بدتمیز ! واہیات آدمی چائے بھی پی گئے۔ سینڈوچ اور یہ میرے ننگٹس بھی کھا گئے۔“

اپنا کوٹ لہراتا وہ فریا کو جوتا اٹھائے دیکھ کر بھاگ گیا تھا، جبکہ اندر آتی ننا سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

”اتنے دنوں بعد بچہ آیا تھا، کھانا کھائے بغیر چلا گیا۔ ویسے تو راہ چلتے اجنبیوں کو گھر اٹھا لاتی ہو اور وقاص کو سوکھے منہ بھیج دیا۔“

”اتنا کچھ چٹ کر گیا ہے، ابھی بے چارہ سوکھے منہ گیا ہے۔“ فریا، ننا کو وقاص کی ہمدردی میں مبتلا دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

”اور یہ کس اجنبی راہ چلتے کو اٹھا کر گھرائی ہوں؟“

”کیا بھلا سا نام تھا اس بچے کا؟“ ننا سوچ میں پڑ گئیں۔

”حمزہ... محمد حمزہ۔“ فریا کی یادداشت کے خانے سے یہ نام نکل چکا تھا۔ تاہم ننا کے یاد دلانے پر وہ جھٹ سے بولی۔

”ہاں... حمزہ۔“ ننا سر ہلانے لگیں۔

”فری یہ تمہیں کہاں ملا تھا۔ کون ہے یہ؟ کس فیملی سے ہے؟ بیٹا! ایک بات جو ہر دفعہ میں تمہیں سمجھاتی ہوں کہ ہر ایک پر اعتبار نہیں کر لیتے۔ ولنشیا، ہمارے لیے نئی جگہ ہے۔ اس لیے سوسائٹی میں ہم ابھی نئے ہیں۔ کچھ اندازہ بھی نہیں کہ ارد گرد کے لوگ کیسے ہیں؟ ایسے تو بھروسہ نہیں کر لیتے“

ننا اس دن بھی حمزہ کے جانے کے بعد اچھی خاصی کلاس لیتی رہی تھیں۔

”حمزہ سے پھر سامنا نہیں ہوا۔ یہ سامنے ہی تو اس کا گھر ہے۔“ ننا پوچھ رہی تھیں۔

”نو...“ فریا اب ٹی وی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

”تم خود پتا کر لیتیں۔“ انہوں نے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔

”ننا! یہ آپ کہہ رہی ہیں۔“ فریا نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر ننا کی طرف دیکھا۔

”ایک مسٹر پڑوسی نے ابھی تک جان نہیں چھوڑی۔ مزید کسی اور پڑوسی سے روابط نہیں بڑھا سکتی۔“

وہ وقاص کا حوالہ دے رہی تھی۔ اڑتیس سال ننا اور وقاص کی فیملی پڑوسی رہے تھے۔ وقاص اس کی پھوپھو کا بیٹا تھا۔ اس کی فیملی انگلینڈ چلی گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ننا بھی یہاں شفٹ ہو گئی تھیں۔ وقاص کو یورپ سیٹل ہونا پسند نہیں تھا۔ یہاں اس کی جاب بہت اچھی تھی اور وہ ہمیشہ پاکستان میں رہنا چاہتا تھا۔ ننا کو وقاص سے خصوصی انسیت تھی۔

”فری! تم نے پوچھا نہیں، حمزہ کیوں ڈپریسڈ تھا؟“

”اف ننا مجھے کیا ضرورت پڑی تھی پوچھنے کی۔ ویسے بھی میں نے کافی احمقانہ حرکت کی تھی۔ اسے گھر نہیں لانا چاہئے تھا۔ مگر نجانے کیوں جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ بھوکا ہے تو مجھے ترس آگیا۔ ہمارے گھر میں نعمتوں کے انبار لگے تھے اور ایک ہمارا بے چارا پڑوسی خالی پیٹ رو رہا تھا۔“ وہ ہمیشہ کی طرح چٹکیوں میں بات کو اڑا رہی تھی۔

”وہ بچہ نہیں، جو بھوک کی وجہ سے بلبلا رہا تھا۔ بات کچھ اور لگتی ہے۔“ ننا کا انداز پر سوچ تھا۔ فریا کی کلاس لینے کے بعد وہ بڑے دلگرفتہ انداز میں کہنے لگی تھیں۔

”تم نے اچھا کیا فری! حمزہ کو لے آئیں، ورنہ یہ گلٹ تو لازمی رہنا تھا۔“ یہ اس وقت کی بات تھی جب فریا، حمزہ کو سی آف گیٹ تک کرنے کے بعد آئی تھی اور ننانے اسے ڈانٹتے کے بعد کہا تھا۔

”بے چارا بچہ! کتنی پیاری صورت ہے اس کی۔“ بہت دن بعد ننا کو بے چارا بچہ یاد آہی گیا تھا۔ فریا بور ہو کر اٹھ گئی تھی۔ ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

”ہیلو میم! وہ جو زور شور سے بیرونی چھوٹے سے لان کے پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصرف تھی اس مردانہ آواز پر چونک کر سیدھی ہوئی۔

”تم...“ وہ اسے پہلی نظر میں ہی پہچان چکی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو وہ فریا کو اسی جگہ ملا تھا۔ حمزہ اس کے حافظے میں نہ چاہنے کے باوجود محفوظ تھا۔ اور ایک دو دن سے تو چپکے چپکے دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھی کہ کیوں نا حمزہ کی خیریت معلوم کر لی جائے۔ ننانے بھی اس سے ایک، دو مرتبہ کہا تھا۔ شاید ان کے ذہن میں بھی حمزہ کا رونا محفوظ تھا۔

”مجھے دیکھ کر آپ شاید کیوں رہ گئی ہیں“ وہ اس کے قریب گھاس پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

”نو... ایسی کوئی بات نہیں، ابھی میں تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی کہ...“

”ارے میں کیا اتنی اہم شخصیت ہوں کہ آپ میرے بارے میں سوچ رہی تھیں۔“ حمزہ کا چہرہ برقی قہقہوں کی طرح جگمگانے لگا۔

”نہیں... نہیں۔“ وہ ایک دم گھبرا گیا۔

”تم مجھے فریا کہہ سکتے ہو۔ ویسے کیا اتج ہے تمہاری؟“

”کچھ دن پہلے میری بیسویں سالگرہ تھی۔“ نہ جانے کیوں حمزہ کا چہرہ اک پل کے لیے تاریک ہو گیا۔

”میں تم سے دو سال بڑی ہوں۔ مگر فرینڈ شپ تو ہو سکتی ہے۔“ فریا اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم ایک بہت اچھی اور سچی خاتون ہو، مجھ سے دو سال چھوٹی لگتی ہو، تو کیا آج سے فرینڈ؟“ حمزہ نے اپنا دایاں ہاتھ فریا کے سامنے پھیلا دیا۔

”آف کورس فرینڈز!“ فریا مٹی سے لٹھڑے ہاتھ اپنی شرٹ سے رگڑتے ہوئے پر جوش سی بولی۔

”اتنے دن کہاں رہے؟“ وہ حمزہ کے لیے ایک چیئر گھسیٹ لائی تھی۔

”میں اس بیچ پر بیٹھوں گا۔“ حمزہ گھاس سے اٹھ کر بیچ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”کیا یہ بیچ میرے لیے بنوایا تھا؟“

”مجھے الہام ہو گیا تھا کہ ولنشیا میں ایک بانگڑو سے ملاقات ہوگی۔ اور وہ ایک بیچ پر بیٹھا ملے گا، سو اسی لیے۔“ وہ بالوں سے کپچر اتار کر مزے سے بولی۔

”تم نے بتایا نہیں کہ اتنے دن کہاں رہے؟“

”ایک سوچ میں گم رہا، تم ہنسو گی تو نہیں؟“

”ایک سوچ میں تم دس دن گم رہے ہو۔ مجھے تو اسی بات پر بے تحاشا ہنسی آرہی ہے۔ تم مسٹر بین جونیر (وقاص) سے کم نہیں ہو۔“ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

”مجھے پتا تھا کہ تم ہنسو گی۔“ حمزہ بغیر برا مانے خود بھی مسکرا دیا۔ ”تم بہت ہنستی ہو فریا! اس دن بھی تمہارے گھر سے آنے کے بعد میں یہ ہی سوچتا رہا تھا کہ کسی کی ہنسی اتنی زندگی سے بھرپور بھی ہو سکتی ہے اور کوئی تم جیسا احمق بھی اس تیز رفتار دور میں موجود ہے۔“

”جسٹ شٹ اپ حمزہ! تم نے مجھے احمق کہا۔“ وہ عادت کے مطابق چلا اٹھی۔

”تم احمق ہی نہیں انوسینٹ بھی ہو۔ یاد ہے میں نے تم سے کہا کہ میں صبح سے بھوکا ہوں اور یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ تم کچھ کوکیز کے پیکٹ اور انڈے مجھے دے دو۔ جو میں تمہارے ہاتھ میں دیکھ چکا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ تم مجھے پیسے بھی دے دو گی۔ تاکہ میں کچھ پیٹ پوجا کر لوں۔ مگر میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گی اور کھانا کھلانے کی آفر کر دو گی۔ میں شاکڈ رہ گیا تھا۔ آج کے دور میں لوگ سگے رشتہ داروں کو

بغیر انویسٹی گیشن کے اندر نہیں گھساتے، میرا حیران ہونا فطری تھا۔ تاہم تم سے اور ننا سے مل کر میرے اندر کی تشنگی اور بڑھ گئی ہے فریا۔“

”تم چاہتے تھے کہ میں کچھ انڈے اور کوکیز کے پیکٹ کے ساتھ کچھ روپے بھی تمہیں دے دوں۔“ فریا ایک دم فریز ہو گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سامنے بیٹھا یہ لڑکا سچا ہے یا جھوٹا۔ مگر ایک چیز کا یقین تو اسے آہی گیا تھا کہ سادگی اور معصومیت ہر کسی کو دھوکا دے سکتی ہے۔ اگر اسے اچھے طریقے سے خود پر طاری کر لیا جائے۔

”مجھے اس دن ذرا بھر بھوک نہیں لگی تھی۔ لگ ہی نہیں سکتی تھی۔ چند ٹکوں کے عوض بے عزتی کروانے کے بعد ہر اس شخص کی بھوک پیاس، نیند تک اڑ جاتی ہے، جو عزت نفس رکھتا ہے۔“ حمزہ نیلے آکاش کی طرف دیکھتے ہوئے ان لمحوں کو گویا وہاں موجود ہی نہیں تھا، فریا چونک گئی۔

”ہم فرینڈز ہیں اور فرینڈ شپ کے آغاز میں، میں تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ تمہارے بارے میں تو میں جان ہی چکا ہوں۔ تم بہت ذہین



ہو، بہت اچھی کوکنگ کرتی ہو، بیکنگ میں ماہر ہو، ماسٹرز کرچکی ہو، ایک اچھا اکیڈمک ریکارڈ رکھتی ہو، ممی، ڈیڈی ایبراڈ ہوتے ہیں، تم بچپن سے ہی ننا کے ساتھ رہتی ہو، ولنشیا میں گھر لیے تم لوگوں کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“ حمزہ اسے مزید حیران کرنے پر تلا ہوا تھا۔ تاہم فریا کا ذہن ابھی تک کوکیز اور انڈوں میں ہی اٹکا ہوا تھا۔

”میں ایک درمیانے درجے سے بھی ذرا کم سٹوڈنٹ رہا ہوں۔ پڑھنا نہ تو میرا شوق تھا، نہ ہی مجبوری۔ میرا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ اب تم پوچھو گی کہ میرا دل کس چیز میں لگتا تھا، میرا دل رویوں

، احساسات، نفرتوں اور محبتوں میں الجھا رہا ہے۔ ٹھہرو میں کچھ اور پیچھے ماضی کی طرف جاتا ہوں۔ مگر اس سے بھی پہلے میں تمہیں بتا دوں کہ میں محمد حمزہ ہوں۔ یہ سب سے بڑا سچ ہے اور اس سے بڑے سچ تمہیں آگے چل کر بتائوں گا۔

یہ بات تمہارے لیے شاکڈ ہوگی کہ یہ سامنے وسیع و عریض عالی شان گھر میرا نہیں ہے، بلکہ میں تو اس گھر میں معمولی سا تنخواہ دار ملازم ہوں۔ اوپر کے کاموں اور سودا سلف لانے کے لیے مجھے اپائنٹ کیا گیا ہے۔ مگر اس گھر کی نیک چڑھی ملازمہ جس کا کچن پر مکمل راج ہے، زبردستی مجھے شیف بنانا چاہتی ہے۔ تم حیران مت ہو فریا! میں تمہیں بتاتا ہوں محمد حمزہ کون ہے۔“ فریا واقعی اس انکشاف پر دنگ رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو اندرون شہر کی غلیظ گلیوں میں پایا۔ گندگی کے ڈھیر پر اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھینے والا محمد حمزہ روتھ رچرڈ کا بیٹا تھا۔ میری ماں کا تعلق انگلینڈ سے ہے۔ میرے ابو کا تعلق لوئر مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ میری دادی ایک معمولی سی مڈ وائف تھی۔ جو اپنے ایریے کے علاوہ جہاں جہاں زچہ بچہ کی بھنک پاتی فوراً دوڑ لگادیتی۔ اس علاقے کی واحد

مشہور اور نامی گرامی دائی تھی جو ناجائز کیس نمٹانے میں ماہر تھی اور اس معاملے میں خاص شہرت رکھتی تھی۔

جہالت، غربت اور بھوک نے جس گھر میں بسیرا کر رکھا تھا۔ ایسے چھوٹے اور پیچ گھرانے میں میرے ابو تنویر اسرار جیسے بچوں کو پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ جن میں ہمت، لگن اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ، جنون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

وہ اپنے ماحول سے الگ رہا۔ وہ لاکھوں کی بھیڑ میں اپنا الگ مقام بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے چاہئے تھے بے تحاشا محنت، ان تھک کوشش اور طویل تھکا دینے والا سفر۔ مگر جنون اور جستجو نے میرے ابو کو مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے تعلیم یافتہ فرد تھے۔ جنہوں نے یونیورسٹی لیول تک تعلیم حاصل کی تھی۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں انگلینڈ کا ویزا مل گیا۔ نہ جانے کس کس سے قرض اور ادھا پکڑ کے بہت سے خواب لیے تنویر اسرار انگلینڈ چلے گئے۔ ان کے ویزے کی مدت مختصر تھی اور انہیں جو کچھ کرنا تھا ان چند

مہینوں میں ہی کرنا تھا۔ چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش کے ساتھ انہیں سہارے کی بھی ضرورت تھی اور یہ سہارہ روتھ رچرڈ کی صورت میں انہیں میسر آ ہی گیا۔ روتھ تیسرے درجے کی معمولی سی نرس تھی۔ اچھی صورت کی وجہ سے اوپر والی آمدنی کے ذریعے بخوبی گزر بسر ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیسے میرے ابو کی ملاقات روتھ سے ہوئی۔ روتھ، ابو سے خاصی متاثر ہو چکی تھی اور ابو کے آفر کرنے پر وہ ان سے پیپر میرج کرنے پر رضا مند ہو چکی تھی رقم وغیرہ کے معاملات بھی طے پا گئے تھے۔ ابو روزانہ کتنے پونڈز روتھ کو دیا کریں گے، یہ سب طے تھا۔

ابو کو روتھ کے توسط سے نیشنلیٹی تو مل چکی تھی مگر کچھ ٹیکس ادا کرنے کے چکر میں ابو ابھی کچھ سیونگ نہیں کر سکے تھے۔

پاکستان میں پیسہ بھجوانا تو دور کی بات تھی۔ ابو خود بہت مشکل سے گزارا کر رہے تھے۔ جن لوگوں سے قرض لے رکھا تھا۔ وہ سب دادی کا ناک میں دم کیے ہوئے تھے۔ دادی خود فاقوں سے عاجز آچکی تھیں۔ گھر کا چولہا ٹھنڈا

رہتا تھا۔ دو، دو دن کچھ کھانے کو نہ ملتا۔ ایسی صورت حال میں اگر ایک، تین سال کے بچے کی ذمہ داری بھی آن پڑے تو گھر کے سربراہ کی کیا حالت ہوگی۔

یہ بچہ میں تھا محمد حمزہ... جس کی ماں اسے جنم دے کر باپ کے دروازے پر پھینک گئی تھی۔ روتھ ایسے کنکے پاکستانی سے اکتا چکی تھی۔ ابو نے کچھ عرصہ تو مجھے اپنے پاس رکھا، مگر پولیس کی مہربانی نے مجھے میرے باپ سے دور کر دیا۔ بلاشبہ میرا باپ محبت کرنے والا بہت اچھا باپ تھا، مگر... ابو کو غلط فہمی کی بنا پر جیل ہوگئی۔ ابو کی خواہش کے مطابق ان کے اسٹور مالک نے مجھے پاکستان، ابو کی فیملی کے پاس بھجوا دیا اور میری زندگی کے تلخ ترین دور کا آغاز ہو گیا۔

میں نے بھوک کا مزہ چکھا۔ میں نے نفرت اور ذلت کا لطف

اٹھایا۔ چاچا، پھوپھی اور دادی، ان تین لوگوں کے پاس میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ محبت، نہ توجہ، نہ وقت۔ میں نے اس گھر میں دادی کی گالیوں، کوسنوں

اور طعنوں کے درمیان بچپن گزارا۔ میرے ابو کے علاوہ دو لوگ اور پڑھنے کے شوقین تھے۔ پھوپھو اور چاچا... کتابوں کے شیدائی، کتابوں کے کیڑے، رات دن کتابوں میں سرگھسائے رکھتے۔

چاچا کبھی کبھی ترنگ میں آکے کہتے ”بھائی تنویر کی طرح بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔“

دادی کو چاچا اور پھوپھو کا پڑھنا سخت ناپسند تھا۔ چاچا بہت اچھے تھے۔ تاہم پھوپھو سخت مزاج تھیں۔ ہر وقت اپنے آپ میں مگن رہتیں۔ پھوپھو کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اسی حساب سے ان کے خواب بھی اونچے تھے۔

ان تین بہن بھائیوں میں ایک چیز مشترک تھی وہ چیز تھی اس ماحول سے فرار۔ ابو تو فرار حاصل کر چکے تھے باقی دو پنچھی بھی اڑنے کو بے تاب تھے۔ چاچا کو کچھ نہ کچھ محبت ضرور تھی۔ دادی کو جب بھی میرے لیے ڈنڈا اٹھاتے دیکھتے فوراً ڈھال بن جاتے۔ اسکول میں چاچا کی مہربانی سے مجھے داخلہ

مل ہی گیا تھا۔ اور اس کے بعد اڑنے والے پنچھی اپنی اڑان بھر کر بہت دور چلے گئے۔

چاچا کو اسکالر شپ مل گیا۔ پھوپھو بھی من پسند ڈگری حاصل کر چکی تھیں۔ رحیاں مدائی قابلیت کے معاملے میں تو خوش قسمت تھی مگر اپنی اولاد سے عمر بھر فیض نہیں پایا۔

سننے میں آیا تھا کہ چاچا نے بھی اپنی کلاس فیلو سے شادی کر لی تھی اور وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ جانے سے پہلے گھڑی بھر کے لیے دادی سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ آخری مرتبہ بھیج بھیج کر ملتے ہوئے چاچا نے کہا۔ ”حامے! زندگی میں ہمت اور لگن کو ہمراہ رکھنا اور روشنیاں اپنی طرف لائیں تو اندھیرے پیچھے چھوڑ کر اندھا دھند بھاگ لینا۔ ہم نے نام اور مقام کے لیے بہت محنت کی ہے اور اب اس محنت کا لطف اٹھانے کا وقت آیا ہے۔“

میں کہنا چاہتا تھا، تنہا تو آپ کچھ بھی نہیں تھے۔ آپ کے پیچھے مشقت کی چکی میں پینے والے ہاتھ تھے مگر میں کچھ نہیں کہہ سکا۔

چاچا چلے گئے اور میں خالی خالی نظروں سے چاچا کو جاتے دیکھتا رہا۔ چاچا نے اپنی بیوی سے دادی کو ملوانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ دادی جو ایک بدنام سی مڈ وائف تھیں ان کا حوالہ شاید دادی کی اولاد کے لیے شرمناک تھا۔ مگر جو بھی تھا دادی ان کی ماں تو تھیں۔ چاچا کے اس طرح چلے جانے کا سارا عتاب بھی مجھ غریب پر نازل ہوا۔ دادی نے جوتی اٹھا کر جی بھر کر مجھے مارنے کے بعد دل کی بھڑاس نکال لی۔ ان کے خیال میں، میں منحوس اور نجس تھا۔ میرا بخت سیاہ تھا اور اس کی سیاہی دادی کے گھر پر سایہ فگن تھی۔

چاچا چلے گئے تو ایک دن ہسپتال میں مقیم پھوپھو بھی ایسی غائب ہوئیں کہ سالوں ان کا نشان نہ ملا۔ دادی رو دھو کر بیٹی پر فاتحہ پڑھنے کے بعد پھر سے اپنے مشغلے میں مصروف ہو گئیں مگر پھوپھو کے غم نے دادی کو ایسی دیمک لگائی کہ پھر وہ صرف چند سال ہی جی سکی تھیں۔ پھوپھی بھی میری آمد سے پہلے ہی چاچا کی طرح دورانِ تعلیم چپکے چپکے گھر بسا چکی تھیں۔ مرنے سے پہلے دادی نے وعدہ لیا تھا کہ ”حامے! وعدہ کرنا مجھ سے، میری بلی کو ضرور



ڈھونڈے گا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ دادی میرے حامی بھرنے پر خوش ہوئی یا نہیں مگر میرا دل ضرور مطمئن ہو گیا تھا۔ دادی نے اپنی زندگی کی آخری رات مجھے جی بھر کر پیار کیا تھا۔

دادی نے کہا۔ ”حامے! تو میرا اصل سود تھا اور میں کھوٹ کے پیچھے رلتی رہی تو ہیرا تھا، تجھے مٹی میں رول دیا اور جو کھوٹ کا مال تھا اسے پاس کر دیا۔ ہاں، میں نے برا کیا، اور میری کوکھ سے جنے بچوں نے میرے ساتھ برا کیا۔“ دادی کو آخری عمر میں پچھتاؤوں نے گھیر لیا تھا۔ عمر کی پونجی لٹنے کے قریب ہو تو آنکھیں چوہٹ ہو ہی جاتی ہیں۔ دادی مر گئیں، مجھے معلوم تھا دادی کے مرنے کے بعد میرے لیے دنیا میں کوئی آسانی نہیں رہے گی، میری زندگی کا دوسرا تلخ ترین دور شروع ہو گیا۔

پیٹ کے دوزخ کو بجھانے کے لیے مجھے مزدوری کرنا پڑی۔ اینٹیں اور پتھر ڈھوئے۔ بجری اور گارا اٹھایا۔ بھوک میرے جسم سے ساری توانائی کھینچ لیا کرتی تھی اور میں بجری کے ڈھیروں پر بے دم ہو کر اونگھنے لگتا۔

دس ماہ خوار ہونے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میرا باپ پاکستان آچکا ہے۔ یہ خبر مردہ تن میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھی۔

ابو مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ وہ بہت کمزور اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ وہ بیمار تھے اور انہیں شاید سہارے کی ضرورت تھی۔

میں ابو کے ساتھ انگلینڈ آ گیا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ طلسماتی دنیا تھی۔ مجھے لگتا تھا میں کسی جادو نگری میں آ گیا ہوں۔ میں کانچ کے اس شہر ہو شربا، اس جگر جگر جگمگاتی دنیا کے حسن سے دم بخود تھا۔ میری آنکھوں نے حسن فطرت کے کئی نظارے دیکھے۔ میرا دن نہ جانے کس احساس تلے دبا اچانک بجھ گیا تھا۔ ابو نے مجھے میری جائے پیدائش دکھائی۔ اک معمولی سا کلینک تھا جس میں محمد حمزہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر ابو نے مجھے وہ مکان دکھایا تھا جس میں وہ میری ماں کے ہمراہ چند سال قیام پذیر رہے تھے۔ ابو آہستہ آہستہ ایک ایک منظر سے پردہ ہٹا رہے تھے۔ یہ مکان بہت مختصر اور غلیظ علاقے میں تھا۔ مجھے اپنے گھر کی گلیاں اور بازار یاد آ گئے۔



تو کیا میرے ابو اس دنیا کی تمنا لیے پردیس کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ اسی لائف اسٹائل کی آرزو کی تھی انہوں نے، خواب کے اس سفر نے انہیں آخر دیا ہی کیا۔ جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ کر آئے تھے وہ ہی کچھ تو انہیں یہاں آکر ملا تھا تو پھر عمر گنوانے میں کیا نفع ملا انہیں۔

میری کچی سوچیں سفر در سفر کر رہی تھیں۔ ٹیکسی کی رفتار کے ساتھ میرا ذہن بھی فل سپیڈ میں بھاگ رہا تھا۔

ٹیکسی کو بریک لگے۔ جس طرح ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی تھی اسی طرح میرا ذہن بھی جھٹکا کھا کر رک گیا۔ میری آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا۔ روشن اور چمکتا دمکتا۔

ابو میرا ہاتھ تھامے اس وسیع و عریض گھر کے انٹرس ڈور کھول کر مجھے اندر لے آئے۔

حامے! یہ تیرا گھر ہے۔ اب وہ مجھے خود میں سمو کر بڑے پیار سے کہہ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں گھبرا رہا ہوں۔ وہ میری گھبراہٹ دور کرنے کے لیے ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگے تھے۔

”ابو! یہ میرا گھر ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے“ میں کنفیوژ تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بے قابو تھی۔ لکڑی کی چھت والا یہ گھر باہر سے جتنا شاندار تھا اندر سے دگنا شاندار تھا۔ مجھے لگا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ خواب کس قدر خوبصورت تھا اگر سلامت رہتا۔ اس خواب کو ایک چنگھاڑتی آواز نے چھناکے سے توڑ ڈالا۔ میرے سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ بے حد ماڈرن سے بوڑھی عورت جس کے چہرے پر لاتعداد جھریاں تھیں۔ اس کے ہاتھ چہرے سے بھی زیادہ بد صورت تھے۔ جھریوں سے اٹے۔ وہ مجھ پر اور ابو پر چلا رہی تھی۔ اس نے ابو کو بہت غلیظ غلیظ گالیاں دیں۔ مجھے بس لمحہ ہی لگا تھا اپنے شاندار سے ابو کے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھنے میں۔ ابو اس عمر میں کیوں اس قدر

شکستہ دل اور بیمار بیمار سے رہنے لگے تھے۔ میں سمجھ چکا تھا۔ اور جب بات سمجھ میں آگئی تو میرا سر اور شانے ابو کی طرح جھک گئے۔

”عزت اور محبت میرے نصیب میں نہیں۔ یہ دونوں چیزیں مجھے میسر نہیں آسکتیں۔“

میں ہر خواہش اور خواب پر دل ہی دل میں فاتحہ پڑھنے لگا تھا۔ خوابوں پر فاتحہ پڑھنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر میں نے اپنے دل کو کچل کر ایسا کیا۔ مجھے یقین تھا سامنے کھڑا میرا باپ بھی ماضی میں یہ عمل دہرا چکا ہے۔ وہ بھی اپنے خوابوں اور تمنائوں کو دفنا چکے تھے۔ میں نے بھی بالکل ویسا ہی کیا۔

میں اپنے باپ کی طرح اس گھر میں تیسرے درجے کا رہائشی تھا اور اس شہر میں اپنی پہچان بنانے کی بھلا مجھے ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے خود کو تیسرے درجے کا شہری اور آخری درجے کا رہائشی سمجھ لیا تھا۔ مان لیا تھا اور صبر کر لیا تھا۔“

”جانتی ہو فریا! وہ بوڑھی عورت کون تھی؟ میرے باپ کی دوسری بیوی۔“

فریا اس کے چند پل خاموش رہنے پر سخت بے چینی محسوس کر رہی تھی اور جب اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو وہ پہلے کی طرح بہت توجہ سے سننے لگی۔

”لیڈی نینی کے ساتھ رہنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ وہ بے تحاشا جھگڑالو عورت تھی۔ چیخنے پر آتی تو پورا دن چیختی رہتی۔ میں اور ابو سارا دن اس کی ذاتی بیکری میں کولہو کے بیل کی طرح جتے رہتے تھے۔ ابو کی صحت کو دیکھتے ہوئے میں ابو کو زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ وہ بہت جلد تھک جاتے تھے۔ انہیں پھیپھڑوں میں مپس کا مسئلہ تھا۔ وہ ریگولر میڈیسن لیتے تھے۔ اگر دوائی نہ کھاتے تو ان میں چلنے پھرنے کی سکت بھی نہ رہتی۔“

ابو چاہتے تھے کہ میں کالج میں ایڈمیشن لوں۔ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ مگر لیڈی نینی نے میری پڑھائی کا سن کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اور کالج میں تو نہیں البتہ ایک انسٹی ٹیوٹ میں انگریزی سیکھنے کے لیے ایڈمیشن دلوایا گیا۔ تین مہینے کا کورس مکمل ہوا تو ڈرائیونگ لائسنس کے لیے کتابچے پڑھنے

شروع کر دیئے۔ لیڈنی نینی نے مجھے اپنا ذاتی ملازم سمجھ رکھا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی اسے ہزاروں کام یاد آجاتے تھے۔ جو نہ جانے میرے آنے سے پہلے کون کرتا تھا۔

تین سال اس نے مجھے ذلیل کیا اور ابو بے بسی سے تماشا دیکھتے رہے۔ ایک دن میرے ضبط کے ٹانگے ادھڑے تو ابو مجھے سمجھانے لگے۔

”تم اپنے قدم جمالو حامے! میں کچھ سرمایہ تمہیں دوں گا۔ میرا دل ہے کہ تم اپنا سٹور اسٹبلش کرلو۔“ ابو نے میرے حوالے سے بھی کئی خواب دیکھ رکھے تھے۔ جو ہمیشہ ادھورے ہی رہے۔

”ابو! آپ پاکستان میں رہتے، وہاں جاب کر رہے ہوتے۔ تو آج ہمارا اپنا گھر

ہوتا۔ بہت زیادہ نہ سہی ہم اچھی زندگی ضرور گزارتے۔ متوازن ماحول

ہوتا میرے اور بہن بھائی ہوتے، ابو آپ نے کبھی سوچا کہ آپ نے یہاں آکر بہت غلط کیا ہے اور دادی سے بہت سال رابطہ نہ رکھ سکے اس سے بھی زیادہ غلط اور برا۔“

”بہت دفعہ سوچا ہے، مگر اب کیا ہو سکتا ہے، حامے! تم نہیں جانتے میں نے وقت کو اپنے اوپر کس قدر تنگ دیکھا ہے۔“ وہ نہ بھی بتاتے تو ان کے مشقت بھرے سفر کی گواہ ان کی تھکی تھکی آنکھیں تھیں۔

پھر ایک روز ابو کو نہ جانے کیا سوچھی۔ وہ لیڈی نینی کو بتائے بغیر مجھے لیے ایک دوسرے شہر آگئے حالانکہ ابو تو شاید سانس بھی لیڈی سے پوچھ کر لیتے تھے۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہا ہے کہ میں اتنا بزدل کیوں رہا ہوں۔ اور ابو بے چارے بیویوں کے معاملے میں انتہائی بد قسمت۔

یہ شہر بھی میرے لیے نیا تھا اور مجھے کچھ دیر تک علم نہیں تھا کہ ابو مجھے کس سے ملوانے کے لیے لائے ہیں۔

میں پہلی نظر میں چاچا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ گریس فل ہو چکے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ شاندار نظر آرہے تھے۔ وہ ایک اچھی خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے چہرے کی صحت مندی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت اچھی جاب کر رہے ہیں۔

”شاجے! بتا یہ کون ہے؟“ ابو چاچا کو دیکھ کر گویا ایک دم توانا ہو گئے تھے۔ پردیس میں یہ اپنے کیا اہمیت رکھتے ہیں کوئی ہم جیسے پردیسیوں سے پوچھتا۔

”یہ تو میرا حامی ہے، اتنا بڑا اور لمبا ہو گیا ہے، اسے کب لائے بھاتنور!“ چاچا نے مجھے بھیج کر بے ساختہ جس جوش اور محبت سے کہا تھا میرے انگ انگ نے محبت کی اس گرمی کو محسوس کیا تھا۔

”بھاتنور! آپ حامی کو یہاں لے آئے۔ یہ ایک بہترین فیصلہ کیا ہے آپ نے۔ حامی کی زندگی بن جائے گی۔“

چاچا مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے البتہ ان کی بیوی کاشفہ چاچی کافی نخوت سے ملی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا تھا چاچی کو ہماری آمد گراں گزری ہے۔ ابو کا آنا بھی انہیں پسند نہیں آیا تھا اور کچھ عرصے بعد مزید کھل گئی تھی کہ چاچی، چاچا کہ رشتہ داروں سے اچھا خاصا خار کھاتی ہیں۔ چاچا کے

رشتہ دار بھلا تھے ہی کتنے۔ واحد میرے ابو، مگر میں حیران رہ گیا تھا، جب چاچا نے ابو کو بتایا۔

”بی بی کی پر موشن ہو گئی ہے۔ اسے یہاں کی کمپنی میں جاب کرنے کا موقع ملا ہے۔ فرقان (بلی کا شوہر) بھی اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ یہاں سیٹل ہو گیا ہے۔ بیٹیاں دونوں پڑھ رہی ہیں۔“

چاچا بڑی محبت سے بلی پھوپھی کا ذکر کر رہے تھے۔ میرا حیران ہونا فطری تھا۔ وقت شاید واقعی بدل گیا تھا۔ ہاسٹل سے غائب ہونیوالی بہن کو بھائی کیسے سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ ابو خود پھوپھی سے ملنے کو بے تاب تھے۔

میں نے محسوس کیا، چاچی کو پھوپھی کا ذکر کرنا ناگوار نہیں گزرا تھا۔ وہ پھوپھی کو اپنے گھر انوائٹ کرنے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ وہ پھوپھی کا ذکر بہت محبت سے کر رہی تھیں۔

میں اور ابویک بھرپور دن گزارنے کے بعد واپس آگئے تھے۔ مگر گھر آنے پر ہمیں ایک طوفان کا سامنا کرنا تھا۔ اس بات سے میں اور ابو دونوں ناواقف تھے۔

لیڈی نینی نے مجھے اور ابو کو بے بھانوی کی سنائیں۔ ہمیں غلیظ غلیظ گالیاں دیں۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ ہم لیڈی نینی کے اس رویے بلکہ ہر طرح کے رویے کے عادی تھے۔ مگر اس نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔ یہ ہمارے گمان میں نہیں تھا۔

اس برفانی رات میں جو لہو منجمد کر رہی تھی۔ کھلے آسمان تلے ہم دونوں بے آسرا کھڑے تھے۔ اپنی زندگی کے اس موڑ پر بھی میں حیران تھا، بے تحاشا حیران، مختصر یہ کہ میں اور ابو شاہجے چاچے کے گھر چلے آئے۔ چاچا حسب معمول خوش ہوئے تھے بلکہ بے تحاشا خوش ہوئے تھے۔ مجھ پر تو نہ جانے کیوں انہیں بے پناہ پیار آرہا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر نرمی سے دباتے۔

”حاما! تو میرا بیٹا ہے۔“

”تو اسے سچ مچ اپنا بیٹا بنا لے۔“ ابو نے نہ جانے کس لہجے میں اور کس انداز میں بات کی تھی۔ میں نہیں سمجھ پایا تھا۔ البتہ چاچا خوب اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

”میں نے سچ مچ اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔“ چاچا کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

”تو سچ کہہ رہا ہے شاہجے!“ ابو کی آنکھیں بہنے لگیں۔

”بھاتنویر! تم بھی نا، حاما میرا بیٹا ہوا، میں نے کہہ دیا۔ آج سے تم اس کی فکر کرنا چھوڑو۔“

چاچی اور اپنے بیٹے سے فر فر انگریزی بولتے چاچا، ابو کے ساتھ اپنے پرانے لہجے میں گفتگو کرتے تھے اور چاچی کو اس انداز پر آگ لگ جاتی تھی۔



وہ ہمارے درمیان نہیں بیٹھتی تھیں۔ انہیں اس جاہلانہ طرز گفتگو سے نفرت تھی۔ انہیں ہمارا اپنے گھر پر قیام بھی کھٹکتا تھا اور وہ اپنے دل کی بھڑاس چاچا کے آفس جانے کے بعد اچھی طرح نکال لیتی تھیں۔

”جاہلوں ان پڑھوں کی طرح چاچا مت کہا کرو، انکل بولا کرو، پینڈو، جنگلی نہ جانے کہاں سے اٹھ کر آگئے ہیں۔“

”انکل تو کوئی بھی ہو سکتا ہے چاچی! چاچا بولنے سے رشتے کی وضاحت ہوتی ہے۔ مجھے دادی نے اسی طرح بولنا سکھایا ہے۔“

میرا بولنا تو چاچی کو اور تپا ڈالتا تھا۔ کجا کہ جواب دینا، یہاں بھی میں تیسرے درجے کا رہائشی تھا۔ یعنی چاچی مجھ سے ایک میڈ والے تمام کام لینے کی کوشش کرتی تھیں اور میں صرف ابو کی خاطر سب کچھ کرنے پر مجبور تھا۔ وہ چاچا کے قریب رہنا چاہتے تھے۔ وہ پھوپھی سے بڑے تپاک سے ملے تھے۔ پھوپھی بھی ابو سے مل کر خوب روتی رہیں۔

ایک دن ابو نے میرے پوچھنے پر بتایا ”شاجے نے بلی کا نکاح فرقان سے کروایا تھا۔ تب بلی ابھی پڑھ رہی تھی۔“ ابو نے سرسری سا بتایا تھا۔ تاہم میں کچھ عرصے بعد کچھ نہ کچھ تو جان ہی گیا تھا۔ یہ کہ جب نکاح کے بعد پھوپھی پریگنٹ ہوئیں تو انہیں ہاسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ اور یہ بات میری پیدائش سے بھی پہلے کی تھی اور میں چاچا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر دادی کو اعتماد میں لے کر یہ فیصلہ کیا جاتا تو اس میں حرج ہی کیا تھا۔ مگر ایک تلخ حقیقت یہ بھی تھی کہ دادی کا حوالہ ان کے بچوں نے ہمیشہ اپنی خوشیوں اور کامیابیوں کی راہ میں رکاوٹ سمجھا تھا۔ ظاہر ہے ایک مڈ وائف کی بیٹی کو فرقان کے گھر والے کبھی بھی بیاہ کر نہ لے جاتے۔ اسی طرح چاچا نے بھی اپنی محبت اور پسند کو حاصل کرنا تھا۔ کیا فرق پڑتا تھا کہ ماں کی خوشی کا احساس کیا تھا، یا نہیں کیا تھا۔

پھوپھی بھی کتنا عرصہ دادی کی نظروں میں دھول جھونکتی رہی تھیں۔ وہ جو چال ڈھال چہرے مہرے سے جان لیتی تھیں کہ عورت حاملہ ہے۔ اپنی بیٹی

کے انداز دیکھ کر قطعاً نہیں ٹھٹھکیں۔ کتنی بڑی سزا قدرت کی طرف سے انہیں ملی تھی۔ اللہ نے اگر کچھ اختیار دے رکھا ہو اور اسے ناجائز استعمال کیا جائے تو اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے علم اور ہنر کو غلط استعمال کرنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ گناہ چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا، بس گناہ ہوتا ہے۔

میرے حافظے میں کہیں کہیں دادی کا چھپ چھپ کر رونا محفوظ ہے۔ شاید وہ اپنی اولاد کی بغاوت کی بو پاچکی تھیں یا پھر جو بھی تھا اپنے گناہوں کا ادراک پشیمانوں کے عمیق گڑھے میں دھکیلتا ہے۔ محلے کی کنواری لڑکیوں کے کیس لیتے ہوئے کبھی اپنے گھر کی عزت کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔

پھوپھی کے غائب ہونے کے بعد رحیاں دائی کی بیٹی کے قصے گلی گلی اور بازار بازار چٹخارے لے کر سنائے گئے۔ مگر یہ کھیل تو پھوپھی نے کالج کی شروعات میں ہی رچا لیا تھا۔ مطلب نکاح کر لیا تھا۔

چاچی بھی اسٹیٹس کانشیس تھیں شاید۔ ظاہر ہے چاچا کے رشتے داروں میں ان کے دو بہن بھائی تھے۔ ابو تو چاچی کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ البتہ اسمارٹ سی

خصوصورت پھوپھی جو بلا کی خوش لباس تھیں۔ چاچی کی پسندیدہ ہستیاں میں شامل تھیں۔

میں کبھی حیران ہو کر سوچتا تھا کہ ابو کے علاوہ رحیاں دائی کے دونوں بچے ہر لحاظ سے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ کمی تو ضرور ہوتی ہوگی۔

ہمارے پرانے محلے کے بعض راوی یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ دادی اپنی بیٹی کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ پھوپھی اپنی پسند سے نکاح کر رہی ہیں، جو بھی تھا، پچھتاوا ادھر بھی تھا اور ادھر بھی۔

کچھ دن بعد لیڈی نینی ہمیں خود لینے آگئی تھی۔ میں اور ابو دونوں ہی نہیں جانا چاہتے تھے، مگر جانا تو ہمیں تھا ہی۔

ایک روز ابو نے مجھے بتایا کہ وہ چاچا کی بیٹی سے میری بات پکی کر چکے ہیں۔ چاچا کی بھی مکمل رضامندی شامل تھی جبکہ چاچی اور پھوپھی دونوں نے

ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ یہ طوفان مجھے دوبارہ اپنے مرکز کی طرف لے آیا۔ یعنی میں پاکستان آگیا۔ ٹھکانہ پہلے بھی میرے پاس نہیں تھا اور اب بھی۔ ایک پرانے جاننے والے کے توسط سے ایک سکول میں مجھے بہت مختصر تنخواہ پر فٹ بال کا ٹیچر رکھ لیا گیا تھا۔ روٹی کا سلسلہ تو چل پڑا تھا۔ تاہم رہنے کے لیے ایک چھت کی ضرورت تھی۔ اخبار بینی کے شوق نے ٹھکانہ بھی فراہم کر دیا۔

یزدانی فیملی کو اپنے کچن کے لیے میرے جیسے لڑکے کی ہی ضرورت تھی۔ یعنی کچن سے متعلقہ اشیاء ہر روز خرید کر لانے کی ذمہ داری میری تھی۔ علاوہ ازیں مجھے بچوں کا ٹیوٹر بھی بنا لیا گیا۔ میڈم کو خبر ہوئی کہ میں انگریزی بولتا ہوں، سو مجھے بچوں کو انگریزی سکھانے پر مامور کر دیا گیا۔ پھر میڈم کو بچوں کے توسط سے پتا چلا کہ میں فٹ بال کا بہترین کھلاڑی رہا ہوں۔ یہ ہوائی نہ جانے کس دشمن نے اڑائی تھی۔ بہر حال ایک گھنٹہ قریبی پارک میں بچوں کو فٹ بال کی پریکٹس بھی کروانا پڑی۔

میڈم کو اندازہ تھا کہ میں اچھی ڈرائیونگ کر سکتا ہوں۔ سو مجھے بچوں کا ڈرائیور بھی بننا پڑا۔ بچوں کو اسکول پک اپ اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری بھی میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی گئی۔ تابوت میں آخری کیل میڈم کی نک چڑھی کوکنگ ایکسپریٹ مس ٹینا نے ٹھونک دیا۔ بچوں کی فرمائش پر ایک دن کیک کیا بیک کر دیا تھا، مس ٹینا مجھے شیف بنانے پر تل گئی۔

مس ٹینا ویسے تھی مجھ غریب سے خار کھاتی تھی۔ اس روز معمولی سی جھڑپ کیا ہوئی، مس ٹینا نے مجھ پر چوری کا الزام لگا دیا۔ میں ناشتے کے لوازمات لینے مارکیٹ گیا تھا، جب کسی نے میرا والٹ اڑا لیا۔ مگر مس ٹینا نے ماننے سے انکار کر دیا۔ خوا مخواہ میری بے عزتی کی۔ مجھے ذلیل و خوار کیا۔ مگر بھلا ہو میڈم کا ان تک بات پہنچی تو میری خلاصی ہوئی۔

”اب تم بتاؤ کیا تم دوستی کے رشتے کو قائم رکھو گی؟ یہ سب جاننے کے بعد کہ میں کون ہوں۔“ حمزہ نے اچانک ہی گفتگو کے سلسلے کو منقطع کر کے بے حد سنجیدہ بیٹھی فریا سے کہا تھا۔

”بولو نا فریا!“ فریا کی خاموشی نے حمزہ کو حد درجہ متوحش کر دیا تھا۔

”کیا بولوں“ بہت دیر بعد فریا نے کہا تھا۔

”یہی کہ تمہیں ایک ڈرائیور، ایک ٹیوٹر اور ایک شیف سے دوستی منظور ہے۔“ حمزہ کے چہرے پر خوفناک قسم کی سنجیدگی طاری تھی۔

”بولو فریا۔“ وہ بے انتہا بے قرار ہوا۔ ”جواب دو۔ خاموش کیوں ہو؟“ گویا وہ رو دینے کو تھا۔ اور اسی بے قراری میں وہ گھٹنوں کے بل فریا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”کہا تو ہے یار! منظور ہے، منظور ہے، منظور ہے۔ کسی ایگریمنٹ پر سائن کروانے ہیں کیا؟“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جبکہ حمزہ کا رکا ہوا سانس ایک دم بحال ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات ابھرے تھے۔ اگر فریا دھیان دیتی تو ضرور کھٹک جاتی۔ وہ فتح یابی کے احساس سے مسرور تھا، بے انتہا مسرور۔

...☆☆☆...

وہ فریا سے اتفاقاً ہر اس جگہ ٹکراتا رہا تھا، جہاں اس کی موجودگی کا اسے یقین ہوتا۔ مارکیٹ، پارک، کالونی کی سڑکوں پر۔ آئندہ آنے والے ان چار پانچ مہینوں میں اس نے فریا کے گرد ایسا دائرہ کھینچ کر اس میں محصور کر لیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اس دائرے سے نکل نہیں سکتی تھی۔ وہ اسے دائرے سے نکلنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ وہ ایسی کوشش کرتی ہی کیوں؟ کیونکہ فریا عتیق ان دوسالوں میں حمزہ کی کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی

وہ حمزہ جو یزدانی ہائوس کا ڈرائیور تھا۔

اک معمولی سا ٹیوٹر۔

معمولی سا شیف۔

فریا عتیق جو بلا کی ذہین تھی۔ پوزیشن ہولڈر تھی۔ گولڈ میڈلسٹ تھی۔ بے حد عام سے محمد حمزہ کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جس کا اکیڈمک ریکارڈ صاف سلیٹ کی مانند تھا۔ جس کے ہر صفحے پر اس کی زندگی کے ذاتی تجربات تھے۔

جب وہ ٹیرس پر کھڑی ہوتی۔ سامنے والوں کے وسیع و عریض لان میں حمزہ جھنجھلایا ہوا سا بچوں سے دماغ کھپا رہا ہوتا۔

”بڑا شوق ہے ان کی ماں کو انگریزی دان بنانے کا۔ بولنا ابھی آتا نہیں۔ ڈھائی تین سال کے ان بچوں کو میں بھلا کیا سکھائوں۔“ وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا کچھ دیر بعد فریا کے روبرو ہوتا تھا۔

”ایک تو میڈم یزدانی نے ہر سائز کا بچہ پالا ہوا ہے۔ پورے نو بچے، لگتا ہے محکمہ منصوبہ بندی والوں کا زور بھی نچلے طبقے پر چلتا ہے۔“ وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔

”تم کوئی ڈھنگ کی جاب کیوں نہیں کرتے؟“ فریا نے اور بھی اسے تپایا۔

”آکسفورڈ یونیورسٹی کا ڈگری ہولڈر ہوں نا! ڈھنگ کی جاب تو مجھے طشتری میں سجا کر پیش کر دی جائیگی۔“ حمزہ نے خفگی سے کہا۔

”تم نے فیوچر کی کوئی پلاننگ کی ہے یا یوں ہی مسز یزدانی کا ڈرائیور بنے رہنا ہے۔“ فریا نے کافی سنجیدگی سے کہا تھا۔

”یار! میں مسٹر یزدانی کو آئیڈیلائز کرتا ہوں۔ فیوچر میں انکی طرح فٹ بال کی ٹیم بنائوں گا۔“ وہ مزے سے کینو چھیلتے ہوئے بولا۔

”میری فی الحال فیوچر پلاننگ یہیں تک ہے۔“

”فٹ بال کی اس ٹیم کو خوار کرنے کے لیے پیدا کرو گے۔ اپنے جیسا شیف اور ڈرائیور بنائو گے انہیں۔“ فریا نے اس کے کندھے پر دھموکا جڑا۔

”یہ تو ان کے نصیب ہوں گے۔ وہ جیسے بھی بن جائیں۔“

”بکومت میں سیریس ہوں۔“

”میں بھی نان اور چنے لگا کر آرہا ہوں۔ نان سیریس نہیں ہوں۔“ وہ آدھا کینو زبر دستی فریا کو تھما کر لاپرواہی سے بولا۔

”مجھے کینو پسند نہیں ہیں۔ تم جانتے ہو۔“ وہ منہ بنا کر چھلے ہوئے کینو کو دیکھنے لگی۔



”شیر تو کرنا ہے۔ چاہے وہ بوائٹڈ ایک ہو، بریڈ کا پیس ہو، آسکریم کا کپ ہو، میرا دل ہو یا تمہارا دل۔“ وہ سرسری انداز میں گہری باتیں کرنے کا عادی تھا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ فریا حیران ہوئی۔

”ڈیر فری! اتنی چھوٹی اور عام سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے دل کا آدھا حصہ میرا اور آدھا تمہارا۔ اسی طرح تمہارے دل کا آدھا تمہارا اور آدھا میرا ویری سمپل۔“

وہ اپنا کینو کھا چکا تھا اور اب ایک ایک پھانک فریا کو زبردستی کھلا رہا تھا۔ حالانکہ وہ اس ہاف کینو کو دوسرے ہاتھ میں دبائے بیٹھی تھی اور حمزہ کو باتوں میں لگا رکھا تھا۔ تاکہ اس کا دھیان فریا کے ہاتھ کی طرف نہ جائے مگر وہ بھی تو حمزہ تھا۔ اور اس کی نظریں بھی فریا کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فریا کو کینو سخت ناپسند تھے۔

”مگر آدھا دل ہی کیوں؟ پورا کیوں نہیں۔“ اسے سخت اختلاف ہوا۔

”فری پیاری! تمہارے دل میں بھوسہ بھرا ہے۔ پورا دل مجھے دو گی تو دل کے بغیر زندہ کیسے رہو گی آدھا دل تمہارے پاس رہے گا اور آدھا میرے پاس۔ دونوں کا کام چلتا رہے گا۔“ وہ تیسری پھانک فریا کے منہ میں زبردستی ٹھونس کر بولا۔

”بس بھی کرو حمزہ! کھالو۔ اتنے کینو پسند ہیں تمہیں۔ جب بھی آتے ہو ایک دو اٹھا لاتے ہو۔“ فریا نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

”یہ تو تمہیں کھانا ہی پڑے گا۔“ وہ چوتھی پھانک اس کے منہ میں ڈالنا چاہتا تھا۔ جب فریا نے پاس رکھا ہوا کینو پورا اٹھا کر حمزہ کے منہ میں ٹھونس دیا اور خود بھاگ گئی۔ جبکہ حمزہ کینو منہ سے نکال کر چیختا ہی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”بہت دن ہو گئے ہیں مسٹر بین جو نئیر کو نہیں دیکھا۔“ وہ بڑے بڑے تھیلے اٹھائے ہانپ رہا تھا۔ فریا بھی اپنی مطلوبہ اشیاء اٹھائے اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی

آئی۔ اب وہ دونوں فٹ پاتھ پر رکھے بیچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تھے۔ جب اچانک حمزہ کو وقاص کا خیال آیا۔

”وہ کوئی تمہاری طرح فارغ ہے۔ اتنی بڑی پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔“ فریا نے اپنے بالوں کو کیچر سے آزاد کیا۔

”تمہارا کزن کچھ زیادہ ادھر کے چکر نہیں لگاتا۔“

”چکر، وہ تو ہمارے یہاں آنے سے پہلے سارا دن ہمارے گھر میں رہا کرتا تھا۔“ تھیلے میں سے دو چاکلیٹ نکالتے ہوئے فریا نے لاپرواہی سے کہا۔

”اچھی پرسنالٹی ہے وقاص صاحب کی۔“ حمزہ نے برا سا منہ بنا کر تعریفی جملے ادا کیے۔

”اچھی نہیں، بہت اچھی۔“

”اب ایسا بھی شہزادہ گلفام نہیں ہے۔“

”تم کیوں جیلس ہو رہے ہو؟“ فریا نے اسے چڑایا۔

”ہونہہ، مجھے کیا ضرورت ہے جیلس ہونے کی؟“

”مجھے تو جلنے کی سخت بو آرہی ہے۔“ وہ ایک چاکلیٹ کا ریپر پھاڑ کر حمزہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔

”مس ٹینا کی ہانڈی جل رہی ہوگی یا بنگالی جی تمہارے دیسی ککڑ کا بھرتہ بنا چکے ہوں گے۔“ حمزہ مزے سے بولا۔

”مجھے نا، محترم وقاص صاحب کے تیور اچھے نہیں لگ رہے۔“ حمزہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔

”کوئی بھی بات سیدھے طریقے سے مت کرنا۔“ فریا ناگواری سے بولی۔

”عنقریب یہ محترم اپنا پروزل تمہارے لیے بھجوا دیں گے۔ لکھوا لو مجھ سے۔“

”ہا۔ ہا۔۔۔“ فریا کا قہقہہ پھوٹ پڑا۔

”میں کچھ غلط نہیں بول رہا۔“

”تم کچھ اور نہیں بول سکتے۔“ اس نے ناگواری سے ایک دھپ حمزہ کے کندھے پر لگائی۔

”کچھ اور...“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں۔ مس ٹینا کوس رہی ہوں گی مجھے۔ یہ سارے مصالحہ جات لے کر جائوں گا، تب ہی دھواں گوشت، بھگارے، بینگن، کڑائی اور نجانے کیا کیا فضول سا پکے گا۔“

”دھواں گوشت یہ تو بڑی مزے کی ڈش ہے۔ ساتھ اگر ویجی ٹیبل پلائو ہو تو واہ مزہ آجائے۔ اور بھگارے بینگن کا بھی ایک اپنا ہی ٹیسٹ ہے۔ ساتھ ٹماٹر اور ہری مرچکی چٹنی کا ہونا بہت ضروری ہے اور...“ فریا خوب چٹخارے لے رہی تھی۔ جب حمزہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”بس کرو فری! تم تو لگتا ہے کھانے کیلئے جیتی ہو۔“ حمزہ کو پہلی ملاقات اور فریا کے ساتھ پہلا دیسی ڈنر یاد آگیا۔

”تو اور کیا۔“ وہ مزے سے پائوں جھلاتے ہوئے بولی۔

”اب ہمارے لیے جینا شروع کر دو۔“ فرمائش کی گئی تھی۔ فریا نے ہنسنا شروع کر دیا۔

”تم چائے کی فرمائش کر رہے ہو نا۔ فریا چائے پینا چھوڑ دو۔“ فریا نے ہنسی روک کر کہا۔

”تو چھوڑ دو یار!“ حمزہ نے دایاں ہاتھ دباتے ہوئے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔

”کیا چھوڑ دوں جینا...؟“

”بکو نہیں۔“ حمزہ نے دہل کر کہا۔ ”میں چائے کی بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔“

”اور تم کافی پینا چھوڑ دو۔“

”کیا یاد کرو گی۔ لو آج سے میں کافی نہیں پیوں گا۔“ حمزہ نے بلا کی سنجیدگی سے کہا۔

”تم کافی پینا چھوڑ دو گے؟ گاڑی پیٹرول کے بغیر نہیں چلتی اور تم کافی کے

بغیر۔“ فریا چیخ پڑی۔

”تم کہو گی تو نہیں پیوں گا۔ علاوہ ازیں دنیا کی کوئی طاقت مجھے کافی پینے سے

نہیں روک سکتی۔“

”مسز یزدانی کو یہ دیسی بدیسی ڈرائیور خاص مہنگا پڑا ہے۔ دن میں کئی کئی

مرتبہ کافی پیتے ہو۔ بریک فاسٹ میں بریڈ، ہنی اور فریش جوس لیتے ہو۔ لچ

میں ہری ہری سبزیاں کھاتے ہو۔ ڈنر میں سلیکٹو ڈش ہونی چاہئے۔ واہ جی، ایسا

ڈرائیور مسز یزدانی ہی انورڈ کر سکتی ہیں۔“ فریا نے صاف مذاق اڑایا۔

”مجھ جیسا لیٹ نائٹ سروس دینے والا آل رائونڈر ابھی پاکستان میں ملنا بہت

مشکل ہے۔“ فضول ہانکنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔

”یہ بات تو ٹھیک کہی۔ بیک وقت بہت سے فائدے حاصل کر رہی ہیں میڈم

تم سے۔“ فریا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ننا آج کل کیا کر رہی ہیں؟“ حمزہ نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

”تمہارے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔“ وہ جل کر بولی۔

”کیا؟“ حمزہ دہل کر رہ گیا۔ ”لڑکیاں؟ میں کسی فلم کا ڈائریکٹر نہیں ہوں۔ اتنی

لڑکیوں کی کاسٹ کو کہاں کھپائوں گا۔“

”فضول ہانکتے رہنا۔“ فریا برا مان گئی۔ ”ننا چاہتی ہیں۔ تم شادی کر لو۔ انہیں

تمہاری تنہائی کا بہت خیال رہتا ہے۔ ان کا بس چلے تو دو منٹوں میں تمہیں

گھر بار والا بنا دیں۔“

”میں تو تنہائی کو ترستا ہوں۔ میڈم کے نو بچے مجھے کب تنہا رہنے دیتے

ہیں۔ رات کے دو بجے بھی چھوٹے دونوں کو حمزہ بھائی کی یاد ستا رہی ہوتی

ہے۔“ حمزہ نے دہائی دی۔

”جب سے ننا نے خالہ خورشید کو بتایا ہے کہ لڑکا نیشنلیٹی ہولڈر ہے، تب

سے رشتوں کی لائن لگ گئی ہے۔“

”کیا سچ؟“ مارے خوشی کے حمزہ کے ہاتھ سے چاکلیٹ گر گئی۔

”کب آڈیشن لینا ہوگا؟“

”حمزہ! پٹو گے مجھ سے۔“ فریا نے تھیلا اٹھا کر اس کے بازو پر دے مارا  
”ننا خوا مخواہ تردد کر رہی ہیں۔ لڑکی تو ان کے گھر میں موجود ہے۔“ اس نے  
معنی خیزی سے آنکھیں پھیلائیں۔

”منہ دھو کر رکھو۔“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔

”صبح رگڑ رگڑ کر دھویا تھا۔ تازہ شیو بنائی ہے۔ آفٹر شیو لوشن کی خوشبو نہیں  
آ رہی۔“

”یہ عمر تمہاری شادی کی نہیں۔ بہت کچھ سیکھنے کی ہے۔ تمہاری اتج کے لڑکے  
فٹ بال کھیلتے ہیں۔ کرکٹ کے شیدائی ہوتے ہیں۔ سپورٹس کے دیوانے ہوتے  
ہیں۔ پڑھتے ہیں۔ کچھ بننے کا، کچھ کر دکھانے کا جنون ہوتا ہے۔“ فریا نے لگے  
ہاتھوں نصیحتوں کی پٹاری کھول دی۔

”ننا کو میرا ایک میسج پہنچا دینا۔“

”کیسا میسج؟“ اسے پوچھنا ہی پڑا۔ ”یہ کمبخت تجسس بھی نہ۔“

”یہی کہ میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈنے کا تردد نہ کریں۔ میں آل ریڈی ان کی  
نواسی پر ڈورے ڈال چکا ہوں۔“ اب وہ جینز کی پاکٹ سے خریدی ہوئی  
چیزوں کی لسٹ نکال کر دیکھ رہا تھا کہ کچھ رہ تو نہیں گیا۔ ورنہ پھر اسے  
مارکیٹ تک دوڑ لگانی پڑتی۔

”ننا بالکل نہیں مانیں گی، جب تک تم شیف بنے رہو گے۔“

”واہ کیوں نہیں مانیں گی۔ فیوچر میں انکی نواسی کو نت نئے کھانے پکا پکا کر  
کھلائوں گا۔ مجھ جیسا لڑکا ملنا بہت مشکل ہے۔“

”بہت خوش فہمی ہے۔“ فریا نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا۔

”آپ جو بھی سمجھ لیں۔“ وہ شان بے نیازی سے بولا۔ ”اوہ مائی گاڈ۔“ وہ کلائی  
پر بندھی نفس سی گھڑی پر ٹائم دیکھتا سر پر ہاتھ مار کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا ہے؟“



”ڈیر فری! تم بھی نا! اپنے ساتھ باندھ لیتی ہو۔ وہ مس ٹینا سی آئی ڈی کی پوری ٹیم لیے میرے پیچھے آجائے گی۔“

”اف، مجھے بھی یاد نہیں رہا۔ بنگالی جی ویٹ کر رہے ہوں گے۔ میں یوگرٹ لے کر جائوں گی، تب ہی فروٹ سیلڈ بنے گا۔“ فریا بھی حمزہ کے پیچھے بھاگی تھی۔

”حامے! آہستہ چل نا۔“ وہ چیخ رہی تھی۔

☆☆☆

”بنگالی جی! میرے اور حمزہ کے لیے کافی اور فری کے لیے چائے لے آئیے۔“ ننا نے حمزہ کو دیکھ کر بشاشت سے کہا تھا۔ آج وہ بہت دنوں بعد ادھر آیا تھا۔

”ننا جی! میں کافی نہیں پیوں گا۔“

”کیوں؟“ ننا حیران ہوئیں۔ جبکہ فریا نے ہنسی چھپانے کے لیے منہ کے سامنے کشن کر لیا۔

”کافی پر بین لگ چکا ہے۔“

”کس نے لگایا؟ کیا گورنمنٹ نے۔“ ننا اور بھی حیران ہوئیں۔

”گورنمنٹ نے کبھی بین اٹھایا ہے۔ محکمہ تعلیم پر بھی تو کچھ زیادہ ہی بین لگا رہتا ہے۔ کیا ضرورت ہے قوم کو ایک اچھا استاد دینے کی۔“ حمزہ سخت کبیدہ خاطر تھا۔

”یہ بات تو سو فیصد درست ہے۔“ فریا کو خود جاب نہ ملنے کا قلق تھا۔

”تم کافی کیوں نہیں پیو گے؟“ ننا ابھی تک وہیں اٹکی تھیں۔

”فریا کو پسند نہیں۔“

”وہ تو مجھے پتا ہے۔“ ننا حیران ہوئیں۔ ”یہ کبھی بھی کافی نہیں پی سکتی۔“

”فریا کو میرا کافی پینا پسند نہیں۔“ حمزہ نے وضاحت کی۔

”لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔“ ننا نے ناگواری سے کہا۔

”یہ تو ایسے ہی کہتی رہتی ہے۔ تم کافی ضرور پیو۔“ وہ خود کافی پسند کرتی تھیں۔ ”اگر کچھ چھوڑنا چاہتے ہو تو یہ شیف کی جاب چھوڑ دو۔ تم پر سوٹ نہیں کرتی۔“ تننا نے نرمی سے اپنی ناپسندیدگی واضح کی۔

”عنقریب ایسا ہی کروں گا۔“ حمزہ کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔  
 ”کیا مطلب؟“ فریا چونکی۔

”کچھ نہیں یار!“ وہ ہمیشہ کی طرح ٹال گیا۔

”کبھی کبھی تم بہت پر اسرار ہو جاتے ہو۔“

”مطلب مشکوک۔“ حمزہ نے فریا کے منہ کی بات چھین لی۔

”یس آف کورس۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ اس پر اسراریت کے پیچھے کوئی ریزن ہو سکتا ہے؟“ حمزہ

ہنستے ہوئے گہرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔“

”سیاستدانوں والے جواب مت دیا کرو۔“ بنگالی جی سموسوں سے بھری پلیٹ فریا کو تھما گئے تھے ان کو آفر کرنے کے بعد خود کھانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ حمزہ اور تننا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

”جمہوریت کا یہی پیغام ہے۔“ حمزہ نے طنزیہ کہا۔  
 ”کون سا پیغام؟“

”وہ جو مجھے اور تننا کو نظر آرہا ہے۔“

”آپ دونوں کو کیا نظر آرہا ہے۔؟“ فریا نے ہونقوں کی طرح انہیں دیکھا۔

”یعنی ہمیں ایک ننھی سی سموسی سے بہلا کر پوری پلیٹ اپنے سامنے رکھ کے

خود کھانے میں جت گئی ہو۔ دراصل جمہوریت کا بھی یہی میسج رہا ہے۔“ حمزہ

نے گل افشانی کی۔ ”لوٹ مار چھین شاد باد‘ مرکز حسین شاد باد۔“

”مجھے نظر مت لگانا۔“ فریا نے فوراً پلیٹ سائیڈ پر کر لی تھی۔

”تمہیں نظر نہیں لگائوں گا۔ بس یہ آٹھواں سموسہ مت کھانا۔“

”حامے! تو میرا کھایا پیا گئے گا۔“ وہ چیخی۔

”میری کیا مجال؟“ اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”اس کاؤنٹنگ کا کیا مقصد ہے۔؟“ وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو چکی تھی۔

”صرف یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اگر تم لیڈی نینی کی بیکری کا چارج سنبھال لو تو بیکری میں سیل کرنے کے لیے فوڈ پراڈکٹ میں کچھ نہیں بچے گا۔“ حمزہ نے قہوے کا آخری سپر لے کر تاسف سے کہا۔

”اور لیڈی نینی میرا قیمہ بنا دے گی۔“ وہ آخری سموسہ منہ میں رکھتے ہوئے مزے سے بولی۔

”اور میں اس قیمے کے کوفتے اور کباب بنالوں گا۔“

”حامے! بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔“

”اچھی محبت کا اثر ہے۔“ وہ برجستگی سے بولا۔

”بھول گئے ہو اپنا رونا دھونا۔ مس ٹینا سے بے عزتی کروا کر بیچ پر بیٹھے رو

رہے تھے۔ اگر میں نہ دیکھ لیتی تو ساری رات بھوکے پیاسے کڑھتے رہنا تھا۔“ فریا بھی جتانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

”احسان عظیم ہے۔ کیسے اتاروں گا اس پہاڑ جتنے احسان کا بدلہ۔“

”اتار سکتے ہو۔“ فریا نے ٹشو سے ہاتھ پونچھ کر مزے سے کہا۔

”وہ کیسے؟“

”مجھے لائبریری چھوڑ آؤ“

”کیا مطلب؟ ایک سموسہ کھلانے کے بعد اتنی بڑی سزا۔“ حمزہ نے دہائی دی۔

”بکو نہیں۔ مسز یزدانی کے ڈرائیور بنے رہتے ہو۔ سارے شہر میں لور لور

پھرتی ہیں۔“

”مفت میں نہیں گھماتا۔“ وہ جو گرز کے تسمے کستا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”اتنے مہنگے جوتے اور کپڑے اور یہ سویٹر بھی امپورٹڈ لگ رہا ہے۔ شکل سے ڈرائیور لگتے نہیں ہو۔“ فریا اپنا شولڈر بیگ چیک کرتے ہوئے بولی۔

”ابو نے لے کر دیے تھے۔ ورنہ میں تو خواب میں بھی انہیں خرید نہیں سکتا تھا۔“ وہ صاف گو تھا اور اس کی صاف گوئی کی فریا دیوانی تھی۔

”تم جانتے ہو۔ مجھے تم میں کیا چیز ایسی دکھائی دی، جو میں، میں نہیں رہی ہوں تم بن گئی ہوں۔ تمہارا دل بن گئی ہوں۔ جو اس سینے میں ہلچل مچا رہا ہے۔“ فریا نے گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اس کے سینے پر رکھی۔

”ون سی چیز؟“ کچھ پل کے لیے حمزہ فریز ہو گیا تھا۔

”تم سچے ہو۔ مجھے صرف دو قسم کے لوگ بے حد پسند ہیں۔ ایک وہ جو سخت جان ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی مشقت کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ محنت سے گھبراتے نہیں۔ بلکہ پہلا قدم اٹھا کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے والے میرے آئیڈیل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کی جدوجہد میں کبھی پیچھے نہیں

رہتے۔ کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں نہیں رہتے۔ مجھے ایسے لوگ ہی پسند ہیں، جو لوہا کوٹنے سے لے کر گارا ڈھونے تک ہر کام شوق سے کرتے ہیں۔ شرم محسوس نہیں کرتے۔ ایسے لوگ تکبر سے پاک ہوتے ہیں۔ تم میں ان دونوں قسم کے لوگوں والی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ہمیں سچ بولتے رہنا ہے۔ محبت اور وفا میں بس یہی شرط لازم ہے۔“

”فری کیا تم خود کار ڈرائیو کر کے لائبریری نہیں جاسکتیں۔“ ایک دم حمزہ سر سے لے کر پیر تک منجمد ہو گیا تھا۔

”حمزہ! تم ٹھیک ہو نا؟“ فری اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

”پلیز فری نو کوئی سچین۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر نرمی سے کہا۔

”تم اندر چلو مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

”فری! پلیز میرا ہاتھ چھوڑو میں چلتا ہوں۔“ وہ نرمی سے فریا کے ہاتھ میں دبا اپنا ہاتھ چھڑانے لگا۔

”مگر حمزہ!“

”نو اگر مگر، ہم شام کو ملیں گے۔ میں تمہیں شام کو لائبریری لے جاؤں گا۔ پلیز فری! مائنڈ مت کرنا۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بیرونی گیٹ عبور کر گیا۔ جبکہ فریا حیران پریشان سی برآمدے کی سیڑھیوں پر بے دم سی بیٹھ گئی۔

☆☆☆

”کیا ہوا تھا دوپہر کو۔ کیوں چلے گئے تھے اچانک؟“ وہ اسے لائبریری لے جانے آیا تھا۔ ایپرن باندھے۔ ہاتھوں پر نجانے کیسے کیسے مسالہ جات لگے ہوئے تھے۔ الجھے سلجھے بال۔ فریا نے غور کیا۔ اس تمام عرصے میں پہلی مرتبہ فریا نے اسے سوچوں میں گم پریشان پریشان دیکھا تھا۔

”کیا ہوا تھا؟“ وہ احتیاط سے ٹرن لے رہا تھا۔

”حامے! اتنے انجان مت بنو۔“ فریا خفا ہوئی۔

”مجھ سے شیئر کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ دوستی کے ایگریمنٹ پر یہ واضح حروف میں لکھا تھا۔ ہاف کینو۔ ہاف ایک۔ ہاف بریڈ، کہاں تو ہر چیز شیئر کرنے پر تلے ہوتے تھے۔“

”فری! تمہیں زردہ بنانا آتا ہے؟“ وہ نجانے کس الجھن میں پھنسا ہوا تھا۔

”زردہ؟“ فریا کو شدید غصہ آیا۔ ”یہ بیچ میں زردہ کہاں سے آگیا۔ میں تم سے کیا پوچھ رہی ہوں۔“

”بتاؤ نا فری!“ وہ کافی ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ شاید وہ بہت جلدی میں تھا۔

”گاڑی چلا رہے ہو یا جہاز؟“

”جہاز اڑاتے ہیں۔“ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”جہاز اڑاتے ہیں۔“

”بتانے کا شکریہ۔“ فریا جل کر بولی۔

”تم بھی مجھے زردے کی ریسپی بتا کر شکریے کا موقع دو۔“ وہ شاید مسکرایا

تھا۔



”مجھے نہیں بنانا آتا۔“

”میں بنگالی جی سے پوچھ لیتا تو بہتر ہوتا۔“

”تو پوچھ لیتے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ناراضی صاف ظاہر تھی۔

”پلیز فری! بتادو نا۔“ حمزہ خوشامدی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

”یہ ننھی سی جان شکنجے میں پھنس گئی ہے۔ یہ سارا کیا دھرا میرا ہی ہے۔“ وہ خود کو کوس رہا تھا۔

”ہوا کیا ہے؟“ فریا زیادہ دیر بے نیاز نہیں رہ سکتی تھی۔

”مس ٹینا دفعان ہو گئیں۔“

”کہاں؟“ فریا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”کراچی۔ کسی اور جگہ سے آفر کیا ملی، مخترمہ نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ میڈم نے مجھے کچن میں کھپا دیا۔“ وہ سخت مشتعل تھا۔ ”میڈم کی بیچی نے مجھے پیدائشی خانساماں یا خاندانی نائی سمجھ رکھا ہے۔ نجانے کیسی کیسی ڈشز

کے نام گنوا دیے۔ زردہ، کچنار گوشت، کریلے کی بھجیا، نجانے یہ کریلے کی بھجیا کیسے بنتی ہے۔“

”اف مائی گاڈ!“ فریا ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

”اڑا لو مذاق۔“ وہ بغیر برا منائے مزے سے بولا۔

”تمہارے اس مسئلے کا حل میرے پاس ہے۔“ فریا نے چٹکی بجا کر سیل فون پر ایک نمبر پریس کیا۔

”کس سے بات کرنے لگی ہو؟“ حمزہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”شی“ اس نے حمزہ کے لبوں پر انگلی رکھ کے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

”او۔“ فریا بات کر چکی تو حمزہ نے اطمینان بھرا سانس خارج کیا۔

”آج تو بنگالی جی بنا دیں گے۔ آئندہ بھی اگر میڈم کی زبان تمہاری طرح چٹخارے لینے لگی تو میں کیا کروں گا؟“

”پھر بھی بنگالی جی ہیں نا؟“

”جیو فریا عتیق!“ وہ مطلوبہ جگہ گاڑی پارک کر چکا تھا۔ ”میں تمہارا ویٹ کروں یا جائوں؟“

”میرے ساتھ اندر آجاؤ۔“

”پڑھے لکھے ادبی لوگوں میں میرے جیسے بے ادب کا کیا کام۔ چلتا ہوں، ایک گھنٹے بعد آؤں گا۔“ وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔

”حمزہ! سنو تو۔ حامے او حامے!“ وہ چیختی رہ گئی تھی۔ مگر وہ حمزہ ہی کیا جو سن لیتا۔

اپنی مطلوبہ کتابوں کو دیکھ رہی تھی جب وقاص نے اسے دیکھا اور قریب چلا آیا۔ ”تم یہاں؟ وقت کیسے نکالا۔ تنہا نظر آرہی ہو، کیا وہ برٹش شیف چلا گیا۔“ وقاص نے چھوٹے ہی کافی چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”وقاص!“ فریا نے کافی ناراضی سے اسے دیکھا۔

”حمزہ کے بارے میں اس لہجے میں بات مت کرو۔“

”کیوں؟“ وقاص کی بھنویں تن گئیں۔ ”پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ مسٹر شیف سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“

”وہ ہی جو تم سے ہے یعنی دوستی کا۔“ فریا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”وہ بہت بے ضرر اور مخلص ہے۔“

”اچھا...“ وقاص نے طنزیہ انداز میں ہونٹ سکیرے۔ ”اس نے خلوص کے بڑے بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ یا خلوص کی بوریاں بھر بھر کر لایا ہے یو کے سے۔“ وہ چبا چبا کر بولا۔

”پلیز وقاص! تمہاری حمزہ سے کوئی دشمنی ہے کیا؟“

”رقیب لگتا ہے مجھے۔“ وہ جل بھن کر بولا۔

”رقیب کیا تمہارا کوئی دوست ہے۔“ اس نے بلا کی معصومیت سے پوچھا۔

”میرا نہیں وہ تمہارا دوست ہے۔“ وقاص نے دانت پیس ڈالے۔ ”یو کے

والا۔“

”حمزہ کی بات کر رہے ہو؟“

”جی ہاں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لائبریری سے باہر نکل آیا تھا۔

”میری کتابیں۔“ فریا چیختی رہی۔

وہ روڈ کراس کر کے ایک کیفے ٹیریا میں گھس آیا تھا۔ فریا بھی اس کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔

”یہاں کیوں لائے ہو؟“ وہ ناراضی سے بولی۔

”تمہارے ساتھ چائے پینے کو دل چاہ رہا تھا۔“ وقاص نے طنز کے تیر

پھینکے۔ ”بات کرنی ہے تم سے دو ٹوک۔“

”یہ جو حمزہ ہے نا! مسز یزدانی کا شیف۔ ایک نمبر کافراڈ ہے۔ لکھوالو مجھ

سے۔“ وقاص حد درجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”تم سے کس نے کہا؟“

”میں آنکھیں رکھتا ہوں۔ سوچنے کے لیے ایک عدد دماغ بھی ہے۔“ وقاص

نے ویٹر کو چائے لانے کا آرڈر کیا تھا۔

”کنجوس آدمی! میں شوارما کھاؤں گی۔ چائے تم خود پیو۔“ فریا کی بھوک ایک

دم بیدار ہو گئی تھی۔ ”چپس بھی منگوائو۔“ اس نے تحکم سے کہا۔

”اوکے جناب!“ وقاص نے ویٹر کو پھر سے آواز دے کر آرڈر نوٹ کروا

دیا۔

”تم حمزہ کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔“ کچھ دیر بعد وہ شوارما کھاتے

ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے لکھوالو یہ حمزہ نہ بے ضرر ہے

نامعصوم۔ اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ عجیب چمک سی ہوتی ہے اس کی آنکھوں

میں۔ شکل سے ہی پراسرار لگتا ہے۔ تم نجانے کس دنیا میں رہتی ہو۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ فریا بھی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”بہت عظیم نقصان سے دوچار کرے گا تمہیں۔“ وقاص نے سامنے رکھی جائے کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

”کیسا نقصان؟ زیور چرائے گا؟ ڈاکہ ڈالے گا؟ کیا کرے گا وہ۔“ فریا سخت مشتعل ہو گئی تھی۔ ”تمہیں لگتا ہے حمزہ اس طرح کر سکتا ہے؟“

”ہاں۔ ڈاکہ تو وہ ڈالے گا۔ لوٹے گا ضرور مگر تمہارے دل کو۔ مجھے سب نظر آرہا ہے۔“ وقاص نے لب کچل کر کہا۔

”تمہیں جو کچھ نظر آرہا ہے اگر درست ہوا تو پھر؟“ فریا کے چہرے پر ٹھٹکا دینے والی سنجیدگی پھیل گئی تھی۔

”تو پھر کیا؟“ وقاص کا گویا میٹر گھوم گیا۔ ”تم اپنے لیے معمولی سے شیف کو سلیکٹ کرو گی۔ جس کا کوئی فیوچر نہیں۔ کوئی اکیڈمک ریکارڈ نہیں۔ کوئی نام و نشان نہیں۔ حسب نسب نہیں۔ خاندان نہیں۔ حتیٰ کہ زندگی کی بنیادی

ضروریات فراہم کرنے کے لیے پیسہ تک نہیں۔ افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہارے انتخاب پر۔“

”اگر بات پیسے کی نکلی ہے تو میں وضاحت کر دیتی ہوں۔ یہ بات میں تم سے چند دن پہلے شیئر کرنے والی تھی۔ وقاص!“ فریا تذبذب کے عالم میں کچھ پل کے لیے خاموش رہی۔ ”مجھے اس معمولی سے محمد حمزہ سے محبت ہو گئی ہے۔ نجانے کب، کس لمحے؟ کس گھڑی مگر میں خود کو اس معاملے میں بے بس پاتی ہوں۔“ وہ ہونٹ کا کونا کچلتے دھیرے دھیرے کہتی رہی۔

”فری! فری تم سوچو، رہن سہن، طرز رہائش، کہیں بھی وہ تمہارے ہم پلہ نہیں ہے۔ کیا دیکھا ہے تم نے اس۔۔۔۔۔ امپچور سے لڑکے میں۔“ وقاص گویا پھٹ پڑا۔

”اور فری! میری بات ذہن نشین کرلو۔ جو وہ نظر آتا ہے وہ ہے نہیں، پر تیں چڑھا رکھی ہیں اس نے خود پر۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ فریا نے بے بسی سے پوچھا۔

”اس نے تمہیں بتایا کہ وہ برطانوی نیشنلیٹی ہولڈر ہے اور تم نے یقین کر لیا۔ ایسا کچھ نہیں ہے اس کے پاس برطانیہ کا ویزا ہوتا تو اسے ایک دو ٹکے

کی ملازمت کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ چند ہزار کمانے کے بجائے پونڈز گنتا۔ احمق! وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ ننا اور تمہیں تنہا جان کر کوئی بڑا چکر چلائے گا۔ پیسہ ہتھیا ئے گا یا تمہیں۔“

”بکواس مت کرو وقاص!“ فریا کا چہرہ یک لخت رنگ بدل گیا۔

”حمزہ کے بارے میں تم بہت غلط سوچ رہے ہو۔ حمزہ ایسا نہیں، ہو ہی نہیں سکتا۔“

”تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھ چکی ہے۔ نام نہاد محبت کی پٹی۔“ وقاص نے بے بسی سے اپنی پیشانی پر مکا مارا۔ ”ایک آخری بات سن لو، وہ ایک امیچور لڑکا ہے۔ تم سے دو برس چھوٹا۔ یاد رکھنا ابھی وہ پانی پر کھڑا ہے۔ قدم جمانے کے لیے اسے سنگلاخ زمین چاہئے۔ تم اگر زمین کا ذرا سا حصہ پیش کر دو گی تو وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما لے گا اور پھر لمبی اڑان بھرے گا۔ اس طرح کہ فریا عتیق ہاتھ ملتی رہ جائے

گی۔ ایک اچھے دوست کا مخلصانہ مشورہ ہے۔ ابھی سے خود کو روک لو۔“

”میرے اچھے دوست شوارما کھلانے کا شکریہ۔“ وہ سر جھٹک کر ماحول پر چھائی کثافت کا اثر زائل کرنے کے لیے بولی۔

”تمہارے شکریے کا شکریہ، اٹھو۔ تمہار مسٹر شیف آگیا ہے۔“ وقاص گلاس ونڈو سے باہر دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

”ایک بات تو واضح ہو گئی۔ میں تمہاری زندگی اور دل میں کہیں نہیں۔“ بل پے کرنے کے بعد وہ فریا کی طرف دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ”بہر حال میری گڈوشز اپنی سب سے اچھی دوست کے لیے۔ خدا کرے، یہ دیسی انگریز تمہارے حق میں بہتر ثابت ہو۔“

وہ دونوں ایک ساتھ کیفے سے باہر آئے تھے۔ فریا نے غور نہیں کیا تھا۔ ورنہ حمزہ کے ماتھے پر ناگوار سلوٹوں کو دیکھ کر ضرور ٹھٹک جاتی۔

☆☆☆

”میں تمہیں لائبریری چھوڑ کر گیا تھا اور تم برآمد کیفے سے ہوئی ہو۔ وہ بھی وقاص کے ہمراہ۔“ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولا تھا۔



”وقاص مجھے زبردستی لے گیا تھا۔“ وہ اپنا بیگ کھنگالتے ہوئے لاپرواہی سے بولی۔

”کیا کیا باتیں ہوئیں؟“

”تم ہی موضوع گفتگو رہے ہو۔“ فریا نے مسکراہٹ دبا کر بتایا۔

”کیا کیا میری شان میں فرماتے رہے ہیں وقاص صاحب؟“ حمزہ کا انداز طنز سے بھرپور تھا۔

”بتاؤ نا؟“ اس نے اصرار کیا۔

”وقاص نے تمہیں پرپوز کیا ہو گا۔“ اس نے قیاس آرائی کی۔

”وقاص کو مجھے پرپوز کرنے کے لیے کینے لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنا پرپوزل گھر بھجوا سکتا ہے۔“

”ہوں...“ حمزہ نے ہنکارا بھرا۔ ”تو پھر ایک گھنٹہ جھک مارتا رہا ہے۔ سیاست

پر گفتگو کرتا رہا ہے۔ ملکی حالات کے بارے میں فکر مند تھا۔“

”ملکی حالات کے لیے تو نہیں البتہ میرے لیے فکر مند تھا۔“ فریا نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے آہستگی سے بتایا۔

”اچھا...“ حمزہ کے چہرے پر بھی تبسم پھیلا۔ ”وہ کیسے؟“

”وقاص سمجھتا ہے کہ تم بہت بڑے فراڈیئے ہو۔ میرے دل کو چرا لو گے۔“

”اسے بتا دینا تھا نا کہ میں آل ریڈی یہ کام کر چکا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”بتا دیا ہے۔“

”او۔ اب۔ سمجھا۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ ”تب ہی میں کہوں

وقاص صاحب مجھے کھا جانے والی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔“ وہ

تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔ فریا نے مزید بتایا۔

”وہ بہت پریشان تھا۔“

”کس بات پر؟“ وہ حیران ہوا۔

”میرے انتخاب پر۔“

”امیزنگ۔“ حمزہ نے گویا لطف اٹھایا۔ ”پھر تم نے کیا کہا؟“

”یہی کہ مسٹر شیف مجھے ہر حال میں قبول ہے چاہے وہ اینٹیں ڈھوئے یا سریا کوٹے۔“

”اور؟“ حمزہ نے گاڑی کی رفتار مزید آہستہ کر لی۔

”وقاص کہتا ہے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ تمہارا تعلق یو کے سے نہیں ہے۔ تم نے اپنے متعلق پوری داستان نشر کی ہے۔“

”وقاص کو سی آئی ڈی میں ہونا چاہئے تھا۔“ حمزہ نے قہقہہ لگایا۔ ”بہر حال ایک دوست اور کزن ہونے کے ناطے تمہارے لیے اس کی یہ فکر مندی قابل اعتراض نہیں ہے۔“

”حامے! یہ گاڑی ہے۔ گدھا گاڑی نہیں۔ اسپید بڑھائو۔ پوری رات یہ سڑک ہی روندنی ہے کیا؟“ فریا نے ایک دھپ اس کے کندھے پر رسید کی۔

”اوہو سوری۔ حمزہ نے اسپید مزید کم کر دی۔“

”حامے!“ فریا نے زوردار گھوریوں سے اسے نوازا۔ حمزہ نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے اسپید بڑھا دی۔

”تم میرے ساتھ لنچ کرو گی؟“ گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

”مسٹر یزدانی کے گھر؟“ وہ حیران ہوئی۔

”نہیں۔“ کسی بھی ہوٹل میں۔

”نیکسی اور پوچھ پوچھ۔“ وہ مسکرائی۔ ”بائی دا وے تم مجھے باقاعدہ پرپوز کرنے کا پروگرام تو نہیں بنا رہے۔“

”کچھ یہی سمجھ لو۔“ حمزہ نے مبہم انداز میں کہا۔

”اچھا۔“ فریا ہنستی چلی گئی۔ ”اس کے لیے ہوٹل میں لنچ کرنا ضروری ہے؟“

”اتنا خاص ضروری بھی نہیں۔ وہ تو میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ خالی خولی باتوں سے تم کہاں سیر ہو گی۔“ وہ اس کے چٹورے پن سے اچھی طرح واقف تھا۔

”اور تم مجھ سے کون سے ڈائلاگز بولو گے؟“ فریا آنکھوں سے بہتا پانی صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ول یو میری می...؟“ وہ بڑے بھرپور انداز میں کہہ رہا تھا۔

”اور میں کیا کہوں گی؟“

”یہ تو تم ہی بتا سکتی ہو۔“ حمزہ نے کندھے اچکائے۔

”اگر میں انکار کر دوں؟“

”تو میں ٹیرس سے چھلانگ لگا کر خودکشی نہیں کروں گا۔“ وہ اپنے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا۔ ”ویسے تم انکار کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہو۔ جو میری فیملنگز ہیں کیا پتہ تمہاری نہ ہوں۔“

”بکو نہیں۔“ وہ خفا ہوئی۔ ”انکار کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“

”تمہارے جیسی عالم فاضل، ویل ایجوکیٹڈ لڑکی میرے جیسے واجبی تعلیم یافتہ آدمی سے شادی کیسے کرے گی۔ بات تو سوچنے کی ہے۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور ریزن؟“ فریا اور بھی خفا ہوئی۔

”ایک وجہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ آئی ایم آشیف،“ وہ سفاکی کی حد تک صاف گو تھا۔ ”یہ حوالہ ایک آنرڈ فیملی کے لیے کوئی فخر کا باعث نہیں۔“

”فار گاڈ سیک حامے! تم بھی نابدھو ہو ایک دم۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔ ”میں ان ساری وجوہات پر لعنت بھیجتی ہوں۔ مجھے کمتر پروفیشن رکھنے والے لوگ برے نہیں لگتے۔ البتہ مجھے احساس کمتری کے مارے ہوئے لوگ زہر سے بھی برے لگتے ہیں۔“

”مگر ہمارے اس معاشرے میں جوتا گانٹھنے والے موچی، کپڑے دھونے والے دھوبی اور برتن بنانے والے کمہاروں کو کسی خاص قدر اور عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، کجا کہ ایسے لوگوں میں رشتہ داری کرنا۔“ وہ سسٹم کی ایک بہت بڑی خرابی پر تنقید کر رہا تھا۔

”مائی گاڈ! تم کون سا پیدائشی خانساں ہو۔ یہ تو مجبور ی اور وقت کی بے رحمی نے تمہیں شیف بنا دیا ہے۔“

”تم میرے بارے میں ہمیشہ نرم الفاظ استعمال کرتی ہو۔ اس لیے کہ تمہارے دل میں میرے لیے بہت جگہ ہے۔ تمہارے ارد گرد رہنے والے اتنے اعلیٰ ظرف نہیں ہوں گے“ وہ ایک اور حقیقت کو بے نقاب کر رہا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر میرا پروزل ننا کے سامنے پیش کیا جائے تو ان کا رد عمل کیا ہوگا؟“ وہ بہت غور سے فریا کے رنگ بدلتے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم تو سوچ میں پڑ گئی ہو۔ سوال کیا بہت مشکل ہے فری!“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ”چلو میں ہی جواب دے دیتا ہوں۔ ننا انکار کر دیں گی۔ کیا پتا ان کا رویہ کسی قدر انسٹنگ بھی ہو۔ مجھے کتنا برا بھلا کہیں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“ فریا نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بڑے مضبوط انداز میں کہا تھا۔

”اب ضرور ہو گا، اگر تم ننا کو مجبور کروگی تو انہیں ماننا ہی پڑے گا۔“

”تم منہ دھو کر رکھو۔ ایسے بھی شہزادہ گلغام نہیں ہو جو میں تمہاری خاطر ہر محاذ پر لڑتی رہوں۔“ وہ جان بوجھ کر اسے چڑا رہی تھی۔

”تم ایسا کروگی اور ضرور کروگی۔“ حمزہ کے لہجے میں دو طرفہ محبت کا یقین بول رہا تھا۔

”اچھا۔ بڑا یقین ہے۔“ فریا کچھ سنجیدہ ہوئی۔

”یقین تم پر نہیں۔ اپنے خالص جذبے پر ہے۔ اس، لگن ہمت اور استقلال پر

ہے۔ میرے جیسے ثابت قدم اور اپنے ارادوں میں پختہ لوگ کم کم ہوتے ہیں۔ شرط یہ کہہ رہا ہوں۔“ اس کے انداز ایک دفعہ پھر ناقابل فہم ہو گئے۔

”کبھی کبھی سچ مچ تم پر اسرار لگتے ہو۔“ فریا نے جھرجھری لی۔

”اچھا۔“ وہ مسکرایا تھا۔ گویا اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ اس میں پر اسراریت کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ ”چلتا ہوں۔“ وہ پلٹنے لگا۔

”بغیر کافی پیسے؟“ فریالگٹ تک اس کے پیچھے آئی تھی۔

”تمہارے اور کافی کے بغیر جینے کا عادی تو ہونا پڑے گا۔“ وہ گیٹ عبور کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

”ناراضی ممی ڈیڈی سے ہے اور بات تم مجھ سے نہیں کر رہیں۔“ حمزہ بچوں کو پارک لے کر آیا تھا۔ بچے کھیل کود میں مصروف تھے اور وہ دونوں واک کر رہے تھے۔ آج موسم بھی بلا کا دلفریب تھا۔ ”میری ممی، ڈیڈی سے کوئی ناراضی نہیں۔“

”تو پھر کیا وجہ ہے؟ کیوں موڈ آف ہے؟“

”ننا چاہتی ہیں کہ میں وقاص سے شادی کر لوں۔ وہ میچور ہے، اسٹیبلش ہے، جبکہ تم...“ وہ بے بسی سے لب کچلنے لگی۔

”تمہاری ننا سے بات ہوئی؟“ وہ ایک دم ٹھٹک گیا۔

”ننا کہتی ہیں کہ تم کسی بھی لحاظ سے میرے لیے پرفیکٹ نہیں ہو۔ یاد رہے یہ ننا کا خیال ہے۔“

”اور تم...؟“ حمزہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میرے اقرار کی کیا ابھی ضرورت ہے؟“ وہ اداسی سے پوچھنے لگی۔ ”ننا کہتی

ہیں میں لاابالی ہوں۔ مجھ میں بچپنا ہے۔ میچوریٹی کی کمی ہے۔ ننا کہتی ہیں۔ ڈگریاں لینے سے شعور ہاتھ نہیں آتا۔ عمر کی بتدریج منازل طے کرنے کے بعد ہی شعور اور میچوریٹی حاصل ہوتی ہے۔“

”ننا غلط کہتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا۔ ان کا اپنا پوائنٹ آف ویو ہے۔“ حمزہ نے کچھ دیر سوچ بچار کے بعد کہنا شروع کیا۔

”لیکن شعور اور میچوریٹی عمر کے محتاج نہیں ہوتے۔ جیسے علم ڈگریاں جمع کرنے سے نہیں ملتا۔ میں نے ایسے ایسے فصیح و بلیغ گفتگو کرنے والے لوگ دیکھے ہیں جنہوں نے کسی درسگاہ سے کوئی سبق نہیں لیا اور ان جیسا عالم فاضل یونیورسٹی آف امریکہ کا فارغ التحصیل بھی نہیں ہوگا اور رہی شعور



، آگہی اور ادراک کی بات تو ذہن کی ایک خاص کھڑکی کھلنے کی دیر ہوتی ہے۔ بعض لوگ لڑکپن میں جوان اور جوانی میں بوڑھے ہو جاتے ہیں جیسے کہ میں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں چالیس سال کا سفر طے کر چکا ہوں۔“ وہ فریا کے چہرے پر نظر جمائے کھڑا تھا۔ اور فریا دم بخود تھی۔ وہ ایسا ہی تھا پل پل میں حیران کر دینے والا۔

”زندگی کے اسباق بڑھتی عمر نہیں۔ بھاگتی دوڑتی گھڑی کی سوئیاں نہیں، بلکہ حالات بہت اچھی طرح سے پڑھاتے ہیں۔ سکھاتے ہیں۔ زندگی جینے کا ہنر کسی کسی کو آتا ہے۔ کم از کم مجھے اور میرے باپ کو کبھی نہیں آیا۔ جنہوں نے یہ ہنر پالیا، وہ وہ دوسروں کے خوابوں کو پیروں تلے روند کر زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے اور پیچھے رہ گئے۔ میرے باپ جیسے لوگ۔ جو ایک تیز رفتار معاشرے میں محنت اور مشقت کی چکی میں پسنے کے باوجود بھی کئی صدیاں پیچھے تھے۔ ہے نا حیرت کی بات۔“

”حمزہ! تم کیا ہو؟ میں کبھی بھی تمہیں سمجھ نہیں سکی اور لگتا ہے کبھی سمجھ نہیں پائوں گی۔“ وہ سچ مچ سخت حیران تھی۔

”میں ریشم کا ایسا دھاگہ ہوں، جسے جتنا سلجھاؤ گی اتنا ہی الجھے گا۔“ حمزہ دھیرے سے مسکرایا۔

”اچھا یہ بتاؤ، تم نے ننا کو کیا جواب دیا؟“

”انکار۔ میں نے انکار کر دیا۔“ وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھ پر انکشاف کیا گیا ہے کہ وقاص سے میری بات کافی عرصے سے طے ہے۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ویسے تو ایک لحاظ سے یہ پریپوزل تمہارے لیے بیسٹ ہے۔“

”حمزہ! خبردار جو فضول ہانکنے کی کوشش کی۔“ اس نے وارننگ دی تھی۔

”ننا ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“ حمزہ نے تاسف سے کہا۔

”تم بلا کی جذباتی اور امیچور ہو۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”اور تم خود کیا ہو؟“ فریا نے تنک کر پوچھا۔

”مجھے تم اتنی آسانی سے سمجھ نہیں پائو گی،“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

”کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ میں نے تم سے محبت کیوں کی۔“

”سوچنے کے لیے اچھا ٹاپک ڈھونڈا ہے۔ کافی بہتر وقت گزر جاتا ہو گا۔“ وہ

پھولوں کی باڑ سے ایک پھول توڑ لایا۔

”اتنے پیارے پھول کو کیوں شاخ سے توڑا؟“ فری نے تاسف سے کہا۔ ”اپنے

مقام سے ہٹ کر تنہا اور ادھورا لگنے لگا ہے۔ پھول ہمیشہ شاخوں پر ہی اچھے

لگتے ہیں۔“ فریا کو تو گلدان میں تازہ پھول سجانا بھی ناپسند تھا۔

”فلاسفر صاحبہ! آئم ایم سوری، آئندہ یہ گناہ عظیم نہیں کروں گا۔“ حمزہ نے

اس کے دونوں کانوں کو پکڑ لیا۔

”اٹس اوکے، ہم نے تمہیں معاف کیا۔“ وہ شان بے نیازی سے بولی۔

”اپنے ظرف کو ہمیشہ اسی طرح وسیع رکھیے گا۔“ فرمائش کی گئی۔ فریا نے

آنکھیں پھیلا کر استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

”میری غلطیوں پر در گزر کرتی رہنا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”غلطی کرو گے تو معاف کر دوں گی۔ غلطیاں دہرائو گے تو کبھی معاف نہیں

کروں گی۔“ اس نے وارننگ دی۔

”تم بہت سادہ اور معصوم ہو فریا!“

”اور تم مجھے کافی چالاک لگتے ہو۔“ فریا نے قہقہہ لگایا۔ حمزہ بھی مسکرا دیا۔

”کبھی کبھی میں حیرانی سے سوچتا ہوں۔ میں اس بیچ پر بیٹھا تھا جب تم نے

پہلی دفعہ مجھے دیکھا تھا اور ٹھہر گئی تھیں اور بھی بہت سے لوگوں کی طرح

مجھے نظر انداز کر کے پاس سے گزر جاتیں تو ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے

قریب نہیں آسکتے تھے۔“ وہ دونوں اپنی کالونی کی روڈ پر آچکے تھے۔

”مگر میں ٹھہرتی کیوں نا؟ مجھے تو اسی موڑ پر ٹھہرنا تھا۔ رکنا تھا۔“ وہ خود بھی شاید پہلی ملاقات سوچنے لگی تھی۔

”فری میں عنقریب ننا سے فائنل بات کرنے والا ہوں۔“ حمزہ کے چہرے پر ایک دم کئی تاثرات ابھر آئے تھے۔

”اتنی جلدی؟ نہیں حامے! ابھی نہیں۔“ وہ گویا چیخ پڑی۔

”میرے پاس وقت بہت کم ہے فری! مجھے ان ہی دنوں میں ننا سے بات کرنا ہوگی۔ آئندہ کالائج عمل تیار کرنا ہوگا۔“ اس کی آواز سرگوشی نما تھی۔ فریا بمشکل ہی سن پائی۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ وہ ٹھٹک کر پوچھ رہی تھی۔

”فی الحال تو تمہارے ساتھ جائوں گا۔ تم کافی بنائو گی میں، بنگالی جی اور ننا پینے کی سعادت حاصل کریں گے۔“ وہ بات بدل گیا تھا۔ فریا نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”ابھی تم نے کیا کہا ہے حمزہ! تم کہاں جانے کی بات کر رہے ہو۔“

”میں بھلا کہاں جائوں گا فری! یہ کیا بچپنا ہے۔“ وہ نرمی سے اپنا بازو چھڑا کر بولا۔

”بھگوڑے! تم بھاگنا چاہتے ہو۔“ وہ ایک دم تپ گئی۔

”تم سے بھاگ کر کہاں جائوں گا بھلا۔“ حمزہ اداسی سے مسکرایا۔

”حامی! تم مجھے بھلا نہیں سکتے۔“ وہ ابھی تک شکڈ تھی۔ گویا اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ حمزہ نے کہیں جانے کی بات کی ہے۔

”باپ رے! فی الحال تو میرا بازو چھوڑو، مجھے پارک جانا ہے، ہائے میرے بچے!“ مسز یزدانی کے گیٹ پر نگاہ کیا پڑی تھی۔ وہ بازو چھڑا کر سرپٹ بھاگا۔

”ادھار رہی۔“ وہ بغیر پلٹے بولا۔

”تم بھی نا محمد حمزہ! پتا نہیں کیا چیز ہو۔ میں تمہیں شاید کبھی بھی نہیں سمجھوں گی۔“ فریا سر جھٹکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔



”بنگالی جی ! فریا کو ذرا باہر بھیجئے۔“

وہ گیٹ کا ذرا سا پٹ کھول کر جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بنگالی جی درختوں سے تازہ پھل اتار رہے تھے۔ ہاتھ میں پکڑی ٹوکری گھاس پر رکھے سر ہلاتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ جو گرز کسے، جینز، شرٹ پہنے اندر سے آتی دکھائی دی۔ وہ اسٹالر کو گھسیٹتا ہموار سڑک پر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اس کے برابر چل رہی تھی۔

”کہیں جارہی ہو؟“

”ہاں، مارکیٹ تک۔“ وہ اپنا والٹ کھولے پیسے چیک کر رہی تھی۔

”اگر کچھ منگوانا تھا تو مجھے بتا دیتیں۔ میں ابھی مارکیٹ سے آرہا ہوں۔“

”تم نے سودا ڈھونے کے علاوہ گورنس والے کام بھی کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ ایس، یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔“ وہ اسٹالر کو دیکھ کر چونکی تھی۔ پھر جھک کر بچے کو دیکھنے کے بعد ناگواری سے بولی۔

”میں ایسا چیپ کام نہیں کر سکتا اور دیکھو، تمہاری خاطر میں کیا کیا کر رہا ہوں۔“ وہ پہلے سے ہی کافی جلا بھناتا تھا۔ فریا کے جتلانے پر اسے تپ چڑھ گئی تھی۔

”میری خاطر، بچہ کسی کا ہے، خد متیں کسی اور کی ہو رہی ہیں۔ اور احسان عظیم مجھ پر۔“ وہ بری طرح چڑ گئی تھی۔ ”اسے کیوں اٹھا لائے ہو؟“

”اس معصوم کی گورنس کی چھٹی ہے۔ بے چارہ باہر آنے کے لیے ہم رہا تھا۔ مجھے خوا مخواہ ترس آگیا۔“ وہ منہ کے زاویے بدل کر کہہ رہا تھا جب بچے نے ایک دم چیخ مار کر رونا شروع کر دیا۔

”اف حمزہ! اسے چپ کروائو۔“ بچہ دھیرے دھیرے والیوم بلند کر رہا تھا۔

”ارے چپ کر جا یار!“ حمزہ گھوم کر بچے کے سامنے آگیا۔ ”چپ کر جا قحط زدہ افریقی بچے۔“ وہ سوکھے سڑے سے کالے چمڑی والے بچے کو پچکارتے ہوئے بولا۔ بچے نے اور بھی بھاں بھاں کر کے رونا شروع کر دیا۔

”مائی گاڈ فری! یہ تو چپ نہیں کر رہا۔“ حمزہ بچے کے مسلسل رونے کی وجہ سے بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

”اس کے منہ میں فیڈر ڈالو۔“ فری بھی گھٹنوں کے بل جھک کر بچے کے رونے کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔

”افریقی چائلڈ! فیڈر تو پی لے یار!“ وہ زبردستی دودھ کی بوتل بچے کے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔ ”منہ کھول، نہیں تو لگائوں جھانپڑ، میں کہہ رہا ہوں کھول منہ کو۔“

”حمزہ! ایڈیٹ بچے کو دودھ کی طلب نہیں۔ زبردستی مت کرو۔“ فری نے گویا اپنا ماتھ پیٹ لیا۔

”ٹانی لو گے یا چاکلیٹ؟“ وہ اپنی جینز کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ”کمال ہے یار تیرے لیے نہ ٹانی نکلی نہ ہی چاکلیٹ۔“

”اسٹوپڈ! یہ ٹانی اور چاکلیٹ نہیں کھا سکتا۔“ فری کو بری طرح ہنسی آگئی تھی۔ اسی پل ایک خاتون ان کے قریب سے گزری تھیں۔ بچے کے ساتھ انہیں ہلکان ہوتا دیکھ کر رک گئیں۔

”آج کل کی لڑکیوں کے کمال نخرے ہیں۔ بچہ رو رہا ہے اور ماں کو پروا ہی نہیں ہے۔“

”میرے لیے۔“ فری حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ ”میرے لیے نہیں اپنے باپ کے لیے رو رہا ہے۔“ فری کو بوکھلاتے ہوئے یہی جواز سوجھا تھا۔ وہ شاید اسے بچے کی ماں سمجھ رہی تھیں۔

”ہائے۔ یہ کیسا زمانہ آگیا؟ باپ سات فٹ دور کھڑا ہے۔ گویا اس نے بچے کو اٹھا لیا تو وہ ساتھ چپک جائے گا۔“



”میں نہیں اسے اٹھا سکتا۔ ناک بہہ رہی ہے اس کی۔ کہاں پھنس گیا ہوں میں۔ اس چڑیا گھر میں۔“ حمزہ نے گویا اپنے بال نوچ ڈالے تھے۔ ”مجھے گورنس سمجھ لیا ہے اس میڈم کی بچی نے۔ بس آج میرے صبر کی انتہا ہوئی۔ کرتا ہوں اس پھولن دیوی سے دو ٹوک بات۔ حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔“

”ایں۔ اسے کیا ہوا، یہ تو چپ کر گیا ہے فری!“ بچہ خاموش ہو چکا تھا۔ حمزہ نے مارے مسرت کے بچے کو سیدھا کر کے دیکھا۔

”ارے، یہ تو سچ مچ سو گیا ہے۔“

”اسے نیند آرہی تھی۔ تب ہی بے چین تھا۔ چلو گھر چلتے ہیں۔“ فریا پلٹنے لگی۔

”تمہیں مارکیٹ نہیں جانا؟“ وہ تذبذب کا شکار تھا۔

”پھر سہی، بچہ اپ سیٹ رہے گا۔ اسے بستر کی ضرورت ہے۔“

وہ اسٹالر گھسیٹ رہی تھی۔ حمزہ نے بچہ اٹھا رکھا تھا۔ وہ دونوں اپنی جھونک میں باتیں کرتے آرہے تھے۔ مسز یزدانی گیٹ پر کھڑی تھیں۔ فریا انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ بھی معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے فریا کو بغور دیکھنے لگیں۔

”پکڑیں اپنے افریقی شہزادے کو بڑا ہو کر ایک عظیم ماڈل بنے گا۔ اس کے چہرے کی لک ہی کچھ ایسی ہے۔ راہ چلتے فقیر بھی ٹھٹک جاتے ہیں۔“ حمزہ بچے کو احتیاط سے مسز یزدانی کی گود میں منتقل کر چکا تھا۔

”تم سے تو میں بعد میں نمٹتی ہوں۔ ذرا فریا سے دودو ہاتھ کر لوں۔“ وہ بڑی بے تکلفی سے حمزہ کے سر پر چپت لگا کر کہہ رہی تھیں۔ فریا کو یہ بے تکلفی کچھ بھائی نہیں تھی۔

”تم بھی قسم توڑ ہی ڈالو۔ کبھی ہمارے گھر نہیں آئیں۔ یہ حاما تو نرا نکما ہے۔ اس نے کبھی تمہیں چائے یا لٹچ پر نہیں بلایا۔ خود تو دن میں دس دس بار تمہارے گھر سے کھا پی کر آتا ہے۔“ وہ بڑی محبت سے اصرار کر رہی تھیں۔

”طوبی آپنی! پھر سہی۔ ابھی مجھے کام ہے۔“ وہ ٹال گئی تھی ویسے بھی ننا کے علم میں لائے بغیر وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔

”میڈم! نہ اصرار کریں۔ اسے واقعی کچھ کام ہے۔“ حمزہ کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

”تم آوارہ گرد! کہاں بچے کو لے کر چلے گئے تھے۔ اس کے سونے کا ٹائم تھا۔“ مسز یزدانی نے بری طرح حمزہ کو جھاڑا۔ ان کا بدلتا انداز فریا کو حیران کر گیا تھا۔ اب وہ حمزہ کو سخت سنائے جارہی تھیں۔ فریا کا دل حمزہ کی پتلی حالت پر بھر آیا۔

”یہ امیر لوگ، ان کے مزاج سمجھنا کہاں آسان ہے۔“ گھر آکر بھی وہ کئی لمحے کلمستی رہی۔

”نجانے اور کتنی دیر اسے باتیں سناتی رہیں گی۔ کیا ضرورت تھی اسے بچے کو بغیر بتائے باہر لے کر جانے کی۔“ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

...☆☆☆...

پچھلے دو دن سے حمزہ غائب تھا۔ اب تو بنگالی جی اور ننا کو بھی تشویش ہو چلی تھی۔

”حمزہ کی خبر تو لو، بے چارا پردیسی تنہا بچہ، خدا نخواستہ بیمار نہ پڑ گیا ہو۔“ اس وقت وہ حمزہ کے لیے پریشان ہو رہی تھیں اور چند دن پہلے یہی حمزہ انہیں سخت برا لگنے لگا تھا۔

”نجانے یہ خانساماں کہاں سے اٹھ کر آگیا ہے۔ میری نواسی سدا کی احمق ہے۔ بھلا مر بھر کے فیصلے جھٹ پٹ کیے جاتے ہیں۔ بغیر سوچ و بچار کے۔ میں ہر گز تمہاری شادی حمزہ سے نہیں کروں گی۔“ وہ سخت جلال میں تھیں۔

”اور میں بھی آپ کو بتا چکی ہوں کہ شادی کروں گی تو صرف حمزہ سے، ورنہ تمام عمر یونہی بیٹھی رہوں گی۔“ نجانے کس فلم کے ڈائلاگ تھے جو مارے جذبات کے فریا کے لبوں سے برآمد ہوئے تھے۔

”تمہاری ماں اور مامے نے بھی یہی کیا تھا۔ تم سے اچھی امید کیا رکھوں۔“ فریا جان گئی تھی۔ ننانیم رضامند ہیں۔ صرف انہیں کچھ خدشات تھے۔ حمزہ کے فیوچر کے بارے میں پریشان تھیں۔ وہ فریا کو کیسے سمجھاتیں کہ بے شک حمزہ میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ سمجھ دار تھا، باشعور تھا، بااخلاق تھا، مگر شادی جیسے حساس اور نازک معاملات میں اور بھی بہت سی چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔

نرم سے نرم الفاظ میں بھی ان کے لیے یہ بہت تکلیف دہ بات تھی کہ ان کی نواسی ایک خانساماں سے محبت کرتی ہے۔ اس سے شادی کی خواہش مند ہے۔ وہ جو عمری میں بھی اس سے ڈیڑھ سال چھوٹا تھا۔ کیا وہ شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہے؟

وہ ان حقیقتوں سے فریا کو بھی روشناس کروا چکی تھیں۔

”میں جاب کر لوں گی۔“ گویا اس نے سب کچھ طے کر رکھا تھا۔

”پھر بھی میں حمزہ کو چار پانچ سال کا وقت دوں گی۔ وہ اپنے قدم جمائے خود کو منوا کر ہمارے سامنے آئے۔ پھر میں تمہیں بخوشی حمزہ کے ساتھ رخصت کر دوں گی۔“ وہ جان چکی تھیں کہ فریا اپنے قدم پیچھے کبھی نہیں ہٹائے گی۔ وہ ضدی تھی اور اپنی ضد منوا کر ہی دم لیتی تھی۔

وہ ننا سے پوچھ کر مسز یزدانی کی طرف آگئی تھی۔ ارد گرد کے لوگوں سے جان پہچان نہ ہونے کے برابر تھی۔ تاہم مسز یزدانی کی ننا سے خاصی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ چوکیدار نے اسے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

”نجانے حمزہ کہاں ہو گا۔ یقیناً کچن میں۔“ وہ سوچتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھی۔ سامنے ایک ملازمہ اسی بچے کو شاید سیریلیک کھلا رہی تھی۔

”طوبی باجی کہاں ہیں؟“ فریا نے اسی ملازمہ سے پوچھا۔

”جی آپ کون؟“ ملازمہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”میں فریا ہوں۔ یہ سامنے ہمارا گھر ہے۔“ وہ ارد گرد پھیلی بے ترتیبی دیکھتے ہوئے بولی۔ بچوں نے ہر چیز تلپٹ کر رکھی تھی۔ اتنے ملازم تھے اور پھر بھی نفاست کا نام و نشان نہیں تھا۔

”اچھا۔ اچھا۔ تو آپ فریا بی بی ہیں۔ حمزہ بھائی جان کی دوست۔“ ملازمہ نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”حمزہ کہاں ہو گا؟“

”ان کی تو طبیعت خراب ہے۔ گلا دکھ رہا ہے۔ بخار ہے۔ ادھر راہداری میں پہلا کمرہ انہی کا ہے۔ بیگم صاحبہ بھی انہی کے کمرے میں ہیں۔“ ملازمہ نے ہاتھ کے اشارے سے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ فریا سنبھل کر چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔

”توبہ باجی خدار، یہ ظلم مت کیجئے۔ میں یہ انڈے کی زردی والا دودھ نہیں پی سکتا۔“

”حمزہ یہ دودھ تم کو پینا ہی پڑے گا۔ ٹھنڈ کا اثر ہے۔ منٹوں میں بھلے چنگے ہو جائو گے۔“ طوبی بڑے لاڈ پیار سے پچکار رہی تھی۔ ایک خانساماں کو۔ اپنے گھر کے ملازم کو۔ فریا گویا دم بخود رہ گئی۔

”ہائے کتنی بو ہے۔ مجھے تو ووسٹنگ ہونے لگی ہے۔“ حمزہ ناک دبائے کہہ رہا تھا۔ اس کا گلا واقعی خراب تھا۔ آواز بے حد بھاری تھی۔ باجی نے زبردستی گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

”لڑکیوں کی طرح نخرے مت دکھاؤ۔ کیا تیسرا مہینہ لگا ہے۔“ حمزہ کو زور کا اچھو لگ گیا تھا۔ وہ کھانتے کھانے دوہرا ہو گیا۔

”یہ کام آپ کو مبارک ہو۔ توبہ توبہ۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”حامد بھائی نے اور آپ نے جو فٹ بال ٹیم بنائی ہے نا۔ ریکارڈ بک میں آپ دونوں کا نام دے دوں گا۔“ پلٹ کر گلاس رکھنے لگیں دروازے میں کھڑی فریا کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”زہے نصیب، آج تو فریا آئی ہے۔ آؤنا رک کیوں گئیں۔“ وہ لبوں پر مسکان سجائے لپک جھپک اس تک آئی تھیں۔

”حمزہ کے لیے آئی ہو گی۔ ہم اتنے اہم کہاں؟“ ان کے لب و لہجے میں شوخی نمایاں تھی۔ جبکہ حمزہ بھی حق دق اسے دیکھے جا رہا تھا۔ گویا اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ فریا، مسز یزدانی کے گھر بھی آسکتی ہے۔

”فری تم؟“ حمزہ کو سچ مچ جھٹکا لگا۔

”کیا میں یہاں نہیں آسکتی مسٹر شیف کی عیادت کرنے؟“ وہ چبا چبا کر بولی تھی۔

”کون ہو تم حمزہ! کیا ہو تم؟ کتنے روپ ہیں تمہارے؟ کبھی بیچ پر بیٹھے رو رہے ہوتے ہو۔ کبھی خانساماں بن کر سامنے آجاتے ہو۔ کبھی ڈرائیور کا روپ دھار لیتے ہو۔ کبھی ٹیوٹر بنے دکھائی دیتے ہو اور کبھی بچوں کی آیا گری کرنے لگتے ہو۔ اتنے ڈھونگ رچا رچا کر کیوں سامنے آتے ہو آخر تم کون ہو؟ کیا کرنے آئے ہو یہاں؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟ کون سا منصوبہ بنا رکھا ہے تم نے

؟ کیوں جھوٹ بولا؟ کیوں غلط بیان جاری کرتے رہے کہ میں تنہا ہوں۔ معمولی سا مزدور ہوں۔ تم کون ہو حمزہ! بتاؤ تم کون ہو؟“ وہ گویا پھٹ پڑی تھی۔

”میں کون ہوں؟ ایک بیس سال کا گھاک مرد۔ محمد حمزہ کون ہے؟ یہ تم اپنے ممی ڈیڈی سے پوچھ لینا۔ تیسرے سوال کا تیسرا اور آخری جواب۔“ وہ لمحہ بھر کو رکا تھا۔ پھر اپنے گریبان سے اس کے دونوں ہاتھ چھڑوا کر بولا۔ ”کیا لینے آیا ہوں؟ میں سمندروں اور سرحدوں کو پار کر کے کیوں آیا ہوں۔“ وہ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سلگتے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”تمہارا دل لینے کے لیے آیا ہوں۔ ورنہ میرے لیے یہاں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ ایک مری ہوئی دادی کی تربیت کے سوا۔“ اس کے لبوں سے انگارے پھوٹ رہے تھے۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”یہ دل میں نے لے لیا۔ اسے اپنی ذات کی قبر میں مقید کر لیا ہمیشہ کے لیے اس قید سے رہائی فریا عتیق کے دل کو نہیں ملے گی۔ کبھی نہیں۔ میں آج



رات کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ تمہاری آنکھوں کے ادھورے خواب جائیں گے۔“

”حمزہ!“ فریا کے قدموں کے نیچے سے گویا زمین سرک گئی تھی۔ سامنے کھڑا یہ لڑکا محمد حمزہ تو نہیں نظر آرہا تھا جسے فریا جانتی تھی۔

”کوئی سوال مت کرنا۔ تمہیں مجھ سے ایک جواب بھی نہیں ملے گا۔ یہ سوال اپنے باپ سے کرنا اپنی ماں سے کرنا کہ محمد حمزہ کون ہے؟“

وہ اسے حق دق کھڑا چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا جبکہ فریا ابھی تک دم بخود کھڑی تھی۔ ساکت، بے دم، خاموش اور حیران۔ حمزہ جس خاموشی سے آیا تھا ایسے ہی چلا بھی گیا۔

☆☆☆

کئی دن کے بعد مسز یزدانی سے بات کرنے کا خیال آیا تھا اور وہ دوسرے ہی لمحے ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔

مسز یزدانی کے کچن میں نیا خانساماں کھڑا تھا۔ نہ جانے کیوں فریا کی آنکھیں لبا لب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”فریا تم؟“ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں ”آؤ نا۔ رک کیوں گئیں۔“ ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی نرمی تھی۔

”نیا شیف ہے کیا؟“ اس نے لب کچلتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اوپر کے کاموں کے لیے رکھا ہے مگر کھانا پکانا بھی آتا ہے۔ میرا مسئلہ حل ہو گیا۔“ وہ سادگی سے بتانے لگیں۔

”حمزہ کے جانے کے بعد آپ کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو گا؟“ وہ جو کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی اس کے لیے ہمت بھی تو مجتمع کرنا تھی۔

”تو اور کیا، بچے بھی کتنے دن ڈسٹرب رہے۔ حمزہ سے بہت زیادہ اٹیچ ہو گئے تھے۔ مجھے تو بالکل اپنے بڑے بیٹے ارسلان کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔“ وہ حمزہ کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئیں۔ ”اتنا ہنس مکھ اور مخلوٹا تھا۔“

”طوبیٰ باجی! آپ جانتی ہیں کہ حمزہ کون ہے؟“ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”سچ پوچھو تو میں اسے پہلی دفعہ دیکھ کر ٹھٹک گئی اتنا تو تم جانتی ہو کہ حامد ملک سے باہر ہوتے ہیں۔ نو بچوں کے ساتھ اتنے بڑے گھر کی دیکھ بھال میری اکیلی جان سے تو نہیں ہو سکتی تھی۔ میں سخت پریشان تھی۔ حامد سے مشورہ کیا تو انہوں نے اخبار میں اشتہار دینے کی تجویز دی۔ مجھے کسی پھرتیلے لڑکے کی ضرورت تھی۔ جو بچن کے ساتھ ساتھ سودا سلف بھی لے آیا

کرتا۔ مجھے حمزہ ہر لحاظ سے پسند آگیا۔ شائستہ مزاج، سلجھا ہوا، رکھ رکھاؤ والا لڑکا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ ملک میں بے روزگاری کی وجہ سے اچھے خاصے گھرانے کا لڑکا تیسرے درجے کی نوکری پر بھی رضامند ہو گیا ہے۔ مگر اس کی ڈیمانڈ سن کر میں تو حیران ہی رہ گئی۔ اس نے کہا مجھے ماہانہ تنخواہ آپ جو بھی دیں منظور ہے۔ مگر مجھے آپ کے گھر میں رہنے کے لیے ایک کمرے کی ضرورت ہو گی۔ ہیٹر کی سردیوں میں خاص ضرورت نہیں۔ البتہ گرمیوں میں اے سی ضرور چلائوں گا۔ خوراک میری سادہ سی ہے۔ البتہ کافی کا میں نشئی

ہوں۔ دن میں کئی کئی دفعہ پیتا ہوں۔ کبھی کبھی رات کو بھی پیتا ہوں۔ میں ڈرائیونگ بھی کر لیتا ہوں۔ بچوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمہ داری میری ہوئی۔ مارکیٹ سے سودا سلف بھی لایا کروں گا۔ آپ کے ڈرائیور کی تنخواہ بھی بچ گئی۔ ٹیوٹر کی بھی چھٹی کروا دیں۔ بچوں کو رات کے تین گھنٹے پڑھایا کروں گا۔“

”میں اس کی ڈیمانڈ سن کر حیران رہ گئی۔ حامد سے مشورہ کیا تو وہ مان گئے۔ وہ احسن طریقے سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال چکا تھا۔ البتہ اسے شیف ٹینا نے زبردستی بنا ڈالا۔ وہ اسے کھانا پکانا سکھا کر گئی تھی۔ جبکہ کچن کے کاموں سے وہ شدید الرجک تھا۔ اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی بڑی بڑی اور گہری باتیں وہ کرتا تھا۔ بہر حال مجھے تو اپنے گھر کے ہر ملازم سے انسیت تھی اور حمزہ سے تو خاص انسیت ہو گئی تھی۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔ اور وہ خوب کامیابیاں سمیٹے۔ ایک برٹش لڑکا دو سال تک میرے گھر میں شیف کے علاوہ دیگر امور احسن طریقے سے سنبھالے رہا ہے، کس لیے؟ کیوں کیا وجہ ہو سکتی

ہے؟ ہر ذی شعور بندہ سوچے گا ضرور۔ میں بھی سوچتی تھی۔ تب مجھ پر انکشاف ہو ا۔ وجہ تم ہو فریا عتیق! تمہارے لیے وہ خود کو بے کار مشغلوں میں ضائع کر رہا تھا۔ بہر حال میں اس کے بارے میں بس یہ ہی کچھ جانتی ہوں۔“ طوبی باجی خاموش ہو گئی تھیں۔ فریا کی ابھی بہت ساری الجھنیں دور نہیں ہوئی تھیں۔ وہ گھر آئی تو ننا کو اپنا منتظر پایا۔ وہ کافی پر جوش نظر آرہی تھیں۔

”تمہارے ممی، ڈیڈی آرہے ہیں فری! روپی بھی آئے گی۔ ابھی وقاص کا فون آیا تھا۔ میرے خیال میں یہ سب کسی خاص مقصد کے لیے آرہے ہیں۔“ ان کے چہرے پر واضح خوشی تحریر تھی۔ حمزہ کے چلے جانے کی سب سے زیادہ خوشی ننا اور وقاص کو ہی تو ہوئی تھی۔

”کیسا مقصد؟“ اس نے تنک کر پوچھا۔

”تمہاری ماں نے وقاص کے ساتھ تمہاری بات پکی کر دی ہے۔“ ننا نے گویا دھماکہ کیا۔

”مگر مجھے وقاص تو کیا کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔ بتا چکی ہوں آپ کو۔“ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

ننا اور پھوپھو کے ساتھ ممی ڈیڈی بھی اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ مگر اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

گزرتے وقت میں وقاص کی دھوم دھام سے شادی ہو گئی تھی۔ وقاص کی شادی کے لیے ممی اور ڈیڈی بھی آئے تھے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی، جب ممی اور ڈیڈی نے صاف انکار کر دیا کہ وہ حمزہ نام کے کسی لڑکے کو جانتے تک نہیں۔ فریا اور الجھ گئی تھی۔

”تم فری سے ہی پوچھ لو۔ بھلے نام کا بچہ تھا۔ سعادت مند، نیک اور شریف۔“ ننا اس سے زیادہ اچھی تعریف اور کیا کرتیں۔ کم از کم بیٹی کو نواسی کی پسند کے متعلق تفصیلات بتانے کی ان میں جرأت نہیں تھی۔

”کرتا کیا ہے؟“ ممی کی توپوں کا رخ اب فریا کی طرف تھا۔

”یو کے چلا گیا ہے۔“

”پہلے کیا کرتا تھا؟ ایجوکیشن کیا ہے اس کی؟ کس فیملی سے ہے؟“ ممی کی بھنویں تن گئیں۔

”جو بنگالی جی کرتے ہیں، یہی کام کرتا تھا نا مسٹر حمزہ! تم کیا بتاؤ گی۔ سب جان گئی ہوں میں اپنی بیٹی کے انتخاب اور پسند کے متعلق۔“ انہوں نے سخت تنفر کے عالم میں سر جھٹکا۔

”ممی!“

”جی چاہتا ہے کہ طمانچے مار مار کے اس کا منہ لال کر دوں۔ اور یہ احمق، بے عقل اتنا پڑھ لکھ کر گنوا دید۔ شیم آن یو فری! ایک خانساں سے محبت کر بیٹھیں۔ اپنا مقام دیکھو اور مقابل کے پروفیشن کو مگر تمہارا بھی کیا قصور ہے، یہ سب کیا دھرا تو ممی! آپ کا ہے۔“

ممی اب ننا سے دوبدو جھگڑنے لگی تھیں۔ ہمیشہ اسی طرح تو وہ کرتی تھیں۔ جب غصہ آتا ننا سمیت فری انسلٹ کر کے رکھ دیتیں۔ بڑا مان تھا انہیں اپنی ذہانت اور دولت پر۔ ننا پر بھی اسی بات کا احسان لادے رکھتی تھیں کہ

آپ کو گھر لے کر دیا ہے۔ نوکر چاکر آپ کی چاکری کے لیے رکھے ہیں۔ تنخواہ چونکہ ممی دیتی تھیں۔ گھریلو اخراجات کے لیے بھی ممی پیسے بھجواتی تھیں۔ سو ننا بے چاری کو دوپل میں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتی تھیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی جتا دیتی تھیں کہ فرمان (فریا کے ماموں) کا فرض تھا ماں کو سپورٹ کرتا۔ میں بیٹی ہو کر ماں کے اخراجات اٹھا رہی ہوں۔

”یہ تربیت کی ہے آپ نے میری بیٹی کی۔“ اب وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ ننا کے چہرے پر سائے لہرانے لگے تھے۔

”پلیز ممی! ننا سے اس لہجے میں بات مت کریں۔“ فریا نے گویا التجا کی۔ ”تم تو مجھ سے بات ہی مت کرو۔ سخت دل دکھایا ہے تم نے میرا۔“ وہ مشتعل ہو کر اٹھ گئیں تھیں۔ ”دیکھا ننا ذرا بھی آپ کا لحاظ نہیں

کرتیں۔ تربیت ان کی بھی تو آپ نے ہی کی ہے۔“ ممی کے جانے کے بعد وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

جانے سے پہلے ممی کا موڈ بہتر ہو گیا تھا۔

”ذرا یہ سنبھل جائے تو کسی اچھے پُرپوزل کو اوکے کر دیجئے گا۔“ وہ ننا سے بار بار کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

پانچ سال گزر گئے تھے۔

وہ محبت کے اسی موڑ پر کھڑی تھی جس موڑ پر وہ اسے ہاتھ تھام کر لے آیا تھا۔ وہ اس کے دل کے خالی کشکول میں اپنی محبت کے دو سکے ان دو سالوں میں ڈال کر اسے نارسائیوں کے عذاب دے کر چلا گیا تھا۔ فریا عتیق کے پاس کچھ نہ تھا، اس کی یادوں کے سوا۔ وہ اپنے گھر کے بیرونی لان میں رکھے اس بیچ کو پہروں تکتی رہتی تھی۔ جہاں اس نے پہلی مرتبہ حمزہ کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اور وہ نہ جانے کہاں تھا، کس دیس میں جابسا تھا۔ کس نگر کا اس نے رخ کر لیا تھا۔ کس بستی میں بسیرا کر لیا تھا۔ کس جزیرے پر جارکا تھا۔ نہ جانے کہاں ڈیرے لگا لیے تھے محمد حمزہ نے۔ اور فریا عتیق حیران ہو کر سوچتی تھی کہ اس دور میں بھی کوئی پہلی نظر کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے؟ مگر کچھ ایسے

چہرے ہوتے ہیں جو متوجہ کر لیتے ہیں، تسخیر کر لیتے ہیں۔ وہ چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ خود سے عہد کر کے آیا تھا کہ فریا شجاع عتیق کا دل چرائے گا۔ اور اس نے پہلی نظر میں اس کا دل چرا لیا۔

سڑک کے کنارے سرسبز گھاس سے سجے چھوٹے سے قطعہ میں رکھے پتھریلے بیچ پر بیٹھے اس یورپین نقوش والے روتے لڑکے نے فریا عتیق کو متوجہ کیا تھا۔ اور جب وہ اس کے بارے میں جان گئی۔ تب بھی اس کے دل میں محمد حمزہ کے لیے ہمیشہ محبت رہی۔ یہ جان کر بھی کہ وہ ایک معمولی سا گھریلو ملازم ہے۔ یہ دلوں کے معاملے سوچ سمجھ کے کہاں ہوتے ہیں۔ عجیب بات تو یہ تھی، فریا نے اس پردیسی کو ہر الزام سے بری کر دیا تھا۔ وہ محبت کا درجہ رکھتی تھی۔ محبت کا ذائقہ اس کے دل نے چکھا تھا۔ پہل اسی نے کی تھی۔ حمزہ کے قریب وہ خود آئی تھی۔

وہ بد عہد نہیں تھا۔ حمزہ نے اس سے کوئی پیمانہ تو نہیں باندھے تھے۔ مگر نہ جانے فریا کو کیسا یقین تھا کہ محبت کے سفر میں وہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔



وہ جھوٹا بھی نہیں تھا۔ اس نے جتنا کچھ اپنے بارے میں بتایا تھا وہ بالکل سچ تھا۔

اس نے صرف ایک چیز فریا سے مخفی رکھی تھی۔ اس نے فریا عتیق کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ پاکستان کسی سے انتقام لینے آیا ہے۔ فریا عتیق سے انتقام؟ مگر کیوں؟ کس لیے؟۔

☆☆☆

فریا نے ایک بہترین ساکھ رکھنے والے سکول میں جاب کر لی تھی۔ ننا اسے مصروف دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ایک دن فریا اپنے لیے بہترین فیصلہ کر لے گی۔

ایک اداس شام وہ ہمیشہ کی طرح اسی سنگی بیچ پر بیٹھی تھی۔ جب پوسٹ مین گیٹ کے قریب آرکا۔ وہ اٹھ کر گیٹ پر گئی تو اس نے ایک رجسٹری اس کی طرف بڑھائی۔

فریا نے خاکی لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فارن کی مہر لگی ہوئی تھی۔ وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔

”یہ ممی نے کیا بھیج دیا ہے۔“ وہیں بیچ پر بیٹھے بیٹھے اس نے لفافہ چاک کر کے اندر سے کچھ کاغذات نکالے۔

”جان فری!“ طرزِ مخاطب نے اسے چونکا دیا۔

”حمزہ کا خط“ اس نے بے صبری سے تحریر پر نظریں جما دیں۔

”تمہیں الجھنوں کے حوالے کر کے یہاں چلا آیا تھا۔ سچ پوچھو تو ایک دن بھی سکون سے نہیں گزرا۔ تمہاری یاد میں اتنی شدت ہے کہ بدلتے موسم بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

بات کا آغاز کہاں سے کروں، چلو آج پھر تم میری داستان سنتی رہو۔ نہ میں نے پہلے تم سے جھوٹ بولا تھا، نہ اب بولوں گا۔ سلسلہ وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ جہاں سے ٹوٹا تھا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ لیڈی نینی ہمیں لینے کے لیے آئی تھی اور ہم اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میں اور میرے ابو... نینی صرف چند دن کی مہمان تھی، ہمارے آنے کے صرف ایک ہفتے کے بعد لیڈی نینی انجاننا کے اٹیک سے ہلاک ہو گئی۔ نینی کا سابقہ شوہر اور بیٹا اس کی آخری رسومات کرنے پہنچ گیا۔ رسومات کا تو صرف بہانہ تھا۔ دراصل وہ نینی کی پراپرٹی کے چکر میں آئے تھے۔ ان دونوں نے مجھے اور ابو کو گھر سے بے دخل کر دیا۔ اس مرتبہ پھر ہم کھلے آسمان تلے آگئے تھے۔

ابو مجھے لیے پھر سے اپنے بھائی کے در پر آگئے تھے۔ ہم بھلا جاتے بھی کہاں۔ فی الحال کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔

چاچی نے ہمیں دیکھ کر طوفان کھڑا کر دیا۔ ”بھوکے ننگے، قحط کے مارے پھر آگئے۔“ وہ بری طرح چلا رہی تھیں۔ ابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جاتے۔

”اس بابے کی دوائیوں کا خرچا کون اٹھائے گا؟“ وہ اس پل حد سے زیادہ جاہل لگ رہی تھیں۔ اور ابو بتاتے تھے کہ چاچی بہت تعلیم یافتہ تھیں۔ چاچا کی ان کے ساتھ لو میرج تھی۔

”اسے کسی اولڈ ہائوس میں پھینکو، اور خود کسی ہوٹل میں برتن دھو یا واش روم صاف کرو، میری بلا سے۔“ چاچی مجھ سے مخاطب تھیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ ابو، چاچا کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کے باپ کی جگہ پر ہیں۔

اس وقت صرف ایک احساس باقی تھا، ذلت، ذلت اور صرف ذلت۔

مگر یہ نہیں پتا تھا کہ اس سے آگے جا کر بہت کچھ سہنا ہے۔

سارا دن وہ مجھے کولہو کے بیل کی طرح جوتے رکھتی تھیں، پھر بھی فارغ رہنے کے طعنے ملتے تھے۔ نہ جانے کتنی نفرت بھری تھی ان کے دل میں ہمارے لیے۔ یہ نفرت اس وقت کھل کر سامنے آگئی جب چاچا نے ابو کی محبت میں اعلان کر دیا کہ وہ میرا رشتہ اپنی بیٹی کے ساتھ پکا کر چکے ہیں۔

چاچی کو گویا آگ لگ گئی تھی کیونکہ اس دفعہ چاچا نے کچھ جرأت کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ وہ اس رشتے کو باقاعدہ رسم کے بعد کوئی نام دینا چاہتے تھے۔ منگنی یا نکاح؟ ابو اور چاچا رات بھر نہ جانے کیا کچھ ڈسکس کرتے رہے تھے۔

اس صبح کا واقعہ ہے۔ قصہ ہی کہوں گا۔ اس شرمناک داستان کو اور کیا نام دوں۔

چاچی اس دن گھر میں تھیں، اور وہ ایک پلاننگ کے تحت گھر میں نظر آرہی تھیں۔ آٹھ بجے کے قریب گھر میں چاچی کی ایک دوست داخل ہوئی۔ عجیب بات یہ تھی، چاچی کی وہ سہیلی میرے اور ابو کے مشترکہ کمرے میں چلی گئی۔ میں اس وقت لائونج میں تھا۔ ہیٹر میں کچھ فالٹ تھا جسے میں ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صرف لمحوں کا کھیل تھا۔ منظر بدل گیا۔ چاچی کی سہیلی چیختی چلاتی ابو کے کمرے سے برآمد ہوئی۔

آگے کیا لکھوں جب جب وہ لمحات یاد آتے ہیں، رگوں میں دوڑتا خون ابلنے لگتا ہے۔

چاچا بھی اتفاقاً گھر آگئے تھے۔ اف میرے خدا! جو الزام چاچی اور ان کی سہیلی نے میرے بیمار باپ پر لگایا تھا وہ کس قدر شرمناک تھا، گھٹیا تھا۔

وہ مجھ پر بہتان باندھ دیتیں۔ مجھ پر تہمتیں لگا دیتیں۔ مگر انہوں نے ابو کو استعمال کیا، اور ابو تو چاچا کی بے اعتباری کے گھائو سے ہی ڈھے گئے۔

”بھائو! آپ نے ایسا کیا! نہیں بھائو! آپ نے اچھا نہیں کیا۔“ چاچا کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ”یہ لوگ قابل ہیں اس گھر میں رہنے کے؟ ہمارے مہمانوں کے ساتھ اب ایسی غلیظ حرکتیں کی جائیں گی۔ ارے مرجانے کا مقام ہے، اس بابے کے لیے۔ اور یہ بے غیرت اس کا بیٹا ہماری بیٹی کے قابل ہے، وہ تو خود اسے ریجیکٹ کر دے گی۔ پوچھ لو ابھی اپنی بیٹی سے۔ وہ اس ان پڑھ، جاہل کے ساتھ رشتہ استوار کرنا بھی چاہتی ہے یا نہیں۔ لعنت بھیج دے گی اسے دیکھنے کے بعد۔ بڑے آئے ہماری بیٹی سے رشتہ گانٹھنے والے۔“ چاچی کی زبان ابھی تک زہر اگل رہی تھی۔

”شاجے! چپ کرا اس عورت کو۔ ایسی بد زبان عورت ہے۔“ ابو پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔

”پلیز بھاتنیر! آپ یہاں سے چلے جائیے۔ ہمارے گھر کا ماحول گندامت کریں۔“

چاچا نے ہاتھ باندھ کر ابو کو باہر کا راستہ دکھایا۔ اب مزید کچھ اور سننے کی ہم دونوں میں سکت کہاں تھی۔ ہم دونوں لٹے پٹے سے گھر سے باہر نکل آئے۔ اس وقت میں نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر عہد کیا تھا کہ میں چاچی کی بیٹی کا دل جیت کر دکھائوں گا۔ اس کا دل جیت کر اپنے پاس رکھ لوں گا۔ وہ پھر کسی سے شادی نہیں کر سکے گی۔ اس رات میں اور ابو بے تحاشا روتے رہے۔

”یہ شاجا میرا بھائی ہے۔ جب یہ یو کے آیا تو خالی ہاتھ تھا۔ کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔ میں نے تین سال تک اپنا فلیٹ اسے دیئے رکھا۔ خود ایک ہوٹل میں ساتھی کے ساتھ کمرہ شیئر کرتا رہا۔

یہ شاجا ہے، جسے کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنی عمر کی تمام پونجی نکال کر اسکے سامنے رکھ دی سوچا تھا کہ ایک چلتا اسٹور خرید لوں گا۔ تمہارے لیے کچھ تو سیونگ ہو، مگر... دیکھو شاجے نے میرا اعتبار نہیں کیا۔ مجھے دو کوڑی کا کر دیا۔“

ابو رو رہے تھے اور وہ اس رات آخری مرتبہ روئے تھے۔

نہ جانے کیا سوچ کر ابو پھوپھی کے گھر چلے آئے تھے۔ پھوپھی نے حتی المقدور ہماری مدارت کی۔ ہمیں رہنے کے لیے ایک اچھا سا کمرہ دیا۔ ابو کے لیے پھوپھی کے دل میں کافی نرم جگہ تھی مگر میرے لیے نہیں۔

ابو اسی رات چپکے سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ پھوپھی کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ میں نے پھوپھی کو بے تحاشا روتے دیکھا۔

ابو کے جانے کے بعد میں وہ کتنا تنہا ہو گیا تھا اور مجھے میرے اپنوں نے مزید تنہا کر دیا تھا۔ ایک دن پھوپھی کی ایک دوست جو بلند آواز میں شاید مجھے سنانے کے لیے کہہ رہی تھی۔

”نہ جانے یہ تنویر بھائی کی اولاد ہے یا پھر کسی اور کا خون، ان انگریز عورتوں کا بھلا کیا بھروسہ...“

یہ ہی الفاظ تھے جو کاشفہ چاچی نے بھی ایک مرتبہ میرے لیے کہے تھے اور شاید چاچا بھی اسی لیے مجھ سے متنفر ہو چکے تھے۔ میرے بارے میں شاید سب ہی مشکوک ہو گئے تھے۔ یہی حالات تھے جب میں نے پاکستان کا رخ کیا۔ تب میرے دل میں صرف انتقام کا جذبہ تھا۔

میں چاہتا تو تمہیں اغوا کر سکتا تھا۔ تم سے گن پوائنٹ پر نکاح کر لیتا۔ تمہاری ماں کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی بھی گھٹیا حرکت کر سکتا تھا۔ بغیر نکاح کے بھی تمہیں لے کر فرار ہو سکتا تھا۔ تمہیں خود تمہاری نظروں سے گرا دیتا۔ تمہیں کریکٹر لیس ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مقصد تو صرف یہ تھا کہ سب لوگ، معاشرہ سب چاچی کی طرف انگلی اٹھائیں۔ ان سے نفرت کا اظہار کریں۔ چاچی بھی ذلت اور رسوائی کا مزہ چکھیں۔

مگر جانتی ہو فری! کس چیز نے میرے شیطانی ارادوں کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔ تمہاری معصومیت نے۔ اس محبت نے جو تم مجھ سے کرتی ہو۔ زندگی میں مجھے صرف ایک محبت میسر آئی ہے اسے میں خود اپنے ہاتھ سے کیسے دفن کر ڈالتا۔ اگر میں ایسا کر لیتا تو جو میرے اندر ایک اور انسان رہتا ہے وہ مجھے کبھی چین سے جینے نہیں دیتا۔

میں نے تین عورتوں کو خود پر مہربان ہوتے دیکھا ہے۔ ایک ننا، دوسری تم اور تیسری طوبی باجی۔

رات بھر میں سوچتا رہا تھا۔ میری طبیعت خراب تھی اور طوبی باجی کی گویا جان پر بنی ہوئی تھی۔ پہلے پہل میں باجی کی فکر مندی پر حیران ہوا تھا۔ اب میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے سارے ملازموں کے لیے نرم رویہ رکھتی تھیں۔ میرے علاوہ کوئی اور ملازم بیمار ہوتا تو تب بھی وہ اس کا خیال رکھتیں۔ اسے آرام کرنے کا موقع دیتیں۔ ڈاکٹر کو گھر بلا کر چیک اپ کرواتیں۔ پرہیزی خوراک مہیا کرتیں۔



اگرچہ رب نے طوبیٰ باجی کو بے تحاشا نواز رکھا تھا، لیکن اس نواز ش اور رزق کی فراوانی نے ان میں غرور اور تکبر نہیں بھرا تھا۔ یہ بھائی کی وہی پرانی، سادہ مزاج اور سادہ لوح طوبیٰ باجی تھیں۔ میں انہیں جان بوجھ کر توبہ باجی کہہ کر چھیڑتا تھا۔

تم حیران ہو گی۔ یہ میں نے کیا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ چلو تمہیں بھی کچھ تفصیل بتا دیتا ہوں۔

اخبار میں ایڈ پڑھنے کے بعد میں سیدھا اسی پتے پر پہنچا تھا۔ پورے تین مہینے ہو گئے تھے مجھے ولنشیا میں گھریلو ملازم کی نوکری ڈھونڈتے ہوئے۔ میرے پاس رہنے کے لیے ٹھکانہ تک نہیں تھا۔ جیب میں جو کچھ تھا وہ ان تین مہینوں میں رہائش اور کھانے پینے پر خرچ ہو گیا تھا۔ مجھے ولنشیا کے علاوہ کہیں اور ملازمت نہیں کرنی تھی۔ یہ تو طے تھا، میں نے کس مشکل اور مصیبتوں کے بعد تم لوگوں کا موجودہ پتہ حاصل کیا تھا۔ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ تمہاری ممی نے آنا فانا ڈیفنس والا گھر بکوا دیا تھا۔ یہ نیا گھر اس لیے تم

لوگوں کو لے کر دیا تھا کہ انہیں شاید میرے طرف سے خطرہ تھا۔ تمہیں جھوٹی کہانی سنا دی تھی کہ تمہارے ماموں کو رقم کی ضرورت تھی۔ تب ہی یہ شفٹنگ عمل میں لائی گئی ہے۔

لوگ اب صرف قابل بھروسہ لوگوں کو گھریلو ملازم رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے، حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ میری تو سفارش کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

میں ہر روز تمہیں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ اکثر تم ننا کو ہمراہ لیے پارک آتی تھیں۔ پچھلے تین مہینوں سے سوائے تمہیں دیکھنے کے اور کوئی تیسرا کام نہیں کیا تھا۔ اور اس دیکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس ببل گم چباتی، لالابالی سی لڑکی کے لیے میرے دل میں کچھ نئے جذبات ابھر آئے۔ میں اس صورت حال پر حیران رہ گیا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک ستم کھائے اس دل پر نہ کیسے دن دھاڑے واردات ہو گئی تھی۔ اس نئے ذائقے نے مجھے دم بخود کر دیا۔

بہر حال میں اخبار لیے یزدانی ہائوس پہنچ گیا تھا۔ پہلے دو امیدوار منہ لٹکائے باہر آئے تو مجھے اندر بلوایا گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ باجی نے مجھے ہرگز نہیں پہچانا تھا۔ ہاں میں نے انہیں پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔

یہ تو طوبی باجی ہیں، بھائی والی، میرے کُرتے سیلا کرتی تھیں۔ واہ مولا ! تو بھی نوازنے پر آئے تو خزانوں کے منہ کھول دیتا ہے۔

میں باجی کی موجودہ رہائش کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری ڈیمانڈ سن کر مسز یزدانی مجھے باہر کا راستہ دکھا دیں گی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اپائنٹ کر لیا گیا۔ میری ڈیمانڈ پوری کردی گئی۔ طوبی باجی کے نرم مزاج کی وجہ سے میں جلد ان سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ اور وہ مجھے باقی ملازموں کی نسبت کچھ زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ شاید میرے انگریزی بولنے کی وجہ سے۔ انہیں میرا انگلش بولنا بھی بہت پسند تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے بچوں کو انگریزی بولنا سکھا دوں۔

ایک دن میں نے باجی سے کہا ”میڈم! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو آپ سے ایک بات پوچھ لوں؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے اجازت طلب کی تھی۔

”تو پوچھو نہ بچے اجازت کیوں لیتے ہو۔“

”آپ بھائی والی طوبی باجی تو نہیں؟“ میں نے اپنی الجھن رفع کرنا چاہی۔

”اور تم کون ہو؟“ وہ ٹھٹک گئی تھیں۔ مجھے بغور دیکھنے لگیں۔

”میں محمد حمزہ ہوں۔ بھائی والا۔“

”ارے تو حامی ہے۔ دائی رحیاں کا پوتا۔ ماشاء اللہ اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ میں نے پہچانا ہی نہیں۔“ میری توقع کے برخلاف وہ بہت خوش ہوئی تھیں۔ میرا تو خیال تھا وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیں گی۔

”تو یہ نوکری کر رہا ہے۔ اپنے ابو کے ساتھ باہر نہیں چلا گیا تھا تو؟“ وہ حیران تھیں اور اپنی حیرت دور کرنا چاہتی تھیں۔ میری رام کہانی سننے کے بعد انہوں نے اپنے بارے میں بتایا۔

”تو جانتا ہے نا! مری ماں درزن تھی۔ بیوہ عورت تھی۔ ہمارے حالات ایک جیسے تھے۔ حالانکہ تمہارے چاچا اور ابو دونوں یورپ میں تھے۔ اس کے باوجود یزدانی ہائوس والوں کے کپڑے میری ماں ہی سیا کرتی تھی۔ اماں کے بعد یہ کام میں نے سنبھال لیا۔ بڑی بیگم (حامد کی والدہ) بڑی نیک خاتون تھیں۔ میں ان کے کپڑے سی کر کوٹھی پر پہنچا آیا کرتی تھی۔ حامد صاحب نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا۔ شاید اس لیے کہ اللہ نے غربت کے باوجود حسن سے نواز رکھا تھا مجھے۔

شادی کے بعد پتہ چلا تھا کہ بڑی بیگم کے متوجہ کرنے پر حامد صاحب میری طرف ملتفت ہوئے تھے۔ حامد صاحب بہت ہی کم رو انسان تھے۔ اپنے حلقہ احباب میں اسی وجہ سے ریجیکٹ ہوتے رہے۔ کالی رنگت، پستہ قد، بے حد معمولی سے نین نقش، اور اب تو دولت بھی نہیں رہی تھی۔ صرف بھرم ہی باقی تھا۔ ان کا کاروبار ڈوب چکا تھا۔ شادی کے بعد میں نے بہت کڑا وقت دیکھا ہے۔ کوٹھی بک گئی تھی۔ گھر کا قیمتی سامان تک بک گیا۔ حامد کی امی اسی

صدے سے انتقال کر گئیں۔ پھر حامد باہر چلے گئے۔ ہمارے حالات پہلے جیسے ہو گئے۔ اللہ سوہنا بڑا مہربان ہے۔ سارے رنگ دکھاتا ہے۔ وہ بہت ہی بزرگی والا ہے۔ اسی کی شان ہے کہ ہم جیسوں پر اپنا رحم کیے ہوئے ہے۔

تم غم نہ کھانا حامد! محنت میں عظمت ہے۔ شان ہے، تم یقین جانو حامد نے یورپ میں اس سے بھی بیچ کام کیے ہیں۔ برتن دھوئے، جھاڑو لگائے ہیں۔ آج ان کا اپنا اتنا بڑا ہوٹل ہے۔ کئی ملازم کام کر رہے ہیں۔ رب کی رحمت سے اور اس کے فضل سے بگڑے کام سیدھے ہو جاتے ہیں۔ بس ثابت قدم رہنا اور محنت اور لگن سے خدا کو منوالینا۔“

”آپ کیوں نہیں گھپیں حامد صاحب کے پاس؟“

”لو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے انگریزوں کے ملک میں بچے بگاڑنے کے لیے جانے کی۔ حامد نے بہت کہا ہے، مگر میں نہیں مانی۔ میرے بچے میرا اثاثہ ہیں۔ میں اس آزاد ملک کا شہری بنا کر خود سے اور زندگی سے دور نہیں کرنا چاہتی۔“

وہ صاف گو تھیں۔ اور جب میں انہیں میڈم کہتا تو انہیں سخت غصہ آتا تھا۔ ”تو طوبی! باجی بولا کر حامے! مجھے میڈم شیڈم نہیں اچھا لگتا۔“

میں نے باجی کو اپنا راز دار بنا لیا تھا اور انہوں نے پوری بات سن کر مجھے نرمی سے سمجھایا۔

”دیکھ حامے! میں خود بیٹیوں والی ہوں، اس بچی کے ساتھ کچھ غلط کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

باجی نے میرے اندر سے غصہ اور نفرت حتیٰ کہ انتقام کے جذبے کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ انہوں نے کہا تو صرف اتنا۔ ”اگر فریا کو پسند کرنے لگے ہو، اس کے لیے اپنے جذبوں کو خالص سمجھتے ہو تو کبھی بھی کسی قسم کا انتہائی قدم مت اٹھانا۔ جو تمہارے لیے عمر بھر کا پچھتاوا بن جائے۔“

”آپ کیا سمجھتی ہیں یہ لوگ کبھی اسے میرا نہیں ہونے دیں گے؟ میرا دل کرتا ہے، ہم سول میرج کر لیں۔ یا پھر خفیہ نکاح۔ اسٹیٹس کے مارے یہ لوگ فریا کے لیے کم از کم مجھے تو پسند نہیں کر سکتے“ میں سخت مشتعل تھا۔

”تو ان لوگوں کو کچھ بن کر دکھا دو نا۔“ باجی نے حلاوت سے مجھے سمجھایا۔ ”دو سال ضائع کر دیئے تو نے حامے! ایک انتقام کے جذبے کے لیے۔ دو سالوں میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”تم لوٹ جاؤ حامے! اگر کچھ حاصل کرنا ہے۔ فریا کو پانا ہے تو خود کو لاکھوں لوگوں کی بھیڑ میں منوالو۔ اپنی پہچان بناؤ۔ اپنا الگ مقام بنائو۔ اور یاد رکھو، اگر فریا تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے تو تمہیں ضرور ملے گی۔“

ان کی باتیں میرے دل میں اتر گئیں اور میں پلٹ گیا۔

چاچی جن سے مجھے بے انتہا نفرت محسوس ہوتی تھی۔ انہوں نے کبھی اپنی سگی ماں کو عزت احترام نہیں دیا تھا تو وہ اپنے شوہر کے بڑے بھائی کو کیسے مقام دیتیں اور پھر شاہجے چاچا اور پھوپھی تھے خود غرض اور احسان فراموش جو لوگ اپنی ماں کے ساتھ مخلص نہ ہوں، ان سے بھلا کون احمق شکوے کرے۔ کیا، کیا تھا ابو نے چاچا نے اور پھوپھی نے دادی کے ساتھ۔ اپنی اپنی

خواہشات کو عزیز رکھا۔ بوڑھی ماں کو ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ پلٹ کر ان کی خبر نہ لی۔

اور کاشفہ چاچی جو چاہتی تھیں کہ ان بیٹی کے لیے کوئی خاص الخاص لڑکا ہو، ان کی خواہش غلط نہیں تھی۔ طریق کار غلط تھا۔ مجھے اور ابو کو چاچا کی نظر سے گرانے کے لیے اتنا کچھ انہوں نے اسی لیے تو کیا تھا کہ چاچا مجھ سے متنفر ہو جائیں۔

اور آخری بات بتادوں تمہیں، کچھ عرصہ پہلے ہی کوئی ڈیڑھ سال پہلے چاچا میرے پاس آئے تھے۔ ابو نے جو رقم انہیں دی تھی مجھے لوٹانے، میں نے دیکھا، وہ شرمندہ تھے۔ پشیمان تھے۔ انہوں نے

صرف اتنا کہا۔

”جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ وقت پلٹ نہیں سکتا۔ تم اس رقم سے کوئی کام شروع کرو، میں تمہیں سپورٹ کروں گا۔ شاید کچھ قرض اسی طرح اتر جائیں جو

میری جان پر دھرے ہیں۔ تم مجھے صرف اتنا بتاؤ میری بیٹی تک کیسے پہنچ گئے حامے! اور وہ تم سے ...“

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے تھے۔ پھر جب بولے تو ان کی آواز دھیمی تھی۔

”فریا تم سے محبت کرتی ہے حامے! دیار غیر میں مشقت کی چکی پیستے ہوئے تھک گئے تو سستانے کے لیے کسی شجر کی چھایا ادھار مت لینا۔ میری بیٹی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وقتی سکون اور خوشی کی خاطر حقیقی مسرتوں کو مت کھونا۔“

وہ چلے گئے تھے۔ میں نے ان کی لرزیدہ آواز میں چھپی خواہشوں کو دل سے محسوس کیا تھا۔

”تو بیٹی کی محبت نے آپ کو توڑ ڈالا ہے چاچا! میں حیران سا سوچتا رہ گیا۔ اب بھی سوچ رہا ہوں، کب سے کھڑا سوچ رہا ہوں، تقریباً دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ ارے فری! ذرا سر تو اٹھا کر اوپر تو دیکھو، تھوڑا گردن کو بھی



موڑو۔ ارے دیکھو بھی، پہلے مڑ کر دیکھو۔ آنسو تو پونچھو۔ ارے رو کیوں رہی ہو؟ نا... نا رونا نہیں، شاباش پیچھے مڑ کر دیکھو۔“

فریا دنگ رہ گئی تھی۔ خط اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ آنسو پونچھے ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا، وہ عین اس کے پیچھے ہی تو کھڑا تھا۔

”حامے! تم.....“ فریا چلائی۔

☆☆☆

”کیا لینے آئے ہو یہاں، کمینے... ذلیل، خود غرض، بہروپئے۔“ اس کے منہ میں جو آرہا تھا بولے جارہی تھی۔ حمزہ کی شرٹ کے سارے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے ناخنوں سے اس کے ہاتھوں اور منہ تک کو نوچا کھسوٹا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔

”ننا!... ننا، بنگالی جی! ارے کوئی ہے جو مجھے بچائے۔“

”شاباش میرے ویر! اب اچھی طرح سے پٹتے رہو کچھ تو سزا تمہیں بھی ملنی چاہئے۔“ طوبی باجی ٹیرس پر کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

”آپ بھی جی بھر کر مسکرا لیں، آگئی نا بہو، تو سارے مزے ہوا ہو جائیں گے۔“ طوبی باجی نے ارسلان کی شادی طے کر دی تھی۔ وہ ان ہی کے اصرار پر پاکستان آیا تھا۔ فریا کو منانے۔

”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ یہ کمینہ پاکستان آچکا ہے۔“ وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

باجی نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔

”اس کمینے نے منع کیا تھا۔“

”اپنی شکل گم کر لو حامے! ورنہ میرے ہاتھوں انجام پذیر ہو جائو گے۔“ وہ وارننگ دے رہی تھی۔

”اس کا بھرتہ بنا دو فری!“ باجی مسلسل حمزہ کو چڑا رہی تھیں۔

”اتنے سے بالشت بھر ارسلان کی شادی کر رہی ہیں۔ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ پچھتاتی رہنا پھر۔ اب بھی ارادہ بدل لیں۔“ وہ دونوں محاذوں پر جنگ لڑ رہا تھا۔ دونوں کی گولہ باری کا جواب دے رہا تھا۔ ”یہ ارسلان تو بڑا تیز نکلا۔ آپ کو لڑکی ڈھونڈنے کا تردد نہیں کرنا پڑا۔“

”خود جب ارسلان کے جتنے تھے، بالشت بھر کے تھے۔ پتا ہے کیا کیا کرتے رہے ہو۔ بھول گئے ہو تو یاد دلائوں، فریا کے ساتھ افسیر کس نے چلایا؟“ وہ ہنس رہی تھیں۔ حمزہ نے مصنوعی شرمندگی خود پر طاری کر لی۔

”معافی تو لے دیں۔ میں تو منتیں کر کر کے تھک گیا ہوں۔ کیسی بہن ہیں، تماشا دیکھے جارہی ہیں۔“ حمزہ نے دہائی دی۔

”جھوٹے، دغا باز! کب منتیں کی ہیں۔“ فریا اس سفید جھوٹ پر تلملا اٹھی۔

”تو کیا پیر پکڑ لوں؟ وہ بھی باجی کے سامنے، یہ پھر طعنے دیتی رہیں گی عمر بھر۔“ حمزہ نے رونی صورت بنا لی۔

”نہ کروں تو؟“ فریا اس اعصابی دباؤ اور اچانک ملنے والے جھٹکوں سے سنبھل چکی تھی۔

”باجی آپ ہٹ جائیں ٹیرس سے۔“ حمزہ نے بھرپور جذباتیت کا مظاہرہ کیا۔

”کیوں؟“ فریا اور باجی دونوں حیران ہوئیں۔

”میں بس خود کشی کرنے والا ہوں۔“

”اللہ نہ کرے۔“ ان دونوں نے دہل کر کہا۔ اسی پل ننا باہر آگئی تھیں۔ ان کے پیچھے بنگالی جی بھی تھے۔

”ننا! دیکھیں طوبی باجی کا خانساں آگیا ہے۔“ فریا نے تھکا دینے والے بوجھ کو شانوں سے اترتا ہوا محسوس کیا۔

”لڑکی! ہوش کے ناخن لے، ذرا احترام کرنا سیکھ۔“ ننا حمزہ سے گرم جوشی سے مل رہی تھیں۔

”کیوں کروں میں اس کا ادب احترام... یہ اس قابل ہے، بغیر بتائے فرار ہو گیا تھا۔ اپنا اتنا پتا بھی نہیں چھوڑا۔“

اب وہ مسکرا رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑے کاغذوں کو لفافے میں ڈال رہی تھی۔ حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے وہ لفافہ پکڑ لیا۔ پھر اس کے کئی ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیئے۔

”آج سے اس بوسیدہ زندگی کا اختتام ہوا۔ اب نئی کتاب کے ہر صفحے پر اپنی پسند کی عبارت لکھوں گا۔“

”کیا لکھو گے؟“ فریا نے ایک بے تکا سوال کیا۔

”صرف محبت...“ وہ بھرپور انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”میں تمہارے ٹوٹے کردوں گی۔“ وہ مسکراہٹ چھپا کر دھاڑی۔ ”میرے ساتھ پھر افسر چلاؤ گے؟“

”فری! بک بک نہ کر... یہ تیرا ہونے والا مجازی خدا ہے۔“ ننا کے چہرے پر خوشی کھلی پڑ رہی تھی۔

”مجھے اس خبیث سے شادی نہیں کرنی، نہیں، نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔

”یہ ریزن اپنے ماں باپ کو دینا۔ شام کی فلائٹ سے آرہے ہیں دونوں... تمہارے ممی، ڈیڈی نے حمزہ سے تمہاری بات طے کر دی ہے۔ آج سے تم مایوں بیٹھ رہی ہو۔ چلو اندر، منہ کھولے پھر رہی ہو۔ روپ کیا خاک آئے گا۔“ ننا مسکراتے ہوئے اندر بڑھ گئی تھیں۔

”ممی مان گئیں؟ مگر کیسے؟“ فریا سارا غصہ بھلائے حیرت سے حمزہ سے پوچھنے لگی۔

”انہیں تمہیں ساری عمر کنوارے بٹھانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میرے ہجر میں سوکھ سوکھ کر کانٹا بن رہی تھیں تم... کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا تم نے، اس لیے ساسو ماں کو ماننا ہی پڑا۔“ وہ آنکھوں میں ڈھیروں چمک لیے کہہ رہا تھا۔

”بنگالی جی! گڑ والے میٹھے چاول اور اپیل پائی بھی بنائیے گا۔“ فریا نے چونک کر آواز لگائی تھی۔ اسے اچانک زوروں سے بھوک لگنے لگی تھی۔ اور اسے بے تحاشا ہنسی آرہی تھی۔

”فری! تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ وہ اس کے سامنے کان پکڑے کھڑا تھا۔ ”تجھے ناحق ستایا ہے، معاف کر دے نا۔“

”کر دیا معاف، کیا یاد کرو گے۔“ فریا نے شان بے نیازی سے کہا۔ ”ویسے محمد حمزہ! داستان امیر حمزہ تو سنا چکے ہو، ہماری نہیں سنو گے۔“

”پوری زندگی آپ ہی کی سنوں گا۔ اب صرف مجھے سنانے دیجئے۔“ بڑی عاجزی سے درخواست پیش کی گئی۔

”سنائیے، فرمائیے۔ ارشاد کیجئے۔“ فریا نے شاہانہ انداز میں کہا۔

”آپ کو یہ معمولی سا مزدور کیسا لگتا ہے؟ اپنی ہمراہی کا شرف بخش دیں گی؟ اگرچہ یورپ میں بھی میں مزدوری کرتا ہوں۔ میں اب بھی مزدور ہی ہوں۔ گورنر نہیں، اتنا بالشت بھر کا فلیٹ ہے میرا۔ دو آدمی چلیں تو ایک

دوسرے سے ٹکراتے رہیں، ویسے تو یہ میرے اور تمہارے لیے نیک شگون ہے، یعنی ٹکرا نا، اور بار بار ٹکرا نا۔ چھوٹا سا اسٹور ہے۔ اس میں گاہک بھی بہت کم آتے ہیں۔ یعنی آمدن نے زیرو سے سٹارٹ لیا ہے۔ شاہجے چاچا جتنا امیر نہیں ہوں۔ ان کے گھر جتنا بڑا گھر نہیں ہے میرا۔ مگر تابعداری میں ان سے بھی چار ہاتھ آگے رہوں گا۔ فرماں بردار شوہر کا ہر سال کا ایوارڈ مجھے ہی ملے گا۔ اب تم پھر بول دو نا!“ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے کہہ رہا تھا۔

”کیا؟“ فریا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں اپنے دونوں ہاتھ دے دیئے۔

”ہاں، قبول ہے۔“

وہ اس کے کان کے قریب گنگنایا تھا۔ فریا کو لگا پانچ سال سے روٹھی بہار نے چپکے سے اس کے درتچے میں جھانک کر پہلی شرارت کی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

## آدھاسی

وہ ابھی ابھی ایک مشہور سائیکاٹرسٹ کے کلینک سے نکلی تھی۔ آج اسے زاریہ فاروقی نے جو کچھ بتایا تھا اسے جان کر اس کے ذہن کی بہت سے گتھیاں سلجھ گئی تھیں، آنکھوں سے پردے ہٹ گئے تھے۔ واپسی پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ان ہی باتوں کی بازگشت تھی۔

”انسانی نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو شخص خود محروم رہتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو یا اپنے سے وابستہ کسی دوسرے فرد کو خوشی پاتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر شخص پیاسا اور تشنہ رہے۔“

ابھی وہ گھر میں داخل ہوئی تھی کہ مانی چیختا ہوا اس سے لپٹ گیا۔

”آپا سلطان لالہ آئے ہیں۔“

”کیوں آئے ہیں؟“ اس کے ماتھے پر بل پڑنے لگے۔

”اپنی بیگم اور لخت جگر کو لینے آئے ہیں۔“ تانی بھی اپنے تئیں جھومتا جھامتا خوش خبری سنانے کی غرض سے دوڑا آیا تھا۔

”وہ کسی سلطان خان کو نہیں جانتی۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”اتنا بڑا سفید جھوٹ۔“ تانی نے پوری آنکھیں کھول کر آگ بگولا ہوتی آپا کو دیکھا۔



”آپا! لالہ تیسری مرتبہ آئے ہیں... ایک دفعہ ان کی درخواست پر غور تو کرو۔“ مانی نے التجائیہ کہا۔

”تین ہزار مرتبہ بھی آئیں گے تو میرا جواب یہی ہو گا۔“

”بھلا کون سا جواب۔“ دونوں نے احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر یک زبان ہو کر بولے۔

”یہی کہ مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا۔“ وہ تن فن کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی تھی اور پھر کوئی دبے قدموں سے اندر چلا آیا۔ درشہوار کا دل پہلو میں دھڑک اٹھا تھا۔

سفر کی تمام تر تھکان گویا لمحوں میں اڑنچھو ہو گئی تھی۔ بائیں پہلو میں دھڑکتا دل خوشگوار ساعتوں کا منتظر تھا۔ حنائی ہتھیلیاں پسینے سے نم تھیں۔ دونوں کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں گنگنا اٹھیں... اس کا سر جھک گیا۔

اس کے بدن پر بہت ہی قیمتی لباس تھا، جس میں سے سحر انگیز روح کو سرشار کرنے والی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ اس پاکیزہ جذبوں سے بو جھل معطر خوشبو نے آنے والے کے دل کا بوجھ کس قدر بڑھا دیا تھا۔ زریاب خان آفریدی کی سب سے حسین اور لائق بیٹی کو بہو بنا کر عالمتاب نے سوچا تھا وہ زیتوں بانو کو ہرا چکی ہیں۔ وہ اپنی پسندیدہ بہو اور لاڈلی بھتیجی کو بیاہ لائی تھیں مگر شکست کا احساس عین کامیابی کی گھڑیوں میں ہوا تھا۔

اس وقت درشہوار کے سامنے سر جھکائے مجرم بنی شرمندہ سی کھڑی تھیں۔ درشہوار کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو اس نے گھنی پلکوں کی چلمن اٹھا کر دیکھا اور گویا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

سامنے اس کی پھوپھی جان عالمتاب کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ درشہوار کی چھٹی حس نے اسے کچھ غلط ہونے کا اشارہ دے دیا تھا۔ اس کے دل میں جلتی شمع کی لو مدہم پڑ گئی۔

”پھوپھی جان! خیریت...؟“ وہ لب کچل کر رو دی تھیں۔

”آپ کیوں رو رہی ہیں؟ مجھے کچھ تو بتائیے۔“ اس کے نرم لہجے میں پوشیدہ خوف نے عالمتاب کے دل کو لرزا دیا تھا۔

”میری کوکھ سے جنم لینے والے بیٹے نے اپنی ماں کے اونچے نسب کو داغدار کر دیا ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

”پلیز پھوپھو! کھل کر بتائیے۔“

”در شہوار بہت مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔ میں ہر بدترین بات سننے کیلئے خود کو تیار کر چکی ہوں۔“ اس کی رگوں میں بھی تو خانوں کا جوشیلا خون دوڑ رہا تھا۔ عزت نفس پر تو ہر شے قربان۔

”سلطان خان، مزارعے خیر دین کی بیٹی سیتو کو بیاہ لایا ہے۔“

”کیا...؟؟؟“ در شہوار کے دل میں نیزے کی انی پیوست ہو گئی۔

”پھوپھی جان یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ وہ وحشت سے بولی، عالمتاب کی سوکن زیتون بانو کی بھانجی سیتو نے اس کو ہرا دیا تھا۔ در شہوار گویا پورے قد

سے ڈھے گئی۔ اس قدر تذلیل، توہین کے احساس نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔

”کیا کوئی در شہوار کو بھی ٹھکرا سکتا ہے؟“ آئینہ اس کے قیامت سراپے کو دیکھ کر تمسخر اڑانے لگا۔

”شہوار بیٹے! اپنی پھوپھی کو معاف کر دو۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر رونے لگیں۔

”پلیز، پھوپھی جان! کیوں گناہ گار کر رہی ہیں۔ اس میں بھلا آپ کا کیا قصور...“ اس نے فوراً ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر چوما۔

”میں کبھی اپنے چھوٹے بھائی زریاب خان کے سامنے سر اٹھا کر نہیں جاسکوں گی۔“ ان کے آنسو ایک تواتر سے بہ رہے تھے۔

”یہ سب نصیبوں کا کھیل ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”آپ خود کو دوش مت دیں۔“

”در شہوار ! تمہاری ہمت سے بڑھ کر بوجھ کندھوں پر آ پڑا ہے۔ کیا اس بوجھ کو اٹھانے کی طاقت ہے تم میں ؟۔“ وہ اس سے کس چیز کی امید رکھتی تھیں ، در شہوار سمجھ چکی تھی۔

”ایک خود غرض شخص نے اپنی ضد اور خواہش کے پیچھے کسی کی پوری زندگی دائو پر لگا دی ہے۔“ سلطان خان خٹک ضدی اور انا پرست ہے تو میری رگوں میں بھی آفریدی خاندان کا لہو دوڑ رہا ہے۔ مجھے اپنی عزت اور ذات کا افتخار، خودداری ہر شے سے عزیز ہے۔ اس کمرے میں کوئی بھی بات آفریدی قبیلے تک تو کیا اس حویلی کی غلام گردشیں بھی سن نہیں پائیں گی۔ آپ بے فکر ہو جائیں پھوپھی جان ! میں اپنی بکھری ذات کو سمیٹ لوں گی۔ بس مجھے ایک رات اپنی محبت کی نفرت پر جی بھر کے رونے دیں۔ شاید اس دل کا کچھ بوجھ آنسو بن کر بہہ جائے۔“ وہ اپنا لباس سمیٹ کر اٹھ گئی تھی۔

بہت دیر بعد جب وہ لباس تبدیل کر کے باہر آئی تو اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آگیا۔

سامنے صوفے پر سلطان خان بیٹھا تھا۔ اس کی یہاں موجودگی در شہوار کیلئے باعث حیرت تھی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ یک دم سیدھا ہوا۔

”کیسی ہو در شہوار ؟“

”کیسا ہونا چاہئے مجھے ؟“ اس نے الٹا سوال داغ دیا۔ لہجہ بے انتہا کٹیلا تھا۔

”تمہیں یقیناً کچھ دیر پہلے ہونے والی کارروائی کی خبر ہو چکی ہے۔“ در شہوار کے دھلے دھلائے چہرے اور خصوصاً آنکھوں کے تاثرات سے وہ بالکل ٹھیک اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ اس کی سیج سجائے نہیں بیٹھی تھی۔ اس کا انداز عام روایتی دلہنوں جیسا نہیں تھا۔

”میں پوچھ سکتی ہوں کہ میرے ساتھ اس ڈرامے کی کیوں ضرورت پیش آئی ؟۔“ اس کی لفظ لفظ میں تلخی رچی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔

”اس وقت تم غصے میں ہو، ہم بعد میں بات کریں گے۔ رات بہت ہو گئی ہے ، میرا خیال ہے اب سو جانا چاہئے۔“ وہ کتنے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ اسے بے اطمینان کر کے۔

”کون سی بات کرو گے۔ میں تم سے کلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ دھوکا دیا ہے تم نے مجھے ... یہاں سونے کی بھی ضرورت نہیں، میرے کمرے میں آنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جاؤ اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس۔“ وہ گویا ایک دم پھٹ پڑی۔

”میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔ اگر بڑی اماں (عالمتاب) نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے اور نکاح تو مجھے سیتو سے کرنا ہی تھا۔ اگر آج ہی میں اسے حویلی لے آیا ہوں تو یہ عہد ہے جسے مجھے ہر صورت نبھانا تھا۔ ہمارے ہاں عہد سے پھرنے والا بے غیرت اور بزدل کہلاتا ہے۔ مجھے چھوٹی اماں زیتون بانو سے کیا وعدہ ضرور پورا کرنا تھا۔ انسلٹ تو تمہاری تب ہوتی، جب سیتو کو اولیت دیتا۔ پہلے اس سے نکاح کرتا۔ اس وقت سیتو کے کمرے میں موجود ہوتا۔ تم در شہوار آفریدی ہو۔ کوئی تمہاری جگہ نہیں لے سکتا۔ کوئی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ سلطان خان بہت نرمی سے بہت رसान سے کہہ رہا تھا۔

”تم نے اسے میرے برابر کھڑا کر دیا ہے۔ تم نے مجھے میری ہی نظروں سے گرا دیا ہے۔ اگر اتنا ہی عشق نے اندھا کر رکھا تھا تو میرے گلے میں اس نام نہاد بندھن کا طوق کیوں ڈالا؟“ وہ زہر خند ہوئی۔

”میں اس لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شہر کی عورتیں بہت بد زبان اور بد لحاظ ہوتی ہیں۔“ سلطان خان بھی شائستگی کا چولا اتار کر دھاڑا۔ اس عشق کے الزام نے اسے سر تاپا سلگا دیا تھا۔

”تو نہ کرتے کس نے مجبور کیا تھا۔“

”تمہاری پھوپھی جان نے۔“ وہ بھی کر خنگی سے بولا۔

”کسی نے گن پوائنٹ پر نکاح نہیں پڑھوایا تھا۔ مرد تھے انکار کر دیتے۔“ در شہوار پھنکاری۔

”انکار کرنے ہی گیا تھا کراچی جب تمہیں ...“ وہ مزید کچھ کہنے سے پہلے لب پھینچ کر خاموش ہو گیا۔

”تم نے مجھے برباد کر دیا ہے۔“

”ابھی بھی کچھ نہیں گیا۔ تم ہر فیصلے میں آزاد ہو۔ خوب سوچ لو۔ مجھے ہر فیصلہ منظور ہوگا۔“ وہ زچ آکر دھیمے سے بولا۔

”کون سا فیصلہ کر لوں؟ یہی ناکہ میں تم سے طلاق کا مطالبہ کروں۔ تم میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتے ہو۔ خود پر سے فرماں برداری کا ٹائٹل نہیں اتروا سکتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تم سے طلاق نہیں لوں گی۔ مجھے شائد نہیں بننا ہر دور میں عورت مجبور رہی ہے۔ کبھی خاندان کی وجہ سے، کبھی ماں باپ کی عزت کی خاطر اور کبھی اس نسب کو بچانے کی وجہ سے عورت، عالمتاب کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ آج سے ستائیس سال پہلے تمہارے باپ نے میری پھوپھی پر سوکن کو بٹھایا تھا۔ تم بھی تو اسی باپ کی اولاد ہو۔“ در شہوار نے تنفر سے کہا۔

”در شہوار! میں تم سے سخت لہجے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر در شہوار کو مزید بولنے سے روکا۔

”ابھی برابر والے کمرے میں جا رہا ہوں۔ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچنا کہ بستر مرگ پر ماں موجود ہو۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں۔ سانسوں کی ڈور ٹوٹنے والی ہو اور وہ آخری خواہش کا اظہار کرے تو آدمی کو کیا کرنا چاہئے۔ بڑی اماں نے تو صرف پیدا کیا تھا جبکہ مجھے پالنے والی چھوٹی اماں تھیں۔ جن سے مجھے عقیدت کی حد تک محبت ہے۔ سیتو مزارعے خیر دین کی بیٹی تھی۔ زیتون بانو کی بھانجی تھی مگر اب وہ سلطان خان کی زوجیت میں ہے۔ جتنے تمہارے حقوق ہیں اتنے ہی سیتو کے بھی ہیں۔ اگر تمہیں میرا فیصلہ، میرا ساتھ منظور نہ ہوا تو میں تمہاری خوشی کا احترام کرونگا۔ دلوں کے سودے زور زبر دستی سے نہیں ہوتے۔ اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔ تم یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر ہو اور میں کم پڑھا لکھا عام سا دیہاتی ہوں۔ پشتون میں آج تک کسی نے بیوی کو طلاق نہیں دی۔ یہ عورت کی ہی نہیں مرد کی مردانگی کی بھی توہین ہے۔ مگر مجھے در شہوار کی خوشی عزیز ہے۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے رکا نہیں تھا، بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکلنا چلا گیا۔



”میں سلطان خان سے بھلا طلاق کس طرح لے سکتی ہوں۔ مئی تو اس رشتے کے حق میں ہی نہیں تھیں۔ میں اس سے طلاق لوں؟ ہرگز نہیں کبھی نہیں ... میں کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع کیوں دوں ... سب میرا تمسخر اڑائیں گے اور میں اس ذلت کو کیسے برداشت کروں گی۔“

وہ تکیے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے بابا زریاب آفریدی پڑھے لکھے نہیں تھے۔ وہ آفریدی قبیلے کے سردار باچا خان کے آخری نمبر والے بیٹے تھے۔ ان کا گاؤں پشاور سے بہتر میل اور احمد آباد سے بیاسی میل دور تھا۔

زریاب آفریدی کی منکوحہ شائلہ آفریدی ان کی چچا زاد بہن تھیں۔ یہ لوگ کراچی میں عرصہ دراز سے مقیم تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب باچا خان ایک دم بیمار پڑ گئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اپنے لاڈلے بیٹے کی خوشی اور فرض کو بھی ادا کر دیا جائے۔ اسی سلسلے

میں انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے سے بات بھی کر لی تھی۔ سو چند دنوں میں ہی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

زریاب آفریدی کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ شائلہ بیاہ کر گاؤں آگئی۔ سننے میں آیا تھا کہ باچا خان کی یہ بھتیجی ان کے بیٹے سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بہت تعلیم یافتہ تھی۔ بہت خود سر اور ضدی بھی تھی۔ ان کے شروع کے اختلافات آئندہ زندگی پر محیط ہو گئے تھے۔ وہ ان پڑھ شوہر سے نباہ کرنا اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اوپر تلے کی تین بیٹیوں کے باوجود وہ اس ماحول میں رچ بس نہیں سکی تھی۔ پھر ایک روز وہ کراچی گئی پھر اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ ماں باپ کے اصرار، باچا خان کے غصے اور زریاب خان کی التجائیں بھی اس کا فیصلہ بدل نہیں سکے تھے۔ اس نے کورٹ سے خلع لے لی تھی۔

اتنی ذلت اور توہین کے باعث زریاب خان گم صم ہو کر رہ گئے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں نوکروں کے رحم و کرم پر تھیں۔ بہت عرصہ لوگ چٹخارے لیتے

رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس قصے پر تب گرد پڑی، جب زریاب خان بھی کراچی شفٹ ہو گئے۔ ان کے چچا نے بیٹی سے تمام تر تعلق توڑ لیے تھے۔ پھر بڑوں نے ایک دفعہ پھر مشترکہ فیصلہ کر کے شمالہ سے چھوٹی نائلہ کا نکاح زریاب خان سے کر دیا۔ نائلہ ان کیلئے بہترین شریک حیات ثابت ہوئی تھیں۔ ان سے زریاب خان کے دو بیٹے ہوئے۔ زندگی کے دریا میں روانی آگئی تھی۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی وہ شادی کر چکے تھے۔ در شہوار کیلئے انہوں نے بہن کے بیٹے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اس شادی سے بہت خوش تھے، مطمئن تھے اور در شہوار انہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اسکی ماں کی کہانی دوہرانے سے خوفزدہ تھی کہ اس کی ماں کا قصہ ایک مرتبہ پھر لوگوں کی زبانوں پر چٹخارے کا باعث بنے گا۔

احمد آباد کے خان راغب علی خٹک اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ وسیع و عریض جاگیر کے تنہا وارث ... ان کی شادی اپنی خالہ زاد عالمتاب سے ہوئی

تھی جو کہ آفریدی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کی شادی کو تیرہ برس بیت گئے مگر ابھی تک حویلی کسی نومولود کی کلکاریوں کی آواز کیلئے ترس رہی تھی۔ عالمتاب کی ساس پیروں، فقیروں اور حکیموں کے علاوہ ڈاکٹری علاج کے بعد بالکل مایوس، پوتے کی آرزو دل میں لیے خالق حقیقی سے جا ملی تھیں۔ بڑے خان نے بہت سوچ بچار کے بعد بیٹے کی دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے ان کی نگاہ انتخاب منشی اللہ بخش کی بیٹی زیتون بانو پر ٹھہری۔ زیتون بانو بہت دبوسی، سیدھی سادی بے ضرر قسم کی لڑکی تھی زیتون بانو کے قدم حویلی کیلئے ایسے مبارک ثابت ہوئے کہ دونوں ہی امید سے ہو گئیں۔ عالمتاب قدرت کی اس ستم ظریفی پر شکوہ کناں ہو گئیں۔ ان کی گود میں سلطان خان نے آنکھیں کھولیں تو وہ شدید بیمار پڑ گئیں۔ ادھر زیتون بانو نے مردہ بچے کو جنم دیا۔ یوں سلطان خان زیتون بانو کی گود میں منتقل ہو گیا۔ عالمتاب کے لاکھ کوشش کے باوجود بھی راغب خان زیتون بانو کو گھر سے نہ نکال سکے۔ سلطان خان ماں سے زیادہ چھوٹی اماں سے مانوس تھا۔ انہوں

نے جی بھر کر اس کے لاڈ اٹھائے تھے۔ وہ بہت نرم دل، صلح جو طبیعت کی خاتون تھیں۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ عالمتاب اور زیتون بانو کے تعلقات میں ابھی تک سرد مہری تھی۔ سلطان اس وقت ایف اے کا سٹوڈنٹ تھا، جب راغب خان انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد تمام تر ذمہ داریاں سلطان کے کندھوں پر آ پڑیں۔ اس نے بہت کم عمری میں ہی تمام بوجھ اٹھالے تھے۔ جاگیر کے مسئلے، کورٹ کچہریوں کے چکر... اندرونی، بیرونی معاملات میں وہ ایسا الجھا کہ پھر تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ان کے خاندان میں کوئی بھی اتنا تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس کے ننھیال والے سب ایجوکیٹڈ تھے۔ سلطان کی کم کم ہی ان سے ملاقات ہوتی تھی۔

تب ہی زیتون بانو کی اکلوتی بھانجی سحر طراز والدین کی وفات کے بعد اپنی خالہ کے پاس حویلی کیا آئی پوری حویلی میں بھونچال آگیا۔

عالمتاب سحر طراز کو اک پل کیلئے بھی گھر میں رکھنا نہیں چاہتی تھیں مگر سلطان کی بروقت آمد نے معاملے کو رفع دفع کر دیا تھا ورنہ عالمتاب تو سحر طراز یعنی سیتو کو گھر سے نکالنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھیں۔ ادھر سیتو کیلئے سلطان گویا رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ معصوم سیتو کو چھوٹا خان اتنا اچھا لگا کہ اس نے ہمیشہ کیلئے دل میں بسا لیا۔

سلطان خان کی وجہ سے اسے حویلی میں رہنے کی اجازت تو مل گئی تھی مگر عالمتاب اس کے ساتھ نوکروں سے بھی بدتر سلوک کرتی تھی۔ سارا سارا دن باورچی خانے میں کھانا بنانے میں مصروف رہتی۔ خان کے یاروں کی اکثر دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان دنوں نوکروں کی گویا کم بختی آجاتی تھی۔ اسے بھی نوکروں میں ہی شمار کیا جاتا تھا۔ سیتو کا بستر سکھاں کے برابر فرش پر لگادیا جاتا۔ خان کو شاید پتہ نہیں تھا ورنہ

وہ ایک پلنگ تو سیتو کیلئے ضرور منگوا دیتا۔

سیٹو کیلئے سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ وہ آتے جاتے خان کو چور نگاہ سے دیکھ لیتی تھی، دل دید سے سیراب کیا ہوتا تھا پورا دن ہی سرشار گزرتا۔ پھر عالمتاب کے ڈنڈے بھی پھولوں کی مانند لگتے تھے۔ عالمتاب نوکروں کو بہت مارتی تھیں۔ ذرا سی غلطی پر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتیں۔ انہیں شاید اس بات پر بڑا مان تھا کہ وہ سلطان خان کی حقیقی ماں ہیں۔ حالانکہ سلطان خان ان کا بیٹا نہیں لگتا تھا۔ اس جیسا نرم مزاج نیک طبیعت تو کئی دوسرا تھا ہی نہیں۔ پوری بستی والے اس کے گیت گاتے تھے۔

ایک دن سیٹو برتن دھونے کے بعد خشک کر رہی تھی کہ ہاتھ روم سے بلوریں نازک سی رکابی گری اور ٹوٹ گئی۔ عالمتاب کو خبر ہوئی تو انہوں نے مار مار کر بھرکس نکال دیا۔ تمام رات وہ روتی رہی اور سکھاں اس کی چوٹوں پر مرہم لگاتی رہی۔ عالمتاب کو اس سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور جب سے زیتون بانو معذور ہو کر کمرے تک محدود ہو گئی تھیں اس دن سے تو وہ اور بھی شیر ہو چکی تھیں۔ گھریلو معاملات میں خان دخل نہیں دیتا تھا نہ ہی خان کو

کسی نے عالمتاب کے روپے کے متعلق بتایا تھا۔ گھر کے سب نوکر عالمتاب سے ڈرتے تھے۔

زیتون بانو کی حیثیت پرانے مکان سے زیادہ نہیں تھی مگر جب چھوٹا خان خصوصاً اماں کے کمرے میں آتا۔ ان کا حال احوال پوچھتا۔ ان کی دوائیاں چیک کرتا۔ ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتا سیٹو کو اماں کا خیال رکھنے کی تاکید کرتا تو خود بخود زیتون کی ذات معتبر ہو جاتی۔ زیتون بانو نظروں ہی نظروں میں بیٹے کی بلائیں لیتیں۔ اس پر دعائیں پڑھ کر پھونک دیتیں۔

سیٹو اس دوران چپکے چپکے خان کو دیکھتی رہتی۔ دل میں کتنا میٹھا میٹھا درد انگڑائیاں لیتا تھا۔ خان کو تو شاید خبر نہیں تھی کہ کوئی چپکے چپکے اس کی محبت میں فنا ہو رہا ہے۔

سیٹو نے غیر محسوس طریقے سے خان کے کاموں کی تمام تر ذمہ داری خود بخود اٹھالی تھی۔ وہ اس کے کپڑے خوب جمایا کر استری کرتی یوں کہ ایک سلوٹ بھی دکھا نہیں دیتی تھی۔ جوتوں کو خوب چمکاتی۔ خان کا کمرہ اپنے

ہاتھوں سے صاف کرتی۔ اس کے کپڑے اب دھوبی کو نہیں دیے جاتے تھے۔ خان بھی اپنے ہر کام کیلئے اسے ہی آواز دیتا تھا اور جب وہ اس کا کام احسن طریقے سے کر دیتی تھی تو وہ اسے تو صیفی نظروں سے دیکھتا تھا۔

☆☆☆

اس دن بھی سیتو خان کے کپڑے استری کر رہی تھی جب وہ فون پر کسی سے بات کرتا اندر چلا آیا۔

”سیتو! یہ بلیک والی نہیں وائٹ والی استری کر دو۔“

”کیوں خان کہیں جانا ہے آپ نے؟“

”ہوں ... کراچی جا رہا ہوں۔“

”کراچی ...“ سیتو کا دل دھک رہ گیا۔

”خان کراچی تو بہت دور ہے۔“ سیتو کا دل بیٹھا جا رہا تھا نجانے خان کب آئے گا۔

”دور تو ہے مگر میں تو جہاز سے جائوں گا۔“ وہ اپنے کچھ کاغذات چیک کرتا بول رہا تھا۔

”خان! کیا کراچی میں بڑی عدالت میں کچھ کام ہے۔“ اس نے جھجکتے ہوئے بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔

”نہیں میں کورٹ کے کام سے تو نہیں جا رہا ہوں۔ مجھے زریاب ماما نے بلوایا ہے۔“ وہ اپنے حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا مگر پھر بھی اس کے بے تکے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔

”زریاب خان ... عالمتاب کے بھائی اور در شہوار کے والد۔“ سیتو کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر گویا بھیج دیا۔ ”کراچی میں در شہوار بھی ہو گی۔ در شہوار خان کی منگیتر۔ عالمتاب کی لاڈلی حسین و جمیل لائق فائق بھتیجی۔“

وہ رنجیدگی سے سوچنے لگی۔ اگرچہ اس نے در شہوار نہیں دیکھتی تھی البتہ عالمتاب کی زبانی اس نے در شہوار کی بہت سی تعریفیں سن رکھی تھیں، ”یہ کہ وہ بہت خوبصورت ہے اور بہت پڑھی لکھی ہے۔“، کیا پتہ وہ خان سے



شادی نہ کرے۔ انکار کر دے۔ شہر میں اسے کوئی اچھا سا لڑکا پسند آجائے۔ جو بہت پڑھا لکھا ہو تو در شہوار خان سے شادی نہیں کرے گی۔ ڈراموں میں تو اسی طرح ہوتا ہے۔ بھلا شہر کی لڑکیاں گائوں کے لڑکوں کے ساتھ گزارا کر سکتی ہیں، اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“

اس نے چور نگاہ سے سلطان کی طرف دیکھ کر چپکے سے دعا کی تھی۔ پھر اس کی نگاہ گویا خان کے چہرے پر جم کر رہ گئی۔

”بھلا خان جیسے بندے کو کوئی ٹھکرا سکتا ہے۔ کیا پتا در شہوار بھی میری طرح خان کی اسیر ہو جائے۔“ اس کا دل اس قدر برا ہو رہا تھا کہ اس نے استری کا پلگ نکال دیا تھا۔ خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”شرٹ استری کردی ہے تو جوتے بھی نکال دو۔“

”خان! آج میں نے دل لگا کر آپ کے کپڑے استری نہیں کئے۔“ وہ شرمندہ سی دبی آواز میں بولی۔

”کیوں؟ آج دل کس طرف محو سفر ہے۔“ خان نے مسکرا کر سادگی سے پوچھا۔ سیتو کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ اس نے سوچا فٹ کہہ دے۔ ”دل تو تمہارا اسیر ہے۔ کسی اور طرف سفر نہیں کر سکتا۔“

”خان! ایک بات پوچھوں؟“

”سیتو! ایک تو تم سوال بہت کرتی ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ تم میٹرک کے پرچے دے لو۔“ وہ اپنے لیڈربیک میں فائلیں ترتیب سے رکھ رہا تھا۔

”پڑھائی میں کہاں دل لگتا ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔ خان نے کپڑے اٹھائے تھے اور پھر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے آیا، تب بھی سیتو سوچوں میں گم وہیں کھڑی تھی۔ سلطان کو بہت حیرت ہوئی۔

”سیتو! کوئی کام ہے؟“

”نہیں خان۔“

”تو پھر یوں کیوں کھڑی ہو؟“

”آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”محترمہ سحر انداز صاحبہ ! ابھی میں جلدی میں ہوں۔ واپس آؤں گا تو ایک چھوڑ دس سوال پوچھ لینا... اور ہاں تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اگر کچھ چاہئے تو بلا جھجک بتا دو اور اماں کی دوائیوں کا نسخہ بھی اٹھا لاؤ۔“

”بہتر خان...“ وہ خوشی خوشی باہر نکل گئی۔ سلطان خان سر جھٹک کر بال سنوارنے لگا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

کراچی تو وہ اکثر جاتا رہتا تھا۔ البتہ زریاب ماما کے گھر وہ بہت عرصہ کے بعد جا رہا تھا۔ در شہوار کو پہلی مرتبہ دیکھنے کی چاہ میں اس نے عالمتاب کو بھی خوش کر دیا تھا جو کہ اس کے کراچی جانے کا سن کر ہی مسرور ہو گئی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ سلطان خان، در شہوار کو دیکھ کر کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

وہ باہر نکلنے لگا تھا جب سیتو نے ایک مرتبہ پھر اس کے کمرے میں جھانکا۔

”خان ! یہ خالہ کی دوائیوں کا نسخہ اور یہ میری چیزیں لے کر آئیے گا۔“ بڑے دھونس بھرے انداز میں کہا گیا تھا۔ سلطان خان نے مسکراتے ہوئے لسٹ پکڑ لی تھی۔

”خان ! ایک بات کہوں؟“

”کہہ دو یا ر.....۔“ وہ لیڈر بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”آپ مجھے سیتو مت بولا کرو بلکہ سحر طراز بولا کرو۔“

”کیوں؟... سب سیتو بولتے ہیں تو مجھے ہی کیوں مشکل میں ڈال رہی ہو۔“

سلطان نے مسکراہٹ لبوں پر سمیٹ کر مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔

”اوکے... اب تم جائو، میں تمہیں سحر طراز ہی بولا کروں گا۔“ وہ مسکراتی

آنکھوں سے پلٹ گئی، جبکہ سلطان خان کے لبوں سے ایک قہقہہ آزاد ہوا۔ وہ کھل کر ہنس رہا تھا۔

”سحر طراز...“ وہ زیر لب بڑ بڑایا۔ ”اس علاقے کے لوگ بھی نام بغیر معنی دیکھے رکھ لیتے ہیں... پھول بی بی، سورج بی بی اور یہ سحر طراز...“ وہ مسکراتے ہوئے بیگ اٹھائے باہر نکل آیا۔ زیتون بانو کے کمرے میں جھانکا تو سیتو آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی فوراً سر پر ڈوپٹا لیا۔

”اتنا آئینہ کیوں دیکھتی ہو سحر طراز!“ وہ آنکھوں میں شرارت لیے پوچھ رہا تھا۔

”خوب صورت جو بہت ہے۔“ کمرے میں آتی ہوئی رنگین نے طنزاً کہا۔ سیتو نے فوراً غور سے آئینے کو دیکھا اور کچھ بد دل سی ہو کر ہٹ گئی۔ گہری سانولی رنگت، پھولی سی ناک... بڑی بڑی آنکھیں اور بے حد باریک ہونٹ، جو چہرے پر نظر ہی نہیں آتے تھے۔ وہ بہت معمولی شکل و صورت کی معمولی سی لڑکی تھی اور نام سحر طراز۔ یعنی سحر طاری کر دینے والی اور اس نے خاک

کسی پر سحر طاری کرنا تھا۔ جب سے اسے اپنے نام کے معنی معلوم ہوئے تھے وہ اپنے نام سے ہی چڑنے لگی تھی۔ پھر اس نے خود ہی سلطان کو منع کر دیا۔

”خان! میں سیتو ہی ٹھیک ہوں۔“

”اور سحر طراز...“ سلطان نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”بھاڑ میں گئی سحر طراز۔“ وہ جلتی بھنتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کراچی پہنچ کر اس نے ایک دو ضروری کام نمٹائے تھے اور اس کے بعد فون کیا۔ چھوٹی اماں کی خیریت پوچھی، فون سیتو نے ریسو کیا تھا۔

”خان! خالہ پوچھ رہی ہیں کہ کب واپسی ہو گی۔“ اس نے دبی آواز میں ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

”واپسی... ابھی تو آئے چھ گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔“ ایک دو مزید باتیں کر کے اس نے فون رکھ دیا تھا۔ اسی پل زریاب خان کا ڈرائیور اسے لینے آگیا۔ وہ

ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ جب وہ آفریدی ہائوس پہنچا تو شام کے سائے گہرے ہو

چکے تھے۔ اسے ایک آراستہ کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سلمان اور عثمان دونوں بھائی چلے آئے۔ ان کے پیچھے در شہوار ٹرالی گھسیٹتی آگئی تھی۔

”اتنا نہیں ہو سکا کہ بہن کی ہیلپ کروا دیں۔“ وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

”بہن نے کونسا اپلے تھاپنے تھے یا تنور میں روٹیاں لگانی تھیں...“ دونوں نے شرمندہ ہونا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ سلطان کے سامنے اس عزت افزائی پر وہ انہیں گھور کر رہ گئی۔

”ڈھیٹوں کے سردار! خبردار جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔“ اس نے لوازمات سے بھری ٹرالی سائیڈ پر کرلی تھی۔ پھر سلطان کی طرف متوجہ ہوئی جو کہ دلچسپی سے ان کی نوک جھوک سے محفوظ ہو رہا تھا۔

”کتنی چینی لیں گے؟“ وہ کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بولی۔

”دو تین بوریاں تو لیں گے ہی۔“ ثانی کی زبان پر پھر کھجلی ہوئی۔

”بکو مت۔“ در شہوار نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

”میں چائے نہیں پیتا۔“ اس نے شائستگی سے کہتے ہوئے سلمان کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑ لی۔

”سلطان بھائی لسی پیتے ہیں، تم لسی بنا لاتیں آپا۔“ عثمان نے کیک پیس میں فورک پھنسا کر شرارت سے آپا کی طرف دیکھا۔ جواباً وہ ایک مرتبہ پھر اسے گھور کر رہ گئی۔

نائلہ بیگم سے ملاقات رات کو کھانے کی میز پر ہوئی۔ ان کا انداز کافی روکھا پھیکا تھا۔ کرید کرید کر حویلی والوں کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ پھر اسے بزنس کے لئے مفید مشوروں سے نوازا۔ سلمان اور عثمان دونوں بور ہو کر اٹھ گئے تھے۔

”اتنا پیسہ بینکوں میں سنبھالنے کا فائدہ... تم کوئی پرافٹ ایبل بزنس کیوں نہیں کرتے۔ تمام عمر کنویں کا مینڈک ہی تو نہیں بنے رہنا۔ میری خواہش ہے کہ

تم شادی کے بعد یہیں سیٹ ہو جاؤ ہمارے پاس ... شہوار کیلئے گاؤں میں رہنا ممکن نہیں۔“

”میں نے اس بارے میں ابھی سوچا نہیں۔“ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا۔

”تو ابھی سوچ لو ... تمہارے ماما تمہیں اچھی طرح گائیڈ کریں گے۔ ابھی سے کوشش کرو گے تو کچھ سالوں تک اچھی ساکھ بنا پاؤ گے۔“ اب کے نائلہ بیگم لہجہ بدل کر بولیں۔

”ممی ! آپ کا فون ہے۔“ کب سے ضبط کرتی شہوار کو آخر بولنا ہی پڑا تھا۔ نائلہ بیگم بیٹی کا موڈ دیکھ کر کچھ سمجھتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ ”اونہہ ، ان باپ بیٹی کا تو ترقی کی طرف رجحان ہی نہیں ہے۔“ وہ جلتے گلستے اٹھ گئیں۔

”پھوپھی جان کی طبیعت کیسی ہے ؟“

”وہ تو ٹھیک ہیں البتہ چھوٹی ماں کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی ہے۔“

”میں نے چھوٹی ماں کی خیریت نہیں پوچھی۔“ وہ جز بز سی ہو کر بولی تھی۔ پھوپھی جان کی سوکن سے اسے کسی بھی قسم کی ہمدردی نہیں تھی۔

”میرے حوالے سے تمہارا بھی ان سے ایک رشتہ بنتا ہے۔“ سلطان نے پہلی مرتبہ اپنے اور اس کے تعلق کا حوالہ دیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ شہوار کے خیالات بھی تو نائلہ بیگم سے نہیں ملتے۔ کیا وہ گاؤں میں اس کے ساتھ نئی زندگی کے آغاز کے بعد رہنا پسند کرے گی۔ زور زبر دستی کا تو وہ کبھی بھی قائل نہیں رہا تھا۔

”کبھی کبھی میں پھوپھی جان کی زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ انہوں نے نجانے اتنا کچھ کیسے برداشت کر لیا۔ نجانے انہوں نے شوہر کی تقسیم کو کیسے گوارا کر لیا۔“

شہوار جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ اس کیلئے ایسا سوچنا بھی محال تھا۔ وہ سلطان خان کو شیئر کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کچی عمر میں ہی وہ شہوار کے خوابوں میں آن بسا تھا۔ دادی نے بہت پہلے ہی اسے باور کروا



دیا تھا کہ اسے دلہن بن کر احمد آباد کی حویلی جانا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ ممی اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔ اس کی بڑی دونوں بہنیں بھی رضامند نہیں تھیں مگر بابا جان دادی کی خواہش ہر صورت پوری کرنا چاہتے تھے۔

”یہ تو بڑے نصیب کی بات ہے کہ آپ احمد آباد والوں کے متعلق کبھی کبھی سوچ لیتی ہیں۔“ سلطان خان نے شگفتگی سے کہا تھا۔ در شہوار قدرے جھینپ گئی۔

”کبھی کبھی نہیں۔ میں تو اکثر سوچتی رہتی ہوں۔“

”پھوپھی جان کے علاوہ بھی کسی کو سوچ لیا کریں۔ کوئی اور بھی آپ کی یادوں میں محفوظ رہنا چاہتا ہے۔“ سلطان خان کی آنکھیں نجانے کس احساس سے جلمگانے لگی تھیں۔

”بھول جانے والوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ وہ جو ہمہ وقت خوابوں اور خیالوں پر قابض ہوں انہیں بھلا کیا کہتے ہیں۔“ در شہوار نے دھیمی آواز میں دلفریبی سے کہا۔

”محبوب۔“ سلطان خان نے مسکراہٹ دبائی اور بولا۔

”کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے۔“

”نہیں۔“ در شہوار کے گالوں میں گلابیاں گھلنے لگی تھیں۔ وہ سرخ لب کا کونا دبائے دھیرے سے بولی۔

”اگر میں کہوں کہ تم بھی آفریدی ہائوس والوں میں سے کسی کو کبھی کبھار سوچ لیا کرو تو...“

”آفریدی ہائوس والوں میں سے کس کو؟ سلمان یا عثمان کو؟ ماما جان کو یا بڑی آپائوں کو۔“ سلطان کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔

”انہیں کیوں؟ آپ مالی یا ڈرائیور کے متعلق سوچئے، یا پھر ہمارے شیف گلہاز یا اس کی بیوی گلبدن کو یاد فرمایا کریں۔ ان کے نو دس بچے بھی ہیں۔“ وہ جل کر بولی تھی۔ سلطان نے ایک خوشگوار قہقہہ لگایا۔

”محبت کے اس سفر میں میں تنہا نہیں ہوں۔ تم بھی ہمراہ ہو۔ یہ احساس روح کو معطر کرنے کیلئے کافی ہے۔ اس سیدھے سادے دیہاتی کے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟ میرے گائوں میں، میرے گھر میں مجھے اپنے کھیت کھلیانوں، ہرے بھرے میدانوں اور اونچے اونچے پہاڑوں سے سچے احمد آباد سے عشق ہے در شہوار! اپنی مٹی سے دور نہیں رہ سکتا۔“ یہ وعدے کی پہلی ڈور تھی، جس میں در شہوار کے اقرار نے پہلی گرہ لگائی۔

”اتنے بھی سیدھے نظر نہیں آتے ہو سلطان خان!“ اس نے اپنے ازلی اعتماد کے انداز میں کہا تھا۔

سلطان خان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ نائلہ بیگم نے چونک کر سٹنگ روم کی طرف دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنا اتنا قیمتی وقت گنوا دیا ہے۔“ سلطان نے مصنوعی تاسف سے کہا۔

”کون سا قیمتی وقت؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی شادی اور منگنی کے درمیان والا گولڈن پیریڈ۔“ وہ شرارت سے ہنسا۔

”منہ دھو کر رکھو خان! کیا اپنی روایتوں سے واقف نہیں ہو۔ ہمارے ہاں شادی سے پہلے منگیترا کا چہرہ نہیں دکھاتے، ملنا جلنا تو بہت دور کی بات ہے۔“ شہوار سچ مچ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ادھر سلطان خان سوچ رہا تھا کہ اس اجلی سوچوں والی لڑکی کے ساتھ زندگی کا سفر بہت آسان ہوگا۔ وہ اسکے ساتھ، ہم قدم چلنے کا ہنر جانتی تھی۔ بہت سے بوجھ خود بخود اس کے دل سے ہٹنے لگے تھے۔ اس نے در شہوار کے متعلق جو سوچ رکھا تھا وہ قطعاً مختلف تھی۔

بہت ہی منفرد اور خاص خدا نے اسے حسن اور ذہانت میں بہت فیاضی سے نوازا تھا۔

وہ بہت سرشار سا واپس لوٹا تھا۔ عالمتاب بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ بیٹے کی آنکھوں میں انوکھے رنگ اور چہرے کی جگمگاہٹ انہیں کامیابی کا سندیسہ سنا رہی تھی۔

”شہوار سے ملاقات ہوئی؟“ رات کو وہ اس کے لیے گرم دودھ لے کر آئی تھیں۔ آج سے پہلے یہ ڈیوٹی سیتو کے سپرد تھی۔ وہ اماں کو آتا دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی پانٹی کی طرف بیٹھ گئیں۔

”آپ نے کیوں تکلیف کی ہے اماں! سیتو کہاں ہے؟“ وہ ان کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے خفگی سے بولا۔

”میں نے پوچھا ہے شہوار سے ملاقات ہوئی؟“ انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔ آنکھوں میں بے پناہ اشتیاق تھا۔

”ہوں...“ اس نے محض ہنکارا بھرا۔

”کیسی لگی تمہیں در شہوار! دیکھنے میں کیسی ہے؟ اب تو اور بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو گی۔“ انہوں نے بہت بے چینی سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔ سلطان خان دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

”اچھی ہے۔“

”صرف اچھی؟“ ان کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

”بہت اچھی ہے۔“

”دیکھنے میں کیسی لگتی ہے، بچپن میں تو بہت خوبصورت تھی۔ پٹر پٹر انگریز ی بولتی تھی۔“ انہیں پونی ٹیل جھلاتی شہوار کا خیال کیا آیا ہونٹ خود بخود مسکرانے لگے۔

”اب میں کراچی گیا تو آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئیے گا شہوار کو“

”میں تمہاری آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ بھی تو اسی کی ماں تھیں۔ اس کے منہ سے ہی اگلوانا چاہتی تھیں۔

”بہت خوبصورت ہے بالکل آپ کی طرح۔“

بالآخر اسے کہنا ہی پڑا تھا۔ عالمتاب مسکرانے لگیں۔

”اماں! وہ خوب صورت نہ بھی ہوتی۔ تب بھی مجھے اسے دیکھ کر مایوسی نہ ہوتی۔ آپ کی پسند مجھے دل و جان سے پسند ہے۔ اس کی سوچ بہت عمدہ ہے وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔“ سلطان خان نے سچائی سے اعتراف کیا۔  
عالمتاب کے دل سے تمام وسوسے مٹ گئے۔

”میں بہت جلد تمہاری شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“ اٹھنے سے پہلے انہوں نے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہا تھا اور پھر لائٹ آف کر کے باہر نکل گئیں۔

”خالہ! آپ تو عالمتاب خانم جتنی خوبصورت نہیں ہو، پھر بھی بڑے خان نے آپ سے شادی کر لی تھی۔“ سیتو، زیتون بانو کے سر میں مالش کرتے ہوئے قدرے یاسیت سے بولی تھی۔

”پگلی نہ ہو تو۔“ انہوں نے سر جھٹکا۔ ”بھلا شادی یا محبت شکل و صورت دیکھ کر کی جاتی ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو دنیا کی ساری قبول صورت عورتیں ایسی

ہی بیٹھی رہ جاتیں۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ میرا نصیب بڑے خان کے ساتھ جڑا تھا۔“ انہوں نے تیل کی بوتل بند کر کے سیتو کو پکڑائی۔  
”ذرا پیروں کی مالش بھی کر دے۔“

”خالہ! چھوٹا خان بہت اچھا ہے نا۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے آہستگی سے پوچھا۔  
”ہاں...“

”سب سے اچھا ہے؟۔“ وہ دھیرے دھیرے ان کے پیروں کی مالش کر رہی تھی۔ اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

”تو اور کیا...“ انہوں نے بے خیالی میں جواب دیا تھا۔

”خالہ کیا خان کی شادی در شہوار کے علاوہ کسی اور سے بھی ہو سکتی ہے؟“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہہ ہی دیا۔  
”کیا مطلب؟“ زیتون بانو چونک اٹھیں۔

”ایسے ہی ایک بات پوچھی ہے۔“ وہ گڑبڑا سی گئی۔

”بے تکی ہانکنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ زیتون بانو نے ڈپٹ کر کہا۔

”اس میں غصہ کرنے والی کیا بات ہے۔ اس خاندان میں پہلے بھی مردوں نے دودو تین تین شادیاں کی ہیں۔ اگر چھوٹا خان کرے گا تو کون سی قیامت آجائے گی۔“ اس کے انداز میں عجیب سی برہمی تھی۔

”سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ خاند دوسری شادی کرے گا کیوں؟“ وہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔

”اگر کرے تو حرج بھی کوئی نہیں۔“ سیتو یاسیت سے بولی۔

”فضول مت بولو۔ اگر عالمتاب نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔“

”اونہہ ! میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“ اس نے منہ بنا لیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد

اس کی پکار پڑ گئی تھی اور وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگی۔

”کہاں مر گئی تھی سیتو !“ عالمتاب نے چلا کر کہا۔

”وہ خانم ... خالہ کی مالش“ سیتو گھگیا کر خاموش ہو گئی۔

”ہڈ حرام ... برتنوں کا ڈھیر پڑا ہے اور تجھے باتیں بگھارنے سے فرصت

نہیں۔“ انہوں نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا۔ سیتو سر پٹ باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ برتنوں کا ڈھیر دھوتے ہوئے اسے خان کی آواز سنائی دی۔

”سیتو ! چھ کپ چائے مردانہ میں بھجوا دو۔“

”بہتر خان !“ وہ ہاتھ پونچھ کر چائے بنانے لگی تھی۔ چائے مردانہ میں بھجوا نے کے بعد اس نے باورچی خانے کا پھیلاوا سمیٹا۔ وسائی دوپہر کے کھانے کی تیاری کیلئے باورچی خانے میں آچکی تھی۔ سیتو کام ختم کر کے سبزی کی ٹوکری میں سے گاجر اٹھا کر دانتوں سے کترتی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ جب ایک مرتبہ پھر خان کی آواز سنائی دی۔

”پھول بی بی ! یہ قیض کا بٹن لگا دو۔“

”اچھا خان ! ابھی لگا دیتا ہے۔“ پھول بی بی نے کپڑوں کے ڈھیر کو تخت پر

رکھا اور پھر سوئی میں دھاگہ ڈالنے لگی۔ سیتو نے آخری سیڑھی پر کھڑے ہو



کر پھول بی بی کے گورے چٹے سراپے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا تھا اور پھر دھپ دھپ کرتی نیچے اتر آئی۔

”پھول بی بی ! قمیص ادھر دو ... بٹن میں لگا دیتی ہوں۔“

”ام لگا لیتا ہے بٹن۔ تم آرام کرلو بی بی!“ پھول بی بی نے ہمدردی سے اس کے تھکے تھکے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ساری رات آرام کیلئے ہوتی ہے۔ میں نے کونسا پہاڑ توڑنا ہے۔ ذرا سا بٹن ہی تو لگانا ہے۔ لاؤ ادھر مجھے دو۔“ اس نے زبردستی پھول بی بی کے ہاتھ سے قمیص لے لی اور پر جھٹ پٹ بٹن بھی لگا دیا۔

”یہ بتاؤ اتنے دنوں سے رنگین نہیں آئی؟“ اس نے راز دارانہ لہجے میں پوچھا۔

”ام کو بھلا کیا پتا ... خانم کو خبر ہو گی۔“ پھول بی بی نے سادگی سے کہا۔

”تمہیں تو خیر اپنا بھی پتہ نہیں، کسی کی بھلا کیا خبر ہو گئی۔“ سیتو نے دھاگے کو دانت سے توڑ کر خفگی سے کہا۔ پھول بی بی احمقانہ انداز میں سر ہلانے لگی۔

”یہ رنگین تو مجھے ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔“ سیتو نے منہ بنا کر کہا۔ رنگین راغب خان کی کزن کی بیٹی تھی اور عالمتاب کی پسندیدہ ہستیوں میں سے ایک تھی۔ اسی لیے سیتو کو کچھ اور بھی ناپسند تھی۔ اس کی شادی علاقے کے مجسٹریٹ سے ہوئی تھی۔ ایک راز کی بات بتائوں ...

ام کو بھی اچھا نہیں لگتا رنگین بی بی ! ادھر حویلی میں سب پر رعب جماتا ہے۔“ پھول بی بی نے سرگوشیانہ کہا۔

”خان اس وقت کہاں ہے؟“ سیتو نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

”ابھی اپنے کمرے میں ہے۔“

”اچھا تم یہ کپڑوں کا ڈھیر اوپر لے جاؤ۔ میں خان کو قمیص دے کر آتی ہوں۔“ وہ لپک جھپک سلطان خان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سلطان خان قالین پر نیم دراز تھا۔ ارد گرد ڈھیروں اخبار پڑے

تھے اور وہ خود فون کان سے لگائے نجانے کس سے بات کر رہا تھا۔ سیتو بہت دیر کھڑی اس کے فون بند کرنے کا انتظار کرتی رہی تھی اور پھر تنگ آکر واپس جانے لگی تھی جب سلطان خان نے اسے آواز دیکر روکا۔

”سیتو! دومنٹ رکو۔“ اب وہ اختتامی کلمات کہہ رہا تھا۔ سیتو رک گئی تھی۔ ٹھہر گئی تھی اور وہ ہمیشہ کیلئے ٹھہرنا چاہتی تھی۔ سلطان خان نے فون رکھ اس کی طرف رخ کیا۔

”تمہارا سامان لے آیا ہوں۔ سامنے الماری میں شاپر رکھا ہے۔ تمام چیزوں کو دیکھ کر پسند کر لو۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ خان کے چہرے پر مسکراہٹ کس قدر بھلی لگتی تھی۔ سیتو نے دل ہی دل میں گویا نظر اتاری۔

”خان! آپ لائے ہو تو یقیناً سب چیزیں اچھی ہوں گی۔“ وہ الماری سے شاپر نکال کر مؤدب کھڑی ہو گئی۔

”مجھے خواتین کی شاپنگ کا تجربہ نہیں ہے۔“ وہ اخبار سمیٹتے ہوئے بولا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ سیتو بھاری بھر کم شاپر کو اٹھائے آہستگی سے کہنے لگی۔

”شکریہ کیسا، یہ تو میرا فرض تھا۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”تم اس گھر میں رہتی ہو۔ چھوٹی اماں کی بھانجی ہو۔ تمہاری ضروریات کا خیال رکھنا تو ہمارا فرض ہے۔“

”خان! ایک بات پوچھوں؟“

”ہوں...“

”آپ در شہوار سے ملے ہیں۔ کیا وہ بہت مغرور ہے؟“

”ارے نہیں تو... وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ نخرہ وخرہ تو نام کا نہیں ہے۔“ وہ خوشدلی سے بتانے لگا۔

”آپ کو کیسی لگی؟“

”بہت اچھی ... سب سے اچھی، بہت اچھے اور صاف دل کی مالک۔ کیا تمہیں نہیں لگتا سیتو! کہ اس حویلی میں درشہوار جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔“ سلطان خان کے لہجے میں حلاوت تھی، مٹھاس تھی۔

”آپ کو ان سے محبت ہے؟“ وہ جھجک کر نظر جھکائے بولی۔

”ہوں ...“ سلطان خان آنکھیں موندے لیٹ گیا تھا۔ سیتو کا دل کہیں دور پاتال میں اترنے لگا تھا۔

”کیا محبت صرف ایک بندے تک محدود رہتی ہے خان!“ اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ چٹ رہے تھے۔

”بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو سیتو!“ سلطان خان چونک اٹھا تھا۔

”بتائیے نا خان! کیا محبت ایک بندے تک محدود ہوتی ہے۔“ اس کے اصرار میں نجانے کون کون سے دکھ بول رہے تھے۔

”محبت بہت وسیع ہوتی ہے۔ اس کا نزول دلوں پر ہوتا ہے۔ اور تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ اپنی پڑھائی پر توجہ دیا کرو۔“ سلطان خان نے جان بوجھ کر گفتگو کا رخ بدل دیا۔

”اتنی بھی چھوٹی نہیں ہوں۔ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہوں۔“ وہ ٹھنکی۔

”ٹھیک ہے بڑی بی! میرے لیے تازہ انار کا جوس لے کر آؤ۔ خوب دماغ پلپلا کیا ہے تم نے میرا۔ اب کچھ دیر سونے دو جاتے ہوئے پردے برابر کر کے لائٹ آف کر دینا۔“ وہ ہدایات دے کر آنکھوں پر بازو رکھے لیٹ چکا تھا۔ سیتو چند پل وہیں کھڑی رہی تھی پھر ابھی ابھی سی واپس چلی گئی۔

...☆☆☆...

”کمی کمینوں کے خاندان سے تعلق جو ہے۔ روٹی پر ایسے ٹوٹ پڑتے ہیں گویا کبھی دیکھی ہی نہ ہو۔ سبزیاں اگانے والوں کو محلوں میں رہنے کی جگہ مل جائے تو یونہی ان کے جامے پھٹنے لگتے ہیں۔“ عالمتاب پورے جلال میں گرج

برس رہی تھیں۔ زیتون بانو کمرے میں دہل کر رہ گئیں۔ ”نجانے اس نامراد نے کیا کیا ہے۔“ وہ فکر مندی سے بند دروازے کی طرف دیکھتی رہیں۔

”آئے دن کے نقصانات تیرا باپ پورے کریگا۔ اتنا بڑا حلیم کا دیگچا الٹ کر رکھ دیا ہے کم بخت نے۔“ عالمتاب اب رنگین کو سیتو کا تازہ ترین کارنامہ بتا رہی تھیں۔

”نگوڑی کا قد کاٹھ بھی ایسا نکلا ہے کہ مارتے ہوئے شرم آنے لگتی ہے۔ بانس کی طرح لمبی ہوتی جاتی ہے۔“ وہ مسلسل واویلا کیے جا رہی تھیں۔ ”نامراد باورچی خانے کا فرش صاف کر۔ سرف ڈال کر دھو۔ ماربل پر چکنائی کے داغ پڑ جائیں گے۔“ ان کی گولہ باری جاری و ساری تھی۔

”سیتو بی بی! آپ کا دھیان کہاں ہوتا ہے؟“ وسائی اس کی عزت افزائی پر رنجیدہ تھی۔

”خان کے آس پاس۔“ اس کا دل گرلایا تھا۔ وہ فرش رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی اور ایک تواتر سے اس کے آنسو بھی نکل رہے تھے۔

”آج تو بچت ناممکن ہے۔ خان دوپہر کا کھانا کھانے آنے والے ہیں۔“  
وسائی خوفزدہ سی ہو کر گھڑی کی سوئیوں کو تکتے لگی تھی۔

”بڑے خان زندہ تھے تب کی بات ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاتھ سے تنوری مرغی کا دیگچہ الٹا گیا تھا بڑی بیگم نے کفگیر سے اتنا مارا کہ دس دن جسم پر ٹکوریں کرتی رہی تھی۔“ ادھیڑ عمر وسائی کو نجانے کونسا وقت یاد آگیا تھا۔  
”اللہ بخشنے بڑی بیگم بھی نوکروں کو بہت پیٹا کرتی تھیں۔“

”بڑے خان نے بیگم کو روکا نہیں؟“ سیتو نے سوس سوس کرتے ہوئے گال رگڑے۔

”نہیں... الٹا انہوں نے مجھے جھڑکا۔ وقت کے بہت پابند تھے کھانا وقت پر کھاتے تھے اور بھوک پیاس برداشت نہیں ہوتی تھی۔“

”وسائی! اب کیا ہوگا؟ سلطان خان آئیوآلے ہیں۔ خانم تو میری بوٹیاں نوچ ڈالیں گی“

سیٹو خوف زدہ سی اٹھ گئی۔ فرش صاف ہو چکا تھا۔ اسی اثناء میں سلطان خان کی جیپ کاہارن سنائی دیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ خود بھی آگیا۔ اس کا رخ بڑے ہال کی طرف تھا۔ اس وقت خان صرف کھانا کھانے گھر آتا تھا۔ سیٹو دھک دھک کرتے دل کے ساتھ خالی برتنوں سے سجے میز کو دیکھتی رہی۔

عالمتاب اور رنگین بھی ہال میں پہنچ چکی تھیں۔

”کم بخت ! ان خالی برتنوں کو چاٹتی رہو۔“ انہوں نے کونے میں کھڑے تھر تھر کانپتی سیٹو پر ایک حقارت بھری نظر ڈالی۔

”اس قدر ملال۔ خیریت تو ہے نا؟“ سلطان خان نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

رنگین نے تمام قصہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

”کوئی بات نہیں اماں! آپ غصہ مت کریں۔ سیٹو ابھی بچی ہے۔ آپ درگزر سے کام لیا کریں اور اس کی ہمت کے مطابق بوجھ ڈالیں۔ اتنی سی تو جان ہے اس کی، بھاری بھر کم دیگچے اٹھوائیں گی تو یہ الٹ ہی دے گی نا۔ تم ایسا کرو سیٹو وسائی سے کہو ٹماٹر ڈال کر آملیٹ بنا دے۔“

”بہتر خان۔“ سیٹو کی سولی پر لٹکی جان شانت ہوئی۔

”نوکروں کی فوج کو کیا زہر کھلانا ہے۔“ عالمتاب دانت پیس کر بولیں۔

”آج نوکروں کو بھی آملیٹ کھلا دیں۔“ سلطان خان نے بے نیازی سے کہا تھا۔

”تمہاری نرمی کی وجہ سے یہ سر پر چڑھتی جا رہی ہے۔“ رنگین نے ناگواری سے جوس پیتے ہوئے کہا۔ سلطان نے سر گھما کر رنگین کی طرف دیکھا۔

”آپ کب آئی ہیں آپا؟“

”تمہیں کسی کی کیا خبر۔“ وہ خفا ہوئیں۔

”اب اتنا بڑا الزام تو مت لگائیں۔“

”کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ آپ سے مل ہی لیا جائے۔ اپنے کام سے شہر جاتے ہو۔ کچھری سے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر میرا گھر ہے مگر بھائی صاحب وزیر اعظم سے بھی زیادہ مصروف ہیں۔“ رنگین کے شکوے بجا تھے۔



”مجسٹریٹ صاحب کا کیا حال ہے؟“

”وہ تم سے بھی زیادہ مصروف ہیں۔“ وہ شوہر سے بھی جلی بیٹھی تھیں۔ سلطان مسکرانے لگا۔

”یہ بتائو شادی کب کر رہے ہو؟“

”ابھی نہیں۔“

”تو پھر کب؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کم از کم ایک سال تو نہیں۔“

”خبردار، ہم ایک سال تک انتظار نہیں کر سکتے۔“ رنگین نے خفگی سے کہا۔

”ابھی میں بہت مصروف ہوں۔ ایک دو دیوانی مقدمات کے فیصلوں کا انتظار

ہے۔ پھر شادی کے بارے میں سوچیں گے۔“

”تم بس سوچتے ہی رہ جاؤ گے اور ہم در شہوار کو لے آئیں گے۔“

”میرے بغیر تو وہ لوگ در شہوار کو آپ کے ساتھ نہیں بھیجیں گے۔“ سلطان خان کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔

”اس بات کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔“ رنگین نے دہائی دی۔

”یہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے مگر اس دفعہ میں اپنی مرضی کروں گی۔“ عالمتاب نے حکمیہ انداز میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے چلے ہی جانا چاہئے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”کھانا تو کھا لو۔“

”یہ آلیٹ کی بھجیا حلق سے اترے گی تو تب نہ۔“ وہ ہال میں داخل ہوتی

سیتو کو دیکھ کر شرارتی انداز میں بولا۔ ”ویسے اچھا لچج کروایا ہے سیتو نے۔“

”احق، بے وقوف...“ عالمتاب زیر لب بڑبرائیں۔

”خانم! آپ کیلئے بھی آلیٹ لے آؤں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”آلیٹ کا بھرتہ تم خود ہی کھاؤ منحوس۔“ انہوں نے تلخی سے کہا۔

”چلتی ہوں خانم ! پھر آؤں گی۔“ رنگین پرس سنبھال کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”کچھ دیر اور رک جاتیں۔ میرا بھی دل بہل جاتا ہے تمہارے ساتھ۔“ عالمتاب نے حلاوت سے کہا۔

”اپنا دل بہلانے کیلئے پکا انتظام کر لیجئے۔ اب در شہوار کو لے ہی آئیں۔“ رنگین نے جاتے جاتے خانم کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

”زریب خان سے فون پر بات کروں گی۔“ خانم نے با آواز بلند کہا تھا۔ پھر سیتو پر نگاہ پڑی تو ان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”دیدے پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھ رہی ہے کلموہی۔“ ان کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ سیتو اٹے قدموں بھاگ گئی۔

”اس کا بھی پکا انتظام کرتی ہوں۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے گول کمرے کا دروازہ پار کر گئی تھیں۔

سیتو انہیں اپنے حجرے میں گم ہوتا دیکھ کر پھر سے نیچے آگئی۔ پیٹ میں چوہوں کی ریس لگی ہوئی تھی۔ خانم کے خوف سے روٹی حلق میں اتر نہیں رہی تھی۔ وسائی، خالہ کا پرہیزی کھانا ٹرے میں سجائے باہر نکلی تو سیتو ہاٹ پاٹ میں سے روٹی نکال کراچار کی پھانک اوپر رکھے مزے سے کھانے لگی۔ اسی پل سلطان خان باورچی خانے میں داخل ہوا تھا۔ وہ شاید پانی پینے آیا تھا۔

”خان ! مجھے کہتے میں پانی پہنچا دیتی آپ کے کمرے میں۔“

”آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ... کیا زندگی کا آخری کھانا کھا رہی ہو۔“ وہ اسے بڑے بڑے نوالے نگلتے دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

”ایسی بات نہیں۔“ سیتو جھینپ گئی تھی۔ کیا بتاتی کہ خانم کا خوف ہر شے پر حاوی ہے۔

”کہاں جا رہے ہیں خان ! سلطان خان کو پلٹتا دیکھ کر غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے چند الفاظ پھسلے۔“

”کیوں تم نے بھی ساتھ چلنا ہے۔“ وہ ایک دم پلٹا۔

”نن ... نہیں تو۔“ سیتو گھبرائی۔

”تو پھر بلا وجہ سوال نہیں کرتے۔“ وہ مڑنے لگا تھا سیتو ایک دم اس کے سامنے آگئی۔

”آپ بتا کر جائیں کہاں جا رہے ہیں۔“

”کیوں؟ تمہیں بتانے کی وجہ۔“ اس نے کچھ چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”خالہ! میرا ناک میں دم کر دیں گی۔“ سیتو کو بروقت بہانہ سوچ گیا تھا۔

”شکار کا لباس پہن کر میں کہاں جاتا ہوں؟“ سلطان خان نے سوالیہ نگاہیں

سیتو کے چہرے پر ٹکا دیں۔ گہرا سانوالا، بے رنگ سا معصوم چہرہ ... جس میں

کچھ ننھے منے گرم جذبوں کی نرمابٹ جھلک رہی تھی۔ سلطان خان اتنا نا سمجھ

تو نہیں تھا کہ اس کے رنگ ڈھنگ کو سمجھ نہ پاتا۔ محبت تو خود ایک خوشبو

ہے جو مقابل تک راز دل اور حال دل پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔

”شکار پر۔“ وہ دبی آواز میں آہستگی سے بولی۔

”جب سب جانتی ہو تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔ بار بار راستہ مت روکا کرو سحر

طراز! میں کسی اور کے سحر میں عرصہ دراز سے گرفتار ہوں۔ محبت کے کچھ

اصول ہیں کچھ ضابطے ہیں۔ ورنہ تمہاری ان کالی آنکھوں میں ستارے بھر

دیتا۔“

وہ بجھے دل سے پلٹ گیا تھا۔ سیتو وہیں دہلیز پر دھیرے دھیرے بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ عجیب بھیانک شور کی آواز سے کھلی تھی۔ وہ سرعت سے پیروں

میں سلیپر اڑس کر نیچے آیا تو سامنے عالمتاب کو غصے سے پھنکارتے دیکھ

کر ٹھٹک گیا۔

”وسائی! اس کلموہی کو جیپ میں ڈال کر اس کے چاچے کے پاس چھوڑ

آؤ۔“

”نہیں، خانم! مجھے کہیں نہیں جانا۔ مجھے خود سے جدا مت کریں۔ میں یہاں

سے مر کر ہی جائوں گی۔ مجھے یوں در بدر نہ کریں۔ اپنے قدموں پر رہنے دیں

خانم!“ وہ دونوں ہاتھ جوڑے التجائیں کر رہی تھی۔ ”میں کہیں نہیں جائوں گی۔“ سیتو تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

”اماں! کیا مسئلہ ہے؟ آپ سیتو کو کہاں بھیج رہی ہیں۔“ سلطان خان کی بھاری آواز کی گونج دور دور تک سنائی دی۔

”خان! تم بیچ میں مت بولو۔“ عالمتاب نے مڑ کر کرخت لہجے میں کہا۔

”اماں! یہ سب کیا ڈرامہ ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”میں اسے واپس بھجوا رہی ہوں۔ یہ اپنے چاچا کے پاس ”ٹھوکر“ چلی جائے تو بہتر ہے۔“ عالمتاب نے بھسم کر دینے والی نگاہ سے سیتو کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہاں اسے کیا پرالیم ہے۔ آپ کا دسیوں کام کرتی ہے۔ چھوٹی اماں کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری اسی کے سر ہے۔“

”تمہاری چھوٹی اماں کیلئے نرس کا بندوبست ہو جائے گا۔“ وہ پھنکاریں۔

”سیتو کہیں نہیں جائے گی... وسائی! اس کا سامان کمرے میں پہنچا دو۔“ وہ تحکم سے کہتا پلٹ گیا تھا۔ اسی پل وہیل چیئر پر بیٹھی زیتون بانو کی آنکھوں سے تشکر کے موتی گرنے لگے۔ وہ چھوٹی اماں کی آنکھوں کی التجا پڑھ چکا تھا۔ رات کو اماں خفا خفا سی اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

”سیتو کے چاچے کا خط آیا تھا... وہ اس کیلئے کوئی لڑکا دیکھ چکا ہے۔ جو ان جہان لڑکی ہے۔ کسی کھونٹے سے بندھ جائے تو بہتر ہے۔“

”تو آپ یہیں کوئی اچھا رشتہ دیکھ لیں۔“

”میں نے شادی دفتر نہیں کھولا ہوا۔“ وہ ناگواری سے بولیں۔ ”تم اسے جانے دیتے، اچھا تھا گھر بار والی ہو جاتی۔“

”چھوٹی اماں کو دکھ دینے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ سیتو تو ان کے جینے کی آس ہے۔“

”تم نے ہمیشہ زیتون بانو کو اہمیت دی ہے۔ اس کے جذبات ، احساسات کا خیال رکھا ہے۔ اپنی ماں کی تمہارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔“ عالمتاب پھپک پھپک کر رودی تھیں۔ سلطان خان گھبرا گیا۔

”اماں! کیا کر رہی ہیں آپ۔“

”کیسی بدنصیب ہوں میں ... شوہر نے بے وفائی کی ... اکلوتا بیٹا سوتیلی ماں کا دم بھرتا ہے۔“ ان کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی تھی۔

”اماں! ... یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ میں تو آپ کا بھی اتنا ہی خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر آپ...“ وہ لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

”میری خواہش ، میری خوشی کی تمہیں کوئی پروا نہیں۔“

”آپ کی کون سی خوشی اور کون سی خواہش میں نے پوری نہیں کی؟“ وہ زچ ہو گیا۔

”سیتو کو کیوں روکا ہے؟ جانے دیتے اسے۔ بہت ہی بدبخت اور منحوس ہے۔“

”اماں! کسی کو بھی بدبخت اور منحوس نہیں کہتے۔“ سلطان خان نے بے ساختہ ماں کو ٹوکا۔

”سیتو کو ٹھوکر بھجوا دو۔“

”ٹھوکر والے اسے رکھنا بھی چاہتے ہیں کہ نہیں۔“

”ان کی بھتیجی ہے۔ تم خط لکھ کر ساتھ روانہ کر دینا۔ خود بخود سیدھے ہو جائیں گے۔“ ان کا اصل مقصد یہی تھا کہ سلطان خان دھمکی نما خط لکھ کر سیتو کے چاچا کو بھیج دیتا تاکہ وہ بغیر اعتراض کے سیتو کو رکھ لیتے۔

”نجانے وہ لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔ میں مطمئن نہیں

ہوں۔“ اس نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔

”تم میری حکم عدولی کر رہے ہو۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔



”اماں! میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے یہاں بہادر خان سے بات کرلو۔“ عالمتاب نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

”کیسی بات؟“ وہ چونکا۔

”سیتو کے رشتے کی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں تھا، ظاہر ہے بہادر خان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس کی حیرت فطری تھی۔

”بہادر خان شادی کے چکر میں ہے۔“

”تیسری شادی کے چکر میں۔“ سلطان خان طنزیہ بولا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ سر دمہری سے کہنے لگیں۔

”سیتو اس کی بیٹی کی عمر کی ہوگی۔“

”مرد کی عمر کون دیکھتا ہے۔“ عالمتاب ہر صورت اسے نکالنا چاہتی تھیں۔

”سالے بڑھاپے میں شادی کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ تنفر سے بولا۔

”بہادر خان مالدار آدمی ہے۔ اچھی ساکھ رکھتا ہے۔ سیتو کیلئے اس سے بہتر رشتہ مل ہی نہیں سکتا کی کمین لوگ ... اونہہ، خواب دیکھتی ہے حویلیوں کے۔ زیتون بانو کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ بڑی آئی سلطان پر اپنا حق جمانے والی۔“ آخری لفظ منہ ہی منہ میں بدبدائے گئے تھے۔ سلطان خان گہری سوچ میں گم تھا۔

”اماں! سیتو کی شادی کے بارے میں فیصلہ چھوٹی اماں کریں گی اور جہاں وہ کہیں گی۔ آپ کو رضامندی دینا پڑے گی۔ باقی کے انتظامات میرے ذمے۔ یہ مت بھولیے گا کہ سیتو ہماری ذمہ داری ہے۔“ وہ دو ٹوک انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”تم میری بات سمجھ نہیں رہے۔“ عالمتاب جھنجلا سی گئیں۔

”تو آپ سمجھا دیں۔“ وہ بے زاری سے کہنے لگا۔

”زیتون بانو نے خود مجھ سے رشتہ ڈھونڈنے کی بات کی تھی۔“

”اچھا...“ وہ حیران ہوا۔ ”آپ نے پہلے کیوں نہیں ذکر کیا۔“

”بس خیال نہیں رہا۔“

”تو پھر آپ نے بہادر خان کا پریپوزل پیش کیا؟“ وہ پر سوچ انداز میں ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں۔“ انہوں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”یکا خیال ہے چھوٹی ماں کا اس رشتے کے بارے میں۔“

”اس نے تمام بات مجھ پر چھوڑ دی ہے۔“

”تو پھر آپ نے انہیں مخلصانہ مشورہ کیوں نہیں دیا؟“ سلطان خان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

”کیا مطلب...؟“ عالمتاب ٹھٹک گئیں۔

”یہی کہ بہادر خان ایک اوباش بوڑھا مرد ہے۔“ وہ غصے سے بولتے ہوئے

کھڑا ہو گیا تھا۔ ”آئندہ آپ اس موضوع پر مجھ سے بات نہیں کریں گی۔“

”میری بات سنو خان!۔“ عالمتاب کو بھی جلال آگیا۔ ”ان دنوں میں سیتو کی نیا پار لگادو، ورنہ میں کوئی انتہائی فیصلہ کر لوں گی۔“

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“ وہ چونک کر پلٹا۔

”زیتون بانو کے ارادے نیک نہیں لگتے اور میں جانتی ہوں وہ جادوگرنی تمہیں اپنے جال میں پھانس لے گی۔“

ان کا لہجہ زہر زہر ہو رہا تھا۔ اب کہ سلطان خان غصے کے عالم میں قدموں کی دھمک پیدا کرتا پلٹ گیا۔

☆☆☆

زیتون بانو کی پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ ساری رات وہ روتی رہی تھیں۔ انہوں نے پوری زندگی اس گھر میں بے زبان جانور کی طرح گزار دی تھی۔ کبھی اپنے حقوق کیلئے آواز نہیں اٹھائی۔ کبھی شوہر کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کی، گھر میں عالمتاب کا راج تھا۔ جس مقصد کیلئے اسے لایا گیا تھا وہ مقصد بھی عالمتاب سے حاصل ہو گیا تو فالتو سامان کی طرح ایک کونے

میں ڈال دیا گیا تھا۔ اگر اس خاندان میں طلاق کا رواج ہوتا تو راغب علی خان شاید انہیں طلاق ہی دے دیتے۔ عالمتاب کے بہت چاہنے کے باوجود انہیں حویلی سے نہیں نکالا گیا تھا۔ اگر سلطان خان نہ ہوتا تو وہ اس اونچی حویلی کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر مر ہی جاتیں۔ آج عالمتاب نے سیتو کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ شاید صدمے سے پاگل ہو جاتیں۔

سلطان خان ہمیشہ کی طرح ان کے سامنے ڈھال بن گیا تھا۔ وہ ان کے دل کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔ اس نے آج تک ان کی نافرمانی نہیں کی تھی۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ اس کا خیال رکھنے کا انداز کس قدر خاص تھا، کس قدر منفرد تھا اور انہوں نے چپکے سے اک انہونی خواہش دل میں پال لی تھی۔ ابھی وہ ان سوچوں میں گم تھیں جب سیتو چلی آئی اور وہ سیتو کی آنکھوں کے رنگ سے ناواقف نہیں تھیں۔

”کہاں تھی اتنی دیر سے... میں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔“ انہوں نے محبت سے کہا۔

”کپڑے دھو رہی تھی... قسم سے خالہ ہاتھ دُکھنے لگے ہیں۔“ وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس کا انگ انگ تھکاوٹ سے ٹوٹ رہا تھا۔

”ادھر آ میں تیرے ہاتھ دبا دوں۔“ انہوں نے پیار سے اس کے بال سمیٹ کر کہا۔

”نہیں خالہ! اب اتنے بھی نہیں دکھ رہے ہاتھ۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”تجھے خان بہت اچھا لگتا ہے سیتو!“ خالہ کی بات سن کر وہ ایک دم گم صم ہو گئی تھی۔

”نن... نہیں تو۔“ وہ گھبرائی۔

”سچ بتاؤ... میرے سامنے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف سچ سننا چاہتی ہوں۔ تمہیں خان بہت اچھا لگتا ہے نا۔“

”ہاں...“ اس نے اعتراف کر لیا۔

”میں ایک بات کہوں مان لو گی؟“

”بولو خالہ ! ... میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔“ سیتو بے قراری سے بولی۔

”خان کا خیال دل سے نکال دو۔“ خالہ کا لہجہ کس قدر بے رحم تھا۔ سیتو کا دل گویا گہری کھائی میں گرنے لگا۔

”خالہ ! آپ کیا بول رہی ہیں۔“ اس کے چہرے کی متغیر ہونے لگی تھی۔

”کھیلن کو چاند مانگتی ہے پگلی ! خود کو دہکتے کونلوں کی بھٹی میں مت جھونکو سیتو ! یہ آتش عشق فنا کر دے گی۔“ زیتون بانو کے بوڑھے چہرے پر آنسو گرنے لگے تھے۔

”خان کو بھول جائوں ... یعنی خود کو بھول جائوں۔“ اس کے دل پر گویا آرے چلنے لگے۔

”میں تجھے آباد اور خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میری خوشی خان سے وابستہ ہے خالہ !“ وہ تھک کر رودی۔

”سیتو ! کیوں صحرائی طلب جاگ اٹھی ہے تیرے دل میں۔“

”محبت کرنے والے نفع اور نقصان نہیں دیکھتے۔“ وہ بہت بڑی بڑی اور گہری باتیں کرنے لگی تھی۔

”محبت کرنے والے ایک رات کے کنارے پر کھڑے رہتے ہیں۔ سحر کے انتظار میں آنکھیں تھک کر بند ہونے لگتی ہیں مگر۔“ زیتون بانو سسکی روک کر خاموش ہو گئیں۔

”میری محبت نامراد نہیں رہے گی۔ مجھے وصل کے لمحوں کا انتظار ہے۔“

”ہر محبت کی راہ میں ہجر کا ہجوم کھڑا ہوتا ہے۔ تجھے اپنی خالہ پر ترس نہیں آتا۔“ ان کی آنکھوں سے ابھی تک موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

”میں خان کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں خان کو دل سے نکال دوں یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔ جس دن ایسا ہو گیا سیتو کی موت واقع ہو جائے گی۔“ وہ دھیرے سے کراہی۔

”میں تیرے لیے دعا کرتے ہوئے ڈرتی ہوں۔“

”آپ دعا کرونا خالہ! کہ خان کا نام میری ہتھیلیوں پر چاند بن کر جگمگانے لگے۔“ وہ بے قراری سے مچلی۔ ”اس کا نام در شہوار کے نام کے ساتھ لکھا جا چکا ہے۔“ زیتون بانو نے تلخی سے کہا۔

”خان کے نام کے ساتھ سحر طراز کا نام بھی لکھا جائے گا۔“ اس نے لبوں کو زور سے کچلا۔

”ایسا کبھی ممکن نہیں ہوگا۔ عالمتاب ایسا کچھ ہونے نہیں دے گی۔“ انہوں نے تھک کر سر تکیے پر ڈال دیا۔

اسی رات سلطان خان ان کے کمرے میں آیا۔ وہ سیتو کے رشتے کی بات کر رہا تھا۔

”آپ نے بہادر خان کے رشتے کیلئے منظوری دیدی ہے۔“ وہ غصے سے گویا پھٹ پڑا۔

”نہیں تو۔“ زیتون بانو حیران پریشان رہ گئی تھیں۔

”میں اس بہادر خان کو شوٹ کر دوں گا۔“

”خان! تھل سے میرے بچے!“ زیتون بانو نے گھبرا اٹھیں۔

”وہ حویلی میں شگن لے کر آنا چاہ رہا ہے۔“ وہ زہر خند ہوا۔

”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

”تو پھر بہادر خان کو جرأت کیسے ہوئی اس نے ایسی بات کیوں کی؟“ سلطان خان تلخی سے بولا۔

”مجھے تو کچھ خبر نہیں بیٹے! تم عالمتاب سے پوچھو۔“ انہوں نے جھجکتے ہوئے

کہہ دیا۔ وہ غصے سے بھناتا پلٹ گیا۔ اس کا رخ عالمتاب کے کمرے کی طرف

تھا۔ اس وقت وہ جائے نماز بچھا کر نماز ادا کر رہی تھیں۔ سلام پھیر کر انہوں

نے بیٹے کے سرخ چہرے کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے۔ بہت غصے میں معلوم ہوتے ہو؟“



”بہادر خان کو یہاں سے کس نے پیغام بھیجا ہے کہ اس کا رشتہ منظور کر لیا گیا ہے؟“ وہ تلخی سے پھنکارا۔

”جس کی بھانجی ہے، اسی سے پوچھو۔“ عالمتاب صاف مکر گئیں۔

”انہیں اس معاملے کی کچھ خبر نہیں۔“ سلطان خان کے لہجے میں واضح تلخی تھی۔

”اونہہ... سب ڈرامے ہیں۔“ انہوں نے تنفر سے کہا۔

”میں بہادر خان کو جواب دے چکا ہوں۔“

”کیوں؟“ عالمتاب نے پھنکار کر کہا۔ انہیں سلطان خان سے ایسی امید نہیں تھی۔

”مجھے سیتو کیلئے وہ پسند نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

”تمہیں سیتو کیلئے کیا پسند ہے؟“ ان کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔ ان کا بیٹا ہی ان کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ کرتیں بھی تو کیا۔

”کم از کم بہادر خان نہیں...“

”تم اس معاملے سے الگ ہو جائو۔“

”ایسا ممکن نہیں۔“

”کیوں؟“

”میں سیتو کیلئے بہت بہتر فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم کیا جانو کہ اس کی بہتری کس چیز میں پوشیدہ ہے۔“ وہ زہر خند ہوئیں۔

”اماں! آپ کو سیتو کیلئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر نرمی سے کہا۔

”میں اسے جلد از جلد حویلی سے دفعاں کرنا چاہتی ہوں۔“

”اس کے لیے آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“

”مگر کیوں؟“

”جب تک مجھے سیتو کے معیار کے مطابق کوئی اچھا رشتہ نہیں مل جاتا اس وقت تک۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”تو پھر اسی انتظار میں رہنا ... تمہیں کم از کم سیتو کے معیار کے مطابق کوئی رشتہ نہیں ملے گا۔“ انہوں نے گویا تمسخر اڑایا۔

”یہ میرا وعدہ ہے۔“

”دیکھ لوں گی تمہارے اس بودے وعدے کو۔“ وہ غصے سے بھڑ بھڑ جلنے لگیں۔

”وقت ثابت کر دے گا۔“

سلطان نجانے کیا سوچ کر مسکرایا تھا۔ ادھر عالمتاب نجانے کون کون سے منصوبے بنا رہی تھیں اور اوپر کاتب تقدیر نے کچھ اور فیصلہ کر رکھا تھا۔ انسان کی سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ وہ خود کو عقل کل کا مالک سمجھتا ہے۔ خود کو باختیار سمجھ کر حکمران بننے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل یہیں سے انسان کے زوال کی شروعات ہوتی ہے۔

☆☆☆

در شہوار دو بہنوں سے چھوٹی اور دو بھائیوں سے بڑی تھی۔ زریاب خان آفریدی کی سب سے چہیتی اور لاڈلی فرمانبردار بیٹی۔ آج سے بہت سال پہلے بابا اور دادی نے واضح لفظوں میں اسے بتا دیا تھا کہ وہ سلطان خان خٹک کی منگیترا ہے۔ اس کی تربیت کچھ اسی خطوط پر کی گئی تھی کہ اسے حویلی والوں سے گھلنے ملنے اور ایڈجسٹ کرنے میں قطعاً کوئی دقت نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بڑی بہنوں سے بہت مختلف اور الگ تھلگ لگتی تھی۔

اس نے اکنامکس میں ماسٹرز کے بعد گھر داری کو بہت ذوق و شوق سے سیکھا تھا۔ دادی نے اسے سلائی کڑھائی میں طاق کر دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ ان سے الجھ پڑتی۔

”کیا احمد آباد میں ٹیلرز نہیں ہیں؟“

دادی کی اس معاملے میں منطق نرالی تھی ان کا کہنا تھا کہ لڑکی کو ہر ہنر میں طاق ہونا چاہئے۔ اچھے برے حالات کی کیا خبر ... سو وہ اچھی خاصی سگھڑ خاتو

ن بن چکی تھی۔ دادی کے پڑھائے سبق اس حد تک ذہن نشین ہو چکے تھے کہ ان کی وفات کے بعد بھی وہ ان ہی کے بتائے طریقے کے مطابق دن کا آغاز کرتی تھی۔

دادی صبح خیز تھیں سو اس کی صبح خیزی کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی۔ اکثر وہ بہت معصومیت سے دادی سے پوچھتی۔

”کیا احمد آباد والے اتنی سویرے اٹھتے ہیں دادی جان!“

”ہاں، بیٹی... گاؤں میں صبح کا آغاز منہ اندھیرے ہوتا ہے۔ یہ گھڑیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ سو دل لگا کر پہلے عبادت کرنی چاہئے اس کے بعد معمول کے کام“ اور معمول کے کاموں میں اس نے سوچ رکھا تھا کہ شاید حویلی میں اسے اپنے تھاپنے پڑیں گے۔ کنویں سے پانی بھر کر لانا پڑے گا، تنور میں روٹیاں لگانی پڑیں گی۔ ایک دن اس نے عادت کے مطابق دادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ دادی ہنستی رہی تھیں۔ پھر بہت پیار سے بولیں۔

”راغب خان کی حویلی بہت وسیع ہے۔ بڑے بڑے دالان ہیں۔ اونچے اونچے محرابی دروازے ہیں۔ دوہرے بھرے پھلوں اور پھولوں سے سجے باغ ہیں۔ ان میں ایک لکڑی کا جھولا لگا ہوا ہے۔ عالمتاب صبح روزانہ چہل قدمی کیا کرتی ہے۔ حویلی میں اتنے نوکر ہیں کہ تمہیں ان کے نام بھی یاد نہیں ہو سکیں گے۔ بیٹی! گھر کی عورت نسلوں کی امین ہوتی ہے۔ ذمہ دار، ذہین عورت گھر کا نظام خوش اسلوبی سے چلا لیتی ہے۔“ اس نے دادی کی ہر بات کو گویا پلو سے باندھ لیا تھا۔

یونیورسٹی میں اس کی ایک ہی سہیلی تھی ساریہ، وہ بھی اس کی دادی سے خوب متاثر تھی۔ حالانکہ اس نے دادی کو دیکھا نہیں تھا مگر در شہوار کی گفتگو میں دادی کا اس قدر ذکر ہوتا تھا کہ اسے بھی دادی سے غائبانہ محبت ہو گئی تھی۔

ساریہ کی ایک ماہ پہلے شادی ہو گئی تھی اور وہ اس وقت اپنے شوہر کے ہمراہ پشاور میں مقیم تھی۔ اس کے شوہر ڈاکٹر کاشف مشتاق بہت بڑے سرجن

تھے۔ ان دنوں وہ ساریہ کی دعوت پر پشاور جانے کا پروگرام بنا رہی تھی ، جب احمد آباد سے پھوپھی جان اچانک چلی آئیں۔ وہ اس کے لیے بہت سارے تحائف لائی تھیں۔ مئی کا موڈ بھی کافی خوشگوار تھا۔ پھوپھی جان شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آئی تھیں۔ اس کے دونوں چھوٹے بھائی اسے خوب چھیڑ رہے تھے۔

”آپا ! اگلے تھاپنے پڑیں گے ... کپڑے دھونا پڑیں گے۔“

”سب کچھ آتا ہے مجھے ... کرلوں گی۔“

”گوبر کے اگلے تھاپ لو گی ؟“ ان دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”ہوں۔“

”صرف زبانی کلامی باتیں ہیں۔“ مانی نے ناک پر سے گویا مکھی اڑائی۔

”مجھے چیلنج مت کرو۔“ اس نے دونوں کو وارننگ دی۔

”ہاں، واقعی چیلنج مت کرو آپ کو ورنہ لہنگا پہنے ، گھونگھٹ نکالے سب سے پہلے گوبر سے دو دو ہاتھ کرنے لگیں گی۔“ عثمان نے ہنس کر کہا تھا۔

دو ماہ بعد اسے احمد آباد چلے جانا تھا۔ اس سلسلے میں بابا نے مری میں ایک گھر خرید لیا تھا۔ جہاں بارات کو آنا تھا۔ ان دنوں مئی اسے کچن میں گھسنے نہیں دیتی تھیں۔ اور وہ لمبے ریسٹ پر سارا سارا دن کتابیں پڑھتی اور میوزک سنتی تھی مگر اس کے شیر جوان بھائیوں سے آپا کا یہ آرام کہاں برداشت ہوتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے آج اس کے کمرے میں دھاوا بول دیا۔

”کیسی ہو آپا۔ دو ماہ بعد تم نے ویسے ہی چلے جانا ہے اور اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بھائیوں کو اپنے ہاتھ سے ایک دو یادگار ڈشز ہی بنا کر کھلا دو ... تاکہ کبھی ڈیپ فرائی بروسٹ ، چائینز فش اور زعفرانی کوفتے کھاتے ہوئے تمہاری یاد اس شدت سے آئے کہ ہم دونوں بھائی رو رو کر آنسوؤں سے بالٹی بھر دیں۔“ دونوں کمال کے ندیدے تھے۔

”جب بھی میں امرتی اور میٹھے سمو سے کھاؤں ، میری آپا مجھے یاد آجائے۔“ سلمان نے لہجے میں مزید رقت بھری۔

”ہمیں چیری کا جوس اور انناس کا اسکواش کون پلوائے گا۔“ عثمانی نے نادیدہ آنسو پونچھ کر مصنوعی آرزوگی سے کہا۔

”فروٹ آئسکریم اور میٹگو آئس کریم کھاتے ہوئے بہت یاد آؤ گی آپا!“ مانی نے لہک لہک کر جملہ کسا۔

”عید پر گاجر اور ناشتے کی فرنی اور شیر خرما بناتے ہوئے ہمیں ضرور یاد کرنا۔“

”کتنے فائدے تھے تمہارے آپا! اپیل جیم ، سنگترے کا جیم ... آلوچے کا مربہ ، آڑو کا مربہ جھٹ پٹ تیار کرتی تھیں تم ... ہر طرح کی ساس کے جار ، ڈائمنگ میز پر تیار ملتے تھے۔ ناریل لیموں اور املی کی ساس کے چٹخارے اب خوب ہی معلوم ہوں گے۔ نجانے میری اور عثمان کی بیوی کتنی پھوہڑ اور بدسلیقہ ہو گی۔“ سلمان اس کے ڈوپٹے کے کونے سے گال رگڑتے ہوئے

مصنوعی سسکاری بھرنے کے بعد مزید بولا ”ایک اور نیکی کا کام کرتی جائو آپا!“

”اب اور کون سا کام کروانا ہے میری دلاری آپا سے؟۔“ عثمان اس سے لپٹتے ہوئے بولا۔

”میرے اور عثمان کیلئے ایک ایک سگھڑ سلیقہ مند بیوی دریافت کرتی جانا۔ ورنہ تمہارے پیارے ، صحت مند بھائی سوکھ سوکھ کر کانٹا ہو جائیں گے۔“ سلمان کا لہجہ حد درجہ خوشامدانہ ہو چکا تھا۔ عثمان کے اندر بھی آپا کے پیار کی ہڑک بیدار ہوئی۔

”میں تمہیں بہت مس کروں گا آپا! جب جب گلبدن کے ہاتھ کے بدذائقہ کھانے حلق میں سے اتریں گے تم اور بھی شدت سے یاد آؤ گی۔“ چائے کی ٹرے لاتی گلبدن جل کر کباب ہو گئی تھی۔

”ام بڑے خان کو بتاتا ہے۔ تم اماری غیبت کرتا ہے۔“



”آپا تمہاری جیسی گرین ٹی تو کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔“ سلمان کی لن ترانیاں جاری و ساری تھیں۔ در شہوار کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”ندیدو..... کھانے پینے کے علاوہ بھی تمہیں کچھ اور سو جھتا ہے۔ تمہارے سیکنڈ ایئر کے اور عثمان کے فرسٹ ایئر کے امتحان ہونے والے ہیں اور آج تم دونوں نے کالج سے چھٹی کس خوشی میں کی ہے۔“ در شہوار نے انہیں بری طرح لتاڑا تھا۔

”تمہارے بچھڑنے کی خوشی میں اتنی دور چلی جاؤ گی نجانے پھر اکٹھے بیٹھنا نصیب بھی ہوگا کہ نہیں... نجانے سلطان لالہ تمہیں ہمارے پاس آنے بھی دیں گے کہ نہیں... خدا کے لیے انہیں اپنی کوکنگ

کے جوہر مت دکھانا۔ یہ شوہر حضرات کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں۔ اسی بہانے سے بیویوں کو میکے جانے سے روکا جاتا ہے۔ تم ان کے معدے کے راستے دل میں اترنے کی کوشش مت کرنا بلکہ ڈائریکٹ دل میں چھلانگ لگا دینا۔ یہ شاعر حضرات دل کو سمندر اور دریا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ تم دل کے

دریا میں اتر کر خودکشی کر لینا مگر معدے کی طرف دھیان مت دینا۔“ اس کے رقت بھرے لہجے پر شوخی کا عنصر نمایاں تھا۔ لگے ہاتھوں مفت مشوروں سے بھی نواز ا جا رہا تھا۔ در شہوار نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”یہ تم کس مراقبے کے گٹر میں گم ہو؟“ اس نے اپنے شانے پر دھرے عثمان کے سر پر چپت رسید کی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ آپوں کے جانے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ آپ تم سمیت ہم دونوں نے بھی ان کی شادی کی خوشی میں شکرانے کے نفل ادا کئے تھے۔ اب بھی اگر دو دن کے لیے آجائیں تو کام کروا کروا کر مت مار دیتی ہیں۔ اور ہم شکر کرتے ہیں جب وہ بچوں سمیت یہاں سے روانہ ہوتی ہیں۔ البتہ آپا تم جب جاؤ گی۔“ عثمان کی آواز بھرا گئی تھی۔ در شہوار ان کی ڈرامہ بازی اور شاندار ایکٹنگ دیکھ کر بھنا اٹھی۔

”تم دونوں نے تو بے شرمی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں۔“

”لو آپا! ہم نے کیا کیا ہے۔“ دونوں فوراً ہی برا مان گئے۔ ”تمہارے فراق کا سوچ کر ہی ہماری جان پر بن جاتی ہے۔ روح بے چین ہو جاتی ہے۔ دل اداسی کے جوہر میں ڈبکیاں لگانے لگتا ہے۔ غم کے بادل چھا جاتے ہیں اور پھر جدائی کا مینہ برسنے۔“

سلمان ہائے وائے کرتا ایکدم اچھل پڑا تھا۔ آپا کا جوتا عین کمر پر لگا تھا۔ ”کس قدر ظالم ہو تم آپا!“ وہ چیخا۔

”یہ لو آپا! ایک اور جتا مارو اسے۔“ عثمان نے دوسرا جوتا بھی اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا جو کہ اس کی کمر کو سلگا گیا۔

”میں کہہ رہی ہوں فوراً کتابیں لے کر لان میں آجاؤ۔“ اس نے تحکم سے کہا۔ ”کالج سے چھٹی کر لی ہے۔ اکیڈمی میں اسلئے نہیں گئے کہ صاحبزادوں کا موڈ نہیں تھا۔“

وہ کمرے میں بکھرا پھیلاوا سمیٹتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ دونوں شرافت سے کتابیں اٹھائے لان کی طرف چلے گئے۔ در شہوار جب اپنے فل سائز کے مگ

میں گرما گرم چائے لے کر لان میں آئی تو دونوں میں پھر سے بحث و تکرار جاری تھی۔



”تم دونوں چپکے سے کہاں کھسک رہے ہو؟۔“ وہ ٹیس پر کھڑی موسم انجوائے کر رہی تھی۔ جوں ہی اس کی نظر گیٹ کی طرف اٹھی تھی۔ سلمان اور عثمان کو باہر نکلتا دیکھ کر وہ چونک گئی۔ دونوں ٹھٹک کر پلٹے تھے۔ ”آپا! ہم سے کچھ کہا ہے؟“ دونوں نے بلا کی معصومیت سے پوچھا۔

”نہیں تمہارے پڑوسیوں سے بکواس کی ہے۔ دونوں فوراً ہی پلٹ آؤ۔“ در شہوار نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

”آپا! اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔“ سلمان منمنایا۔

”تم بھی آجاؤ آپا! آسکریم کھا کر آتے ہیں۔“ عثمان نے التجائیہ نظروں سے دیکھ کر پکارا۔

”صدف آپنی آنے والی ہیں۔“

”ان کے لیے بھی آسکریم لے کر آئیں گے۔“ سلمان زبر دستی اسے گھسیٹ لایا تھا۔ موسم واقعی بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

آس کریم بار پہنچ کر عثمان ان دونوں کے لیے مینگو فلیور لے آیا۔ وہ آپس میں نوک جھوک کرتے کالونی کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔

”آپا! اس سہانے رومینٹک موسم میں اگر اچانک سلطان لالہ آجائیں تو...“ سلمان کو ایسی ہری ہری اکثر سو جھتی رہتی تھیں۔

”تو ہم انہیں بھی آسکریم کھلا دیں گے۔“ عثمان نے سادگی سے کہا۔

”تم گھامڑ ہی رہو گے عثمان!“ سلمان نے تاسف سے سر ہلا یا۔

”تم بڑے عقل مند ہو۔“ عثمان جل بھن کر بولا۔

”اس میں کوئی شک ہے کیا۔“ سلمان نے تنک کر پوچھا۔

”شک، مجھے تو تمہارے احمق ہونے کا پورا پورا یقین ہے۔“

”بکو مت...“ سلمان کو ایک دم غصہ آگیا تھا۔ وہ اپنی انسلٹ برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ”آپا! وہ ماریہ ہے نا۔“ عثمان نے فوراً دیدے گھما کر کہا تھا۔ مانی صاحب کا غصہ ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”کون ماریہ؟ اچھا اچھا ماریہ واسطی، کیا ہوا ہے اسے۔ کہیں وہ بھی بھارت تو نہیں چلی گئی۔“ سلمان نے کمال مکاری سے بات گھمادی تھی۔ سلمان شہوار کو ہٹا کر عثمان کے برابر چلنے لگا تھا۔ ساتھ ہی اس نے عثمان کے بازو پر زور دار کہنی ماری۔ عثمان کی سریلی چیخ سن کر شہوار کے بڑھتے قدم رک گئے اور ادھر مانی آنکھوں ہی آنکھوں میں بھائی کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ شہوار نے ذرا رعب سے پوچھا۔

”کیا تکلیف ہے؟ کیوں روڈ پر کھڑے چیخ رہے ہو۔“

”آپا پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“ سلمان نے فوراً لہجے میں رقت بھری۔

”جھوٹ بول رہا ہے آپا!“ عثمان کو قطعاً یقین نہیں آیا تھا۔ ادھر وہ بے چارا آپا کی نظر بچا کر التجائیں کر رہا تھا۔ ”معاف کر دو میرے بھائی۔ ریڈ شرٹ دوں گا ... پرفیوم بھی لے لینا۔“

”اونہ ... لالچی سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے۔“ عثمان نے دانت پیسے۔

”یہ تم دونوں کیا کھسر بھسر کر رہے ہو؟“ وہ اپنے ہی دھیان میں گم چونک کر پلٹی تھی۔ عثمان اور سلمان سڑک کے عین وسط میں کھڑے نجانے کون سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اس نے ہنسی دبا کر گویا اپنا سر پیٹ لیا۔

”آپا! یہ اشتہاری کمپنیوں کی طرح مجھے لالچ دے رہا ہے۔ یہ دوں گا، وہ دوں گا، اسے ذرا بتا دو کہ تم نے لالچ بری بلا ہے سٹوری مجھے کوئی تین سو مرتبہ سنائی ہے۔ بچپن میں۔“ عثمان نے شان بے نیازی سے جتایا۔

”میرے پیارے ننھے بھائی! کل بائیک تم چلانا بلکہ اڑانا میں تمہارے پیچھے بیٹھوں گا ... کل ہم اکٹھے کالج جائیں گے۔“ سلمان کے منہ سے شہد ٹپکنے لگا

تھا۔ عام حالات میں تو وہ اپنی بائیک کے قریب بھی عثمان کو پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔

”تم ناک بھی رگڑ لو تب بھی میں ماریہ کے متعلق آپا کو بتا کر ہی دم لوں گا۔“ عثمان قطعاً اس کی التجائوں سے متاثر ہونے والا نہیں تھا۔

”یہ ماریہ کا کیا چکر ہے۔“ آپا کو بالآخر پوچھنا ہی پڑا تھا۔

”یہی تو میں آپ کو بتا رہا ہوں ملکہ عالیہ۔“ عثمان نے لہک لہک کر کہا تھا۔ سلمان خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

”کینے ... غدار ... بھانڈ“

”تم کنجوس، خبیث اور چھوٹے دل والے ... اپنا لیپ ٹاپ دیا ہے کبھی۔“ عثمان نے مزید بدلہ اتارا۔

”لے لینا خود غرض انسان۔“

”اونہ، میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنے جیسا لالچی مت سمجھو۔“

”آخر مسئلہ کیا ہے؟“ شہوار زچ ہوا اٹھی۔

”بتانی میں تجھے وارننگ دے رہا ہوں کہ امریکہ مت بنو۔“

”آپا! اس خبیث کی باتوں پر دھیان مت دینا۔“ سلمان اس کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز چلنے لگا۔

”آپا! میری بات سنے بغیر تم نہیں جاسکتی۔“ عثمان بھی ایک ہی جست میں ان تک پہنچ چکا تھا۔

”تو پھر بتا بھی دو۔“ شہوار نے چڑ کر کہا۔

”وہ ماریہ ہے نا... ہمارے پڑوس میں اسی کی بلی نے جڑواں بچے دیئے ہیں۔“ جہاں آپا نے قدرے بھنویں اچکا کر قدرے خفگی سے دیکھا تھا وہیں۔ سلمان نے اطمینان سے بھرا سانس ہوا کے سپرد کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا سانس پھر اٹکنے لگا۔

”یہ جو آپ کے بھائی محترم ہیں نا... آج کل روز ماریہ کی کیٹی کی عیادت کے لیے سرخ گلابوں کا گلدستہ لے کر جارہے ہیں۔ یاد رہے سرخ گلاب۔“ بتانی بات مکمل کر کے رکا نہیں تھا۔ سلمان اس کی گردن دبوچنے کیلئے اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ در شہوار ہنستے ہوئے ماریہ کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

...☆☆☆...

نیچے سے ایک دم چیخوں کی آواز اور آپا بچائو کا شور سنائی دیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بیڈ پر اوندھی رکھی اور پھر پورے جلال کے ساتھ سلمان اور عثمان کے مشترکہ کمرے میں پہنچ گئی۔ سلمان نے تکیہ پکڑ رکھا تھا اور عثمان ہائے کرتا اپنے بچائو کی کوششوں میں مصروف تھا۔ کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔ کتابیں، کشن، تکیے بالترتیب کارپٹ، صوفے اور بیڈ پر نوحہ کناں تھے۔ عثمان نے در شہوار کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی تھی۔ تبھی مانی نے زور دار آواز میں للکارا۔



”آپا! پیچھے ہٹ جائو۔ یہ کمینہ آج میرے ہاتھوں شہید ہو جائے گا۔“

”نہیں آپا! میرے سامنے دیوار چین بنے کھڑی رہو۔“ تانی منمنایا۔ ان دونوں کی چیخ و پکار کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ درشہوار کا ضبط جواب دے گیا۔

”میں کیا کہ رہی ہوں۔ خاموش ہو جائو۔“ اس نے گرج کر کہا۔

”نہیں آپا! اب خاموش نہیں ہوا جاتا۔“ مانی نے فلمی ڈائلاگ جھاڑا۔

”ہوا کیا ہے؟“ وہ خفگی سے بولی تھی۔ یعنی کہ بڑی بہن کے گرجنے برسنے کا کوئی اثر نہیں تھا۔

”اس نے میری نئی نکور شرٹ کا حشر کر دیا ہے۔“ مانی رو دینے کو تھا۔

”تم نے کونسا اپنے ولیمہ پر پہنی تھی۔“

”اپنے نہیں تمہارے ولیمے کیلئے سنبھال کر رکھی تھی۔ اس شرٹ میں ریڈ ٹائی

کے ساتھ میں بہت ڈیشننگ لگتا ہوں۔ احمد آباد کی ٹیاروں کو متاثر کرنا

تھا۔“ مانی کا ملال کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا

”اس صورت پر عاشق ہوں گی۔“ مانی چلبلا اٹھا۔

”حسن سادگی میں ہوتا ہے۔ دیکھنا مجھے دیکھ کر احمد آباد کی الہڑ دوشیزائوں کے دلوں میں ہلچل مچ جائے گی۔“ تانی نے فخر سے کہا۔

”ہلچل نہیں مچے گی۔ ہارٹ اٹیک ہو جائے گا انہیں۔ کیوں آپا!“

”آپا کو تو بخش دو۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑے تھے۔

وہ چپ چاپ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے آچکے تھے۔ ایک سلیب پر اور دوسرا ڈائننگ ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا بنانے لگی ہو؟“ مانی نے دلار سے پوچھا۔

”چائے۔“ وہ مزے سے بولی تھی جانتی تھی کہ دونوں ہی چائے سے الرجک ہیں۔

”خالی چائے؟ ساتھ رول کباب بھی ہوں گے؟“

مانی باہر نکلنے لگا تھا۔ جاتے جاتے پلٹ کر پوچھنے لگا۔

”نہیں۔“

”اونہہ ، تو پھر اکیلے جلاتی رہو کلیجہ ، دل اور گردے وغیرہ تو ... میں نے تو سوچا تھا تمہارا چائے میں ساتھ دوں گا۔ تم چائے پینا میں رول کباب کوک کے ساتھ اڑائوں گا مگر ...“ وہ زیر لب بڑبڑاتا باہر نکل گیا۔

”مانی رکو تو ...“ وہ پکارتی رہ گئی۔

”جانے دو آپا ! ہم دونوں مل کر کباب اور رول کھالیں گے۔“ ثانی جانتا تھا آپا نے دوپہر کو رول اور کباب بنا کر فریز کیے تھے۔ آپ کے حلق میں اکیلے رول اور کباب کیسے اتر سکتے تھے۔ وہ فوراً مانی کو آوازیں دیتی باہر کی طرف اسکے پیچھے لپکی۔

”آرہا ہوں آپا ! کاہے کو غم کھاتی ہو ... میں اکیلے تو ثانی کو کچھ ہضم نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ پورچ کے ایک کونے سے برآمد ہوا۔

”فٹا فٹ آجائو۔“

”ابھی آیا ...“ وہ مسکراتا ہوا جب واپس آیا تو ثانی میز پر چائے کے لوازمات سجا کر بیٹھا تھا۔ ”اسے واپس آتے دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔ پیٹ پوجا کرنے کے بعد پہلے اپنا بیڈ روم صاف کرو ... پھر باہر جانے دوں گی۔“ اس نے تحکم سے کہا۔

”آپا ! میں نے تو کلب جانا ہے۔“ مانی نے ڈھیروں کیچپ میں کباب ڈپ کر کے منہ میں رکھا اور بولا۔

”اور میں نے اکیڈمی ...“ ثانی بھی منمنایا۔

”بہت ہی نکمے ہو تم دونوں ... نجانے میرے جانے کے بعد کیا حشر کرو گے۔“ شہوار ناراضگی سے بولی۔

”بائی دا وے آپ کہاں جارہی ہیں ؟“ مانی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”لبرٹی اور کہاں۔“ ثانی نے گویا بھائی کی عقل پر ماتم کیا۔

”احق، گدھے، آپا احمد آباد جانے کی بات کر رہی ہیں۔“ مانی نے ثانی کی کمر میں دھموکا جڑا۔

”سچ آپا!۔“ مانی اچھلا۔

”تم احمد آباد چلی جاؤ گی آپا!“

”بہت مسخرے ہو تم دونوں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”ویسے آپا! ایک بات پوچھوں؟“ مانی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

”تم نے کب سے اجازت لینا شروع کر دی۔“ ثانی نے صاف مذاق اڑایا تھا۔

”جب دو بڑے بات کر رہے ہوں تو پھر تم جیسے چھوٹوں کو نہیں بولنا

چاہئے۔“ مانی نے بڑے پن سے کہتے ہوئے ثانی کو بری طرح لتاڑا۔

”اونہ۔“ ثانی اونہہ کر کے کباب اور کیچپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہاں تو آپا! میں ایک بات پوچھنا چاہ رہا تھا۔“

”کون سی بات...“ شہوار ٹھٹکی۔

”ابھی مجھے اپنی سہیلی سمجھ لو... بلکہ چند لمحوں کے لیے مجھے ماریہ باجی سمجھ لو۔“ وہ رازداری سے اس کے قریب جھکتے ہوئے کہنے لگا۔

”کیا بات ہے؟۔“ شہوار الجھی۔

”آپس کی بات ہے۔ کیا سلطان لالہ کا کبھی فون آیا ہے؟“

”سلمان...“ در شہوار نے خفگی سے کہا۔

”اس میں حرج ہی کیا ہے۔ انڈر سٹینڈنگ اچھی چیز ہوتی ہے۔“

”ماشا اللہ۔“ در شہوار نے اپنے براڈ مائنڈڈ بھائی کو خوب خوب سراہا۔ ”مجھے ایسی

باتیں پسند نہیں تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

”اچھا یہ بتاؤ... کل میں نے بابا جان کے ساتھ احمد آباد جانا ہے کوئی خط

وغیرہ ہے تو لالہ کو میرا مطلب ہے لالہ کی امی کو دے دوں گا۔“ وہ اس

کے گھورنے پر سٹپٹا گیا تھا، اسی لیے بات بدلنے لگا۔ ثانی کی ہنسی چھوٹ گئی

تھی اور در شہوار بھی مسکراہٹ چھپانے کی غرض سے چائے پینے لگی۔

دوسرے دن وہ احمد آباد جانے کیلئے تیار شیار ہو کر اس کے کمرے میں اسے خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ در شہوار ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔ بک ریک کی تمام کتابیں بیڈ پر بے ترتیب پڑی تھیں۔

”اللہ حافظ آپا! جارہا ہوں میں... اپنے بھائی کے لیے دعا کرنا کہ کہیں کوئی ٹیاری تمہارے سبیلے بھائی پر فدا نہ ہو جائے۔“

”بڑی خوش فہمی ہے میرے سبیلے بھائی کو اپنے بارے میں۔“ وہ مسکرائی۔

”تمہارا بھائی لاکھوں میں ایک جو ہوا۔“ مانی اترایا۔

”اللہ حافظ اپنا خیال رکھنا۔“ اس نے اپنے قریب جھکے مانی کی پیشانی کو چوما۔

”کہنے کی ضرورت نہیں۔ خود کو سینت سینت کر رکھوں گا۔“ جاتے ہوئے اس نے ڈائلاگ جھاڑا۔

”مسخرے زیادہ رہنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ پیچھے سے پکاری۔

”آپا! ویسے میری کل کی آفر برقرار ہے۔ کوئی سندیسہ، پیغام خط وغیرہ۔“

”مانی! اس کے گھورنے پر وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا بھاگ گیا۔ در شہوار سر جھٹک کر کتابیں ترتیب سے رکھنے لگی۔

”ادھر حویلی میں ایک محترمہ ہیں سحر طراز عرف سیتو پھر کی کی طرح گھومتی ہیں اور چکور کی طرح چکر لگاتی ہیں۔ سلطان لالہ کے ارد گرد۔“

آج دوپہر کو واپسی ہوئی تھی اور سلمان کے پاس لاتعداد قصے تھے انہیں سنانے کے لیے۔ اس وقت وہ دونوں لان میں گھاس پر پھسکڑا مارے بیٹھے تھے۔ شہوار کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ اس نے مانی کی بات پر توجہ نہیں دی۔ اگر اس وقت توجہ دے لیتی تو حالات شاید مختلف ہوتے۔

شادی کی ڈیٹ فکس ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ کارڈ بھی چھپ کر آچکے تھے۔ جب حویلی سے اطلاع آئی۔ زیتون بانو وفات پاگئی ہیں۔ بابا جان اور ممی پشاور روانہ ہو چکے تھے۔ ان کی واپسی کے بعد حویلی سے عالمتاب کچھ دن رہنے کی غرض سے چلی آئیں۔ وہ بہت الجھی الجھی تھیں۔ انہوں نے شہوار کو کچھ بھی بتانا

گوارا نہیں کیا تھا۔ مگر کچھ دنوں تک اڑتی اڑتی کچھ باتیں اس کی سماعتوں میں بھی اتر آئی تھیں۔ سلطان خان شادی کیلئے رضامند نہیں۔

ممی اور بابا جان نے ان باتوں پر توجہ نہیں دی تھی۔ پشاور سے اس کی دوست ساریہ بھی آچکی تھی۔ آہستہ آہستہ گھر مہمانوں سے بھرنے لگا۔ وہ لوگ شادی کی غرض سے پچھلے ہفتے مری آچکے تھے۔ نکاح تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ صرف رخصتی کی رسم باقی تھی۔

”سلطان خان شادی کے لیے کیوں رضامند نہیں؟“ یہ پھانس دل میں چبھن دیتی رہی تھی۔ بہت دفعہ اس نے فون کرنے کے بارے میں سوچا تھا مگر پھر نجانے کیوں وہ سلطان خان سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکی تھی۔

پوری رات سوچتے ہوئے اور روتے ہوئے گزر چکی تھی۔ صبح صادق کا وقت تھا جب کوئی دبے قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔

”شہوار۔“ خان نے اسے دبی آواز میں پکارا۔ در شہوار سوئی کب تھی۔ نیند تو شاید آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے روٹھ چکی تھی۔

”میں جانتا ہوں تم سوئی نہیں ہو تمہیں نیند بھلا آ بھی کیسے سکتی ہے۔“ اس کا انداز ناقابل فہم تھا۔

”تم اگر سوچ رہی ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو ایسا نہیں ہے۔ میں اماں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکا تھا۔ میں نے انہیں واضح لفظوں میں بتا دیا تھا کہ تمہیں صاف صاف بتا دیں کہ مجھے سیتو سے بھی نکاح کرنا ہوگا۔ یہ نکاح میری مجبوری تھی۔ میں چھوٹی اماں کی آنکھوں میں بجھتی زندگی کی لو دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے میرے سامنے ہاتھ باندھ کر التجا کی تھی۔ مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ سیتو کے مستقبل کی وجہ سے خوف زدہ تھیں۔ مجھے مرنی ہوئی ماں کے ساتھ کیا گیا وعدہ تو نبھانا ہی تھا اور اس بات سے اماں واقف تھیں۔“

”ان وضاحتوں کی کیا ضرورت ہے؟“ در شہوار گویا پھٹ پڑی۔

”تم بد گمان ہو۔ ناراض ہو۔“

”آپ کو میرے غم میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ تنفر سے بولی۔



”ٹھننے دل سے سوچو در شہوار ! وہ معصوم لڑکی قطعاً بے ضرر ہے۔“

”جس طرح زیتون بانو بے ضرر تھیں۔ تمام عمر میری پھوپھی جان کی سلگتے ہوئے گزر گئی۔“ در شہوار کی آواز بھرانے لگی۔

”اب تم کیا چاہتی ہو ؟“ وہ گویا زچ ہوا۔

”سیتو کو طلاق دے دو۔“

”ایسا ممکن نہیں۔“ خان کے لہجے میں سختی نمایاں تھی۔

”کیوں ممکن نہیں۔ ہم اس کی اچھی جگہ شادی کر دیں گے۔“

”وہ میری بیوی ہے ، میری عزت بن چکی ہے۔ تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتیں کہ اب اسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنا ناممکن ہے۔“ وہ جھنجلا اٹھا۔

”تو پھر مجھے بے دخل کر دو۔“ در شہوار زہر خند ہوئی۔

”اتنا مجبور مت کرو۔۔۔ محبت کا خراج مانگتی ہو۔ دل کو تھوڑا وسیع کر لو۔ ایک سیتو ایک دو اور سیتو کی گنجائش نکل آئے گی۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا تھا۔ پھر اطمینان سے بیڈ پر لیٹ گیا۔

”اڑا لو میری بے بسی کا مذاق۔“ شہوار کو رونا آگیا۔

”وہ بے چاری بھی انتظار کی سولی پر لٹکی ہے۔ تم گرین سگنل دو تو اسے بھی معتبری کا احساس بخشوں گا۔“ وہ بڑے غیر سنجیدہ انداز میں بڑی سنجیدہ بات کر رہا تھا۔

”تو جاؤ جا کر اس کا دل بہلاؤ۔“ در شہوار سر سے پیر تک سلگ گئی۔

”پہلے تم میرا دل بہلاؤ۔ پھر میں اس کا بہلانے کی کوشش کروں گا۔“

”تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا خان ! مجھے تمہاری تقسیم گوارا نہیں۔“ وہ رونے لگی تھی۔ ”مجھے بٹا ہوا سلطان خان نہیں چاہئے۔ تم اسے ہاتھ لگائو گے۔ چھوٹو گے۔ یہ سب میری برداشت سے باہر کی باتیں ہیں۔“

”تھوڑی سی برداشت پیدا کرلو۔ تم جانتی ہو کہ سلمان اور عثمان ماما کی دوسری بیوی سے ہیں۔ ان کی والدہ تمہاری سگی خالہ ہیں۔ تمہاری والدہ اسی شہر میں اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ پر سکون زندگی گزار رہی ہیں۔ بہت سی تکلیف دہ حقیقتوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔“ وہ نرمی سے بول رہا تھا۔ در شہوار کو دکھ دینے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر حالات نے اچانک پلٹا کھایا تھا۔ زیتون بانو کے آنسوؤں نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ جس ہسپتال میں وہ داخل تھیں۔ اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں نکاح کا فریضہ ادا ہوا تھا۔ دوسرا نکاح کرتے ہوئے وہ خود بہت اعصابی تناؤ کا شکار تھا۔ اس نے بہت سوچا تھا کہ شہوار کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دے گا مگر در شہوار سے فون پر بات بھی نہیں ہو سکتی تھی اور ادھر زیتون بانو سیتو کو ہمیشہ کے لیے اسے سونپ کر آنکھیں بند کر گئی تھیں۔ ان کے رونے گر گڑانے اور التجائوں نے سلطان خان کا دل پسیج دیا تھا۔ حالانکہ اس نے انہیں ہر طرح سے یقین دہانی کروائی تھی کہ سیتو کی بہت اچھی جگہ شادی کرے گا اور یہ کہ اماں کے



روئے کی وجہ سے بھی فکر مند نہ ہوں مگر ان کے لبوں پر ایک ہی التجا تھی۔

”خان! میں پر سکون ہو کر دنیا سے جائوں گی تم میری سیتو کا سائبان بن جائو۔“

”مجھے اس پل صراط سے گزرنا ہی پڑے گا۔“ وہ تھک کر سوچنے لگی۔

”میں تمہیں تمہارے مرتبے کے لحاظ سے سرفراز کرنا چاہتا ہوں در شہوار!

اول تم میری پہلی منکوحہ ہو ... زریاب خان آفریدی کی بیٹی اور میرا دل

صرف تمہارا اسیر ہے۔ ادھر تو صرف حقوق اور فرائض کا معاملہ ہوگا۔ یہ بات

اچھی طرح جان لو مجھے بار بار وضاحتیں دینا پسند نہیں ہیں۔“

اس کے جادو اثر لہجے میں پتہ نہیں کیا بات تھی کہ در شہوار موم کی طرح

پگھل گئی۔ اسے سلطان خان کے حرف حرف پر یقین آگیا۔



اس کا ولیمہ بہت شاندار تھا۔ مری سے سب ہی تقریباً آئے تھے۔ بابا جان اور مئی تو ولیمہ کے بعد ہی واپس چلے گئے تھے البتہ مانی اور ثانی کچھ دن رہنے کی غرض سے رک گئے تھے۔ حالانکہ ان کے امتحان قریب تھے اور در شہوار کو ان کی پڑھائی کی بہت فکر تھی۔ سارا سارا دن تو وہ دونوں گھومنے پھرنے میں گزار دیتے تھے۔ اس علاقے کی خوب صورتی سے ثانی بہت متاثر ہوا تھا۔ ساریہ بھی ثانی اور مانی کے ہمراہ رک گئی۔ طے یہ پایا تھا کہ واپسی پر جاتے ہوئے ثانی اور مانی ساریہ کو پشاور چھوڑ دیں گے۔ ساریہ کے گپلو سے بیٹے کے ساتھ در شہوار کا بھی خوب دل لگا ہوا تھا۔

جس دن ان تینوں کی واپسی ہوئی تھی یہ اس دن کی بات ہے۔ جب اس نے سحر طراز یعنی سیتو کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اتنے دنوں میں وہ اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ آج صبح ہی ہر طرف سیتو کی پکار سنائی دے رہی تھی۔ جب شہوار کی آنکھ کھلی تب سلطان خان اسے آواز دے رہا تھا۔

”سیتو! میرے کپڑے نکال دو۔“ کچھ ہی دیر بعد ایک بے حد سانولی، معمولی نقوش والی دہلی پتلی نو عمر لڑکی کمرے میں سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا انداز بہت سہاسہا تھا۔

”تم کیوں آئی ہو؟“ شہوار بال سمیٹ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

”خان نے بلوایا ہے۔“ وہ لڑکی سہمے لہجے میں سر جھکائے کپکپاتی آواز میں کہنے لگی۔

”تم کیا بھری ہو۔ خان نے سیتو کو بلوایا ہے۔“ شہوار نے قدرے ڈپٹ کر کہا۔ پھر بیڈ شیٹ کی شکنیں دور کرنے لگی۔

”میں سیتو ہوں۔“

”کیا تم سیتو ہو؟“ در شہوار نے اب کچھ حیرانی کے عالم میں اس کا سر تاپا جائزہ لیا۔ ”سلطان خان جیسے شاندار بندے کی دوسری بیوی سحر طراز کیا یہی ہے۔“ وہ حیرت سے سوچتی رہ گئی۔ خان رات کو اس کے کمرے میں نہیں تھا۔ ”تو کیا سیتو کے پاس تھا۔“ در شہوار جانچتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”سلطان خان رات کو تمہارے پاس تھا؟۔“

”جی... اس نے منہ سے مری مری آواز نکالی۔“

”جائو کپڑے نکال کے دو اپنے خان صاحب کو۔“

وہ دوسرے ہی لمحے کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ سلطان خان واش روم سے باہر نکلا تو کمرے میں شہوار کہیں نہیں تھی۔ البتہ سیتو استری سٹینڈ کے قریب کھڑی کپڑے استری کر رہی تھی۔

”سیتو! شہوار کہاں ہے؟“

”باہر گئی ہیں۔“

”جائو جا کر بلا کر لائو۔“ وہ بالوں کو تولیے سے رگڑ رہا تھا۔

”جی بہتر۔“ سیتو فوراً باہر نکل گئی تھی۔ دو منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔

”خان! وہ ناشتہ بنا رہی ہیں۔“

”کس کے لیے؟ اور کیوں؟ وسائی کہاں ہے؟“ سلطان خان ناراضی سے گویا ہوئے۔

”وسائی بھی باورچی خانے میں ہے خان! یہ آپ کے کپڑے۔“ اس نے سفید شلوار قمیض سلطان خان کی طرف بڑھا دی۔ وہ کپڑے چینیچ کرنے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ جب واپس آیا تو سیتو ابھی تک کمرے میں موجود تھی۔

”سیتو! کوئی کام ہے کیا؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”نہیں خان!“

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ وہ مصروف انداز میں قمیض کے بٹن بند کرتا ہوا پوچھنے لگا۔

”آپ کہیں جارہے ہیں؟“

”ہوں ... شہر جا رہا ہوں ... کچھ منگوانا ہے تو بتا دو۔“ وہ سیتو کے قریب کھڑا اس کے نرم گال کو چھو کر بول رہا تھا۔ جب کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور در شہوار اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ شاید وہ ناشتہ لے کر آئی تھی۔ اور اس کی پہلی نگاہ سلطان خان کی طرف اٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سیتو کے سانولے گال پر تھا۔ جبکہ دوسرے ہاتھ میں سیتو کا سانولا ہاتھ دبا تھا۔ سلطان خان اسے دیکھ کر نہ چونکا نہ ٹھٹکا بلکہ بڑے ہی بھرپور انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں کس نے باورچی خانے میں بھیجا ہے؟“ وہ در شہوار سے مخاطب تھا۔  
 ”رومانس بگھارنا ہو تو اس کے کمرے میں چلے جایا کرو۔ میرے کمرے میں ایسے سین کری ایٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ تلخی سے بولی، سلطان خان کے سوال کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

”سیتو! گل ریز خان سے کہو گاڑی نکالے۔“ اس نے سیتو کو جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ باہر نکل گئی تو شہوار کی طرف متوجہ ہوا۔

”اتنا غصہ ... میں تو صرف پوچھ رہا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“  
 ”میں نے آپ سے وضاحت نہیں مانگی ... بہر حال سحر طراز آپ کی بیوی ہے۔ البتہ مجھے اسے دیکھ کر شدید حیرت ہوئی تھی۔“  
 ”کیوں؟“ سلطان خان نے نا سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔  
 ”وہ میرے تصور سے کافی مختلف ہے۔“ اس نے ناشتے کی ٹرے کو ٹیبل پر رکھ دیا۔

”ہوں ... وہ ظاہری حسن میں تمہارے پاسنگ بھی نہیں۔ البتہ خدمت تم سے بہت زیادہ اچھی کرتی ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”اونہ، خادمائیں خدمت کرنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔“ اس نے جل کر سوچا۔ وہ سیتو سے جب بھی بات کرتا، ہنستا بولتا۔ اس کے لیے کچھ نہ کچھ خرید کر لاتا تو شہوار کا رواں رواں سلگنے لگتا تھا۔



یہی حال عالمتاب کا تھا۔ وہ تو برملا اپنی نفرت کا اظہار کر لیتی تھیں۔ سیتو سے سارا سارا دن کام کرواتیں۔ نوکروں کے سامنے اسے بری طرح لتاڑ کر رکھ دیتیں۔ کبھی کبھی غصے کے عالم میں دو تین تھپڑ بھی مار

دیتیں۔ در شہوار حیران تھی کہ اس نے کبھی خان کو شکایت کیوں نہیں کی۔ پھوپھی جان اس کے بہت لاڈ اٹھاتی تھیں۔ اسے پکن کے کاموں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھیں۔ سلطان خان جب بھی شہر جاتا تھا۔ در شہوار کو ساتھ لے جاتا۔ بقول اسے کے ”سفر میں تمہارے تصور سے بہتر تمہارا ساتھ ہے۔“

خان نے اسے اپنی بے تحاشا محبت سے سرفراز کیا تھا۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں در شہوار کا ہی عکس تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی محبت اور بھی گہری اور مضبوط ہو رہی تھی۔ ہر گزرتا دن اس کی چاہتوں کو اور بھی نکھار بخشتا تھا۔ سلطان خان کے ہمراہ اس نے بہت سیاحت کی تھی۔ حالانکہ اسے گھومنے پھرنے کا شوق نہیں تھا۔ در شہوار سفر کے دوران

بھی ایک چیز ہمیشہ نوٹ کرتی تھی کہ خان کے دھیان سے کبھی بھی سیتو کا خیال نہیں نکلا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتا اس کی خیریت ضرور پوچھتا۔ اس کے لیے اچھی اچھی چیزیں خریدتا۔ اس نے صحیح معنوں میں دونوں بیویوں کے مابین توازن برقرار رکھا تھا۔ اس نے احسن طریقے سے راتوں کی تقسیم کر رکھی تھی۔ اسے دونوں بیویوں کے جذبات، احساسات اور ضروریات کا خیال رہتا تھا۔ شاید خان کی اسی توجہ کا اثر تھا کہ سیتو بھی دن بہ دن نکھرتی جا رہی تھی۔ عالمتاب سے سیتو کے چہرے کے رنگ کہاں برداشت ہوتے تھے۔ وہ اسے زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں اور جب کبھی شہر سے رنگین آجاتی تو پھر سیتو بے چاری کی تمام دن درگت بنتی۔

آج سویرے ہی رنگین شہر سے آگئی تھی۔ سیتو کو اچھے کپڑوں اور ہلکے پھلکے زیور میں دیکھ کر استہزائیہ ہنسنے لگی۔

”کیوں ہنس رہی ہیں آپا!“ سیتو اب بالکل خاموش نہیں رہتی تھی بلکہ خانم کو اور رنگین کو کوئی چبھتا ہوا جواب دے دیتی تھی۔

”سوچ رہی ہوں ... مہمل میں ٹاٹ کا پیوند کس قدر برا لگ رہا ہے۔“

”اپنے گھر اور گھر والے کے متعلق سوچا کرو۔ ناحق ہمارے بارے میں سوچتی رہتی ہو۔“ سیتو بھی استہزائیہ ہنسی تھی۔ رنگین کو گویا تازیانہ لگ گیا۔

”اچھے کپڑے اور زیور گھنے پہن کر شہوار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تم۔“

”مقابلہ کر نہیں سکتی مگر مقابل کھڑی ضرور ہو گئی ہوں۔ خان نے نکاح کیا ہے میرے ساتھ اپنے گھر اور زندگی میں پہلے نکاح کے باوجود جگہ دی ہے۔ سحر طراز اتنی بھی کمتر نہیں ہے۔“

اس کی آنکھوں میں اعتماد کی چمک تھی اور یہ اعتماد خان کے علاوہ کون اسے بخش سکتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ بدل رہی تھی۔ در شہوار بھی حیران رہ گئی۔

”کبھی اپنی شکل و صورت دیکھنا آئینے میں۔“ رنگین نے غصے سے کہا۔ ”مجھے آئینہ دیکھنے کا تردد کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ خان کی میری طرف اٹھنے والی ہر نگاہ مجھے معتبر کر دیتی ہے۔“ وہ دھیمے سے مسکرائی۔

”خود کو کچھ بھی سمجھ لو ... کمی کمینوں کے خاندان کی ہی بیٹی کہلاؤ گی۔“

عالمتاب اب اچانک دالان میں آگئی تھیں۔ وہ خانم کو دیکھ کر نہ پہلے کی طرح ڈری نہ گھبرائی بلکہ اعتماد سے مسکراتی رہی۔

”میری حیثیت اور اہمیت تو وقت ثابت کردے گا خانم!“ وہ بہت کچھ جتا کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”نامراد! میرا بس چلے تو تجھے حویلی کے پچھواڑے میں دفنا دوں۔ نجانے کس گھڑی تیری خالہ بد ذات میری زندگی میں زہر گھولنے چلی آئی تھی اور اب اس کے پیچھے پیچھے تو بھی اپنی نحوست لے آئی۔“ خانم نے ہاتھ نچا کر کہا تھا یوں کہ ان کی گوری کلائی میں موجود کنگن بج اٹھے۔

”ایک سال گزر گیا ہے اسی طرح کچھ اور سال بھی گزر ہی جائیں گے۔ سدا آپ کی حکومت تو نہیں رہے گی خانم!“ سیتو کا انداز تائید دینے والا تھا۔

”سیتو! تمہیں بزرگوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے؟“ در شہوار سے ضبط نہ ہوا تو بول پڑی اور شاید سیتو چاہتی بھی یہی تھی کہ در شہوار بولے

اور وہ اپنے اندر کی تملہاٹ کو باہر کرے۔ رقابت سیتو کو بھی گیلی لکڑی کی طرح سلگاتی تھی۔

”بزرگ خود ہی عزت نہیں کروانا چاہتے“

”تم اپنی حد میں رہو۔“ شہوار نے ناراضی سے کہا۔

”میری حدود کا تعین کرنے والی آپ کون ہوتی ہیں؟“ سیتو سلگ کر بولی۔

”بکواس بند کر کم ذات ، ورنہ زبان کھینچ لوں گی۔“ خانم نے چنگھاڑ کر کہا۔

”بہت توہین کروائی ہے میں نے اپنی۔ اب کسی کی جرأت نہیں کوئی مجھ سے اونچی آواز میں بات کرے۔“ سیتو پھنکاری۔

”سیتو! شرم کرو تم خان کی ماں سے مخاطب ہو۔“

”شہوار بی بی! آپ کو نہیں پتا یہ عورت بہت ظالم اور خود غرض ہے۔ بہت عرصہ زبان بند رکھی ہے۔ مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔ میرے پیروں کے نیچے

زمین کہاں تھی۔ اب میں مضبوطی سے کھڑی ہوں مجھے اس مغرور عورت کے ایک ایک ظلم کا بدلہ لینا ہے۔“ وہ چلائی۔

”تیرا ستیا ناس ، حرام زادی ... جس تھالی میں کھاتی ہے اس میں ہی چھید کرتی ہے۔ تیری آنکھیں نوچ لوں گی۔ زبان کاٹ دوں گی۔“ خانم آگ بگولا ہو گئی تھیں۔ ادھر شہوار حق دق کھڑی تھی کہ معاملہ کیسے سنبھالے۔

خانم نے چلا چلا کر وسائی کو بلایا۔ ساتھ میں اسے کمرے میں جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ حیرانی بلکہ دکھ کے عالم میں اپنی اونچی ، لمبی ، گوری چٹی معزز پھوپھی کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ جن کے لبوں سے گالیوں کا طوفان برآمد ہو رہا تھا۔ مگر وہ ساتھ ساتھ سیتو کو بھی قصور وار سمجھ رہی تھی جس کی بد زبانی اور بد کلامی کی وجہ سے پھوپھی جان شدید اشتعال میں آچکی تھیں۔

اسے کمرے میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس رات سلطان خان بہت دیر سے گھر آیا تھا۔ وہ سیدھا اسی کے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی سیتو کا پوچھا۔

”سیتو کہاں ہے شہوار؟“

”اپنے کمرے میں ہو گی۔“ شہوار نے سیتو کو اس ہنگامے کے بعد نہیں دیکھا تھا۔

”پھول بی بی کہاں ہے اس سے پوچھو۔“

”کیوں؟ خیریت، کوئی کام ہے تو مجھے بتا دو... سیتو سے بہتر ہی سرانجام دوں گی۔“ وہ خوش دلی سے بولی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی موجودہ زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

”یہ اس کی رپورٹس آگئی ہیں۔“ خان نے لیڈر کے بیگ میں سے ایک فائل نکال کر شہوار کو پکڑائی۔

”کیسی رپورٹس ہیں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”پریگننسی رپورٹس ہیں۔“ وہ بہت دلکشی سے مسکرایا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

شہوار نے فٹ چہرے کے ساتھ رپورٹس کو بغور دیکھا اور بولی۔

”مبارک ہو سلطان خان! اچھی خبر ہے۔“ اس دھچکے سے سنبھلنا مشکل تھا مگر وہ سنبھل چکی تھی۔

”تم کیوں اداس ہو گئی ہو؟ کیا خدا کی رحمت سے مایوس ہو۔“ وہ فوراً ہی اس کے چہرے پر چھائی رنجیدگی جان چکا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔

”شہوار! یہ تو اللہ کی دین ہے۔“ سلطان خان سمجھ چکا تھا کہ وہ اندرونی توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکی ہے۔ اسے بچوں سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اپنی سہیلی ساریہ کو اسی لیے اصرار سے بلواتی تھی کہ اس کا ایک گپلو سا بیٹا بھی ہمراہ آتا تھا۔ سلطان خان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ دنیا کی ہر نعمت اس کے قدموں میں ڈھیر کر سکتا تھا مگر اس معاملے میں اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

”جانتی ہوں میں۔“ ایک آنسو اس کے گال پر لڑھک آیا تھا۔ اسے سیتو کا صبح والا رویہ یاد آنے لگا۔ یقیناً وہ اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس

کرچکی تھی۔ تب ہی تو اس قدر با اعتماد دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ اس حویلی کا وارث پیدا کرنے والی تھی کیوں نہ مغرور ہوتی۔

”تم مایوس ہو رہی ہو گویا ہماری شادی کو صدیاں بیت گئی ہیں۔ ابھی ایک سال ہی گزرا ہے۔“

”خان ! تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ جائو سیتو کے پاس ، اس وقت اسے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو پلیز...“ وہ ایک دم رخ موڑ کر بڑے ضبط سے بولی۔

”میں کسی بہت اچھی ڈاکٹر سے کنسلٹ کرتا ہوں۔“

”تم جائو سیتو کے پاس ، اس مسئلے پر پھر بات کریں گے۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔“ وہ اب قدرے سنبھل چکی تھی۔

”پورا دن باہر کی خاک چھان کر آیا ہوں ، نہ چائے پوچھی ، نہ پانی۔“

”سوری چائے تو تم پیتے نہیں ہو۔ البتہ کھانا اور پانی ابھی لاتی ہوں۔“ وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔ سلطان خان کو کچھ تسلی ہو گئی تھی اسے مسکراتا دیکھ کر۔

وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی تو وسائی ٹرالی میں کھانا رکھ چکی تھی۔ اس نے وسائی سے سیتو کے متعلق پوچھا۔

”وہ خانم کے کمرے میں ہے۔“ وسائی نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”خانم کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے۔“ وسائی نے شاید بات بنائی تھی۔ شہوار کو کچھ اسی طرح محسوس ہوا تھا۔

”اچھا یہ ٹرالی تم کمرے میں لے چلو، میں ذرا پھوپھی جان کی طبیعت پوچھ کر آتی ہوں۔“ وہ وسائی کو ہدایات دے کر باہر نکلنے لگی تھی جب وسائی سرعت سے بولی۔



”بی بی! آپ خان کو کھانا دے کر آئو۔ میں خانم کو دوا اور دودھ دے کر ابھی آئی ہوں۔ سیتو بھی وہیں سوچکی ہے۔“

”ٹھیک ہے... تم برتن دھو کر سونا۔“ وہ ٹرائی گھسیٹ کر باہر نکل گئی۔ کمرے میں آئی تو سلطان خان فریش سا ہو کر صوفے پر بیٹھا میگزین دیکھ رہا تھا۔

”کھانا کھا لیجئے خان صاحب!“ اس نے خان کے ہاتھ سے میگزین پکڑ لیا۔

”تمہاری مانی اور ثانی سے بات ہوئی تھی؟“ اچانک یاد آنے پر اس نے در شہوار سے پوچھا

”نہیں۔“

”اسی لیے دونوں شکوے شکایات کر رہے تھے۔ کم از کم فون ہی کر لینا تھا۔“

”بس خیال نہیں رہا۔“ وہ خود کو ڈپٹنے لگی تھی۔ بھلا ایسی بھی کیا خود فراموشی۔

”صبح تیار رہنا۔“ سلطان خان نے کہا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ہم کراچی جائیں گے۔“

”سچ.....“ وہ خوشی سے چہکی۔ ایک سال کے دوران وہ صرف تین مرتبہ کراچی گئی تھی اور وہ بھی صرف ایک ہفتے کے لیے۔

اگلی صبح وہ بہت جلد بیدار ہو گئے تھے۔ شہوار نے نماز پڑھی، سلطان خان بھی مسجد سے واپس آگیا تھا۔ شہوار پھوپھی جان کو بتا کر نیچے آئی تو پھول بی بی برتن صاف کر رہی تھی۔ اس نے پھول بی بی سے پوچھا۔

”سیتو کہاں ہے؟“

”وہ تو رنگین بی بی کے پاس شہر گیا ہے۔“

”اتنی سویرے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”وہ تو رات سے ادھر ہے۔“ پھول بی بی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”کیوں؟“

”یہ تم ام کو نہیں پتا۔“ اس نے دائیں بائیں سر ہلایا۔

”تمہیں کس نے بتایا ہے کہ سیتو شہر گئی ہے۔؟“ در شہوار نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”وسائی نے۔“ پھول بی بی سادگی سے بولی۔

”میرے ساتھ وسائی نے جھوٹ کیوں بولا ہے اور وہ تو کہہ رہی تھی کہ پھوپھی جان کی طبیعت خراب ہے۔ حالانکہ پھوپھی جان بہت فریش اور صحت مند دکھائی دے رہی تھیں۔ نجانے کیا معاملہ ہے۔“ وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ راستے میں اس نے خان سے اپنی الجھن سنیر کرنا چاہی۔

”خان ! سیتو کہاں ہے ؟ کل سے اسے نہیں دیکھا۔“

”وہ رنگین آپا کے پاس شہر گئی ہے۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔ گویا اس کے لیے یہ معمول کی بات ہو۔

”تمہیں کس نے بتایا ؟“ نجانے وہ کیا کریدنا چاہتی تھی۔

”اماں نے۔“

”کس کی اجازت سے گئی ہے ؟ کیا سیتو نے تم سے پوچھا ہے۔“

”ظاہر ہے اماں نے بھیجا ہے۔ پھر اجازت کا کیا سوال۔“ خان نے گویا بات ختم کر دی تھی مگر نجانے کیوں در شہوار کی الجھن رفع نہیں ہوئی تھی۔ وہ عالمتاب کے عجیب و غریب رویے کو سوچتی رہ گئی۔

☆☆☆

”بچہ ضائع نہیں ہو سکتا ... وقت کافی گزر گیا ہے۔“ علاقے کی دائی مقامی زبان میں کہہ رہی تھی در شہوار کا ہینڈل پر رکھا ہاتھ لرز گیا تھا۔ وہ تین گھنٹے پہلے واپس آئی تھی پورے پندرہ دنوں کے بعد حالانکہ ابھی عالمتاب نے اسے کچھ دن اور رہنے کی اجازت دے دی تھی مگر نجانے کیوں در شہوار کا جی گھبرانے لگا تھا۔ سو اس نے مانی اور ثانی کے اصرار کے باوجود واپسی کے لیے شور مچا دیا۔

سلطان خان ہی اسے واپس لے کر آیا تھا۔ اسے حویلی چھوڑ کر وہ زمینوں پر چلا گیا تھا۔ در شہوار ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد اوپر عالمتاب کے کمرے

میں ان سے باتیں کرنے کی غرض سے آئی تھی جب اندر سے آتی آوازیں سن کر ٹھٹک گئی۔ وہ پشتو بول نہیں سکتی تھی مگر سمجھ ضرور لیتی تھی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

”پھوپھی جان کس کے بچے کی بات کر رہی ہیں۔“ وہ کئی لمحے سوچتی رہی۔

”سیتو کے بچے کی۔“ اس نے اندازہ لگایا تھا مگر پھر خود ہی اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ ”بھلا پھوپھی جان خان کے بچے کے متعلق ایسی بات کیسے کر سکتی ہیں۔ یہ بچہ تو ان کا حقیقی وارث ہو گا۔“

اسی شام عالمتاب خان سے کہہ رہی تھیں۔ ”دو بکرے منگوا کر سیتو کا صدقہ دو ... اور دیگیں پکوا کر غازی شاہ کے دربار بھجوا دو۔“ درشہوار نے خود کو پھر سے ملامت کیا۔ ”میں بھی نجانے کیا کیا فضول باتیں سوچتی رہتی ہوں۔ پھوپھی جان تو بہت خوش ہیں۔ سیتو کو کمرے تک محدود رکھا ہے۔ کسی بھی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ کسی اجنبی عورت سے نظر کے خدشے کی وجہ سے ملنے نہیں دیتیں۔“ وہ بے اختیار سوچے گئی۔

”بی بی! آپ کو خانم بلا رہی ہیں۔“ پھول بی بی نے اسے سوچوں کے بھنور میں سے نکالا۔ وہ تیزی سے عالمتاب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”جی پھوپھی جان! آپ نے بلوایا ہے۔“ اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”ہاں میرے بچے! ادھر میرے پاس بیٹھ۔“ انہوں نے بڑی محبت سے اپنے قریب جگہ بنائی۔

”کراچی والے ٹھیک ہیں؟“

”جی۔“ وہ مختصر بولی۔

”تم بھی خوش ہو؟“ انہوں نے جانچتی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

”میں بہت خوش ہوں۔“

”سچ کہہ رہی ہو؟“ انہیں گویا یقین نہیں آیا تھا۔

”بالکل سچ۔“ وہ سچائی سے بولی۔

”تم نے میرا مان بڑھا دیا ہے شہوار! دل خوش کر دیا ہے میرا۔ مجھے اسی لیے اپنے نسب پر، خاندان پر فخر ہے۔ ہماری بیٹیاں ہماری عزت کا بھرم رکھتی ہیں۔“ عالمتاب نے بے اختیار اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ اور بولیں

”تم نے خان کی اس بھول بلکہ گناہ کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنے باپ سے بھی نہیں میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے اپنی پھوپھی کو شرمندگی کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا ہے۔ دیکھ بیٹی! تیری آزمائش زیادہ دنوں پر محیط نہیں ہے۔ جلد ہی تمہیں اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا۔“

”کس عذاب سے؟“ شہوار نا سمجھی کے عالم میں بولی۔

”رقابت کے عذاب سے، سوکن کے عذاب سے۔“ وہ تنفر سے بولیں۔

”میں اپنے نصیب پر راضی ہوں۔ میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے

پھوپھی جان!“ شہوار نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

”میں لوگوں کے طعنے تشنے کا حوصلہ خود میں نہیں رکھتی۔ آفریدی قبیلے کے ہر فرد نے بابا جان پر انگلی اٹھانی تھی کہ جیسی ماں ویسی بیٹی نہ ماں شوہر سے نبھا کر سکی ہے اور نہ اب بیٹی نے شوہر سے نبھا کیا۔ میں اس گالی کو سہنے کا حوصلہ کہاں سے لاتی۔ سو دل سے راضی ہوں۔ خان مجھ سے محبت کرتا ہے، میرا خیال رکھتا ہے۔ مجھے مزید کسی اور شے کی طلب نہیں۔“

”میں تیرے دکھ سے واقف ہوں بیٹی! خود بھی اسی عذاب میں جلتی رہی ہوں۔ زیتون بانو کی بھلا کیا مجال تھی۔ یہ تو میرا بیٹا ہی مجھے دھوکا دے گیا ہے۔ میں ہار چکی ہوں ماس عورت سے اور مجھے میرے بیٹے نے ہی شکست سے دوچار کیا ہے۔“ وہ زہر خند ہوئیں۔

”وہ کلمو ہی میری آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی ہے جی چاہتا ہے۔ آگ لگا دوں اسے“ وہ نفرت سے سوچ رہی تھیں۔

”پھوپھی جان! ایک بات پوچھوں؟“ اس نے اجازت طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں پوچھ... ایک چھوڑ ہزار باتیں پوچھ۔“

”سیٹو رنگین آپا کے پاس شہر کیوں گئی تھی؟“

”رنگین کی صحت خراب تھی اس لئے بھیجا تھا اسے۔“ انہوں نے گڑبڑا کر

جواب دیا۔

”تو آپ کسی ملازمہ کو بھیج دیتیں۔“

”سیٹو بھی ملازمہ ہے۔ میں تو کبھی اسے مالکن کا درجہ نہ دوں ... اگر تجھ سے

خوشخبری کی خوشبو پاتی تو میرے قدم آج زمین پر نہ ٹک رہے ہوتے۔“ وہ

نجانے کیا سوچتی جارہی تھیں۔ شہوار نے متوجہ کیا تو گلا کھنکھار کر بولیں۔

”سیٹو کا شہر کی ڈاکٹرنی سے چیک اپ بھی کروانا تھا۔“

”اوہ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

”خان کا تیرے ساتھ روئے ٹھیک تو ہے؟“

”ہوں...“ اس نے ہنکارا بھرا۔

”سچ بتا شہوار! بچے کی خبر کے بعد اس کے رویے میں کوئی فرق تو نہیں

آیا۔“ ان کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔

”نہیں پھوپھی جان! خان بہت اچھا ہے۔ بلکہ وہ تو سب کے ساتھ بہت اچھا

ہے۔ آپ کے ساتھ میرے ساتھ ... نوکروں کے ساتھ، مزارعوں کے ساتھ

اور پھر سیٹو کے ساتھ بھی تو اس کا رویہ اچھا ہونا ہی ہے۔ وہ خان کے بچے

کی ماں بننے والی ہے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”کم بخت، اسی لیے تو اتراتی پھرتی ہے۔“ وہ جل کر بولیں۔

”احمق جو ہوئی... ورنہ اس حالت میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔“ خانم کو

بھتیجی کی سادگی پر جی بھر کر تائو آیا۔

”بے وقوف تو تم ہو... اللہ نے حسن بھی دیا ہے۔ ذہانت سے بھی سرفراز کیا

ہے۔ اتنا نہیں ہو سکا کہ شوہر کو ایک کم شکل عورت کے چنگل سے آزاد

کروالیتیں۔“



”پھوپھی اماں! آپ کا بیٹا صورت کے عشق میں گرفتار ہونے والا نہیں۔ سب سے بڑی بات وہ حقوق اور فرائض میں کوتاہی نہیں کر سکتا۔ یہ جنگ محبت کی تھوڑی ہے۔ محبت تو وہ مجھ سے کرتا ہے۔ یہ جنگ فرائض کی ہے اور وہ اپنا فرض اچھی طرح سے نبھا رہا ہے۔“

”یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ تم بھی تھوڑا اپنے اندر رعب اور دبدبہ پیدا کرو۔ وہ کل کی چھوکری اس قدر زبان دراز ہو چکی ہے اور تم...“ ان کی ناراضی بجا تھی۔ وہ اپنی بھتیجی میں وہ سب خوبیاں دیکھنا چاہتی تھیں جو کہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

”پھوپھی جان! سیتو آپ سے اتنی بدتمیزی کیوں کرتی ہے؟“ شہوار نے حیرانی سے پوچھا۔

”کلموہی کے پیٹ میں انانج جو ڈالا ہے۔ نمک حرام ہوتے ہیں یہ کمی کین لوگ۔“ عالمتاب نے حقارت سے کہا۔

”بہر حال آپ اس کا ریگولر چیک اپ کرواتی رہیے گا۔ بے چاری بہت ویک ہے۔ کھاتی پیتی بھی تو کچھ نہیں۔ آئندہ اس کی ڈائٹ کا میں خیال رکھوں گی۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

”تمہیں سیتو کے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے تحکم سے کہا۔

”کیوں؟“

”بس میں نے کہہ دیا ہے۔“ ان کا انداز ناقابل فہم تھا۔

”پھر بھی کوئی وجہ تو ہو گی؟“ اس نے جرح کی۔

”اس کا سایہ تم پر پڑ جائے گا۔“ انہوں نے جان بوجھ کر بات بنائی۔

”یہ کیا بات ہوئی“ شہوار ہنس پڑی۔

”میں نے منع کیا ہے نا لہذا تم سیتو کے قریب بھی نہیں پھٹکو گی۔“ انہوں نے گویا وارننگ دی۔ پاگل ہے انٹ شنٹ بکتی رہتی ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ سر ہلا کر انہیں مطمئن کرنے کے بعد ابھی نیچے ہی آئی تھی جب پھول بی بی دبے قدموں اندر چلی آئی۔

”کیا بات ہے؟“

”بی بی! ام کو سیتو بی بی نے بھیجا ہے۔“

”کیوں؟“

”وہ آپ کو بلاتا ہے۔ بولتا ہے ضروری بات کرنی ہے۔ خانم کو پتہ نہ چلے چکے سے آجائیں۔“ پھول بی بی نے راز داری سے گویا التجا کی تھی۔

”سیتو بی بی بہت بیمار ہے۔ آپ اس کی بات سن لو بی بی۔“

”چلو تم۔ میں ابھی آرہی ہوں۔“ کچھ دیر سوچ کر وہ لائٹ آف کر کے باہر آگئی تھی۔ سلطان خان کو ہاٹ گیا ہوا تھا۔ کل رات اسے واپس آنا تھا۔ سو وہ بے دھڑک سیتو کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

”شہوار بی بی! تم کہاں تھیں... میں نے تمہیں اتنا یاد کیا۔“ بستر پر لیٹی سیتو ایک دم اس سے اٹھ کر لیٹ گئی۔

”خیریت، تمہیں کیا ہوا ہے۔ کس قدر زرد ہو رہی ہو۔“

”میں بیمار تھی۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”شہوار بی بی! تم اور خان اچھے ہو اور باقی سب بہت برے ہیں۔ بہت بے رحم ہیں۔“ وہ لرزتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”باقی کون...؟ پھولی بی بی، وسائی، سکھاں یا خانم“

”خانم... اس نے گویا سرگوشی کی۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“

”سچ بول رہی ہوں بی بی! خانم کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ مجھے مار ڈالے۔“ سیتو رونے لگی۔

”مگر کیوں؟ وہ ایسا کیوں کریں گی؟“

”نفرت کرتی ہیں مجھ سے ... میری خالہ سے۔“

”مگر وہ تو مرچکی ہیں۔“ شہوار کو حیرت ہوئی۔

”خالہ نے میرا نکاح خان سے کروایا ہے۔ اس لیے بھی ... وہ اپنی سوکن سے تمام عمر نفرت کرتی رہی ہیں۔“ وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

”خانم نے مجھے بہت مارا ہے۔ میرا کھانا پینا دوائی بند کر رکھی ہے۔“

”کیا .....؟“ وہ گم صم رہ گئی۔

”تم کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔“ سیتو نے رنجیدگی سے کہا۔

”سیتو! یہ باتیں تم نے خان کو بتانا تھیں۔“

”میں خان سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ وہ بہت خوفزدہ تھی۔

”کیوں؟“

”خانم مجھے جان سے مار ڈالیں گی۔“

”تم اتنی بد گمان کیوں ہو۔ خانم تو بچے کی آمد سے خوش ہیں۔“

”سب دکھاوا ہے۔“ وہ تھک کر بولی

”تم خان کو بتانا۔“

”ہوں ...“ اس نے ہنکارا بھرا تھا۔ وہ اک نئی الجھن کا سرا اسے تھما کر خود تو پر سکون ہو گئی تھی مگر شہوار کا چین و سکون کھونے لگا تھا۔

☆☆☆

مانی اور ثانی آپا کو سرپرائز دینے کے چکر میں بغیر بتائے ہی آن دھمکے تھے۔

”آپا! تم جیسا بے وفا تو محبت کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے

گا۔“ مانی کے ڈائلاگز اور ثانی کے شکوے ... در شہوار بوکھلا کر رہ گئی۔

”تمہیں احمد آباد بیاہ کر تو ہم پچھتائے۔“ ”نجانے کس ڈرامے کا مکالمہ تھا۔

کراچی میں ہوتیں تو روزانہ آجاتے ... بلکہ میں نے تو تمہارے ہی گھر میں

ڈیرہ لگا لینا تھا۔“ ثانی کی محبت اسی طرح جوش مارتی تھی۔

”تم سے تو عقلمندی کی توقع کی نہیں جاسکتی۔“ مانی نے تاسف سے سر ہلایا۔

”خود کو عقل کل سمجھتے ہو۔“ تانی اس پر چڑھ دوڑا تھا۔ بمشکل آپا نے سیز فائر کروایا۔

”یہاں اپنی اوقات دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ڈپٹا۔

”آپا! کچھ کھلا دو، پیٹ میں بلیاں ناچ رہی ہیں۔“ مانی نے دہائی دی۔

”پیٹ میں چوہے ناچتے ہیں بلیاں نہیں۔“ آپا نے ہنس کر مانی کے سر پر چپٹ لگائی۔

”اس کے پیٹ میں بلیاں ڈانس کرتی ہیں اور وہ بھی ماریہ کی۔“ تانی نے فوراً چوٹ کی تھی۔

”تم اپنی چونچ بند رکھو۔“ مانی نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچائے۔

”پہلے تم اپنا چیتے جتنا منہ بند کرو۔ مکھیاں گھس جائیں گی۔“ تانی نے بھی بدلہ اتارا۔

”بی بی! خانم بول رہی ہیں۔ کھانا کھا لیں۔“ پھول بی بی نے آکر اطلاع دی۔

”پھول بی بی، سدا پھولوں کی طرح مسکراتی رہو۔ ہزاروں سال جیو۔“ مانی کی زبان پر پھر سے کھجلی ہونے لگی تھی۔ پھول بی بی بوکھلا گئی۔

”امی سے کچھ بولا خان!“

”جائو پھول بی بی! ان کی باتوں پر دھیان مت دو۔“ درشہوار کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے۔

”آؤ میرے لعل۔“ خانم نے دونوں کو پکارا۔

”پہلے بتائیں۔ لعل میں ہوں یا یہ لومڑ ہے۔“ مانی کی ہر منطق ہی نرالی تھی۔

درشہوار نے ہنسی چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

”لومڑ کسے کہا؟“ تانی نے گرج کر کہا۔ خانم کے ساتھ ساتھ وہ بھی دہل کر رہ گئی تھی۔

”تمہیں اور کسے۔“ مانی کھانے کی طرف متوجہ تھا۔

”تم خود گھامڑ گدھے ہو۔“ پھول بی بی کے سامنے اس کی عزت افزائی پر ثانی  
جل کر کباب ہو چکا تھا۔

”خاموشی سے کھانا کھاؤ... ورنہ بغیر کھانا کھائے ہال سے نکال دوں  
گی۔“ شہوار نے دونوں کو دھمکایا۔

”یہ ظلم تم اپنے لاڈلوں کے ساتھ کرو گی آپا!“ ان دونوں کو گویا یقین نہیں  
آیا تھا۔ اس کی دھمکی کا یہ اثر ہوا کہ دونوں شرافت سے کھانا کھانے لگے۔  
خانم بھتیجیوں کی نوک جھوک سے خاصی محظوظ ہو رہی تھیں۔ کھانے کے بعد  
وہ ان کو کمرہ دکھانے کی غرض سے اٹھ گئی تھی۔

”آپا! یہ سائیں سائیں بلکہ بھاں بھاں کرتی حویلی کس قدر خوفناک اور پر  
اسرار لگتی ہے۔“ ثانی حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں خوف نہیں آتا؟“ اب وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”خوف کیسا“

”اتنا بڑا خالی مکان اور صرف تم دو لوگ۔ لالہ تو زیادہ تر گھر سے باہر ہوتے  
ہیں۔“

”اتنے نوکر بھی تو ہیں۔“ شہوار نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

”پھر بھی خاموشی... مجھے تو خوف آنے لگا ہے۔“ ثانی نے جھر جھری لی۔ مانی

کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ رات کو نئی جگہ کی وجہ سے مانی کو نیند نہیں  
آ رہی تھی۔ البتہ ثانی بے خبر سو رہا تھا۔ وہ کافی دیر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا

پھر تنگ آکر اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے کھڑکی کھول کر کئی لمحے باغ میں لگے درختوں  
کو دیکھتا رہا۔ رات کے اندھیرے میں اونچے لمبے درخت بہت بھیانک دکھائی

دے رہے تھے۔ پھر کچھ سوچ کر باہر نکل آیا۔ کوریڈور سے ہوتا ہوا بڑے ہال

میں داخل ہو گیا۔ اس کا ارادہ باہر باغ میں جانے کا تھا۔ جوں ہی وہ راہداری

میں سے گزرا اندر سے آتی آوازیں سن کر ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔

”خان! تمہاری محبت نے مجھے روگی بنا دیا ہے۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے میں

تھکنے لگی ہوں۔“



”مجھے تو لگتا ہے سیتو! کہ تم بھی مجھ سے خوش نہیں ہو۔ چھوٹی اماں کے عہد کی پاسداری کرتے ہوئے ماں کا دل دکھایا ہے۔ شہوار کو تکلیف دی ہے جبکہ تم بھی دل میں نجانے کون کون سی شکایتیں جمع کیے ہوئے ہو۔“ یہ آواز مانی لاکھوں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ ایک دم اس کے اندر غم و غصے کا جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔

”میں جانتی ہوں خان! آپ میرے ساتھ فرض نبھاتے ہیں۔ محبت تو آپ کو در شہوار سے ہے۔ مگر پھر بھی میں بہت خوش ہوں۔ میری خوشی اور اطمینان کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ میرا نام آپ کے نام سے جڑا ہے۔ میں خود کو معتبر سمجھنے لگی ہوں۔“

”احساس کمتری کے احساس سے نکل کر دیکھو... تم کہیں سے کمتر نہیں ہو۔ اللہ نے تمہیں سب سے بڑی نعمت سے نوازا ہے۔“ سلطان خان کا انداز دلجوئی کرنے والا تھا۔ مانی کا چہرہ اشتعال کے عالم میں سرخ ہونے لگا۔

”یہ آپ کی توجہ کا ثمر ہے خان! ورنہ سیتو تو کچھ نہیں تھی۔ بہت ہی حقیر اور کم ذات۔“ وہ شاید مسکرائی تھی۔

”تم اپنا خیال رکھا کرو۔ میں شہوار سے کہہ دوں گا وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جایا کرے گی۔“

”خان! آپ خوش تو ہیں نا؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”میں شاید زندگی میں دوسری مرتبہ اس خبر کو سن کر خوش ہوا ہوں۔“ خان کے لہجے میں سچائی تھی۔

”پہلی مرتبہ کب خوشی ہوئی تھی؟“ سیتو نے بے چینی سے پوچھا۔

”ایک تو تم سوال بہت کرتی ہو۔ سو جائو اب۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”بتائیے نا خان!“ وہ ٹھنکی۔

”پوچھ کر کیا کرو گی۔“

”در شہوار کی خوش قسمتی پر رشک کروں گی۔“ سیتو کے جواب نے خان کو ٹھٹکا دیا۔

”بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو سحر طراز!“ وہ واقعی سیتو کے اندازوں کی درستی پر حیران ہوا تھا۔

”بڑے لوگوں نے اپنی ہمراہی کا شرف جو بخشا ہے۔“ وہ دھیمے سے مسکرائی۔

”اپنے نام کی طرح شاعرانہ باتیں کرتی ہو۔“ خان کے لب بھی مسکرا اٹھے۔

”مجھے ساحرانہ باتیں کرنا جو نہیں آتیں۔ ورنہ تم پر کوئی سحر پھونک کر اپنے

دل میں مقید کر لیتی۔“ سیتو نے بے اختیار سوچا۔

ادھر سلمان سے مزید اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے

ڈگ بھرتا سیدھا در شہوار کے کمرے میں پہنچ گیا۔ غم و غصے سے اس کا برا

حال تھا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے در شہوار کو جھنجوڑ کر اٹھایا۔

”یا وحشت۔“

وہ دہل کر اٹھی تھی۔ سلمان کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

”تم اس وقت۔“ وہ گویا کانپ گئی تھی۔ سلمان کے تاثرات دیکھ کر اسے خوف

آنے لگا۔

”اس حویلی میں کون سا ڈرامہ چل رہا ہے؟“ اس کے لفظوں میں شعلوں کی

لیک تھی۔

”کون سا ڈرامہ؟“ اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

”کیا مانی، خان اور سیتو کے تعلق کے بارے میں جان گیا ہے۔“

”سب کچھ جان کر انجان بن رہی ہو... یا تمہیں بھی بے خبری میں مارا گیا

ہے۔ سلطان ایک ملازمہ کے ساتھ۔“ وہ خون کے گھونٹ بھر کر گویا لب

بھینچے خاموش ہوا تھا۔ شاید ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

”وہ ملازمہ نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟“ وہ چیخا۔

”خان کی بیوی ہے۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

”ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا۔“

”نہیں۔“

”تم جانتی تھیں کیا؟“ مانی چنگھاڑا۔ اس انکشاف نے اسے آگ بگولا کر دیا۔

”ہاں یہی سمجھ لو۔“ اسے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

”میں تمہیں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہنے دوں گا۔“

”پاگل مت بنو۔ سیتو خان کی مجبوری ہے۔ میں تمہیں سب کچھ بتاتی

ہوں۔“ اس نے نرمی سے کہتے ہوئے زبردستی مانی کو اپنے پاس بٹھا کر وہ

سب کچھ بتا دیا جو کہ اس کے علم میں تھا۔ مگر مانی اور بھی بپھرنے لگا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا آپا! ابھی اور اسی وقت، جب تک

لالہ سیتو کو طلاق نہیں دیتے تم نہیں آؤ گی۔“ اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔ وہ

اپنے بہت ہی جوشیلے سترہ سالہ بھائی کو کئی لمحے دیکھتی رہی تھی پھر گویا تھک کر بولی۔

”مجھے مجبور مت کرو مانی! میں ماں کی طرح طلاق کا دھبہ اپنے ماتھے پر

نہیں لگوائوں گی۔“

”ان باتوں کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

”گالی ہر دور میں گالی ہی ہوتی ہے۔ میرے باپ کے کندھے جھک جائیں۔ یہ

میں گوارا نہیں کر سکتی۔“ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ مانی تھک ہار کر رو دیا۔

”اپنے ضبط کا بڑا امتحان مت لو آپا!“

”میرا امتحان قدرت کو منظور ہے۔ دیکھو آزمائش کی یہ بھٹی ہمیں کیا بناتی ہے

مگر یہ تو طے ہے کہ مجھے شائلہ آفریدی نہیں بننا۔“ وہ بے چاری رو دی

تھی۔

مانی دل پر بھاری بوجھ لیے یہاں سے گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے در شہوار سے کہا۔

”مان جاؤ آپا! میرے ساتھ چلو ... میں تمہاری زندگی کو گرہن لگتا نہیں دیکھ سکتا۔“

”میں اپنے نصیب پر شاکر ہو چکی ہوں۔“ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ سو اسے بدلنا بہت مشکل تھا۔

☆☆☆

وقت دھیرے دھیرے گزرنے لگا۔ سیتو کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی۔ عالمتاب نے بظاہر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ دیگیں پکوائیں، غریبوں میں کھانا تقسیم کیا گیا تھا۔

سلطان خان بہت خوش تھا اور در شہوار اس کی خوشی میں خوش تھی۔ ان دنوں سیتو بہت سرشار رہتی تھی۔ ہر وقت سچی بنی رہتی۔

کچھ سال مزید گزر گئے۔ در شہوار کی گود ہنوز خالی تھی۔ عالمتاب کے ماتھے پر بل پڑنے لگے تھے۔ ان کی دیرینہ خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی۔ جبکہ سیتو اپنی دنیا میں مگن تھی۔

ضوفشاں چوتھے سال میں لگی تھی۔ جب خدا نے در شہوار پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے۔ خان خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ عالمتاب کو گویا دونوں جہان کی خوشیاں مل گئی تھیں۔ ان کے رنگ ڈھنگ پھر سے بدلنے لگے۔ وہ جو بالکل مایوس ہو گئی تھیں ایک دم خوشی سے کھل اٹھیں۔ ایک مرتبہ پھر وہ پہلے والی عالمتاب بن چکی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر سیتو پر زندگی کے دروازے تنگ کیے جانے لگے۔

عالمتاب کو اب کوئی فکر، خدشہ نہیں تھا۔ انہیں اب سیتو کے وجود کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں در شہوار سے وارث ملنے کی امید ہو چکی تھی۔ سیتو پھر سے پس منظر میں چلی گئی۔ سیتو عالمتاب کی آنکھوں میں چھپنے والا ایسا کانٹا تھا جس نے ہر پل ہر لمحہ انہیں چبھن اور افیت دی تھی۔

سلطان خان رات کو ان کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ ان سے زمین اور جائیداد کے متعلق بات کر رہا تھا۔ وہ ان سے کچھ مشورہ طلب کر رہا تھا۔ عالمتاب یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔ سلطان خان، ان کا بیٹا، ان کے جگر کا ٹکڑا، راغب خان خٹک کا اکلوتا وارث۔

”اماں! میں چاہتا ہوں کہ کچھ زمینیں اور حویلی کا ایک حصہ سیتو اور ضوفشاں کے نام کر دوں۔“

”کیا مطلب...“ وہ یکدم ٹھٹک گئیں۔

”میں جائیداد کی تقسیم کرنا چاہتا ہوں... زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد میری اولاد یا بیویوں میں جاگیر کے مسائل پر جھگڑے ہوں۔ دراصل میں سیتو اور ضوفشاں کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔“

”میری زندگی میں ایسا ہر گز نہیں ہو گا۔“ ان کا ازلی جلال عود آیا۔

”اس میں حرج کیا ہے۔ اگر میں نہ رہا تب بھی جائیداد میں سے قانون انہیں حصہ ضرور دے گا۔“ اس کا انداز ناقابل فہم تھا۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو خان! خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ اپنے ہونے والے بچے کی تمام خوشیاں دیکھو۔“ ماں کا دل پسچ گیا تھا مگر وہ بیٹے کی خواہش کے سامنے سر جھکانا نہیں چاہتی تھیں۔ سیتو جیسی کم ذات کو خود مختاری سونپنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ خان نے مزید بحث نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے چلا گیا تھا کچھ دن بعد منشی نے آکر عالمتاب کو خبر دار کر دیا۔

”خان! نے حویلی اور جائیداد میں اپنی دوسری بیوی اور بچی کو حصہ دے دیا ہے۔ آج قانونی کارروائی ہو چکی ہے۔ ابھی ابھی پٹواری شہر روانہ ہوا ہے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ انہیں لگا تھا کہ دوسرا راغب خان ان کے مقابل آن کھڑا ہوا ہے۔ وہ بھی تو زیتون بانو کو زمینیں اور جائیدادیں سونپنا چاہتا تھا مگر عالمتاب نے ایسا کچھ ہونے نہیں دیا تھا مگر اب بازی ایک دم الٹ گئی تھی۔ ان کے بیٹے نے ایک دفعہ پھر انہیں شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ زہریلی ناگن کی طرح بل کھانے لگیں۔



ان دنوں شہوار کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ اس قدر نیند آتی کہ وہ سارا سارا دن سوئی رہتی۔ عالمتاب کو اس کی صحت کی بہت فکر تھی۔ فروٹس، جوسز، دودھ لیے خادماں اس کے سر پر کھڑی رہتیں۔ اپنی سستی بھگانے کے لیے شہوار نے گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ خانم کے منع کرنے کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔

شہوار نے محسوس کیا کہ سیتو کا رویہ بھی چند دنوں میں بدل گیا ہے۔ وہ بہت خود سر اور زبان دراز ہو چکی تھی۔ خانم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی۔ ایک دن بند کمرے میں ان کی تکرار ہو رہی تھی۔ در شہوار کے کان میں قریب سے سے گزرتے ہوئے چند فقرے پڑے۔

”خانم! تمہاری بادشاہت صرف چند گھڑیوں پر مشتمل ہے۔ کوڑھ کے مریض کی طرح تمہیں حویلی کے پچھواڑے میں ڈال دوں گی۔ گن گن کر بدلے لوں گی تم سے۔ بڑا زہر بھر دیا ہے تم نے میرے اندر... ابھی تو تم سے میں نے اپنی خالہ کی اذیتوں کا بدلہ بھی لینا ہے۔“

”اونہہ، تو کل کی چھوکری میرے مقابل کھڑی ہو گی۔ حویلی اور جائیداد میں حصہ دار بن کر تم باختیار نہیں ہو گئی۔ ابھی دو منٹ میں تیرے کس بل نکال سکتی ہوں۔“ خانم پھنکاریں۔

”زیتوں بانو کے نیل و نیل وجود کا تم نے حساب دینا ہے۔ اسے سیڑھیوں سے دھکا کس نے دیا تھا۔ اس کے بچے کی قاتل تم شیطان عورت۔“ سیتو کی دھیمی آواز میں غراہٹ تھی۔ در شہوار کانپ کر رہ گئی۔ اس کی چھٹی حس خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ ایسا ہی الارم خانم کی سماعتوں کے قریب بج اٹھا تھا۔

یہ سیتو تو آستین کا سانپ نکل آئی تھی۔ اسے پچیس سال پرانی باتیں کس نے بتائیں؟ خانم کا ذہن تیزی سے نیا منصوبہ بنا رہا تھا اور کچھ بھولی بسری یادیں بھی تازہ ہو رہی تھیں۔

راغب علی خان کی دوسری شادی سراسر عالمتاب کی توہین تھی۔ وہ غصے میں محض بل کھا کر رہ گئیں۔ زیتون بانو حویلی میں دلہن بن کر اتر آئی

تھیں۔ عالمتاب کو بہت عرصہ سسر اور شوہر کے خوف سے زبان بند رکھنا پڑی۔ سسر کی وفات کے بعد حویلی پر ان کا اختیار واضح ہو گیا۔ سلطان خان کی ماں بن کر ان کی حیثیت کو زیتون بانو چیلنج نہیں کر سکتی تھی۔

ایسے ہی زرد دن میں عالمتاب کو وسائی نے بتایا کہ زیتون بانو پھر سے امید سے ہو گئی ہیں۔

”کیا؟“ وہ بے چین ہو اٹھیں۔ ایک شام انہوں نے زیتون بانو کو اوپری منزل کی صفائی کے لیے بھیج دیا۔ اس وقت گھر کے نوکر اپنے کوارٹرز میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے اطمینان سے سیڑھیوں پر اچھی طرح تیل پھیلا دیا تھا۔ یوں اپنے ہی دھیان میں مگن سیڑھیاں اترتی زیتون بانو پھسلتے ہوئے زمین بوس ہو گئیں۔ اس حادثے میں وہ اپنی دونوں ٹانگیں گنوا بیٹھی تھیں۔ تین جگہ سے دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ان کے دوہرے نقصان ہوئے تھے مگر وہ زبان بند کیے اپنی لحد میں اتر گئیں۔ آج تک اس راز پر سے پردہ اٹھانے کی

جرات کسی میں نہیں ہوئی تھی پھر اس دو ٹکے کی سیتو کی بھلا کیا مجال تھی۔ وہ پرسکون ہو کر کچھ اور سوچ رہی تھیں۔

”میں تو چاہتی ہوں کہ تم زندہ رہو۔ ضوفشاں کی ماں ہو مگر تم خود ہی۔“ انہوں نے زیر لب کہا تھا اور پھر اطمینان سے تسبیح پڑھنے لگیں۔

☆☆☆

”خان! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے سفید پتھروں والا زیور لاکر دو گے۔“ درشہوار دودھ کا گلاس لیے اندر داخل ہوئی تو سیتو دلار سے فرمائش کر رہی تھی۔

”اب شہر گیا تو یاد کروانا۔“ وہ کچھ کاغذات سامنے پھیلائے مصروف انداز میں بولا تھا۔ درشہوار نے گلاس اس کے سامنے رکھا۔

”تم نے دودھ پیا؟“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

”میرا دل نہیں چاہتا۔“ شہوار بے زاری سے بولی۔

”دوا سمجھ کر پی لیا کرو۔“

”میں سیتو تھوڑی ہوں کہ پورا جگ دودھ کا پی جاؤں۔“ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”خان! شہوار بی بی میرا کھانا پینا گنتی ہیں۔“ اس نے فوراً شکایتاً کہا۔ ”مجھے نظر بھی لگ سکتی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”نہ نظر لگانا اسے شہوار! بے چاری اور موٹی ہو جائے گی۔“ وہ مذاقاً بولا تھا۔ سیتو پہلے سے اچھی خاصی صحتمند اور پیاری ہو گئی تھی۔

”ابھی تو وہ سوچکی ہے۔“ شہوار نے اسے بتایا۔

سیتو باہر نکل گئی تھی۔ شہوار، خان سے تفصیلاً بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ سیتو

اور خانم کی گفتگو کے متعلق اسے بتانا چاہتی تھی اور بھی بہت سے الجھنیں

تھیں، جو خان سے شیئر کرنا ضروری ہو گیا تھا مگر سلطان خان کے پاس اب

وقت کی بہت قلت تھی۔ دو تین مقدمے ایسے تھے جو کہ وہ جیت چکا

تھا۔ اسی وجہ سے وہ بہت مصروف ہو چکا تھا۔ اپنی زمین پر وہ موسم کے فروٹ

اسٹور کرنے کے لیے کولڈ فارم تعمیر کروا رہا تھا ان دنوں وہ زیادہ تر باہر ہی رہتا تھا۔ اب بھی اچانک اسے کسی مزدور کے زخمی ہو جانے کی وجہ سے جانا پڑا۔

”شہوار! تم سو جانا... میں ذرا دیر سے آؤں گا۔“ وہ اس کے گال تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

در شہوار، عالمتاب کی شخصیت کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ نجانے کتنے خول چڑھا رکھے تھے انہوں نے اپنے اوپر... کبھی کبھی بہت ہی پراسرار لگنے لگتی تھیں کہ شہوار کو بھی خوف آنے لگتا تھا اور سیتو بھی ناقابل فہم کردار تھا وہ جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی۔

☆☆☆

اس سے اگلی شام کی بات تھی۔ خان کو سٹہ گیا ہوا تھا۔ گھر میں ہو کا عالم تھا۔

نجانے تمام نوکر کہاں تھے۔ وہ مینگو شیک بنانے کے لیے کچن میں آئی تھی۔ دو

گلاس شیک پینے کے بعد اس نے ایک گلاس میں سیتو کے لیے بھی ڈال لیا

تھا۔ تبھی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ بڑے کمرے میں فون سننے چلی گئی۔ مانی اور ثانی کا فون تھا۔ وہ دونوں اتنی جلدی کہاں چھوڑنے والے تھے۔ بیس منٹ بعد خود ہی فون بند ہو گیا تھا۔ وہ بھائیوں کی باتیں انجوائے کرتی پھر کچن میں آگئی۔ سلیب پر اسی طرح گلاس رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا تو وسائی برتن دھونے کے لیے آگئی۔ درشہوار اسے رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے کر سیتو کے کمرے میں آگئی۔ سیتو ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

”یہ شیک پی لو۔ اپنے لیے بنایا تھا۔ تمہارے لیے بھی لے آئی ہوں۔“  
 ”شکریہ جناب کا۔“ سیتو مسکرائی۔

”ضوفی کدھر ہے؟ میں خان کو فون کرنے لگی ہوں۔ ضوفی کی بات بھی کروا دیتی ہوں۔“

”وہ شاید باغ میں ہے۔“ سیتو نے گلاس اٹھا کر ٹی پر نگاہیں جما دیں۔ شہوار باہر نکل آئی تھی۔ ضوفی باغ میں کھیل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر لپک کر آگئی۔  
 ”امی جان! بابا کب آئیں گے؟“

”ابھی کچھ دیر تک آجائیں گے۔ چلو تم اندر اس وقت باہر نہیں نکلتے۔“  
 ”وہ ضوفی کو گود میں اٹھائے ابھی کوریڈور میں تھی جب سیتو گھبرائی، بوکھلائی باہر نکل آئی۔ اس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔“

”شہوار بی بی مجھے نجانے کیا ہو رہا ہے۔“ اسے ابکائیاں آرہی تھیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ اس کے پیٹ میں شدید درد تھا۔ درشہوار بھی گھبرا اٹھی۔

”وسائی! بھاگ کر جا، جیلے خان حکیم کو بلا کر لا۔“ سکھاں نے وسائی کو باہر دوڑایا۔

”میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ سیتو کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔“ وہ بے ہوش پڑی سیتو کا ڈوپٹے سے منہ صاف کرتے ہوئے گھبرائی آواز میں بولی۔ اسی پل جیپ حویلی کا پھاٹک عبور کر کے پورچ میں آرکی۔ سلطان خان آگیا تھا۔ وہ سیتو کے گرد انہیں کھڑا دیکھ کر ادھر ہی چلا آیا۔

”کیا ہوا ہے اسے؟ وہ دوزانو بیٹھ کر سیتو کے گال تھپتھپانے لگا۔“

”پیٹ میں درد ہے۔ الٹیاں آرہی تھیں اسے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا پھر یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔“ در شہوار نے گھبرائی ہوئی آواز میں بتایا۔

”کیا کھایا ہے اس نے؟“

”آم والا دودھ پیا ہے۔“ سکھاں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ وہ بغیر کچھ کہے سیتو کو بانہوں میں اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ در شہوار بھی ساتھ جانا چاہ رہی تھی۔ جب تک وہ چادر لے کر آئی جیپ پھاٹک عبور کر گئی تھی۔ تین گھنٹے کے ناقابل برداشت انتظار کے بعد سیتو کو مردہ حالت میں واپس لایا گیا۔

”سیتو مر گئی ہے۔“ جائے نماز پر بیٹھی در شہوار کو پھول بی بی نے آکر بتایا۔

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس کا دل پاتال میں اترنے لگا۔

☆☆☆

وہ ہسپتال کی عمارت سے باہر نکلا تو موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔ آتے جاتے موسم اب اس پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔

اس کے ہاتھ میں پوسٹمارٹم رپورٹ تھی۔ ابھی کچھ دیر بعد وہ گھر میں عدالت لگانے والا تھا۔ ایک کٹہرے میں اس کی ماں اور دوسرے میں بیوی کھڑی تھی۔ اسے سیتو کا قاتل منظر عام پر لانا تھا۔

سیتو، جس کے ساتھ اس نے مجبوری کا بندھن باندھا تھا۔ وہ زیتون بانو کے بندھے ہاتھوں کی التجا تھی۔ جسے اس نے بیوی کا درجہ دیا تھا۔ عزت دی تھی۔ احترام دیا تھا۔ وہ جو اس سے نوعمری میں عشق کرنے لگی تھی۔ خیر دین مزارعے کی سحر طراز حویلی والوں کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئی۔

کون اس کا قاتل تھا؟ سلطان خان کی ماں یا محبوب بیوی؟ ان دونوں عورتوں کے علاوہ راغب علی خان کی حویلی میں اور تھا ہی کون۔

”سحر طراز کو شیک میں زہر دیا گیا تھا۔“ ڈاکٹر کاشف نے رپورٹ تھمتے ہوئے کہا تھا۔

حویلی پہنچ کر اس نے تمام خادماؤں کو لائن میں کھڑا کر دیا تھا۔ سکھاں، وسائی، شاداں اور پھول بی بی... ان میں سب سے کم عمر ملازمہ پھول بی بی



تھی۔ باقی تینوں تیس سالوں سے حویلی میں مقیم تھیں۔ پھول بی بی کو تفتیش کی لسٹ میں سے خارج کر دیا گیا تھا۔

یہ تینوں حویلی کی نمک خوار خادماں تھیں۔ ان میں سے کسی کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ حویلی کی مالکن کو زہر دے دیتیں۔

اب وہ اپنی ماں یعنی خانم عالمتاب کے کمرے میں چلا آیا۔ در شہوار کو بھی بلوا لیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جزدان میں لپٹا قرآن پاک کا نسخہ تھا۔ اس کی نگاہیں ماں اور بیوی کے چہروں پر گویا گڑی ہوئی تھیں۔

”آپ دونوں کو حلفیہ بیان دینا ہوگا کہ سیتو کے قتل میں آپ دونوں کا ہاتھ نہیں ہے۔ میں آپ کے حلفیہ بیان پر یقین کروں گا اور سیتو کی موت کو امر خد اوندی سمجھ کر تسلیم کر لوں گا کہ وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر آئی تھی۔“ سلطان خان کے لہجے میں زخمی شیر کی پھنکار تھی۔ وہ کچھ لمحے سوچنے کے بعد پھر سے بولا۔

”مگر اس کا قتل ثابت ہونے کی صورت میں میرے عتاب سے آپ کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔ یہ میرا خود سے عہد ہے۔ بولو در شہوار! اسے دودھ تم نے پلایا ہے۔ وسائی گواہ ہے۔ سیتو کے بیان محفوظ ہیں اور قرآن پاک تمہارے سامنے ہے۔ ایک بات یاد رکھنا، مرنے سے پہلے وہ مجھے بتا چکی ہے کہ ملک شیک میں زہر تم نے ملایا تھا اور وہ گلاس تم اپنے ہاتھوں سے سیتو کو دے کر آئی تھیں... اب بولو، جواب دو۔“ وہ اسے خاموش دیکھ کر دھاڑا۔ حویلی کے در و دیوار نے پہلی مرتبہ سلطان خان کی بلند آواز سنی تھی۔

در شہوار قرآن پاک کو ہاتھ میں لیکر بولنا چاہ رہی تھی جب ایک دم خانم چیخ اٹھیں۔

”تم اپنی ماں پر الزام لگا رہے ہو۔ بہتان باندھ رہے ہو۔ میں حلفیہ کہتی ہوں کہ سیتو کو میں نے زہر نہیں دیا۔ اپنی بیوی سے پوچھو۔ اسے ہی اس کی کمزوری کا، صحت کا خیال رہتا تھا۔ اسی بہانے کام تمام کر دیا ہے بے چاری کا اس نے۔ میری نہیں اس کی سوکن تھی وہ... مجھے کیا ضرورت تھی اسے مارنے کی ...

مارنا ہوتا تو میں زیتون بانو کو مارتی ، جس کے ساتھ میرا رقابت کا رشتہ تھا۔“

”پھوپھی جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ درشہوار ہکا بکا رہ گئی۔

”سچ کہہ رہی ہوں۔“ انہوں نے رکھائی سے کہا۔

”میں نے تو سوچا تھا کہ آپ میرا ساتھ دیں گی مگر آپ۔“ صدمے کی شدت سے اس کی آواز پھٹ گئی۔

”مجھے قاتلوں کا ساتھ نہیں دینا۔“

”میں نے سیتو کو نہیں مارا، میرا سچ وقت ثابت کرے گا۔“ اس کے لہجے میں

پتھروں سی سختی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ سامنے کھڑی عورت بہت مفاد

پرست اور حاسد ہے۔ بازی پلٹتی دیکھ کر گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا تھا اس نے۔

”سلطان خان! میرے حصے کی سزا سنا دو مجھے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔ اسے گویا یقین ہو چکا تھا کہ سلطان خان اس کی کسی بات کا یقین نہیں کرے گا۔ سو فوراً ہی ہتھیار ڈالنے لگی۔ ویسے بھی وسائی کا بیان ، سیتو کا اعتراف اور خانم کا جھوٹ سب وزن میں برابر ہو چکے تھے۔ درشہوار کا پلڑا ہلکا رہ گیا تھا۔ یہ سراسر پولیس کیس تھا۔ سلطان خان کے اثر و رسوخ کی وجہ سے بات دب گئی تھی۔

”درشہوار مجھے تم سے محبت تھی۔ میں تمہارے اس گناہ کو معاف کر سکتا تھا مگر تم نے ضوفی کی ماں کو اس سے چھین لیا ہے۔ میں تمہارا یہ گناہ قبر تک معاف نہیں کروں گا۔ میں تمہیں احسن طریقے سے خود سے الگ کرتا ہوں تم اس حویلی سے چلی جاؤ۔ جب جب تم پر نگاہ پڑے گی ، مجھے میری بیٹی کی محرومیاں افیت میں مبتلا کر دیں گی۔“

وہ اسے سزا سنا کر چلا گیا تھا۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیتا۔ سلطان خان نے اسے طلاق نہیں دی تھی۔

وہ اگلی صبح کراچی روانہ ہو گئی تھی۔ چار ماہ بعد اس نے سلطان خان کے بیٹے کو جنم دیا تھا

اور اب محض ایک سال بعد اسے لینے کے لیے آگیا تھا۔ درشہوار کو نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بیتے دنوں کی یاد میں بھیگتی رہیں۔

☆☆☆

”آپا! لالہ آئے ہیں۔“ مانی دروازے کی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔

”تو میں کیا کروں۔“ وہ غصے سے بولی۔

”آپ ایک دفعہ ان کی بات سن لیں۔“

”اگر نہ سنوں تو۔“

”تو ہم زبردستی سنوا لیں گے۔“ ثانی بھی لپک کر آیا۔

”جبران کدھر ہے؟“ اسے اپنے بیٹے کا خیال آیا تو غصے سے بولی۔

”اپنے بابا کے پاس۔“

”جائو لے کر آؤ اسے۔“

”وہ اغوا نہیں کر لیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ہم ان کی بیٹی ضوفی کو

کڈنیپ کر لیں گے۔“ ثانی نے ضوفی کے پھولے گال پر چٹکی بھر کر

پوچھا۔ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

”بالکل ٹھیک۔“ ضوفی کھلکھلائی۔

”امی جان! ہم اپنے بھائی کو لے جائیں گے۔“

”کہاں...“ مانی نے پوچھا۔

”ڈنمارک...“ بچی نے نزاکت سے کہا۔

”ان باپ بیٹی کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔“ مانی مزے سے بولا تھا۔ رات کو

ایک مرتبہ پھر بابا جان اس کے پاس آئے تھے۔

”شہوار! تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”کیسا فیصلہ؟“ وہ ٹھٹکی۔

”اپنی زندگی کے بارے میں۔“

”فیصلہ تو آپ کر چکے ہیں۔“

”میں ابھی کی بات کر رہا ہوں۔“ انہوں نے رسان سے کہا۔

”میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”ایسے کس طرح گزرے گی اگر تمہیں سلطان خان کا ساتھ منظور نہیں تم

اسے معاف نہیں کر سکتیں تو میں اس سے کہتا ہوں اچھے طریقے سے میری

بیٹی کو فارغ کر دے۔“ وہ گویا فیصلہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ در شہوار

کے قدموں تلے زمین کھسک گئی۔

”بابا! میں طلاق نہیں لوں گی۔“ بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔ ”مگر اس کے ساتھ

رہنا بھی نہیں چاہتی۔“

مجھے اپنی تذلیل اور توہین نہیں بھولتی۔

”معاف کر دو بیٹا! معاف کرنے والے اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں۔“

”آپ کو کس نے بتایا کہ میرا ظرف وسیع ہے۔“ وہ رکھائی سے بولی۔ بابا جان

اسے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا مشورہ دیکر فی الحال چلے گئے تھے۔ صبح

صبح مانی اور ثانی کے ساتھ ضوفی پھر سے آگئی۔

”امی جان! آپ کب چلیں گی ہمارے ساتھ بابا نے آپ کا ٹکٹ بھی خریدنا

ہے۔“ اتنی سے بچی خوب پڑھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ یقیناً باپ نے رٹایا تھا۔

”اگلے سال چلوں گی۔“ اس نے بچی کو ٹالا۔

”اس سال کیوں نہیں؟“ بچی ٹھنکی۔

”مانی اسے لے جائو۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”اس کے بابا کو بھیج دوں۔“ مانی نے آنکھوں میں شرارت بھر کر کہا۔

”سیدھے ہاتھ کے دو جھانپڑ لگائوں گی۔“

”آپا! کتنی ظالم ہو تم، معاف کیوں نہیں کر دیتیں لالہ کو۔“ ثانی خفگی سے بولا

تھا۔

”کئی کمینوں کو ہارٹ اٹیک ہوا ہوگا جب تم پیدا ہوئے تھے۔ وکیل صفائی بن کر آجاتے ہو۔“

”لالہ نے معافی نامہ بھیجا ہے۔ آپ غور کر لیں۔“ مانی نے لفافہ اس کے سامنے ڈال دیا اور خود باہر چلا گیا۔

شہوار نے اس دو تین صفحات پر مشتمل خط کو پڑھنا شروع کیا۔ اس کی نظریں تحریر پر پھسل رہی تھیں۔

”شہوار میں اک عام سا کم پڑھا لکھا دیہاتی ہوں۔ مجھے باتیں بنانی نہیں آتیں مگر میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ تم اس معمولی سے دیہاتی کی آنکھوں میں اترنے والا پہلا پہلا خواب ہو۔ تمہاری تصویر میرے دل اور آنکھوں میں سجانے والی اماں جان تھیں۔ انہوں نے اول روز سے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ تم یعنی در شہوار میری دلہن بنو گی۔ میں نے تمہارے حوالے سے بے شمار خواب دیکھ رکھے تھے۔ حسین، خوشنما، دل نشین خواب حالانکہ میں حسن پرست نہیں ہوں۔ فصل کی بوائی، کٹائی میں... ہل چلاتے ہوئے ساون، بھادوں

ہر موسم میں، ہر رات میں تمہارا تصور میرے ہمراہ تھا۔ پھر کسی سیتو کی بھلا کہاں گنجائش نکل سکتی تھی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ خدا نے مجھے بے حد نرم دل سے نوازا ہے۔ اسی لیے مجھے اپنی چھوٹی ماں سے بہت انسیت تھی۔ اپنے نوکروں، مزارعوں سے محبت تھی۔

تم سے نکاح کے بعد میں بہت سرشار تھا۔ مگر ان دنوں چھوٹی اماں ابھی ابھی نظر آتی تھیں۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ ہر راز، ہر بات... وہ سب اذیتیں جو اماں جان کی طرف سے

انہیں سوغات میں ملی تھیں۔ ان کے غم کا بوجھ میرے دل کو بو جھل کر گیا تھا۔ اماں جان نے ان کے ساتھ بہت زیادتیاں کی تھیں۔ بہت ظلم ڈھائے تھے۔ حالانکہ وہ قطعاً بے ضرر تھیں۔ بے قصور تھیں۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میری ماں کسی کو اس حد تک مجبور اور بے بس کر سکتی ہے



انہوں نے چھوٹی اماں کو سیڑھیوں سے گرانے کے لیے جو گھٹیا ترین حرکت کی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے انہیں ہمیشہ صابر اور شاکر پایا

انہوں نے بہت افیت ناک زندگی گزاری تھی۔ شاید اسی لیے جب اپنے آخری وقت میں انہوں نے سیتو کی ذمہ داری ہمیشہ کے لیے مجھے سونپی تو میرے دل نے یہ گوار نہیں کیا کہ میں چھوٹی اماں کی آخری خواہش کو دھتکار دوں... مجھے افسوس ہے کہ میں چھوٹی اماں کی سیتو کی حفاظت نہیں کر سکا۔ چھوٹی اماں نے سیتو کے مجبور کرنے پر مجھ سے نکاح کی التجا کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے بہت چاہتی تھی لیکن میرے دل میں تمہیں، میں تمہاری محبتوں اور قربانیوں کی قدر بھی نہیں کر سکا۔

کچھ حقائق آپ کی زندگی کے انتہائی کریہہ اور بھیانک سچ ہوتے ہیں جنہیں خود سے بھی شیر نہیں کیا جاسکتا۔ مگر آج میں تمہیں سب کچھ بتانا چاہتا

ہوں۔ تم مجھ سے خفا ہو، ناراض ہو کر میں نے اس گناہ کی سزا تمہیں دی ہے جو تم سے سرزد ہوا ہی نہیں۔

سیتو کو زہر تم نے نہیں اماں جان نے دیا تھا۔ یہ سچ میں اس وقت بھی جانتا تھا مگر مجھے تم پر جھوٹا الزام لگانا پڑا۔ تمہیں کچھ عرصے کے لیے خود سے دور کرنا پڑا۔ محض اس لیے کہ مقابل میری ماں تھی۔ میں اپنی ماں کو سب کی نظروں میں گرا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں جان گیا تھا۔ سیتو کو زہر اماں نے دیا تھا، انہوں نے پھول بی بی کو کہا تھا کہ یہ دوا ہے اسکے گلاس میں ڈالنا ہے۔ یہ سچ جان کر مجھے بہت افیت ہوئی تھی میرے لیے احمد آباد میں رہنا اب ناممکن ہو چکا تھا۔ سو میں کچھ عرصے کے لیے ڈنمارک چلا گیا تھا۔ میں تم سے اور جبران سے غافل نہیں ہوا تھا مگر تمہارا سامنا کرنا بہت مشکل تھا... اگر تم مجھے معافی کا سندیسہ دے دو تو میں دو ٹکٹ اور خرید لوں گا... درشہوار! اب اور جدائی کی سزا مت دو۔

ادھر احمد آباد میں عالمتاب تنہا حکومت کر رہی ہیں۔ راغب علی خان خٹک کی حویلی میں ان کی رعایا میں ایک بیٹا تھا۔ وہ بھی بغاوت کر کے جلاوطن ہو گیا ہے۔ میں نیچے معافی نامے کا منتظر ہوں۔ اگر معاف کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو تو بیگ تیار کر کے نیچے آجاؤ۔ میں منتظر ہوں۔“

شہوار نے تحریر پر سے نظریں ہٹا کر اک طویل سانس خارج کیا تھا۔ وہ پھوپھی اماں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جن کا ططنہ اور غرور روز اول کی طرح قائم و دائم تھا۔ جنہیں اپنے کسی بھی عمل پر پشیمانی نہیں تھی۔ عجیب خودپرست قسم کی عورت تھیں۔ جنہیں پتھر کی دیواروں سے عشق تھا اور وہ اتنی بڑی حویلی میں تنہا رہنا چاہتی تھیں۔ جاگیروں پر راج کرنا چاہتی تھیں۔ نوکروں پر حکم چلاتی تھیں اور کبھی کبھی سیتو کی طرح پھول بی بی کو روئی کی مانند دھنک کر رکھ دیتیں۔ وہ ایک نفسیاتی بیماری میں مبتلا ”ذہنی مریضہ“ تھیں اور ان سے مرد اور عورت کے تعلق کو برداشت کرنا مشکل تھا۔ یہ تعلق ان کے اپنے بیٹے سلطان خان کا اپنی بیوی سحر طراز سے ہوتا یا در شہوار سے۔ ان کے ہاں بیوہ

اور مطلقہ عورتیں کام کرتی تھیں۔ اتنی قریب کی بات سلطان خان ذرا دیر سے سمجھا تھا۔ ورنہ سیتو کو اس اونچی حویلی سے نکال کر کہیں دور لے جاتا۔

اور سیتو کے بعد عالمتاب کا نشانہ در شہوار تھی۔ صرف انہیں سلطان خان کے وارث کا انتظار تھا۔ اس کے بعد در شہوار کی جگہ بھی حویلی کے پچھواڑے میں ہوتی۔ سلطان خان بہت کوشش کے باوجود اس آدھے سچ کو مکمل نہیں کر سکا تھا۔ جسے در شہوار بغیر کہے ہی جان گئی تھی۔ کیونکہ بعض سچ واقعی بہت کریہہ اور تلخ ترین ہوتے ہیں، جنہیں خود سے بھی شینر نہیں کیا جاسکتا اور سلطان خان کیسے اپنی ماں کی اس شرمناک بیماری کا اعتراف کرتا۔ اس نے بہتر یہی جانا تھا کہ در شہوار کو کچھ عرصہ کے لیے اپنے سے دور کر دے۔

نیچے سے مانی اور ثانی کی آوازیں آرہی تھیں۔ در شہوار بہت تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے چلی گئی۔ وہ سلطان خان کو اب مزید انتظار نہیں کروانا چاہتی تھی۔

## ختم شد

پاکستان  
حکومت  
مقامی